ماہنامہ
کرن
جون 2015
WWW.PAKSOCIETY.COM
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM
ماہِ رمضان کرن کے سنگ
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 5000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 6000 روپے

مستقل سلسلے

جون 2015

جلد 38 شمارہ 3

قیمت 60 روپے

خط وکتابت کا پتہ

کرن

37- اردو بازار کراچی

خط وکتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

مدیرہ کی

ماہ جون کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

بھرپور گرمی، درجہ حرارت پینتالیس ڈگری سینٹی گریڈ ٹھنڈے مشروبات ماہ جون کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ موسم کی یہ حدت اپنے اندر بے پناہ خوبیاں اور مضمرات سموئے ہوتے ہیں۔

پاکستان کے سیاسی حالات تقریباً پُر سکون ہیں۔ ہلکا سا مدو جزر جمہوری روایات کا خاصہ ہے۔

سانحہ پشاور کے بعد سانحہ صفورا اور پھر مستونگ میں پیش آنے والے واقعے نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا۔

یہ وقت کا اہم ترین تقاضا ہے کہ ہمیں اپنے ذاتی مفادات سے بالاتر ہو کر ملک و ملت کی بہتری کے لیے سوچنا چاہیے کیونکہ اسی وطن کی سلامتی ہمارے وجود اور بقا کی ضامن ہے۔

رمضان شریف کی آمد آمد ہے۔ یہ پیارا مہینہ رحمت باری تعالیٰ کے لطف عنایات کا مہینہ ہے۔ صبر اور عبادات اس مہینے کا خاصا ہیں۔ لہٰذا ان ایام کو غنیمت جانیں اور اپنے رب سے اس کی رحمتوں، بخششوں اور عفو و درگزر کی خصوصی التجائیں کریں۔ کیونکہ یہ مبارک ساعات صرف قسمت سے ہمارے حصے میں آتے ہیں۔ یہ ماہ مبارک چونکہ ایثار و قربانی کا درس دیتا ہے لہٰذا اس مقدس مہینے میں غربا و مساکین، بیواؤں، یتیموں اور پڑوسیوں کا خصوصی خیال رکھیں۔ کیونکہ اس مہینے میں اللہ تعالیٰ ہر اجر کو سات گنا بڑھا دیتا ہے۔

جولائی کا شمارہ حسب روایات عید نمبر ہوگا۔ قارئین اور مصنفین سے درخواست ہے کہ اپنی تحریریں ہمیں جلد از جلد روانہ کر دیں تاکہ عید نمبر میں شاملِ اشاعت ہو سکیں۔

اس شمارے میں،

- اداکارہ حریم فاروق سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اداکارہ "سوہائے علی ابڑو" کہتی ہیں "میری بھی سنیے"،
- "آواز کی دنیا سے" اس ماہ کی مہمان ہیں "سوئم کیفی"
- اس ماہ "شکیلہ شہزادی" کے "مقابل ہے آئینہ"،
- "اک ساگر ہے زندگی" نفیسہ سعید کا ناول اپنے اختتام کی طرف،
- "ردائے وفا" فرحین اظفر کا سلسلے وار ناول،
- "میں گمان نہیں یقین ہوں" نبیلہ ابر راجہ کا مکمل ناول،
- اپنی تھکن مجھے دے دو" نذہین آرزو کا مکمل ناول،
- "شاید" فائزہ افتخار کا دلکش ناولٹ،
- "خالہ، سالا اور اوپر والا" فاخرہ گل کی دلچسپ مزاحیہ تحریر،
- موسم گل میرے دیس میں" عتیقہ ملک کا دلکش ناولٹ،
- "بہار دسترس میں ہے" حیا بخاری کا دلکش ناولٹ،
- بشریٰ احمد، عزہ خالد، نظیر فاطمہ، حمیرا نوشین، آسیہ عارف اور طوبیٰ احسن کے افسانے اور مستقل سلسلے،

مفت،

اس شمارے کے ساتھ کرن کتاب "ماہ رمضان کرن کے ساتھ" کرن کے ہر شمارے کے ساتھ علیحدہ سے مفت پیش خدمت ہے۔

وَحدہٗ

صبح ازل کیا

شام ابد کیا

قید مکاں کیا

وقت کی حد کیا

تُو ان سب سے بالاتر ہے

تُو ہی مخفی تُو ہی خبر ہے

سب چہرے تیرے ہی چہرے

سارے نام ترے ہی نام

تُو خود ہی اپنا شاہکار

تُو خود ہی اپنا انعام

سرشار صدیقی

نورِ ازل ہیں نور کا پیکر حضورؐ ہیں

تخلیق کائنات کا محور حضورؐ ہیں

معراج وہ ملی جو فرشتے نہ پا سکے

بعد از خدا ہر ایک سے برتر حضورؐ ہیں

بندوں کی رہنمائی تو ہر اک نبیؐ نے کی

ہاں سارے رہنماؤں سے بڑھ کر حضورؐ ہیں

دائم جہاد حق کا نشان ظفر ہے وہ

باندھے ہوئے جو پیٹ سے پتھر حضورؐ ہیں

سیرت ہے پاک اُسوہ حسنہ ہے بے مثال

انسانیت کا ماہ منور حضورؐ ہیں

قرآن کا نزول ہوا جن کے قلب پر

سرتاج انبیاء وہ پیمبر حضورؐ ہیں

سیماؔ گناہ گار و خطاکار ہوں مگر

تسکین یہ ہے کہ شافع محشر حضورؐ ہیں

سیما سراج

حریم فاروق سے ملاقات

شاہین رشید

حریم فاروق نیا نام مگر چہرہ جانا پہچانا کیونکہ آپ انہیں سیریلز میں اور کمرشلز میں تواتر کے ساتھ دیکھ رہے ہیں، آج کل بھی آپ انہیں "دیار دل" اور "دوسری بیوی" میں دیکھ رہے ہیں۔ اور اس انٹرویو کے آنے تک "دوسری بیوی" اختتام پذیر ہو چکا ہو گا۔

* "کیا حال ہیں حریم فاروق صاحبہ؟"

☆ "جی اللہ کا شکر ہے۔"

* "آج کل کیا مصروفیات ہیں؟"

☆ "تین پروجیکٹ ایسے ہیں جو آج کل شوٹ ہو رہے ہیں۔ ان میں ایک "بگ بین" کا ہے اور دو ایم ڈی پروڈکشن کے ہیں جو کہ "ہم ٹی وی" کے لیے ہوں گے۔ ان کے ڈائریکٹرز میں ایک اویس خان ہیں۔ حسیب حسن اور بگ بین کے عبداللہ یادینی ہیں۔ ان تینوں کے رائٹرز میں ماہا ملک، رخسانہ نگار اور مونا حفیظ ہیں۔"

* "ڈرامہ سائن کرتے وقت رائٹر، ڈائریکٹر، اپنا کردار یا گھر کا کچن دیکھتی ہیں؟"

☆ "گھر کا کچن...... نہیں نہیں ایسا کچھ نہیں، کچھ

چیزیں اہم ہوتی ہیں ان پہ توجہ دینی چاہیے' مجھے سب سے پہلے اپنا کردار دیکھنا ہوتا ہے۔ پھر ڈائریکٹر' پھر اسکرپٹ اور لاسٹ میں اپنے "کو اسٹار" دیکھتی ہوں کیونکہ جب تک ٹیم اچھی نہیں ہوگی' اچھی چیز بن کر سامنے نہیں آئے گی۔ تو میرے لیے ٹیم کی بہت اہمیت ہے۔"

* "گزرے زمانے میں لوگ بجیا' حسینہ معین' بانو قدسیہ' اشفاق احمد اور انہی کی طرح دیگر رائٹرز کے نام دیکھ کر کام کی حامی بھرتے تھے تو آج کل بھی کچھ رائٹرز ایسے ہیں جن کے لیے آپ کا دل چاہتا ہو کہ میں کام کروں؟"

☆ "جی.... بالکل کچھ رائٹرز ایسے ہیں جن کے لیے کہا جاتا ہے کہ اگر ان کے اسکرپٹ آئیں تو انہیں منع نہیں کرنا چاہیے۔ جن میں ایک تو فرحت اشتیاق صاحبہ ہیں الحمد للہ ان کے دو پروجیکٹ کیے ہیں۔ ایک تو آپ دیکھ ہی رہی ہیں "دیار دل" اور دوسرا "میرے ہمدم میرے دوست" اور دونوں ہی ماشاء اللہ کافی کامیاب رہے۔ اس طرح عمیرہ احمد ہیں اور ایک دو اور بھی رائٹرز ہیں کہ جن کے ڈراموں میں کام کرنے کی خواہش ہے۔"

* "دیار دل" میں ارحمند کے رول کے لیے ہی آپ کا انتخاب ہوا تھا کیا؟ اور فرحت اشتیاق سے ملاقات ہے آپ کی؟"

☆ "حسیب نے مجھے کال کی (ڈائریکٹر) اور اس کردار کے لیے اور ہماری ایک ہی میٹنگ ہوئی تھی۔ پھر میں نے اسکرپٹ پڑھا' چونکہ فرحت کی تحریر تھی تو مجھے بھروسا تھا کہ تحریر اچھی ہوگی۔ کیونکہ وہ ہمیشہ اچھا لکھتی ہیں۔ مجھے کردار بہت پسند آیا۔"

* "فرحت سے ملاقات ہے؟"

☆ "نہیں فرحت سے ملاقات نہیں ہے اور میں ان سے ضرور ملنا چاہوں گی۔ بس اتفاق ایسا ہوا کہ جب میں جاتی تھی تو فرحت نکل چکی ہوتی تھیں۔ فرحت کے دو پروجیکٹ کر چکی ہوں اور ابھی تک میری ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔"

* "اب تک کتنا کام کر چکی ہیں آپ؟"

☆ "ٹی وی کے تو میرے چار ہی پروجیکٹ آن ایئر ہوئے ہیں۔ "میرے ہمدم میرے دوست' موسم' دوسری بیوی' دیار دل" اور ٹی وی پر کام کرنے سے پہلے ایک فیچر فلم کی تھی "سیاہ" کے نام سے اور بہت اچھا ریسپانس ملا تھا اور لکس ایوارڈ کے لیے میں نامزد ہوئی تھی۔ اے آر وائی فلم ایوارڈ" کے لیے بھی میں نامزد ہوئی تھی۔ اسلام آباد میں تھیٹر کیا۔ جب کراچی آئی تو انور مقصود صاحب کے ساتھ بہت تھیٹر کیا۔ پانچ سال تھیٹر کیا' فلم کی اور اب 2 سال سے ٹی وی کر رہی ہوں۔

* "اچھا کہاں لگا؟ تھیٹر' ٹی وی"

☆ "تھیٹر تو ہمیشہ سے ہی متاثر کرتا ہے۔ تھیٹر کو تو بھول ہی نہیں سکتے' تھیٹر تو آرٹسٹ کا عشق ہوتا ہے اور آرٹسٹ سیکھتا بھی تھیٹر سے ہی ہے اور اگر کسی کو ٹی وی پہ کام کرنے سے پہلے تھیٹر میں کام کرنے کا موقعہ ملے تو وہ ضرور اس سے فائدہ اٹھائے۔ کیونکہ تھیٹر بہت کچھ سکھا دیتا ہے آپ کو۔"

* "کچھ اپنے بارے میں بتائیں' پھر آگے چلتے ہیں؟"

☆ "ضرور.... میرا نام حریم فاروق ہے اور میں 26 مئی 1989ء میں اسلام آباد میں پیدا ہوئی۔ پنجاب نارووال سے ہمارا تعلق ہے۔ ننھیال بہاولپور سے ہے اماں ابا دونوں ڈاکٹرز ہیں۔ اماں اسکن اسپیشلسٹ ہیں ڈاکٹر روبینہ قریشی نام ہے۔ اسلام آباد میں ہی 26 سال سے پریکٹس کر رہی ہیں اور ابا نے ڈبل "ایم بی بی ایس" اور ڈبل "پی ایچ ڈی" کیا ہوا ہے اور آج کل وہ ہیلتھ منسٹری کے ساتھ ہوتے ہیں اور میں آرٹسٹ ہوں۔ میری چھوٹی بہن آرکٹیکچر بن رہی ہے اور وہ نیویارک میں ہوتی ہے تو اماں ابا نے فری ہینڈ دیا ہوا تھا کہ جو مرضی پڑھو۔ بس ڈگری ہونی چاہیے' پھر بے شک میڈیا میں جاؤ یا کسی بھی پروفیشن میں۔ چنانچہ پھر میں نے بیچلر کیا' سوشیالوجی میں اور "جرنلزم" میں اور اس کے بعد برابر کام شروع کر دیا۔ خیر میری ایک ہی چھوٹی بہن ہے اور ستارہ جیمنائی ہے۔ جبکہ میری ہائیٹ 5 فٹ 8 انچ ہے۔"

* "اور شادی؟ لو یا....؟"

☆ "قہقہہ' نہیں ابھی نہیں ہوئی اور نہ ہی فی الحال کوئی ارادہ ہے۔ لیکن جب قسمت میں ہوگی ہو جائے گی۔ کیونکہ اس کے لیے تو کوئی پلاننگ نہیں ہوتی اور میں تو کہتی ہوں کہ اگر آپ Love کریں تو اپنے اماں ابا کو ضرور بتائیں' انہیں اعتماد میں لیں۔"

* "شوبز میں کیسے آمد ہوئی اور پہلے تھیٹر میں آئیں تو کیسے آئیں؟"

☆ "تھیٹر میں کام کرنے کا شوق تو ہمیشہ سے ہی تھا' بس مجھے ایکٹر بننا تھا میں نے سوچا ہوا تھا کہ یا تو لائر بنوں گی یا ایکٹر بنوں گی تو جب میں لاء شروع کرنے لگی تو مجھے ایک موقعہ ملا تھیٹر میں کام کرنے کا۔ اس طرح کہ میرا ایک دوست تھا اسے کچھ آئیڈیا تھا میرے بارے میں کہ مجھے اداکاری آتی بھی ہے اور مجھے شوق بھی ہے۔ تھیٹر پلے اسلام آباد میں ہی ہونا تھا تو اس نے کہا کہ تم آکر آڈیشن دے دو.... تو میں نے ایسے ہی مذاق مذاق میں اور کچھ شوق میں آڈیشن دے دیا۔ کامیاب ہو گئی۔ بس پھر اس تھیٹر کمپنی کے ساتھ میں نے پانچ سال تھیٹر کیا اور ٹی وی میں اس طرح آمد ہوئی کہ جب کراچی میں تھیٹر شروع کیا تو بہت سارے پروڈکشن ہاؤسز سے لوگ آتے تھے تھیٹر دیکھنے کے لیے تو میں کئی لوگوں کی نظروں میں آئی اور آفرز آنے لگیں لیکن چونکہ میں سیکھنے کے پروسس میں تھی اور سمجھتی تھی کہ ابھی میں اس قابل نہیں ہوں کہ ٹی وی پہ کام کر سکوں تو میں انکار کر دیتی تھی۔ مگر میں نے سوچ لیا تھا کہ کوئی اچھا اسکرپٹ ملا تو کروں گی۔ یہ نہیں کہ آفر آئی اور کر لیا تو پہلی اسکرپٹ ہی فرحت اشتیاق کی تھی۔ میں نے اسکرپٹ پڑھا مجھے اچھا لگا۔ میری میٹنگ ہوئی شہزاد بھائی سے بھی میٹنگ ہوئی (ڈائریکٹر) تو پھر آئیڈیا ہو گیا کہ ٹیم اچھی ہوگی اور اس سیریل نے مجھے شہرت دی اور میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ مجھے ایک دم سے اتنی پہچان مل جائے گی۔"

* "کمائی کا عمل تو پھر تھیٹر سے ہی شروع ہو گیا ہوگا؟"

☆ "نہیں نہیں' مجھے یاد ہے جب میں 14 یا شاید 15 سال کی تھی تو ایک این جی او نے ایک کارنیول ارینج کیا تھا اور ایک ایونٹ کو آرگنائز کرنے کے لیے انٹرن شپ کر رہی تھی تو میری پہلی کمائی 3 ہزار روپے تھی۔ اور کافی زیادہ لگے تو میں نے امی ابو' بہن اور دادا دادی میں بانٹ دیے۔"

* "اچھا لگ رہا ہے اس فیلڈ میں آکر؟"

☆ "جی بہت اچھا لگ رہا ہے اور اس فیلڈ میں رہنے کے لیے آپ کا اچھا ہونا ضروری ہے اور آپ اپنے کام سے کام رکھیں۔ فضول کی چیزوں میں نہ گھسیں اور اپنے کام پر دھیان رکھیں۔"

* "تنقید ہوتی ہے کام پہ؟"

☆ "بالکل ہوتی ہے اور اکثر ہوتی ہے۔ مگر تنقید میں بھی آپ کو فرق دیکھنا پڑتا ہے کہ کیا آپ کو ڈاؤن کرنے کے لیے تنقید کی جا رہی ہے یا اس کے پیچھے حوصلہ افزائی بھی ہے کوئی مثبت پہلو بھی ہے کہ نہیں۔"

* "کبھی برا وقت گزارا؟"

☆ "ہاں جی ضرور گزرا۔ اس طرح کہ جب میں کراچی تھیٹر کرنے آئی تو میں نے اپنے اماں ابا کو ایک بات کہی تھی کہ میں خود سب کچھ کر کے دکھاؤں گی اگرچہ فیملی کی طرف سے پیسے کی کبھی کمی نہیں رہی۔ بہت خوشحال فیملی ہے میرا تعلق ہے مگر جب اپنا کام شروع کیا تو ایک ذمہ داری کا احساس بھی ہوا کہ اب میں اتنی بڑی ہو گئی ہوں کہ خود کما سکتی ہوں اپنی ذمہ داری خود اٹھا سکتی ہوں۔ کیوں اپنے ماں باپ پر بوجھ بنوں۔"

* "کون سے سین بہت آسانی سے کر لیتی ہیں؟ رونے دھونے والے یا رومانٹک؟"

☆ "میں کوئی بھی سین آسانی سے نہیں کر سکتی، ہر سین سے پہلے مجھے ایک ٹینشن سی ہوتی ہے.... اور ڈائریکٹر مجھ پر بھروسا کرتا ہے یہ میرے لیے بہت بڑی بات ہے۔ لیکن جب مجھے ڈائریکٹر کہتا ہے کہ آپ کو اس سین میں یہ ایکسپریشن دینے ہیں تو مجھے اور بھی زیادہ ٹینشن ہونے لگتی ہے کہ پتا نہیں ایسے ایکسپریشن دے سکتی ہوں کہ نہیں۔"

* "رولز کے لیے کوئی خاص ڈیمانڈ ہوتی ہے؟ یا کیا دل چاہتا ہے کہ کس طرح کے کردار ہوں؟"

☆ "نہیں کوئی خاص ڈیمانڈز تو نہیں ہوتیں اچھا رول ہو مگر پھر بھی دل چاہتا ہے کہ ایسے ایک دو رولز

مجھے ملیں جس میں یہ دکھایا جائے کہ عورت یا لڑکی اتنی مظلوم ہوتی نہیں ہے بلکہ وہ بہت مضبوط ہوتی ہے اور سروائیو کرسکتی ہے۔"

* "طبیعت میں سستی ہے یا شوٹ پر وقت پر پہنچ جاتی ہیں؟"

☆ "طبیعت میں سستی ہے۔ جس ٹائم مجھے اٹھنا ہوتا ہے اس سے ایک گھنٹہ پہلے کا الارم لگا کر سوتی ہوں۔ مگر کام کے معاملے میں سست نہیں ہوں اور جہاں مجھے جانا ہوتا ہے وہاں وقت پر پہنچ جاتی ہوں۔"

* "کردار کرتے وقت جو کردار آپ کر رہی ہوتی ہیں۔ وہ نظر میں ہوتا ہے یا کہیں دیکھنے کے لیے جاتی ہیں؟"

☆ "میرے خیال میں کوئی ایسا کردار ہوتا نہیں ہے کہ جو تھوڑا بہت نگیٹو نہ ہو' میرا یہ بھی خیال ہے کہ ہر کردار کے لیے آپ کو Dimension دیکھنی پڑتی ہے کیونکہ کوئی انسان مکمل طور پر نہ اچھا ہوتا ہے نہ برا ہوتا ہے۔ اس میں بہت سے رنگ ہوتے ہیں تو اگر کوئی نگیٹو رول کر رہی ہوتی ہوں تو یہ ضرور سوچتی ہوں کہ اگر میں بری دکھائی جا رہی ہوں تو میں کس وجہ سے بری ہوں تو اپنے کردار کے لیے محنت کرتی ہوں اور حقیقی زندگی میں کوئی کردار دیکھا ہے تو پھر اس کو گہرائی میں جا کر سوچتی ہوں۔ اور خود اپنی بھی imagination ہوتی ہے کہ اگر میں ایسی ہوتی تو کیا میں ایسا کرتی کہ نہ کرتی۔"

* "کچھ ہلکی پھلکی باتیں بھی ہو جائیں کہ کھانا اپنے ہاتھ کا پکا ہوا اچھا لگتا ہے یا دوسروں کے ہاتھ کا؟"

☆ "کچھ عرصہ سے میں ڈائٹ پہ ہوں اور بہت سختی سے اس پر عمل درآمد ہو رہا ہے تو اپنے ہی ہاتھ کا پکا ہوا کھاتی ہوں۔ سبزیوں کو ابال کر پکاتی ہوں لیکن اگر ایسا کچھ نہ ہو تو پھر دل چاہتا ہے کہ کوئی دوسرا اپنے ہاتھ سے پکا کر کھلا دے تو کیا کہنے۔"

* "کوکنگ چینل سے فائدہ اٹھاتی ہیں؟"

☆ "ہاں۔۔۔ مزا آتا ہے اور ایک آدھ بار ٹرائی بھی کیا تو ٹھیک ٹھاک پک گیا۔"

* "شادی کی تقریبات پسند ہیں؟"

☆ "ہاں جی کیوں نہیں' مجھے شادی کی تقریبات میں جانا اچھا لگتا ہے اور مہندی کی رسومات بہت اچھی لگتی ہیں اور تحفہ آپ ان کی ضرورت کے مطابق دیں۔"

* "پہچان کیسی لگتی ہے؟"

☆ "اچھی لگتی ہے۔ لوگ پہچانتے ہیں تو دل خوش ہوتا ہے مگر میں کہتی ہوں کہ شہرت کے لیے کام نہیں کرنا چاہیے بلکہ کسی مقصد کے لیے کام کرنا چاہیے آپ کا مقصد آپ کا مشن شہرت سے زیادہ اہم ہے۔"

* "حریم آپ دو ہی بہنیں ہو' بھائی کی کمی محسوس ہوتی ہے؟ یا ماں باپ کو بیٹے کی؟"

☆ "بھائی کی۔۔۔ اماں ابا تو کہتے ہیں کہ ہمیں بیٹے کی کمی محسوس نہیں ہوتی ہمارا یہی بیٹا ہے۔"

* "ناراض ہوتی ہیں تو اظہار کس طرح کرتی ہیں؟"

☆ "کھانا پینا چھوڑ دیتی ہوں۔"

* "شاپنگ کے لیے کوئی خاص جگہ جاتی ہیں؟"

☆ "نہیں۔۔۔ جہاں سے جو چیز اچھی مل جاتی ہے اٹھا لیتی ہوں۔ کسی خاص جگہ کا انتخاب نہیں کرتی۔"

* "اپنا ملک اچھا ہے یا باہر جا کر دل کرتا ہے کہ یہیں رہ جائیں؟"

☆ "نہیں جی۔۔۔ ہمارا ملک بہت اچھا ہے اور ہم جہاں بھی جائیں اپنے ملک واپس آکر سکون ملتا ہے اپنے ملک سے بہتر کوئی نہیں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے حریم فاروق سے اجازت چاہی۔ اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں ٹائم دیا۔

☆ ☆
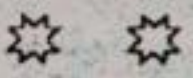
میری بھی سنیے

سوہائے علی ابڑو

شاہین رشید

1 "پورا نام؟"
"سوہائے علی ابڑو۔"

2 "سوئیٹ نیم؟"
"یہی ہے۔"

3 "جنم سال/ شہر؟"
"13 مئی 1993ء/ کراچی۔"

4 "ستارہ/ قد؟"
"ٹورس/ پانچ فٹ تین انچ۔"

5 "تعلیمی ڈگریاں؟"
ہنستے ہوئے... "ایک ہی ہے جی۔ گریجویشن کیا ہے۔"

6 "میں بننا چاہتی ہوں؟"
"لائر... مگر اب ٹائم نہیں ہے۔ لیکن جب موقع ملا ضرور لائر بنوں گی اور پریکٹس بھی کروں گی۔"

7 "میری فیملی؟"
"بڑی بہن، بڑا بھائی اور میں، والدین نہیں ہیں۔"

8 "شادی؟ یا کام؟"
"کام بھی کرنا ہے۔ بہت آگے تک جانا ہے۔ اپنا نام بنانا ہے اور پھر شادی۔ شادی ویسے بھی نصیبوں کا کھیل ہے۔ جب نصیب میں ہوگا، ہو جائے گی، ابھی

جلدی کیا ہے۔"

9 "نام کمانے کا شوق ہے یا پیسہ کمانے کا؟"

"دونوں کا... پہلے نام۔ کیونکہ نام ہو گا تو کام ملے گا اور جب کام ملے گا تو پیسہ بھی ملے گا۔"

10 "سونے سے پہلے میرے لیے لازمی ہے کہ؟"

"کہ میں کچھ نہ کچھ پڑھ کر سوؤں' مجھے مطالعہ کرنے کا بہت شوق ہے اور مطالعہ کرتے کرتے جو نیند آتی ہے اس کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔"

11 "میں متاثر ہوتی ہوں؟"

"ملک سے باہر جا کر لوگوں کے اخلاق سے' انجان بندے سے بھی ایسے بولتے ہیں جیسے پتا نہیں کب سے جانتے ہیں۔ پھر باہر کے ملکوں کی خوب صورتی بھی بہت متاثر کرتی ہے۔"

12 "پریکٹیکل لائف میں کب آئی؟"

"بہت چھوٹی عمر سے آپ اسے پریکٹیکل لائف تو نہیں کہہ سکتیں کیونکہ جب میں چھوٹی تھی تو اسکول کی چھٹیوں میں ہمیں نے ٹیوشن پڑھائی تھی اور مجھے پندرہ ہزار روپے ملے تھے۔ تب سے کمانے کا شوق پیدا ہو گیا۔ ہاں ڈراموں میں آنا پریکٹیکل لائف میں آنا کہہ سکتی ہیں۔"

13 "ڈراموں میں آفرز کی لائن لگ گئی؟"

"جب میں نے "سات پردوں میں" سیریل کیا یہ یاسر نواز کی ڈائریکشن تھی۔"

14 "میری خواہش یہ ہے کہ؟"

"میں ایک پاگل اور ذہنی طور پر معذور لڑکی کا کردار کروں۔ دیکھیں کہ یہ خواہش کب پوری ہوتی ہے۔"

15 "پسندیدہ چینل؟"

"وہ جس میں میرا ڈرامہ آرہا ہو۔"

16 "پسندیدہ سواری؟"

"مجھے بس میں سفر کرنے کا مزا آتا ہے۔ مگر اب تو بس کا سفر بھی کسی خطرے سے کم نہیں۔"

17 "محفل میں لوگ ٹوک دیتے ہیں؟"

"جب میں محفل میں بیٹھ کر ناخن چباتی ہوں۔ بہت بری عادت ہے۔ میں اس سے چھٹکارا چاہتی ہوں۔"

18 "نصیحت جس پر عمل کرتی ہوں؟"

"جو دل کو لگے' ورنہ تو اپنی ہی چلاتی ہوں۔ وہی کرتی ہوں جو میرا دل چاہتا ہے۔"

19 "کس کا سر پھاڑنے کو دل چاہتا ہے؟"

"اس شخص کا سر پھاڑنے کا دل چاہتا ہے جو مجھے گھورے یا غلط نظروں سے دیکھے۔"

20 "گھر آتے ہی دل چاہتا ہے کہ؟"

"کھانا کھاؤں اور سو جاؤں۔"

21 "لوگ کہتے ہیں کہ؟"

"اللہ نے تمہاری ایک مکمل شخصیت بنائی ہے۔ مگر میں کہتی ہوں کہ مجھے لگتا ہے کہ میری ہائیٹ کم ہے اور یہ کمی مجھے کبھی کبھی بہت محسوس ہوتی ہے۔"

22 "کن چیزوں پہ خرچ کرتی ہوں؟"

"کپڑے' جوتے' میک اپ وغیرہ۔ یہی ایک لڑکی کا شوق ہوتا ہے اور میں اپنے شوق پورے کرتی ہوں۔"

23 "میں فریش ہوتی ہوں؟"

"صبح کے وقت اور پھر شام کے وقت جب گھر آنے کا وقت ہوتا ہے۔ پھر شام کو موسم بھی ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔"

24 "میں اکثر اداس ہو جاتی ہوں؟"

"اپنے والدین کے لیے۔"

25 "بے ساختہ رب کا شکر ادا کرتی ہوں؟"

"جب روڈ پر کوئی حادثہ دیکھتی ہوں۔ جب ملک میں کوئی حادثہ دیکھتی ہوں تو رب کا شکر ادا کرتی ہوں کہ میں اس حادثے کا شکار نہیں ہوئی۔ مگر لوگوں کے اور بے گناہ لوگوں کے حادثے پہ بہت دکھی بھی ہو جاتی ہوں۔"

26 "لڑکے برے لگتے ہیں یا مرد؟"

"مرد حضرات... ہمیشہ برے لگتے ہیں۔"

27 "جھوٹ کب بولتی ہیں؟"

قہقہہ... "ہمیشہ پکڑی جاتی ہوں۔ اس لیے نہیں

بولتی۔"

28 • "اپنی شخصیت میں کیا پسند ہے؟"

"مجھے اپنے بال بہت پسند ہیں اور میں ان کی بہت حفاظت کرتی ہوں۔"

29 "آج کے دور کی بہترین ایجاد؟"

"موبائل فون اور دیگر بہت سی چیزیں۔"

30 "پیسہ جمع کرنے کا بہترین طریقہ؟ گولڈ یا کیش؟"

"میرے نزدیک کیش جو کہ بنک میں ہو اور جب آپ کا دل چاہے نکال لیں۔ کیونکہ گولڈ لے لو تو پھر بیچنے کو دل نہیں چاہتا۔"

31 "گہری نیند سے اٹھنا کیسا لگتا ہے؟"

"بہت برا اور جو یہ کام کرتا ہے ان پر بہت غصہ آتا ہے مگر غصے کا اظہار نہیں کرتی کہ جو اٹھاتا ہے مجبوری سے ہی اٹھاتا ہے۔"

32 "ناشتا، لنچ اور ڈنر میں کیا پسند ہے؟"

"مجھے سب سے زیادہ ناشتا کرنا اچھا لگتا ہے۔ ناشتا کرکے انسان سارا دن فریش رہتا ہے۔ اس لیے ناشتے پر خاص توجہ دیتی ہوں اور دل چاہتا ہے کہ ہر روز کچھ نیا ہو۔"

33 "اور جن کے ہاتھ کا کھانا پسند ہے؟"

"میری ایک آنٹی ہیں ان کے ہاتھ کا۔ میں انہیں دنیا کی بہترین کک کہتی ہوں۔"

34 "اب تو عادت ہو گئی ہے؟"

قہقہہ..." لائٹ کے جانے کی 'نہ جائے تو حیرانی ہوتی ہے کہ آج کوئی اہم دن تو ہے نہیں' پھر کیوں نہیں گئی لائٹ۔"

35 "لوگ ملتے ہیں بے ساختہ کہتے ہیں؟"

"ارے آپ؟... آپ تو اسکرین پہ بہت بڑی نظر آتی ہیں مگر ہیں کتنی چھوٹی۔"

36 "کچھ چیزیں جو بیگ میں لازمی ہوتی ہیں؟"

"گلاسز اور گھر کی کچھ ضروری چیزیں۔ موبائل وغیرہ۔"

37 "دن میں کتنی بار آئینہ دیکھتی ہوں؟"

"یہ تو یاد نہیں... مگر دیکھتی رہتی ہوں۔ کیونکہ شوٹ کے دوران تو بار بار دیکھنا پڑتا ہے اور ویسے بھی جب موقعہ ملتا ہے دیکھ لیتی ہوں۔"

38 "غصہ کب آتا ہے؟"

"کسی خاص بات پر نہیں آتا۔ غصہ ہے کسی بھی بات پر آسکتا ہے۔"

39 "ردعمل؟"

"کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ مگر جو بھی ہوتا ہے۔ برا ہی ہوتا ہے بلکہ بہت ہی برا ہوتا ہے۔"

40 "کونسا تہوار بہت پسند ہے؟"

"تہواروں میں اتنی دلچسپی نہیں لیتی' اس لیے کوئی خاص تہوار پسند نہیں ہے۔"

41 "ڈرائیونگ کے دوران بور ہو جاؤں تو؟"

"تو میوزک سنتی ہوں۔ ریڈیو لگا لیتی ہوں اور اردگرد کا جائزہ لیتی ہوں۔"

42 "مذہب سے میرا لگاؤ؟"

"بہت زیادہ ہے۔ کوشش کرتی ہوں کہ نماز روزے کی پابندی کروں مگر جب پریشان ہوتی ہوں تو ضرور نماز پڑھتی ہوں۔ بہت سکون ملتا ہے نماز پڑھ کر۔"

43 "نیند جلدی آجاتی ہے یا دیر سے؟"

"ارے، بہت دیر سے.... نیند آتی ہے تو بیڈ پہ جاتی ہوں اور جب بیڈ پہ جاتی ہوں تو نیند رفوچکر ہو جاتی ہے۔ عجیب ہی بات ہے۔"

44 "اپنے سرہانے کیا کیا چیزیں رکھتی ہوں؟"

"چند ضروری چیزیں جیسے کتاب، فون، روز واٹر اور پینے کے لیے پانی۔"

45 "کب انجوائے کرتی ہیں؟"

"ہر دن، ہر لمحہ.... اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔"

46 "اپنے ملک کا بہترین شہر؟"

"صرف اور صرف کراچی۔"

47 "میک اپ کتنا ضروری ہے؟"

"ضروری تو نہیں ہے۔ مگر ضروری بن گیا ہے۔ ورنہ جو نیچرل حسن ہوتا ہے وہ لازوال ہوتا ہے۔"

48 "برے لگتے ہیں وہ لوگ؟"

"جن کے دو چہرے ہوتے ہیں۔ آپ کے سامنے کچھ، میرے سامنے کچھ.... منافقت بہت ہے لوگوں میں۔"

49 "پلاننگ کرتی ہوں؟"

"جب نیا سال شروع ہونے لگتا ہے تو پلاننگ کرتی ہوں کہ کیا کیا کرنا ہے۔"

50 "فارغ وقت کیسے گزارتی ہوں؟"

"انٹرنیٹ اور فیس بک پر یا میوزک سن کر یا ڈانس کی پریکٹس کر کے۔"

51 "صبح اٹھ کر پہلی خواہش؟"

"اچھا سا ناشتا مل جائے.... ناشتے کے بعد واک کے لیے نکل جاتی ہوں۔"

52 "سکون کہاں ملتا ہے؟"

"صرف اور صرف اپنے کمرے میں اور اپنے بستر پر۔"

53 "بھوک میں برابر کھانا کھاتی ہوں یا جو مل جائے؟"

"جو مل جائے کھا لیتی ہوں۔ انتظار نہیں ہوتا برابر کھانے کا۔ مگر ایسا کم ہوتا ہے.... مجھے زیادہ تر برابر کھانا ہی اچھا لگتا ہے۔"

54 "زندگی سے کیا سیکھا؟"

"بہت کچھ.... پہلے چھوٹی چھوٹی بات سے دل ٹوٹ جاتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی بات پر جذباتی ہو جاتی تھی، مگر اب بہت مضبوط ہو گئی ہوں۔ حالات سے لڑنا سیکھ لیا ہے۔ اب کوئی مسئلہ نہیں ہوتا کوئی کچھ بھی کہہ لے۔"

55 "ملک میں تبدیلی ضروری ہے یا انسان میں؟"

"انسان میں اپنی.... سوچ کو پوزیٹو کر لیں سب ٹھیک ہو جائے گا ملک خراب نہیں ہے، ہم خراب ہیں۔"

56 "شوبز میں آکر کیا پایا کیا کھویا؟"

"شہرت پائی، عزت پائی، مگر پرسنل لائف کھو دی۔"

57 "کہاں بیٹھ کر کھانا اچھا لگتا ہے؟"

"ویسے تو چٹائی پہ بیٹھ کر کھانا اچھا لگتا ہے، مگر اب چٹائی ہر جگہ تو نہیں ہوتی۔ تو پھر ڈائننگ ٹیبل پہ ہی کھانا کھانا اچھا لگتا ہے۔"

58 "پاکستان کے علاوہ پسندیدہ ملک؟"

"کوئی نہیں، اپنا ہی ملک پسندیدہ ہے۔ اس ملک نے مجھے سب کچھ دیا ہے۔"

59 "اپنی غلطی مان لیتی ہوں؟"

"اگر مجھے محسوس ہو کہ میں نے غلط کیا ہے تو سوری کرنے میں شرمندگی محسوس نہیں کرتی۔"

60 "قابل اعتماد کون ہوتا ہے اپنے پرائے، لڑکیاں یا لڑکے؟"

"کوئی بھی ہو سکتا ہے.... جو آپ کے ساتھ مخلص ہوں وہ ہی پھر قابل اعتماد بھی ہوتے ہیں۔"

☆ ☆

سونم کیفی

شاہین رشید

شوبز کی فیلڈ ایسی ہے جس میں کام کرنے والوں کا فن ان کی نسل میں بھی منتقل ہوتا ہے۔ ہمارے بہت سے فنکار ایسے ہیں جن کی اولادیں اس فیلڈ میں ہیں اور بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔۔۔ "غزالہ کیفی" سے بھلا کون واقف نہیں۔ خوب صورت فنکارہ' خوب صورت پرفارمر ہمیشہ سے اسکرین پہ کم آئیں مگر جب آئیں چھا گئیں۔ اب ان کی بیٹی "سونم کیفی" اس فیلڈ سے وابستہ ہیں۔ اگرچہ اسکرین پہ نظر نہیں آتیں مگر 'ریڈیو کے سامعین انہیں بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔

★ "کیا حال ہے سونم اور کیا کر رہی تھیں؟"

✳ "جی اللہ کا شکر ہے اور بیٹی کو اسکول سے لینے گئی ہوئی تھی۔"

★ "آپ شادی شدہ ہیں؟"

✳ "جی جی بالکل۔۔۔ ماشاء اللہ سے دو بچے ہیں میرے۔۔۔ ایک بیٹی جو تین سال کی ہے اور ایک بیٹا جو پانچ ماہ کا ہے۔"

★ "نام میں بہت کشش ہے کس نے رکھا اور کیا مصروفیات ہیں آج کل؟"

✳ "میرا نام والد نے رکھا اور اس کے معنی "خوب صورت" کے ہیں اور مصروفیات یہ ہے کہ بیٹا جو کہ پانچ ماہ کا ہے اس کی دیکھ بھال میں لگی رہتی ہوں اور ریڈیو ایف ایم 100 سے بھی بریک لیا ہوا ہے۔"

★ "ایف ایم کے علاوہ کیا کرتی ہیں؟ کبھی اسکرین پہ آئیں؟"

✳ "میں اپنے والد کی آرگنائزیشن ای ٹی این میں کام

کرتی تھی اور ایف ایم کی مصروفیات تھیں.... اور جہاں تک اسکرین کی بات ہے تو بہت زمانہ گزرا ایک سیریل ہوا تھا "عروسہ" اس میں "مشی خان" کے بچپن کا رول میں نے کیا تھا... اور اسکول و کالج کے زمانے میں میں نے اسٹیج پلے بہت کیے ہیں اور شوبز سے مجھے بہت دلچسپی ہے اور میں آنا چاہتی ہوں، لیکن اس لیے نہیں آسکی کہ میں اپنی تعلیم میں بہت مصروف تھی میں لاء کر رہی تھی اور لاء کے دوران ہی میری شادی ہو گئی اور فوراً" ہی اللہ نے اولاد کی امید لگا دی تو بس پھر موقعہ ہی نہیں ملا کہ میں شوبز کی طرف آؤں۔"

★ "دل تو چاہتا ہو گا؟"

☀ "بالکل جی، دل چاہتا ہے۔ مجھے بہت شوق ہے اداکاری کا، شوبز کے دیگر شعبوں میں کام کرنے کا میں گا بھی بہت اچھا لیتی ہوں اور یہ سب کام کرنے کی صلاحیت میرے اندر موجود ہے۔ اس حساب سے آپ کہہ سکتی ہیں کہ میں نہیں آسکی کہ موقع نہیں ملا... لیکن ایک بات اور بھی واضح کر دوں کہ میں نے کبھی شہرت کے بارے میں نہیں سوچا۔ مجھے آرٹ بہت اپیل کرتا ہے۔ مجھے اسٹیج پلے زیادہ اپیل کرتے ہیں۔ بہ نسبت ٹی وی کے ڈراموں کے اور اپنے اس شوق کی خاطر میں نے اسٹیج پہ بہت کام کیا ہے اور میں نے انگریزی اسٹیج پلے میں ہی کام کیا ہے۔ اردو میں کام کرنے کا اتفاق نہیں ہوا ہے۔"

★ "کیا وجہ ہے کہ اسٹیج پلے کرنا زیادہ اپیل کرتا ہے کیا فوری رسپانس مل جاتا ہے اس لیے؟"

☀ "بار بار ٹیکس (takes) لے کر ٹی وی کے لیے ایکٹنگ کرنا میرے نزدیک کوئی بڑی بات نہیں ہے آپ کی اداکاری کا معیار کیا ہے.... آپ کی ڈائیلاگ ڈیلوری کیسی ہے۔ آپ کے ایکسپریشن کیسے ہیں۔ اس کی صحیح پرکھ اسٹیج پلے پہ ہی ہوتی ہے۔ آپ لائیو کس لیول پہ پرفارم کر سکتے ہو اس کی پرکھ تھیٹر میں کام کر کے ہی ہوتی ہے۔"

★ "مگر پھر بھی انسان کبھی بھول بھی تو جاتا ہے نا؟"

☀ "ہاں تو اس موقع پر آپ کا جو ٹیلنٹ ہے وہ آپ کے ڈیفنس کے لیے آتا ہے آپ بھول جاؤ تو آپ کو یہ آئیڈیا تو ہوتا ہے کہ سچویشن کیا ہے آپ نے بات کو ٹوئیٹ کر کے بات کو کس طرح ڈیلور کرنا ہے اور ایک آدھ بار میرے ساتھ ایسا ہوا بھی ہے اور جب میں نے کامیڈی پلے کیا تھا تو بہت سی جگہوں پہ گڑبڑ بھی ہوئی مگر وہ گڑبڑ بڑے مزے سے کور ہو جاتی تھی۔ اور اتنی آسانی سے ہو جاتی تھی کہ لوگوں کو ہوٹنگ کا بھی موقع نہیں ملتا تھا اور جو اسٹیج پلے دیکھتے ہیں انہیں اس بات کا سنس ہوتا ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے اس لیے وہ ہوٹنگ نہیں کرتے اور ویسے بھی کبھی بہت بڑا بلنڈر ہوا نہیں۔"

★ "کبھی پسینے آئے، تھیٹر پہ پرفارم کرتے ہوئے؟"

☀ "میں جب 5 سال کی تھی تو میں نے اسٹیج پہ پرفارمنس دینی شروع کی تھی اور میں اس وقت کا بھی بہت پراعتماد تھی اور کبھی بھی میں نروس نہیں ہوئی۔"

★ "امی کے ڈرامے دیکھ کر کیسا لگتا ہے؟"

☀ "امی کے ڈرامے دیکھ کر دل چاہتا ہے کہ کاش میں بھی ان کی طرح ہو سکتی ان کی طرح خوب صورت ہوتی، ان کی جیسی معصومیت کے ساتھ اداکاری کر سکتی یہ نہیں کہ وہ میری ماں ہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ میری رول ماڈل ہیں اور ہم ملک سے باہر جب بھی گئے ہیں تو وہاں کے پاکستانی نہ صرف پہچانتے ہیں بلکہ بہت عزت بھی دیتے ہیں تو ان باتوں سے دل بڑا ہوتا ہے کہ اپنے ملک میں تو سب جانتے ہی ہیں ملک سے باہر بھی لوگ بہت پہچانتے ہیں۔"

★ "ریڈیو پہ کیسے آئیں، ان کی تفصیل سے پہلے کچھ اپنے بارے میں آپ بتائیں؟"

☀ "میں کراچی میں 20 جولائی 1989ء میں پیدا ہوئی۔ اسٹار کینسر ہے اور میں بہت زیادہ یقین کرتی ہوں... ہاں یہ کہ آج کیا ہو گا، کل کیا ہو گا اس پہ یقین نہیں کرتی ہاں، جس وقت جس گھڑی آپ پیدا ہوتے ہیں

اس کے universally اثرات آپ کی شخصیت پر ضرور پڑتے ہیں اور آپ کی شخصیت کو متاثر کرتے ہیں۔۔۔ اور آپ کا ستارہ کافی حد تک آپ کی شخصیت کو Explain کر دیتا ہے اور میں جب لوگوں سے ملتی ہوں تو تھوڑی سی دوستی ہونے کے بعد ان کا اسٹار ضرور پوچھتی ہوں' کیونکہ پھر میرے لیے ان سے بات کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ تو میرے شوہر کا اسٹار ٹورس ہے اور میرے بڑے بھائی ورگو ہیں۔ تو میں ان سب کو بہتر طریقے سے سمجھ سکتی ہوں اور جو آپ کا اسٹار ہے وہ تو بہت ہی ٹھنڈے مزاج کے ہوتے ہیں۔ خیر تو آگے چلتے ہیں میرے تین بھائی ہیں۔ دو مجھ سے بڑے ہیں اور ایک مجھ سے چھوٹا ہے' میں اکلوتی اور لاڈلی بہن ہوں اور میں نے ایل ایل بی آنرز کیا ہوا ہے اور پریکٹس اس لیے نہیں کر سکی کہ میری شادی ہو گئی۔"

★ "شادی کچھ جلدی نہیں ہو گئی؟"

☼ "جی بالکل' آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میری جن سے شادی ہوئی' ہم دونوں فیملیز بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں تو آپ کہہ سکتی ہیں کہ ہماری Love Marriage ہے' مگر پھر بھی دونوں خاندانوں کی رضا مندی سے ہماری شادی ہوئی۔ میرے میاں کا اپنا بزنس ہے اور ان کا نام اسد نعمان ہے۔"

★ "ریڈیو پہ کیسے آئیں اور ویسے بھی تھیٹر تک آنے میں امی سیڑھی بنی یا آپ اپنے ٹیلنٹ سے آئیں؟"

☼ "نہیں جی' میں نے کہیں بھی امی کا سہارا نہیں لیا اور جہاں بھی گئی اپنے ٹیلنٹ سے گئی ہوں۔۔۔ اور جب میں ریڈیو پہ گئی تو میں نے اپنا "فل نیم" بھی کسی کو نہیں بتایا۔ ہوا کچھ اس طرح کہ جب میں چھوٹی تھی تو میری ایک عادت تھی کہ میں کیسٹ پلیئر میں کیسٹ ڈال کر خود ہی آر جے بن کر باتیں کرتی تھی اور ریکارڈ کرتی تھی اور کرتے کرتے مجھ میں خاصی خود اعتمادی بھی آ گئی تھی۔ تو جناب شادی سے پہلے طاہرہ خان کا ایف ایم ریڈیو ون" پہ آڈیشن دیا اور کامیاب ہو گئی تھی' مگر مجھے فوری طور پر یو ایس اے جانا پڑ گیا جس کی وجہ سے بات بیچ میں ہی رہ گئی۔ پھر پاکستان آئی اور میری بیٹی کی پیدائش کے بعد پاپا نے مجھے ان سے ملوایا۔

بڑی اچھی دعا سلام ہوئی اور میں کافی دیر ان سے باتیں کرتی رہی تو پھر میرے پاپا نے انہیں میرے بچپن کی باتیں بتانا شروع کیں اور FM کے شوق کے بارے میں بھی بتایا۔ تو انہوں نے بڑی دلچسپی سے پاپا کی باتیں سنیں اور پھر کہا کہ 'بیٹا آپ میرے آفس آیئے گا۔" میں نے کہا کہ چلیں ٹھیک ہے۔ پھر میں ان کے آفس گئی تو اچانک ہی انہوں نے کہا کہ تم ایک ڈیمو Demo دے دو۔ میں تو تیار بھی نہیں تھی مگر میں نے ڈیمو دے دیا۔ انہوں نے ڈیمو اپروو کر دیا اور پھر اک دن انہوں نے مجھے آر جے صارم کے ساتھ ایک شو کرنے کے لیے دے دیا۔ تو بے شک مجھے آر جے بننے کا شوق تھا لیکن اس مقام تک آنا بالکل غیر ارادی طور پر ہو گیا۔"

★ "پھر پہلے پروگرام کو کر کے کیسا لگا اور کیا رسپانس ملا؟"

✳ "میں اپنے پہلے پروگرام میں بہت نروس تھی۔ جب مجھے پتا چلا کہ مجھے کسی کے ساتھ شو کرنا ہے تو میں اس لیے بھی گھبرا رہی تھی کہ پتا نہیں وہ صاحب کیسے ہوں گے جس کے ساتھ مجھے شو کرنا ہے' ان کا مزاج کیسا ہو گا تو میں نے کہا کہ ان صاحب کے ساتھ میری ملاقات کرا دیں تاکہ مجھے آئیڈیا ہو جائے کہ وہ صاحب کیسے ہیں۔ میری ملاقات ہوئی صارم سے اور پھر چند منٹوں میں ہماری بہت اچھی دوستی ہو گئی اور پہلا شو بہت زیادہ اچھا گیا اور پھر ہر شو میں بہت اچھا رسپانس آتا تھا اور میں نے بھی بہت انجوائے کیا۔"

★ "پروگرام کا فارمیٹ کیا تھا اور ہفتے میں کتنے دن پروگرام کرتی تھیں؟"

✳ "فارمیٹ تو انٹرٹینمنٹ کا ہی تھا اور میں ہفتے میں 3 دن پروگرام کرتی تھی۔ رمضان میں میں ہر روز آتی تھی اور اب بریک کے بعد ان شاء اللہ دوبارہ جلدی شروع کروں گی۔"

★ "اور کیا کیا مشاغل ہیں آپ کے؟ یا کیا کیا شوق ہیں؟"

✳ "مجھے میوزک بہت پسند ہے۔ موویز بہت شوق سے دیکھتی ہوں۔ مطالعہ کا بہت شوق ہے' لیکن مجھے جس کام میں بہت مزا آتا ہے وہ ڈرائیو کرنے میں مجھے دن میں ایک بار ڈرائیو کرنا بہت ضروری ہوتا ہے اور جس دن نہ کروں خود سے ڈرائیو تو بہت بے چین رہتی ہوں اور ڈرائیو بھی اکیلے کرتی ہوں۔"

★ "کراچی کی ٹریفک اور یہ شوق؟"

✳ "اصل میں میں پیدا کراچی میں ہوئی ہوں۔ لیکن میری پرورش اسلام آباد میں ہوئی ہے۔ جب میں تین سال کی تھی تو ہم اسلام آباد چلے گئے تھے اور میں شادی کے بعد کراچی آئی ہوں اور یہاں کی ٹریفک بہت خراب ہے اس لیے میں تو اپنے علاقے سے باہر نہیں نکلتی۔"

★ "کیا FM مخصوص کلاس کے لوگ یا مخصوص عمر کے لوگ سنتے ہیں یا سب ہی شوق سے سنتے ہیں؟"

✳ "میرے خیال سے ریڈیو ہر کلاس کے لوگ اور ہر عمر کے لوگ۔ بہت شوق سے سنتے ہیں۔ ریڈیو ڈرائیونگ کے دوران بھی مزا دیتا ہے اور اگر آپ کہیں کام کر رہے ہیں تو ریڈیو لگا دیں آپ کا کام جلدی بھی ہو جائے گا اور آپ انجوائے بھی کریں گے۔"

★ "وائس اوور کی بھی؟"

✳ "جی بالکل کی ہے' ریڈیو کے جو کمرشلز ہوتے ہیں اس میں اکثر میں میری آواز ہوتی ہے۔ ٹی وی کے کمرشلز کو کبھی ٹرائی نہیں کیا' کیونکہ اتنا ٹائم نہیں ہوتا اور ڈبنگ میں تو چھ سے سات گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ اس لیے نہیں کیا۔"

★ "دل چاہتا ہے کہ امی کی طرح پہچانی جاؤں؟"

✳ "میرا دل یہ کہتا ہے کہ جس طرح میری امی کو عزت ملتی ہے۔ اسی طرح مجھے بھی ملے' لوگ جب مجھے دیکھیں اور ملیں تو کہیں کہ واقعی یہ غزالہ کیفی کی بیٹی ہے۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتی۔"

★ "لڑکیوں کو کمانا چاہیے اور کیا لڑکیوں کے لیے اعلا تعلیم بہت ضروری ہے کیا؟"

✲ "لڑکیوں کو ضرور کمانا چاہیے اور جہاں تک تعلیم کی بات ہے تو لڑکوں کے لیے تو تعلیم ضروری ہے ہی' ان سے بھی زیادہ لڑکیوں کی تعلیم ضروری ہے' کیونکہ میرے حساب سے یہ بہت ضروری ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ لڑکیوں کے لیے پیسے جمع کرو' ان کے لیے جہیز جمع کرو۔ وہ غلط کہتے ہیں کیونکہ میں کہتی ہوں کہ آپ لڑکیوں کو جہیز نہیں بلکہ اعلا تعلیم دیں۔ جو اس کو زندگی میں کہیں گرنے نہیں دے گی' آپ تعلیم کے ذریعے بیٹی کو اتنا سکیور کردیں کہ وہ کبھی بھی کسی سے ڈرے نہیں۔"

★ "طبیعتاً" کیسی ہیں آپ؟"

✲ "نرم بھی ہوں اور گرم بھی ہوں' میں غصے کی تیز بھی ہوں اور حساس بھی' بہت ہوں اور بہت نرم دل اور رحم دل بھی ہوں۔ اور میں اپنے غصے کو اکیلے رہ کر کنٹرول کرنے کی کوشش کرتی ہوں اور میری کوشش ہوتی ہے کہ' جب تک میرا غصہ دور نہ ہو میں اپنے آپ کو لوگوں سے دور رکھوں۔ کیونکہ غصے میں کوئی غلط الفاظ منہ سے نکل جائیں تو وہ' بہت غلط بات ہوجاتی ہے۔ بس رونا بہت آتا ہے۔"

★ "ہاں.... کیونکہ غصے میں کہے ہوئے الفاظ بعد میں طعنہ بن جاتے ہیں خیر۔ گھرداری سے لگاؤ ہے؟"

✲ "مجھے ہر وہ کام کرنے کا مزا آتا ہے جو میں اپنی مرضی اور اپنی خوشی سے کرتی ہوں۔ ڈیوٹی کرنا مجھے پسند نہیں ہے۔ جب میں اپنی مرضی اور خوشی سے کوئی کام کرتی ہوں تو وہ کام ہمیشہ اچھا ہوجاتا ہے اور پریشر میں آکر تو کوئی کام اچھا نہیں ہوتا اور اس معاملے میں میرے سسرال والے بھی بہت اچھے ہیں اور مجھ پر کوئی دباؤ کوئی پریشر نہیں ہے ہم جوائنٹ فیملی میں رہتے ہیں۔ تو جب میرا دل چاہتا ہے کچھ نہ کچھ پکالیتی ہوں صفائی کے بغیر میں رہ نہیں سکتی تو جب یا جس دن گھر میں کام والی نہ ہو تو میں خوشی خوشی سارے کام خود کرلیتی ہوں۔"

★ "سیاست سے لگاؤ ہے۔ کھیلوں سے؟"

✲ "سیاست سے تو بالکل بھی لگاؤ نہیں ہے اور میں ان بہت ہی کم لوگوں میں سے ہوں جن کو کرکٹ سے نفرت ہے۔ ایک تو زیادہ تر میچز فکس ہوتے ہیں لوگوں کو پتا نہیں ہوتا اور وہ شکست سے مایوس ہوجاتے ہیں اور پھر وطن سے محبت اور "ایکا" صرف کرکٹ کے دوران ہی نظر آتا ہے۔ باقی دنوں میں محبت اور ایکا سب غائب ہوتا ہے ہر قسم کے جرائم بھی ہو رہے ہوتے ہیں لاقانونیت بھی ہو رہی ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کو بھلا برا بھی کہہ رہے ہوتے ہیں۔ تو بس اسی لیے مجھے کرکٹ پسند نہیں ہے۔ ویسے گیم مجھے وہی اچھا لگتا ہے جو میں کھیل سکتی ہوں۔"

★ اور اس کے ساتھ ہی ہم نے سونو کیفی سے اجازت چاہی۔ اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں ٹائم دیا۔
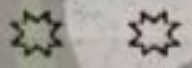
مقابل ہے آئینہ

شکیلہ شہزادی

ادارہ

☆ "آپ کا پورا نام... گھر والے پیار سے کیا پکارتے ہیں؟"

○ "میرا پورا نام "شکیلہ شہزادی" ہے۔ جو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا اور نہ ہی مجھ سے کبھی اچھا لکھا جاتا ہے۔ البتہ اپنے نام کے معنی اچھے لگتے ہیں۔ گھر والے پیار سے بہت سے ناموں سے پکارتے ہیں۔ مثلاً" امی ابو اور دونوں بھائی شکیلہ ہی کہتے ہیں۔ ارسلان اور نبیلہ بجو' شکو' معد (بھانجا) کی پری آنٹی۔ ماہ نور (بھتیجی) کی شالو پھوپھو' سنبل کی بھی شالو تھی۔ مختصر یہ کہ خاندان میں جتنی بھی فیملیز ہیں سب نے مختلف نام رکھے ہوئے ہیں۔"

☆ "کبھی آئینہ نے آپ سے یا آپ نے آئینہ سے کچھ کہا؟"

○ "آئینہ اکثر مجھ سے کہتا ہے کہ 'تمہاری آنکھوں کی ویرانی اچھی نہیں لگتی اور میں آئینے سے کچھ نہیں کہتی۔ سچ پوچھیں تو پچھلے 6 ماہ سے آئینہ بہت کم دیکھتی ہوں بقول شاعر

کیا کہوں میں زندگی بھر کس لیے تنہا رہا
آئینہ تھا پتھروں کے خوف سے سہما رہا

☆ "آپ کی سب سے قیمتی ملکیت؟"

○ "میری سب سے قیمتی ملکیت میرے تمام رسالے' میری تصویریں' میری ڈائری اور تمام خوب صورت یادیں' جن میں میری دوست سنبل ہر پل میرے ہمراہ تھی۔"

☆ "اپنی زندگی کے دشوار لمحے بیان کریں؟"

○ "میری زندگی میں' بہت کم لمحات دشوار تھے۔ مگر جو تھے وہ قیامت لمحے تھے۔ جب مجھے سنبل کی موت کی خبر ملی' جب اس کا مردہ وجود زندگی کی ہر حرارت اور ہر رعنائی سے مبرا ایمبولینس میں آیا۔ یوں لگا کہ سر پہ آسمان ٹوٹ پڑا ہو اور پھر اس کے دسویں کے دن دادا ابا کی ڈیتھ یوں لگا جیسے زندگی تمام ہوئی۔ یہ احساس خون کے آنسو رلا رہا تھا کہ مجھ سے دو والہانہ پیار کرنے والے لوگ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے ہیں۔"

☆ "آپ کے لیے محبت کیا ہے؟"

○ "میرے لیے محبت میری زادراہ ہے ایک بہت خوب صورت آفاقی جذبہ۔ جو دلوں میں خامشی سے جاں گزیں ہو جاتا ہے۔ مگر ہم اس جذبے سے انکاری ہوتے ہیں۔"

☆ "مستقبل قریب کا کوئی منصوبہ جس پر عمل کرنا ہے؟"

○ "مستقبل قریب کا منصوبہ یہ ہے کہ جناب کو بیوٹیشن بننے کا جنون سوار ہو گیا ہے۔ جس پر ہر حال میں عمل کرنا ہے' ان شاء اللہ۔"

☆ "پچھلے سال کی کوئی کامیابی جس نے آپ کو مسرور و مطمئن کیا ہو؟"

○ "کوئی خاص کامیابی نہیں ملی۔ البتہ منگنی کا ٹوٹنا اور جان چھوٹنا میرے لیے کم از کم کامیابی ہی ہے۔ جس سے میں کافی مطمئن ہوں' ورنہ پچھلے ڈیڑھ سال سے لگتا تھا کہ منگنی نام کا پنجرہ ہے' جس میں میں قید ہوں اور اچانک پنجرہ کھول دیا گیا ہو اور میں آزادی سے اڑ رہی ہوں۔"

☆ "آپ اپنے گزرے کل' آج اور آنے والے کل کو ایک لفظ میں کیسے واضح کریں گی؟"

○ "گزرا کل ایک درد تھا' موجودہ آج سانسوں کے بوجھ تلے دبا ہوا۔ آنے والا کل بہت روشن ہو گا' ان شاء اللہ تعالیٰ۔"

☆ "آپ اپنے آپ کو بیان کریں؟"

○ "بظاہر تو انٹرویو کا مطلب خود کو بیان کرنا ہی ہوتا' مگر ہم کچھ کہیں گے تو اپنے منہ میاں مٹھو ہو گا۔ آپ کو دوسروں کی رائے اپنے بارے میں بتاتی ہوں۔ میری کزن کی پرنسپل نے کہا تھا کہ تم میں کانفیڈنٹ کی کمی نہیں۔ نبیلہ بجو کہتا ہے کہ تم ضدی اور خود سر ہو۔ ارسلان کا (بھائی) کہنا ہے کہ تم ناریل کی طرح ہو' دیکھنے میں سخت' مگر اندر سے نرم' تم کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔ میرا اپنے بارے میں خیال یہ ہے کہ میں بہت حساس ہوں۔ سب کا بہت خیال رکھتی ہوں۔ مگر میرا کوئی نہیں رکھتا۔ کیونکہ گھر کی مرغی دال برابر' مگر مزاج کی بہت نرم ہوں' خوش اخلاق اور خوش لباس ہوں اور کبھی کبھار ایک گہرے راز کی مانند بقول شاعر۔"

رہنے دو کہ اب تم بھی مجھے پڑھ نہ سکو گے
برسات میں کاغذ کی طرح بھیگ چکا ہوں

☆ "کوئی ایسا ڈر جس نے آج بھی اپنے پنجے آپ میں گاڑے ہوئے ہیں؟"

○ "اکثر ڈر لگتا ہے کہ مر گئی تو خدا کا سامنا کس منہ سے کروں گی' کیونکہ زندگی میں بہت کم نیکیاں کی ہیں اور گناہ کثرت سے۔ گانے سننا' ٹی وی دیکھنا' فلمیں دیکھنا' سب جاننے کے بعد بھی برائی کی طرف راغب ہونا۔ اللہ ہم سب کو معاف کرے' آمین۔"

☆ "آپ کی کمزوری۔۔۔ آپ کی طاقت کیا ہے؟"

○ "میری کمزوری' خوب صورت شاعری' خوب صورت مسکراہٹ' خوب صورت ہیل سینڈل' چاکلیٹ اور۔۔۔ اور میرا تعریف۔۔۔ (یعنی شرماتے ہوئے) میری طاقت' میری پختہ ایمان' اس آسمان اور زمینوں کے رب پر یقین' جو اپنے ایک بندے سے ستر ماؤں جتنا پیار کرتا ہے اور اپنا مسلمان ہونا۔"

☆ "آپ کے نزدیک دولت؟"

○ "میرے لیے تو بہت ضروری ہے' کیونکہ جن کے پاس دولت نہیں ہے' ان کا خیال ہے کہ دولت ہی سب کچھ ہے اور جن کے پاس دولت وافر مقدار ہے' ان کے لیے ایک ہی رٹا رٹایا جملہ کہ دولت ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔ دولت ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ اچھی زندگی گزارنے کے لیے بہت ضروری۔"

☆ "آپ خوش گوار لمحات کس طرح گزارتی ہیں؟"

○ "پہلے اپنے خوش گوار لمحات سنبل کے ساتھ گزارتی تھی۔ مگر اب زندگی میں خوش گوار لمحات بہت کم آتے ہیں اور ان کی عمر مختصر۔"

☆ "گھر آپ کی نظر میں؟"

○ "گھر میں رہنے والے اچھے ہوں تو گھر کسی جنت سے کم نہیں۔ اگر ایک ہی گھر میں رہنے والے ایک دوسرے کو برداشت کر رہے ہوں تو گھر ایک میدان جنگ' ویسے میرے خیال میں گھر صرف مردوں کے ہی ہوتے ہیں۔ عورت کے لیے تو ایک سرائے ہی ہے۔"

☆ "کیا آپ بھول جاتی ہیں اور معاف کر دیتی ہیں؟"

○ "بھول جانا بہت مشکل ہے۔ جب بھی بھول جانے کی کوشش کرتی ہوں تو گزرے پل کا ایک ایک منظر آنکھوں میں ریت بن کر چبھنے لگتا ہے۔ نہ ختم ہونے والی اذیت ہونے لگتی ہے۔ مگر یہ سوچ کر کہ معاف کر دینا اللہ کو بہت پسند ہے۔ کوشش ضرور کرتی ہوں معاف کرنے کی کہ' کچھ لوگ ایسے ہیں جنہیں معاف کر ہی نہیں سکتی۔ ویسے میری ڈکشنری میں معافی نام کا لفظ بہت کم ہے۔"

☆ "کامیابی کیا ہے آپ کی نظر میں؟"

○ "کامیابی میرے لیے ہماری بھرپور محنت کا میٹھا پھل مزید ترقی کرنے کا کامیاب ذریعہ اور آگے بڑھنے کی لگن۔"

☆ "سائنسی ترقی نے ہمیں مشینوں کا محتاج کر کے کاہل کر دیا ہے یا واقعی یہ ترقی ہے؟"

○ "میرے خیال میں سائنسی ترقی نے مجھ جیسے کاہل الوجود کے لیے آسانی ہی پیدا کی ہے میرے لیے تو یہ ترقی ہی ہے۔"

☆ "کوئی عجیب خواہش یا خواب؟"

○ "کیا سوال پوچھ لیا ظالم! لاکھوں خواہشیں اور ہزاروں خواب ہیں۔ خواہشات کا پورا ہونا ناممکن ہے' کیونکہ میری عظیم ترین خواہش ہے کہ میں نایاب جیلانی اور نبیلہ عزیز سے ملوں۔ ان سے پوچھوں کہ وہ کون سی کیفیت ہوتی ہے، جو آپ کو عشق کی گہرائی تک لے جاتی ہے۔ عشق کو اتنا لازوال بنا کر لکھتیں ہیں' مجھ سمیت ہر بندے کا دل عشق کرنے کو چاہتا ہے اور میں جب جب ان ساحرہ رائٹرز کو پڑھتی ہوں تو بے ساختہ دل سے یہ آواز آتی ہے کہ وہ زندگی ہی کیا' جس میں عشق نہیں کیا۔ خواب یہ ہے کہ رائٹر بنوں اور شہرت پاؤں' مگر نا' جی ایسی خداداد صلاحیت ہم میں کہاں' ہم ٹھیک سے کسی سوال کا جواب نہیں لکھ سکتے۔ افسانہ یا ناول لکھیں گی۔ خواب یہ بھی ہے کہ کرن کے ہر شمارے میں میرا نام ہو۔"

☆ "برکھا رت کو کیسے انجوائے کرتی ہیں؟"

○ "جب میری عزیز ترین دوست سنبل تحریم حیات تھی۔ ہر برکھا رت میں اسی کے ساتھ انجوائے کرتی تھی' کیونکہ یہ ہمارا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ بارش میں بھیگتے اپنے اچھے مستقبل کے لیے دعائیں کرتے اور خوب گپیں لگاتے۔ اب یہ حال ہے بقول شاعر اور بقلم انیقہ انا جی کہ۔۔۔"

بارش ہوئی تو گھر کے دریچے سے لگ کر ہم
چپ چاپ سوگوار تجھے سوچتے رہے

اور سنبل اور دادا ابا کو یاد کر کے رونا اور ان کی مغفرت کی دعائیں کرنا کہ اللہ تعالیٰ انہیں جنت عطا کرے۔ (آمین)

☆ "آپ جو ہیں' وہ نہ ہوتیں تو کیا ہوتیں؟"

○ "واہ کیا سوال ہے۔ سارے رونے ہی اس ہونے کے ہیں۔ نہ ہم ہوتے نہ غم ہوتے' بقول شاعر۔"

ڈبویا مجھ کو ہونے نے
نہ ہوتی میں تو کیا ہوتی

☆ "آپ بہت اچھا محسوس کرتی ہیں جب؟"

○ "مجھے بہت اچھا لگتا ہے' جب میں کسی فقیر کو پیسے دیتی ہوں اور تب اچھا لگتا تھا' جب کوئی اپنی مصروفیت سے وقت نکال مجھے میری سالگرہ پر بیسٹ وشنز اور خوب صورت دعاؤں کے تحفے دیتا۔ آئی مین دیتی' مگر اب کچھ بھی اچھا نہیں لگتا' اپنی اکلوتی دوست کے بغیر۔"

☆ "آپ کو کیا چیز متاثر کرتی ہے؟"

○ "مجھے کوئی ایک چیز متاثر کرتی ہو تو بتاؤں۔ مجھے مععد عباس (تین سالہ بھانجا) کے معصوم سوال بہت انسپائر کرتے ہیں۔ مجھے ہر خوب صورت شعر بہت اچھا لگتا ہے۔ جب کوئی پاکستانی ٹیم جیتنے کے بعد زمین پر سجدہ کرتی ہے تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مجھے پڑھے لکھے لوگ بہت اٹریکٹ کرتے ہیں اور مجھے نبیلہ عزیز اور نایاب جیلانی کی ہر تحریر اور باقی رائٹرز کا ہر خوب صورت جملہ بہت متاثر کرتا ہے۔"

☆ "کیا آپ مقابلے کو انجوائے کرتی ہیں یا خوف زدہ ہو جاتی ہیں؟"

○ "میں نے آج تک کسی سے مقابلہ نہیں کیا۔ اس لیے انجوائے کرنے یا خوف زدہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

☆ "متاثر کن کتاب' مصنف' مووی؟"

○ "متاثر کن کتاب' وصی شاہ کی "آنکھیں بھیگ جاتی ہیں" مصنف نایاب جیلانی اور مریم عزیز اور نبیلہ عزیز' مووی "مرزا"۔"

☆ "آپ کا غرور؟"

○ "میرا غرور' میرا پاکستانی ہونا' میرا مسلمان ہونا' یہ

غرور کہ ہم آلِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں اور جب کوئی کرن ڈائجسٹ میں میری کسی سلسلے میں موجود اشاعت کو پڑھتا ہے اور خوب صورت کمنٹ دیتا ہے تو خود پر فخر سا ہوتا ہے۔"

☆ "کوئی ایسی شکست جو آج بھی اداس کردیتی ہے؟"

○ "ایسی کوئی خاص شکست نہیں ہے۔ البتہ جب کبھی کرن میں کچھ بھیجا ہوا ہو اور شائع نہ ہو تو بہت دکھ ہوتا ہے 'مگر مایوسی نہیں ہوتی۔"

☆ "کیا آپ نے پالیا جو آپ زندگی میں پانا چاہتی تھیں؟"

○ "نہیں بہت کچھ پانا ہے 'مگر کھویا بہت کچھ ہے پچھلے سال۔"

☆ "اپنی ایک خامی یا خوبی جو آپ کو مطمئن یا مایوس کرتی ہے؟"

○ "میری خوبی یہ ہے کہ میں بڑی سے بڑی خبر کو آرام سے ہضم کرلیتی ہوں۔ سامنے والے کچھ بھی کہہ لے۔ اپنے چہرے کے تاثر کو نارمل رکھتی ہوں 'جبکہ سامنے والا خود شرمندہ ہوجاتا ہے۔ خامی یہ ہے کہ غصہ بہت آتا ہے 'ہروقت ناک پہ دھرا رہتا ہے۔ غصے میں دل چاہتا ہے کہ دماغ کی کوئی نس پھٹ جائے اور میں ہمیشہ کے لیے پرسکون ہوجاؤں۔ اپنا غصہ بہت پریشان اور مایوس کرتا ہے۔ سنبل اکثر کہا کرتی تھی کہ شالو تیرے غصے سے پریشان ہیں ہم۔ فوراً "لال ٹماٹر ہوجاتی ہو۔ مگر میرے غصے کا علاج یہ ہے کہ تنہائی میں چلی جاتی ہوں اور خود سے خوب لڑتی ہوں۔"

☆ "کوئی ایسا واقعہ جو آپ کو شرمندہ کردیتا ہے۔"

○ "ایسا کوئی واقعہ نہیں 'ویسے میں بہت کم شرمندہ ہوتی ہوں 'بقول امی تو نے تو شرمندہ ہونا سیکھا ہی نہیں 'ہم ہی شرمندہ ہوجاتے ہیں 'تجھے شرم دلاتے دلاتے 'ہاہاہا۔"

☆ "کوئی شخصیت یا کسی کی حاصل کی ہوئی کامیابی جس نے آپ کو حسد میں مبتلا کیا ہو؟"

○ "ایسی کوئی شخصیت نہیں 'میں کسی سے حسد نہیں کرتی 'بس رشک کرتی ہوں۔"

☆ "مطالعہ آپ کی نظر میں؟"

○ "مطالعہ میرا بہترین استاد 'میرا زادِ راہ اگر آج میں ایک چھوٹا سا ذرہ ہوں تو مطالعے کی وجہ سے 'جب بھی فارغ ہوتی ہوں کچھ نہ کچھ پڑھتی ہی پائی جاتی ہوں۔"

☆ "آپ کے نزدیک زندگی کی فلاسفی کیا ہے؟ جو آپ اپنے علم 'تجربہ 'مہارت میں استعمال کرتی ہیں؟"

○ "زندگی بے شک خوب صورت نعمت ہے 'مگر ہم زندگی سے خوش ہوں تو زندگی حسین لگتی ہے اور کوئی شکایت ہو تو زندگی بوجھ 'مگر بعض اوقات ہر انسان کی زندگی میں ایک ایسا موڑ آجاتا ہے کہ سارا علم 'سارا تجربہ 'اپنی ساری مہارتیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔"

☆ "آپ کی پسندیدہ شخصیت؟"

○ "میری پسندیدہ شخصیات نبی صلی اللہ علیہ وسلم 'حضرت علی کرم اللہ وجہہ میرے دادا ابو اور میری عزیز از جان دوست سنبل تحریم۔"

☆ "ہمارا پورا پاکستان خوب صورت ہے 'آپ کا خاص پسندیدہ مقام؟"

○ "ہمارا پاکستان ہی مجھے اچھا لگتا ہے 'مگر اپنا شہر ملکوال تو بہت ہی پسند ہے 'میری خواہش ہوتی ہے کہ ملکوال کا نام ہر جگہ ہو۔"

☆ "اپنی کامیابیوں میں کسے حصہ دار ٹھہراتی ہیں؟"

○ "میں اپنی کامیابیوں میں اپنے رب کے بعد اپنے چھوٹے بھائی قاسم علی کو حصہ دار ٹھہراتی ہوں۔"

☆ ☆

سرورق کی شخصیت

ماڈل ---------- علینہ

میک اپ ---------- روز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافر ---------- موسیٰ رضا

نفیسہ سعید

ملک صاحب اپنے گھر والوں کو بے خبر رکھ کر اپنے کم سن بیٹے ایشال کا نکاح کر دیتے ہیں جبکہ ایشال اپنی کزن عریشہ میں دلچسپی رکھتا ہے اور سن بلوغت تک پہنچتے ہی وہ اس نکاح کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا ہے' ملک صاحب ہار مانتے ہوئے اس کی دوسری شادی عریشہ سے کر دیتے ہیں جس کی شرط صرف اتنی ہے کہ وہ اپنی پہلی منکوحہ کو طلاق نہیں دے گا۔

حبیبہ تعلیم حاصل کرنے کراچی آئی ہے جہاں وہ شاہ زین کے والد کے آفس میں جاب کرنے لگتی ہے۔ جس دوران شاہ زین حبیبہ میں دلچسپی لینے لگتا ہے' مگر حبیبہ کا رد عمل اس معاملے میں خاصا عجیب و غریب ہے وہ شاہ زین کو اپنا دوست تو مانتی ہے' مگر اس کی محبت کا مثبت جواب نہیں دے پاتی۔

فرہاد تین بھائی ہیں اس کے دونوں بڑے بھائی معاشی طور پر مستحکم ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی بیوی' بچوں کی ضروریات بھی کھلے دل سے پوری کرتے ہیں جبکہ فرہاد اس معاملے میں خاصا کنجوس ہے یہ ہی سبب اس کی بیوی زینب کو فرہاد سے بد ظن کرنے کا باعث بن جاتا ہے۔

فضا' زینب کی جٹھانی ہے جو اس کی خوب صورتی سے حسد کرتی ہے اور اپنی اس حسد کا اظہار وہ اکثر و بیشتر اپنے رویہ سے کرتی رہتی ہے۔ سالار' صباحت کا کزن ہے جو شادی شدہ ہونے کے باوجود زینب کو پسند کرنے لگتا ہے' اسی لیے وہ بہانے بہانے اسے قیمتی تحائف سے بھی نوازتا ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

بارہویں قسط ۱۲
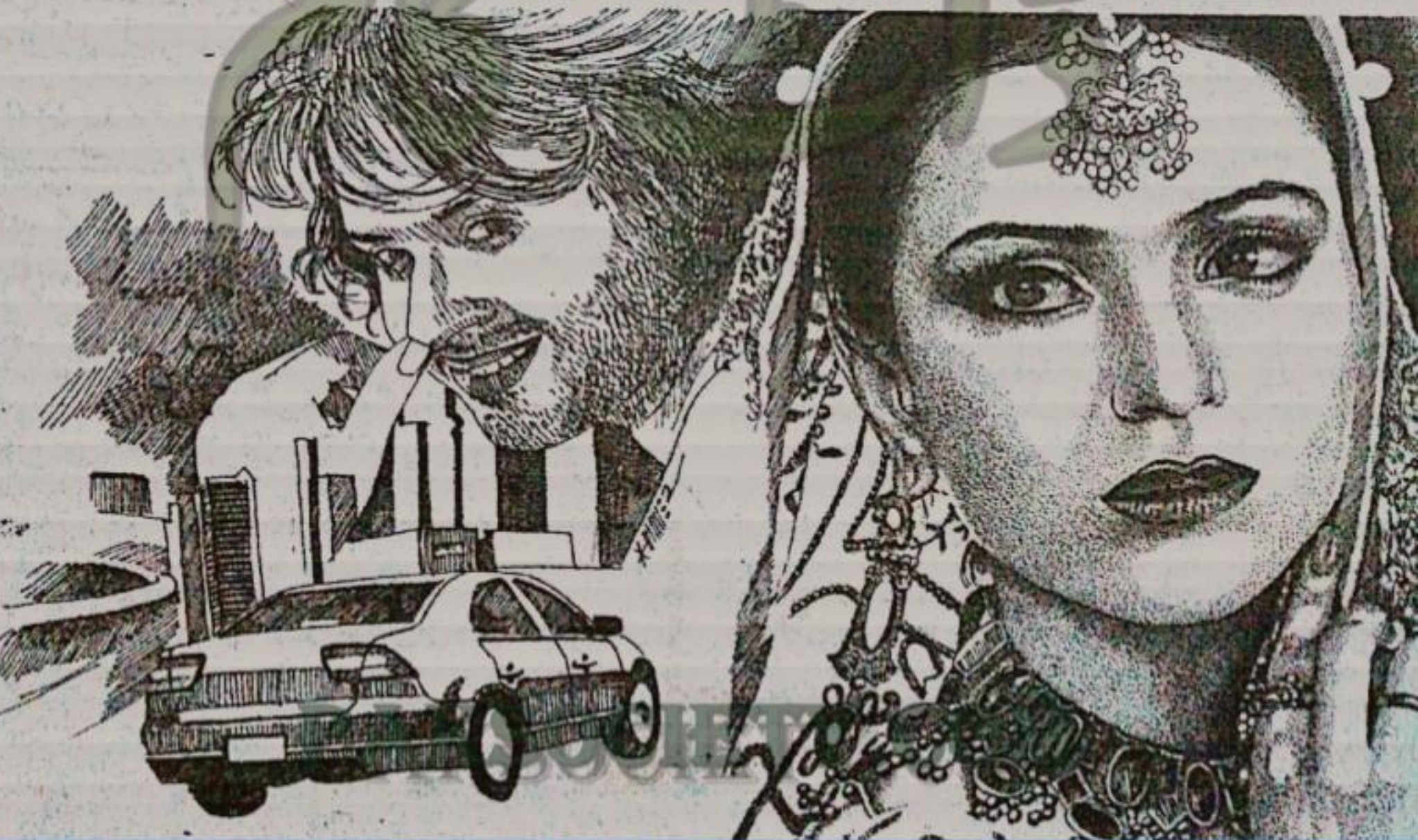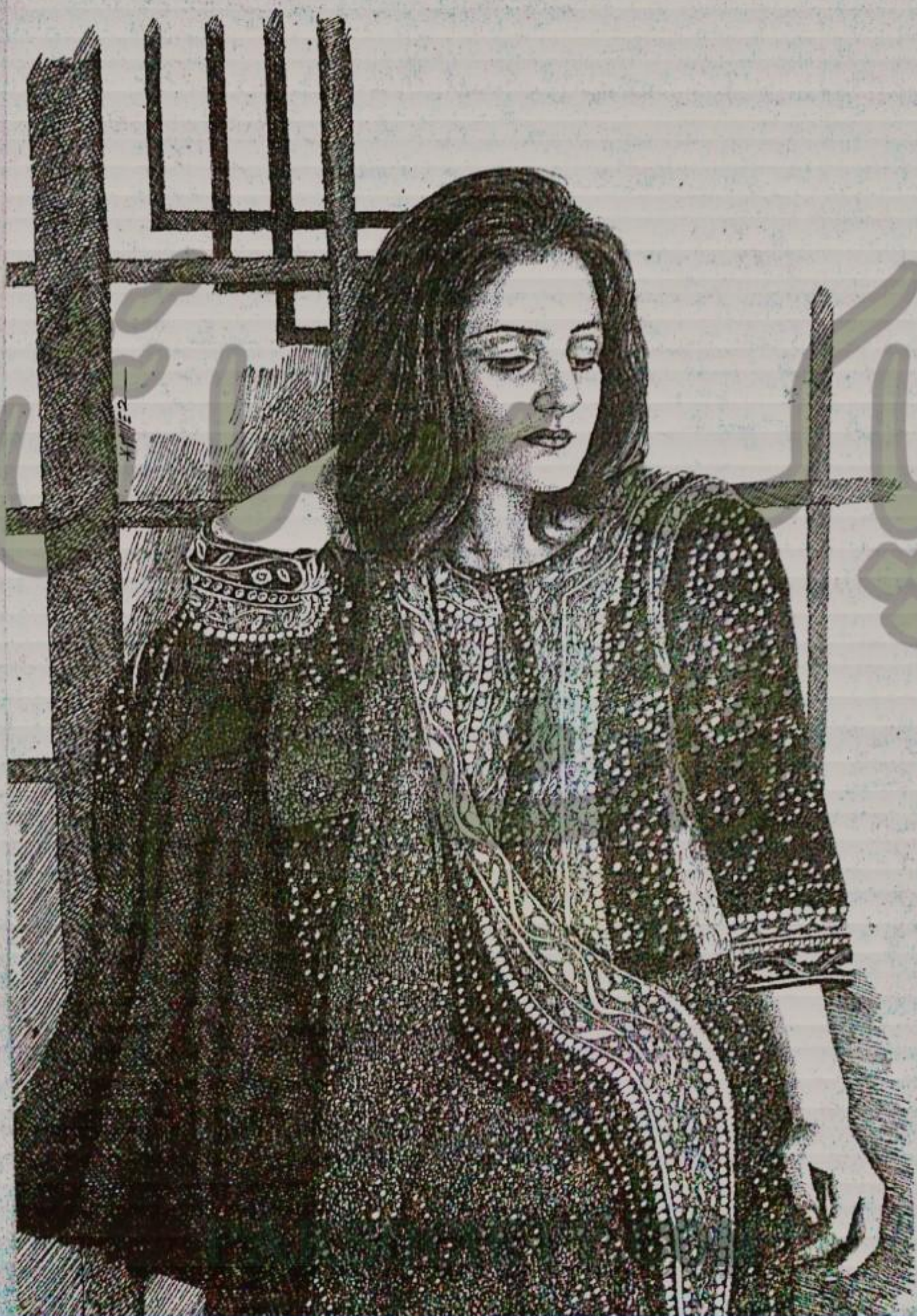
"یہ حبیبہ کہاں رہ گئی۔"
نازیہ نے شاہ زین کو مخاطب کیا جو ابھی ابھی ایشال سے گلے مل کر فارغ ہوا تھا۔
"پتا نہیں مما میں دیکھ کر آتا ہوں۔"
اماں کے اشارہ کرتے ہی وہ پھر سے اٹھ کھڑا ہوا جب یک دم بیرونی دروازہ پر پڑا پردہ ہٹا کر وہ اندر داخل ہو گئی جس کا انتظار کمرے میں موجود ہر فرد بڑی بے چینی سے کر رہا تھا۔
"السلام علیکم!"
سلام کرتے ہی وہ دروازے کے بالکل قریب رک گئی' ایسے جیسے اس کے قدموں نے مزید آگے بڑھنے سے انکار کر دیا ہو' باوجود کوشش کے وہ کچھ نروس ہو گئی تھی۔
"وعلیکم السلام۔" جواب کے ساتھ ہی صباحت اٹھ کھڑی ہوئیں۔
"آگے آجاؤ بیٹا وہاں کیوں رک گئیں۔"
اسے کنفیوژ کھڑا دیکھ کر نازیہ آنٹی نے حوصلہ دیا' سبج سبج قدم اٹھاتی وہ آگے بڑھ آئی۔
"تم تو ہو بہو اپنی ماں جیسی ہو۔" اسے گلے لگاتے ہی پہلا جملہ صباحت کے منہ سے یہ ہی نکلا۔
ایشال نے ہمیشہ یہ سنا کہ زینب چاچی ایک مکمل حسن کا نمونہ تھیں۔ اس وقت اپنی ماں کے منہ سے نکلنے والے یہ ستائشی الفاظ سن کر اس نے جو نظریں اٹھائیں تو وہ جھکنا ہی بھول گئیں' اسے یقین ہی نہ آیا کہ یہ سامنے کھڑی لڑکی حبیبہ ہے وہ حبیبہ جسے اس کی منکوحہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے خوب صورت تو جاذبیہ اور مریم بھی تھیں مگر حبیبہ کا حسن ایسا تھا جس نے ایشال جیسے خود پسند شخص کو مبہوت کر دیا۔
"ایک پل تو تمہیں دیکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے میرے سامنے زینب کھڑی ہو۔"
صباحت نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے کہا جواباً" حبیبہ کے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا' شاید اس وقت وہ بول ہی نہیں سکتی تھی اسے محسوس ہوا جیسے اس کا گلا رندھ گیا ہے اس کی نگاہوں میں بے اختیار اپنی ماں کا بیمار اور لاغر وجود لہرا گیا' جو زمانے کی ستم ظریفی کے ہاتھوں یکسر برباد ہو گئی تھی۔
"السلام علیکم حبیبہ کیسی ہیں آپ!" اسے مخاطب کرنے سے ایشال خود کو باز نہ رکھ سکا۔
"شکر الحمدللہ بالکل ٹھیک۔"
مختصر جواب دے کر اسے قطعی نظر انداز کرتی وہ سامنے رکھے صوفے پر شاہ زین کے برابر جا بیٹھی۔ "حبیبہ اتنی حسین ہو گی" یہ تو شاید اس کے تصور میں بھی نہ تھا اسے دیکھتے ہی نگاہ بے اختیار قریب بیٹھی اریشہ کے چہرے پر جا پڑی' جو بغور اسے ہی تک رہی تھی جانے اس کی نگاہوں میں ایسا کیا تھا وہ کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔ وہ اتنا دل پھینک تو کبھی نہ تھا کہ کسی لڑکی کے حسن کو دیکھ کر ایسے بے خود ہو جاتا' یہاں شاید اس کی اس بے خودی کی وجہ حبیبہ سے جڑا رشتہ تھا وہ رشتہ' جسے اتنے سال اس نے کبھی کوئی اہمیت ہی نہ دی' حبیبہ سامنے بیٹھی مما سے بات کر رہی تھی۔ ایشال نے ترچھی نگاہوں سے اس کا بغور جائزہ لیا سبز شلوار قمیض میں ملبوس حبیبہ کا ملکوتی حسن اسے اپنے سحر میں جکڑ رہا تھا۔
"گرین کلر کس قدر خوب صورت ہوتا ہے' میں بلاوجہ ہی آج تک اس رنگ سے چڑتا رہا۔" حبیبہ کے جسم پر موجود گرین کلر دیکھتے ہی اس کے دل میں پہلا خیال یہ ہی آیا۔
"میرا خیال ہے کہ ہمیں اب چلنا چاہیے۔"
جانے اریشہ کو کیا ہوا وہ یک دم ہی اٹھ کھڑی ہوئی شاید وہ ایشال کی بے خودی محسوس کر چکی تھی' بے چینی اس کے چہرے سے عیاں تھی جو بھی تھا اس وقت سامنے بیٹھی لڑکی اس کی سوتن کے عہدے پر فائز تھی رشتہ پسند کا ہو

یا مجبوری کا ؟ اپنی نزاکتوں کا احساس ہر دم دلاتا ہے۔
"اتنی جلدی... " ایشال کے کچھ کہنے سے قبل ہی نازیہ آنٹی بول اٹھیں۔
"میں نے سب کے لیے ڈنر تیار کروایا ہے۔"
"سوری آنٹی ہمیں پاپا کی طرف جانا ہے ہمارا ڈنر وہاں ہے اور وہ ویٹ کر رہے ہوں گے چلو ایشال۔"
اس نے اطمینان سے بیٹھے ایشال کو پکارا' حبیبہ نے دیکھا وہ کچھ گھبرائی ہوئی تھی اسے حیرت ہوئی شاید اریشہ کو ایشال کی محبت پر بھروسا نہ تھا کیوں کہ جو بھروسا رکھتے ہیں وہ ایسے نہیں گھبراتے۔
"او کے آنٹی ہم چلتے ہیں مما پاپا آپ کے ساتھ ڈنر کریں گے۔"
کھڑے ہوتے ہوئے ایشال نے نازیہ کو مخاطب کیا' پھر ایک نظر حبیبہ کے چہرے پر ڈالی جو شاہ زین سے مسکرا مسکرا کر محو گفتگو تھی اسے ایشال کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا ایشال یہ محسوس کر چکا تھا اسے حبیبہ کا اس طرح خود کو نظر انداز کر کے شاہ زین سے باتیں کرنا قطعی پسند نہ آیا جو بھی تھا حبیبہ اس کی منکوحہ تھی... ابھی تک اس نے طلاق نہ دی تھی وہ ایک مرد تھا اور مرد کی انا کی تسکین ہمیشہ ایک عورت کو اپنے سامنے گڑگڑاتے دیکھ کر ہوتی ہے چاہے وہ مرد کتنا تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو۔
لیکن یہاں تو وہ جس حبیبہ کا تصور لے کر آیا تھا صورت حال اس سے قطعی مختلف تھی' حبیبہ کا اسے اگنور کرنا' اسے ذرا نہ بھایا۔ وہ جو اس غلط فہمی میں تھا کہ حبیبہ اس کے انتظار میں نگاہیں فرش راہ کیے بیٹھی ہوگی اس کی یہ غلط فہمی ایک پل میں ہی دور ہو گئی۔ اپنی غلط فہمی کے دور ہوتے ہی وہ ایک دکھ اور تکلیف کے احساس میں گھر گیا بھول گیا یہ ابتدا اس کی طرف سے ہوتی تھی' وہ ہی تو تھا جس نے اتنے سال حبیبہ کو انتظار کی سولی پر لٹکا رکھا تھا اور خود اپنی بھرپور زندگی جی رہا تھا۔ بالآخر وہ حبیبہ کا اس طرح نظر انداز کرنا برداشت نہ کر سکا اور یک دم بول اٹھا۔
"اللہ حافظ حبیبہ۔"
اس کی زبان سے ادا ہونے والے ان بے اختیار الفاظ نے حبیبہ کو حیران کر دیا' جواباً وہ کچھ بول ہی نہ پائی اور نہ ہی ایشال نے اس کے جواب کا انتظار کیا اور اریشہ کی سنگت میں لاؤنج کا دروازہ عبور کر گیا۔

☼ ☼ ☼
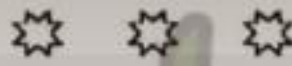
"یہ زینب اور وجاہت بھائی کے درمیان کیا چل رہا ہے؟"
آج کئی دنوں بعد رابعہ' فائزہ سے ملنے آئی تھی اور آتے ہی اس کی طرف سے کیے جانے والے اس سوال نے فائزہ کو تھوڑا سا بوکھلا دیا۔
"کچھ بھی نہیں۔" اس کی زبان تھوڑا سا لڑکھڑا گئی۔
"وہ دراصل ہمارے پرانے محلے میں رہنے والی فضیلت آنٹی کی بیٹی ہے۔ جو محلے کے بچوں کو سپارہ پڑھایا کرتی تھیں۔"
"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔" رابعہ نے کڑے انداز میں تفتیش کی۔
"میں نے یہ پوچھا ہے کہ اس کا وجاہت بھائی سے کیا سلسلہ ہے' کیوں وجاہت بھائی سارا دن تمہارے گھر پائے جاتے ہیں اور میں نے یہ بھی سنا ہے کہ زینب بھی اوپر تمہارے گھر ہی ہوتی ہے خاص طور پر اس وقت جب وجاہت بھائی یہاں آتے ہیں۔"
"تمہیں یہ سب کس نے بتایا۔" فائزہ قدرے حیران ہوئی۔
"میں نے جب بھی بھائی کو فون کیا وہ تمہارے گھر ہی ہوتے ہیں اور اکثر ان کی باتوں میں زینب کا تذکرہ ہوتا ہے

جو ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتا جا رہا ہے' میں جانتی ہوں کہ وہ کئی سالوں سے زینب کو پسند کرتے ہیں اور ان کی یہ پسند اب محبت میں ڈھل چکی ہے۔ جس کا اندازہ ان سے بات کرنے والا ہر شخص با آسانی لگا سکتا ہے۔"

رابعہ نے ہر بات تفصیل سے بتائی جسے سن کر فائزہ نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا ورنہ وہ جانے کیا سمجھی تھی۔

"جو آپ سوچ رہی ہیں ویسا کچھ بھی نہیں ہے زینب ایک شادی شدہ عورت ہے۔ جس کی تین بیٹیاں ہیں۔" فائزہ اب قدرے مطمئن ہو چکی تھی۔

"شادی شدہ یا بچیاں ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا یہ سب کچھ کسی بھی انسان کو بہکنے سے روکنے کے لیے کافی نہیں ہے اس لیے بہتر ہے کہ تم ان دونوں پر نظر رکھو اور کوشش کیا کرو جب وجاہت بھائی آئیں زینب اوپر نہ آئے۔" رابعہ کے دل میں کچھ ایسا تھا جو اسے پریشان کر رہا تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے بابا کر لوں گی کوشش' اب یہ بتاؤ تم نے کھانے میں کیا کھانا ہے؟" فائزہ قدرے اکتا گئی۔

"جو دل چاہے بنا لو......"

رابعہ کے جواب دیتے ہی فائزہ وہاں سے اٹھ کر باہر کچن کی طرف آ گئی کیوں کہ' وہ رابعہ کے پاس بیٹھ کر اس کے مزید سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼
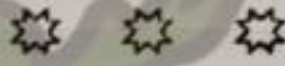
"یہ رکھ لو...." وجاہت نے ایک پھولا ہوا براؤن لفافہ میری جانب بڑھایا۔

"یہ کیا ہے؟"

لفافہ تھامتے ہی میں نے کھول کر اندر جھانکا' ہرے اور نیلے نیلے نوٹ جنہیں دیکھتے ہی میں حیران رہ گئی۔

"یہ کس لیے ہیں؟" میں نے لفافہ وجاہت کی سمت واپس بڑھایا۔

"تمہارے لیے۔" اس نے لفافہ کو ہاتھ لگائے بنا جواب دیا۔

"میرے لیے کیوں؟" وجاہت کا اس طرح پیسے دینا مجھے بہت عجیب لگا۔

"کیوں اتنے سوال جواب کر رہی ہو زینب' رکھ لو میں اپنی خوشی سے دے رہا ہوں گرمیوں کی شاپنگ کر لینا۔"

"سوری وجاہت میں اتنی رقم ایسے نہیں رکھ سکتی۔"

میں نے فوراً سے بیشتر ہاتھ میں پکڑا لفافہ بیڈ پر رکھ دیا وجاہت کا اس طرح پیسے دینا مجھے ذرا اچھا نہ لگا' ایسا محسوس ہوا جیسے وہ میری قیمت ادا کر رہا ہو۔

"میں چلتی ہوں فرہاد گھر آنے والا ہو گا۔" گھڑی میں ٹائم دیکھتے ہی میں سیڑھیوں کی جانب لپکی۔

"ایک منٹ زینب! میری بات تو سنو۔" وہ جلدی سے میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔

"ناراض ہو گئی ہو؟" میری دلی کیفیت کا اندازہ اسے ہمیشہ بنا کہے ہی ہو جایا کرتا تھا۔

"نہیں...." میں نے خود پر بمشکل قابو پایا۔

"سوری زینب میرا مقصد تمہیں تکلیف دینا نہ تھا میں تو صرف......"

"ٹھیک ہے وجاہت ہم اس موضوع پر پھر کبھی بات کریں گے ابھی مجھے جانا ہے کیوں کہ کچھ ہی دیر میں فرہاد گھر آنے والا ہے اور مجھے نیچے جا کر روٹی پکانی ہے ورنہ وہ ناراض ہو جائے گا۔"

میں اس کے قریب سے گزر کر باہر نکل آئی۔

☼ ☼ ☼

"ایک بات پوچھوں۔"
وہ ٹیرس پر تنہا کھڑی جانے کن سوچوں میں گم تھی جب اس کے پیچھے شاہ زین آن کھڑا ہوا۔
"ہاں پوچھو۔" وہ مسکراتے ہوئے اس کی جانب پلٹی۔
"تمہیں دکھ نہیں ہوا ایشال اور اریشہ کو ایک ساتھ دیکھ کے...."
"کس بات کا دکھ...."
حبیبہ کا لہجہ بالکل سادہ سا تھا جس میں کوئی دکھ یا پریشانی کہیں نہیں جھلک رہی تھی شاہ زین کے دل کو اطمینان سا حاصل ہوا۔
"یہ دکھ کہ جس جگہ تمہیں ہونا چاہیے تھا' وہاں ایشال کے برابر اریشہ کھڑی تھی دیکھو حبیبہ یہ سننا کہ 'ایشال نے تمہیں چھوڑ کر اریشہ کو اپنا لیا اتنا تکلیف دہ شاید نہ ہو جتنا ان دونوں کو اس طرح ایک ساتھ دیکھنا میری بات سمجھ رہی ہو نا۔"
حبیبہ کے چہرے پر چھائی مسکراہٹ دیکھ کر وہ کچھ کنفیوژ ہو گیا۔
"بہت اچھی طرح۔" وہ بدستور مسکراتے بولی۔
"ایک بات بتاؤں شاہ زین میں نے اپنی ماں کی زندگی سے ایک سبق بہت اچھے سے سیکھا ہے وہ یہ کہ 'زندگی کبھی بھی کسی ایسے شخص کے ساتھ نہ گزارو جو تمہاری قدر و قیمت نہ جانتا ہو ورنہ تمہاری زندگی خود تمہارے لیے عمر بھر کا روگ بن جائے گی' جانے لوگ صبر و شکر جیسے الفاظ صرف عورت ہی کے ساتھ کیوں منسوب کر دیتے ہیں اور مرد ان دو لفظوں سے مبرا کیوں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہیں قرآن میں یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ 'صبر و شکر کرنے والی صرف خواتین ہونی چاہئیں وہاں تو لفظ مومنین استعمال کیا گیا ہے' مگر افسوس ہم ہمیشہ عورت ہی کو یہ درس دیتے ہیں کہ ہمیشہ صبر کرے 'اللہ کا شکر ادا کرو' ایسے میں کوئی نہیں جانتا کہ وہ اپنے دل کو کہاں کہاں مارتی ہے' صرف ایک اچھے بننے کا جوش اسے اندر سے مار دیتا ہے ختم کر دیتا ہے' مرد کا ہر گناہ جائز اور عورت کی ایک ذرا سی غلطی پر پکڑ' صرف عورت ہی کھوٹ سے پاک کیوں ہونی چاہیے؟ کیوں ہر مرد چاہتا ہے کہ اس کی بیوی نیک اور پاکباز ہو؟ کیوں مرد کوشش نہیں کرتا خود سے منسوب عورتوں کو نیک اور پاکباز بنانے کی؟ کیوں ان کی دلی خواہشات کو اس قدر بے مول کر دیتا ہے کہ وہ سانس لیتے ہوئے بھی ڈرنے لگتی ہے کہ کہیں ٹوٹ کر بکھر نہ جائے؟ کیوں کرتے ہو تم سب مرد ایسا' کیوں عورت کی قدر نہیں کرتے؟"
اس کی آواز بھرا گئی وہ رو رہی تھی۔
"سب مرد ایک جیسے نہیں ہوتے حبیبہ بالکل اس طرح جس طرح سب عورتیں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔"
اس نے حبیبہ کے کندھے پر آہستہ سے اپنا ہاتھ رکھا۔
"تم' اریشہ' فضا تائی اور زینب چاچی کیا یہ سب عورتیں ایک جیسی ہیں' نہیں نا تو بس سب مرد بھی ایک جیسے نہیں ہوتے بالکل ایسے جیسے میں اور ایشال ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں' ایک نے تمہیں کھو دیا اور دوسرا تمہیں پانے کے لیے سرگرداں۔"
وہ نہایت ہلکے پھلکے انداز میں بول رہا تھا اور حبیبہ بڑے دھیان سے سن رہی تھی اس کا آخری جملہ سنتے ہی حبیبہ کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔
"گڈ ہنستی رہا کرو تم مجھے ایسے ہی اچھی لگتی ہو۔" اس کی ہلکی ہلکی سرخ آنکھیں اور بکھرے گولڈن بال' شاہ زین کو ایسا محسوس ہوا جیسے اگر وہ کچھ دیر اور یہاں کھڑا رہا تو شاید خود پر اپنا ضبط کھو دے۔
"بہت رات ہو گئی ہے سو جاؤ اب تم بھی۔"

اسے ہدایت دے کر وہ وہاں رکا نہیں بلکہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا چند ہی پل میں اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

☼ ☼ ☼
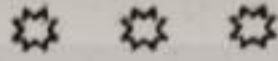
"یہ میرے کپڑے ہیں پیک کر دو جمعرات کی شام میں عمرے پر جا رہا ہوں۔"
کچن کے دروازے کو کھڑے فرہاد نے مجھے ایسے اطلاع دی جیسے وہ دو دن کے لیے کسی دوسرے شہر جا رہا ہو' حالانکہ یہ مجھے دو دن قبل فضہ بھابھی بتا چکی تھیں کہ یاسمین فرہاد کے ساتھ عمرے پر جا رہی ہے پھوپھو ہاں سے دونوں صباحت کی طرف دبئی جائیں گے مگر میں نے کوئی خاص توجہ نہ دی کیونکہ وہ ہمیشہ سے ہی ایسی بے پر کی اڑانے کی عادی تھیں لیکن اب فرہاد کے بتانے کے بعد کسی غلط فہمی کی گنجائش باقی نہ رہی۔
"کم از کم مجھے بتانا تو چاہیے تھا کہ میں عمرے پر جا رہا ہوں یہ کیا چھپ چھپا کر ساری تیاری کر لی اور جانے سے پہلے ایسے اطلاع دی جیسے کسی غیر کو بتایا جائے۔"
اس کے ہاتھوں میں موجود کپڑے کا تھیلا تھامتے ہوئے شکوہ خود بخود میری زبان سے پھسل گیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی میری تیوری پر چند بل ابھر آئے۔
"یہ تو اللہ تعالیٰ کا کرم ہے وہ جب اپنے بندوں کو بلائے اس میں اتنا ناراض ہونے والی کیا بات ہے نصیب والے اس کے در پر جاتے ہیں۔" تفاخرانہ لہجہ۔
میں جو کہنا چاہتی تھی وہ فرہاد کی سمجھ میں بھی نہیں آسکتا تھا اسی لیے مزید بحث کرنے سے اچھا تھا خاموشی اختیار کر لی جائے۔
"جانا تو یاسمین آپا نے تھا لیکن ان کی بدولت میرا بھی سبب بن گیا' انہیں محرم کا مسئلہ تھا اسفند اور صمد بھائی دونوں نے ہی منع کر دیا جانتی ہو نا وہ تو اپنی بیویوں کے بغیر جاتے ہی نہیں ہیں اب ایسی بھی کیا عورت کی غلامی کہ بندہ کسی کام کا ہی نہ رہے کتنے عرصہ سے صمد ٹال رہا تھا کہ صباحت بھابھی فارغ ہوں تو سب چلیں گے مگر' نہ وہ فارغ ہوئیں اور نہ ہی صمد نے ہاں کی' بے چاری ان کے انتظار میں بیٹھی تھیں تو' میں نے سوچا کیوں نہ میں ہی چلا جاؤں حالانکہ انہوں نے مجھ سے کہا بھی نہیں تھا یہ تو ثواب کا کام ہے جس کے بھی حصہ میں آجائے۔"
جانے وہ کیا کیا بول رہا تھا مجھ میں اب مزید سننے کی تاب نہیں تھی اس لیے میں نے اسے درمیان میں ہی ٹوک دیا۔
"مجھے اپنے سارے کپڑے نکال دو میں پیک کر دوں۔" مجھے اس کی کسی بات میں کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ کیا' کیوں اور کب جا رہا تھا مجھے اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔
"ایک تو میں جب بھی کہیں جانے لگوں تمہارا موڈ پہلے ہی آف ہو جاتا ہے شکر نہیں کرتیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے عمرے کی سعادت کے قابل سمجھا الٹا منہ بنا لیا تمہاری جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو یہ سب سن کر خوش ہو جاتی۔"
میں اس کی تمام باتوں کو نظر انداز کر کے اندر کمرے میں آگئی کیونکہ میرا موڈ اس وقت کسی بات پر بھی فرہاد سے الجھنے کا نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

"تمہاری طبیعت ٹھیک ہے ایشال۔"
وہ جب سے نازیہ آنٹی کے گھر سے آیا تھا ایسا ہی کھویا کھویا سا تھا کہ اریشہ سے برداشت نہ ہوا اور اس نے ٹوک ہی دیا۔

"نہیں سر میں بہت شدید درد ہے۔"

اس نے کروٹ بدل کر آنکھیں موند لیں' وہ جھوٹ بول رہا تھا اس بات کا اندازہ اریشہ کو ہو چکا تھا۔

"ایشال۔"

اس نے ایک بار پھر اسے پکارا۔

"ہاں بولو کیا بات ہے؟"

اب وہ مکمل طور پر اس کی جانب متوجہ تھا۔

"مما نے کسی لیڈی ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ لیا ہے۔"

"اچھا تو تم چلی جانا۔"

جواب دے کر اس نے ایک بار پھر سے کروٹ بدل لی۔

"مجھے اکیلے نہیں جانا تمہیں بھی میرے ساتھ جانا ہے وہ تمہارا چیک اپ بھی کریں گی۔"

اریشہ نے ہاتھوں پر لوشن لگاتے ہوئے ڈریسنگ کے شیشہ سے اس کی جانب دیکھا جو بدستور آنکھیں موندے لیٹا تھا۔

"مجھے کسی چیک اپ کی ضرورت نہیں ہے۔"

"لیکن ایشال تمہیں ایک دفعہ تو ڈاکٹرز کے دیے ہوئے سارے ٹیسٹ کروانے چاہئیں اس میں آخر برائی کیا ہے جو تم ہر بار منع کر دیتے ہو۔"

اسے ایشال کا انکار کرنا ہمیشہ سے زیادہ برا لگا۔

"مجھے نیند آرہی ہے لائٹ بند کردو۔"

یہ اس کی بات کا جواب نہیں تھا' مگر اس وقت وہ مزید کوئی بات کر کے اس سے الجھنا نہ چاہتی تھی اس لیے خاموشی سے اٹھ کر لائٹ بند کردی۔

☼ ☼ ☼
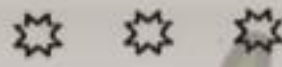
"ہمیں معاف کردو حبیبہ ہم تمہارے گناہ گار ہیں ساری زندگی ہم نے عیش و عشرت میں گزار دی اور کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا ہماری ماں اور بہن کن حالوں میں زندہ ہیں۔"

جاذبیہ نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے معافی مانگی۔

"مجھے آپ لوگوں سے کوئی شکوہ نہیں اور جہاں تک میں سمجھتی ہوں ان حالات میں ہر شخص اپنی جگہ درست تھا۔" اس کا سپاٹ لہجہ بالکل پر سکون تھا۔

"میں تو سمجھ دار تھی جانتی تھی کہ میری ماں کن حالات میں زندگی بسر کر رہی ہے پھر بھی وقت پڑنے پر دوسروں کے ساتھ شامل ہو گئی ان سنگسار کرنے والوں کے ساتھ جن کے ہاتھوں میں نوکیلے پتھر تھے۔"

مریم آپا کے لہجہ میں تاسف چھلک رہا تھا۔

"اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے مریم آپا وقت سب کچھ روند کر گزر گیا۔" اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی گھل گئی۔

"میری ماں آپ سب کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ترستی اس دنیا سے چلی گئی ان کے کان آپ کی آواز سننے کے خواہش مند تھے مجھے تو خیر آپ لوگوں نے کبھی اپنی سگی بہن نہ سمجھا مگر معاف کیجئے گا' وہ تو آپ کی سگی ماں تھیں نا کتنا سمجھایا تھا آپ لوگوں کو سالار انکل نے مگر آپ دونوں نے وہ کیا جو فضہ تائی نے چاہا اور ان کے کہنے پر

عمل کرتے ہوئے اپنی سگی ماں سے ہر ناطہ توڑ لیا۔"

"ناطہ ہم نے نہیں توڑا تھا حبیبہ۔"

جاذبیہ کے لہجہ میں شکوہ ابھرا۔

"وہ ہمیں چھوڑ کر گئی تھیں بالکل بے یار و مددگار اور بے آسرا' جانتی تھیں کہ ہمارے باپ کو ہم سے کوئی سروکار نہ تھا ہمارے لیے تو سب کچھ ہماری ماں ہی تھی ہمارے ہر دکھ درد کی ساتھی پھر کیوں اس نے ہمارے ساتھ یہ سب کیا' صرف ہمارے باپ سے انتقام لینے کی خاطر' اسے نیچا دکھانے کے لیے ہم سب کو برباد کر دیا تم فضہ تائی کو کتنا بھی برا سمجھو مگر سچ تو یہ ہے کہ ہمارے لیے سب کچھ وہ ہی ہیں انہوں نے ماں نہ ہوتے ہوئے بھی ہمیں ماں بن کر پالا۔"

"سچ تو یہ ہے کہ جاذبیہ باجی کہ کئی دفعہ ہماری زندگی میں وہ سب کچھ ہو جاتا ہے جس کے لیے ہم کوئی پلاننگ نہیں کرتے جہاں تک میں سمجھتی ہوں زندگی پلاننگ سے نہیں گزرتی' اس کا تو کام گزرنا ہے اور یہ گزرتی چلی جاتی ہے کئی دفعہ تو بنا سوچے سمجھے وہ سب ہو جاتا ہے جو ہماری قوت فیصلہ کو ختم کر دیتا ہے اور ہم ایک مشین کی مانند وہ سب کرتے چلے جاتے ہیں جو کرنا نہیں چاہتے اور شاید اسی کو نصیب کہتے ہیں۔"

وہ ذرا سی ذرا سانس لینے کے لیے رکی۔

"یہ سب کچھ کہنے کا میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ میں اماں کی وکالت کر رہی ہوں یا یہ کہ اماں نے جو کیا صحیح کیا' میں تو آپ کو صرف یہ بتانا چاہتی ہوں کہ آپ دونوں کی طرح میں بھی فرہاد ہی کی بیٹی ہوں آپ کی سگی بہن اور میرا مقصد صرف یہ ہی ثابت کرنا ہے آپ لوگوں نے جو کچھ میرے لیے دوسروں سے سنا وہ محض من گھڑت تھا سچ وہ ہے جو میں آپ دونوں کو بتا رہی ہوں۔"

بولتے بولتے اس کی آواز رندھ گئی۔

اس کے الفاظ دونوں کو شرمندہ کر گئے' سچ تو یہ تھا کہ' اب ان تمام باتوں کا کوئی فائدہ نہ تھا یہ سب تو زینب کی موت کے ساتھ ہی شاید ختم ہو گیا تھا۔

✲ ✲ ✲
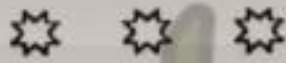
"ایشال اس دن کے بعد آپ سے نہیں ملا۔" نازیہ نے سالار کی جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"نہیں اور مجھے حیرت ہے صمد نے بھی اس سلسلے میں مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔" نازیہ کی بات بنا کہے ہی وہ سمجھ چکا تھا۔

"تو پھر آپ کو خود انہیں فون کر کے پوچھنا چاہیے تاکہ معاملہ ایک طرف ہو اور ہم کسی نتیجہ پر پہنچ سکیں۔"

"ٹھیک ہے میں کل ہی دونوں کو فون کرتا ہوں۔" سالار اس کی بات سے متفق ہوتا ہوا بولا۔

"یہ حبیبہ کہاں ہے شام سے دکھائی نہیں دے رہی۔"

"گھر ہی میں ہے' آج مریم اور جاذبیہ اس سے مل کر گئی ہیں تب سے ہی ڈسٹرب ہے اب تو میرا خیال ہے سو گئی ہے۔"

اللہ تعالیٰ اب اس کی تمام مشکلات جلد از جلد آسان کرے اور اس سلسلے میں کی جانے والی ہماری کوششوں کو کامیاب فرمائے۔"

سالار نے اٹھتے ہوئے دل کی گہرائیوں سے اس کے حق میں دعا کی۔

"آمین۔"

جواباً تازیہ نے صدق دل سے آمین کہا۔

☆ ☆ ☆
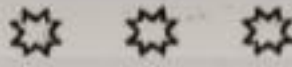
رات کا جانے کون سا پہر تھا جب ایشال کی آنکھ کھل گئی۔ اسے کچھ بے چینی سی محسوس ہوئی کروٹ بدل کر اپنے قریب لیٹی اریشہ پر ایک نظر ڈالی ایک دم اسے ایسا محسوس ہوا جسے اریشہ کا وجود حبیبہ کی صورت میں ڈھل گیا ہو وہ چونک اٹھا جلدی سے قریب رکھا موبائل اٹھا کر آن کیا' اس کی روشنی میں ایک بار پھر اریشہ کا جائزہ لیا تاکہ' اس کے نقوش واضح ہو سکیں جو حبیبہ کے تصور میں کہیں کھو گئے تھے وہ اٹھ بیٹھا۔

"پتا نہیں یہ مائیں اولاد کی اس قدر برین واشنگ کیوں کرتی ہیں' جب پاپا نے میرا نکاح حبیبہ سے کیا تھا تو کیا ضرورت تھی مما کو' بلاوجہ بھکانے کی انہیں پاپا کا ساتھ دینا چاہیے تھا نہ کہ مجھے غلط راستے پر ڈال کر بلاوجہ حبیبہ بے چاری کی زندگی برباد کی۔"

اپنی غلطی کا الزام دوسروں پر ڈالنا اس کی پرانی عادت تھی جس میں اسے کمال حاصل تھا۔

"بری بات ہے ایشال اپنی کسی بھی غلطی کا ذمہ دار دوسروں کو مت ٹھہراؤ مان جاؤ دونوں بار قصور تمہارے دل کا ہی تھا۔"

اس کے دماغ نے اسے سرزنش کی' وہ اٹھ بیٹھا' جانتا تھا کہ اب نیند نہیں آنی' اپنے پاس رکھا سگریٹ کا پیکٹ لیے وہ باہر ٹیرس میں آگیا کمرے کی گھٹن سے باہر نکلتے ہی اسے قدرے سکون ملا۔

"اب پتا نہیں یہ سالار انکل مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس نے خود سے سوال کیا۔"

"مجھے یہاں اب مزید نہیں رکنا چاہیے لندن واپس چلے جانا چاہیے تاکہ' وہاں کوئی مجھ سے وہ ڈیمانڈ نہ کرے جو میرے لیے پورا کرنا ابھی فی الحال ممکن نہیں رہا۔"

اس نے ریت میں سر ڈال کر زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا۔

"لیکن کب تک' آخر تو مجھے کوئی ایک فیصلہ کرنا ہی ہوگا پھر اس قدر گھبرانے یا ڈرنے والی کیا بات ہے' میری زندگی ہے اور مجھے جو بہتر لگے وہ سب سے کہہ دینا چاہیے۔"

اس سوچ کے دماغ میں آتے ہی اس کا دل قدرے مطمئن ہو گیا اور وہ وہیں ٹیرس پر موجود کرسی پر بیٹھ گیا۔

☆ ☆ ☆
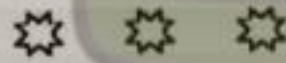
میں جیسے ہی سیڑھیوں سے نیچے اتری صحن میں رکھی چارپائی پر موجود رنگ برنگے کپڑے دیکھ کر وہیں رک گئی۔

"یہ سب کس کے ہیں؟"

میں نے چارپائی کے قریب کھڑے فرہاد کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ یاسمین آپا کے ہیں میرے بیگ میں ہی رکھ دو۔"

اس نے تمام کپڑے قریب موجود شاپر میں ایک ایک کرکے ڈال دیے اور پھر وہ پلاسٹک کا تھیلا میری جانب بڑھایا۔

"سعودیہ میں بہت گرمی ہے' صمد نے بتایا ہے کہ دبئی بھی خاصا گرم ہے اس لیے ہلکے کپڑے لے کر آنا سو' آپا نے مجھے فون کیا کہ ان کے لیے کچھ کپڑے لے کر سلوا لوں ان کے شوہر کا تو تمہیں پتا ہی ہے عجیب ڈھیٹ سا آدمی ہے بیوی پر ایک روپیہ خرچ کرنا گناہ سمجھتا ہے مجھے تو حیرت ہے کہ اس نے عمرے کی مد میں خرچ ہونے والی رقم جانے کیسے دے دی' اسی لیے میں نے آپا کو منع کر دیا تھا کہ اب مزید اس سے کچھ نہ مانگے ایسا نہ ہو کہ بلاوجہ کا فساد

کھڑا کردے۔"

میرے سوال کا جواب خاصا تفصیلی تھا جسے سنتے ہی نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے غصہ آگیا۔

"اگر میاں صرف سعودیہ یا دبئی میں نہیں آتیں، یہاں بھی آتی ہیں مجھے اور بچیوں کو بھی اتنی ہی گرمی لگتی ہے جتنی یا سمین آپا کو، تمہارا فرض تھا فرہاد ان کی شاپنگ کرتے وقت ہمیں بھی یاد رکھتے۔"

"ارے اس میں اتنا غصہ ہونے والی کیا بات ہے۔" وہ حیران ہوا۔

"اس گھر میں جو کچھ ہے سب تمہارا ہے میں نے تو تم سے کبھی کسی بات کا حساب نہیں مانگا تمہارا جو دل چاہے کھاؤ، جیسے دل چاہے استعمال کرو، تمہارے گھر سے کوئی آئے کوئی جائے میں نے کبھی سوال نہیں کیا اور جہاں میں اپنی بہن پر ایک روپیہ خرچ کردوں وہاں تم لڑنے جھگڑنے لگتی ہو کم از کم اتنا تو احساس کیا کرو کہ میری ایک ہی بہن ہے۔"

حسب معمول اسے بہت برا لگا، خفگی سے اس کے چہرے کے تاثرات بگڑ گئے۔

"اس گھر میں ہے ہی کیا جو میں استعمال کرتی ہوں یا اپنے گھر والوں پر لٹا دیتی ہوں اور یہ بات تم بہت اچھی طرح جانتے ہو میرے گھر والے یہاں آکر ایک وقت کا کھانا بھی نہیں کھاتے۔"

"دراصل تم ایک ناشکری عورت ہو۔"

دھیما لہجہ اور سخت الفاظ ہمیشہ سے اس کا وطیرہ رہے۔

"اور تم جیسی عورت کبھی کسی کا احسان نہیں مان سکتی تمہارے لیے کچھ بھی کرلوں تم ساری زندگی ایسی ہی رہو گی۔"

کپڑے کا تھیلا اٹھائے وہ اندر چل دیا۔

"ایسا کون سا احسان ہے تمہارا مجھ پر جو کوئی شوہر اپنی بیوی پر نہیں کرتا سوائے تمہارے۔" لاکھ کوشش کے میرا غصہ کم نہ ہوا۔

"دراصل زینب تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ تم دوسروں سے جیلس ہو جاتی ہو، چاہے وہ فضہ بھابھی ہوں یا یاسمین آپا، تمہیں تکلیف صرف یہ ہے کہ میں اپنی بہن کے ساتھ عمرہ کرنے کیوں جارہا ہوں۔" اس کا سلگتا لہجہ جو مجھے سرتاپا آگ کر گیا۔

"ایک مسلمان ہونے کے ناطے صرف پانچ وقت کی نماز، تہجد، عمرے، حج تم پر فرض نہیں ہے فرہاد میرے بھی کچھ حقوق ہیں جن کے تم ذمہ دار ہو۔"

میں حلق کے بل چلائی اور بھول گئی کہ مریم سامنے کمرے کے دروازے منہ کھولے کھڑی مجھے ہی تک رہی ہے۔

"اپنی آپا کا تمہیں ساری زندگی خیال رہا میرا کوئی احساس ہے تمہیں میرے کسی بھی گناہ ثواب کا ذمہ دار کون ہے؟ کوئی بھی ایسا گناہ جو تمہاری غفلت کے باعث مجھ سے سرزد ہو اس کا حساب کون دے گا کبھی سوچا ہے تم نے یہ۔" میں رونے لگی۔

"میں جب بھی کوئی نیکی کا ارادہ کرتا ہوں تم اسے ہمیشہ اسی طرح ہی رو دھو کر برباد کرنے کی کوشش کرتی ہو۔"

کپڑوں کا تھیلا اندر کمرے میں پھینک کر وہ باہر نکل گیا۔

"لعنت ہے مجھ پر جو سب کچھ ہوتے ہوئے ایسے بے فیض مرد کے ساتھ اپنی زندگی برباد کررہی ہوں، سالار تو مجھ سے دور ہو گیا لیکن وجاہت کو اب میں کبھی نہیں چھوڑوں گی چاہے اس کے لیے مجھے سب کچھ چھوڑنا پڑے میں دکھاؤں گی اس شخص کو کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو میری قدر کرتے ہیں مجھ سے محبت کرتے ہیں۔"

میں آنسو پونچھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی' کپڑوں کا تھیلا وہیں فرش پر پڑا تھا جسے میں نے ہاتھ بھی نہ لگایا' الماری میں کپڑوں کے نیچے ایک موبائل موجود تھا جو مجھے وجاہت نے دیا تھا جس کا نمبر صرف اس کے پاس تھا لیکن' آج تک میں نے خود اسے فون نہیں کیا تھا اب فرہاد کے رویہ نے مجھے اتنا تاؤ دلایا کہ' میں نے باہر دروازے کی کنڈی لگائی موبائل نکالا اور وجاہت کا نمبر ملانے لگی تاکہ اس سے بات کر کے اپنی فرسٹریشن دور کر سکوں فرہاد کا رویہ میرے اندر سرکشی کو ابھار رہا تھا جس کی کوئی پروا اب مجھے بھی نہ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼
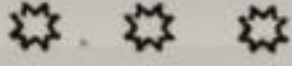
''میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے پاپا۔'' وہ سینے پر ہاتھ باندھے صمد کے سامنے کھڑا تھا۔

''کون سا ارادہ۔''

اس نے بات اتنی اچانک شروع کی تھی کہ صمد کو سمجھ ہی نہ آیا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔

''میں حبیبہ کو طلاق نہیں دوں گا۔''

اس کے لہجہ کی سختی چہرے پر بھی در آئی۔

''واٹ۔''

اس کی بات سنتے ہی صمد کو ایک جھٹکا سا لگا۔

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے ہوش میں ہو تم جانتے ہو..... تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''شکر الحمدللہ میں باقائمی ہوش و حواس آپ سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ' مجھے حبیبہ کو طلاق نہیں دینی وہ میری منکوحہ ہے اور زبردستی کوئی بھی مجھے اس بات کے لیے مجبور نہیں کر سکتا کہ میں حبیبہ کو طلاق دوں یہاں تک کہ آپ بھی نہیں میں عاقل و بالغ ہوں اور اپنے ہر فیصلے کا اختیار قرآن و سنت کی رو سے میرے پاس ہے۔''

''بھاڑ میں گئے تم اور تمہارے فیصلے' تم نے تو زندگی کو ایک مذاق بنالیا ہے۔ تمہارا ہر فیصلہ صرف تمہاری اپنی ذاتی انا کے لیے ہے۔ دوسروں کا احساس تو تم میں قطعی ختم ہو گیا ہے شرم آنی چاہیے تمہیں' دو لڑکیوں کی زندگی اپنے ہاتھوں برباد کرتے ہوئے۔'' غصہ سے ان کا سانس تیز ہوا۔

''آپ بھول گئے شاید۔''

اس پر صمد کے غصہ کا قطعی کوئی اثر نہ ہوا۔

''ہمارا مذہب' ہمیں چار شادیوں کی اجازت دیتا ہے اور حبیبہ سے اپنی شادی برقرار رکھنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ' میں خدانخواستہ اریشہ کو چھوڑ رہا ہوں' میں اتنا کماتا ہوں کہ دو بیویوں کی کفالت کر سکتا رہا۔''

اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے وہ صمد کی جانب تکتے ہوئے بولا۔

''تم جانتے ہو کہ چار شادیوں کی اجازت کن شرائط کے تحت ہمارے مذہب نے دی ہے۔''

صمد اس کے مقابل آن کھڑے ہوئے۔

''ہاں میں نے اپنے دین کا مکمل طور پر مطالعہ کیا' پھر ایک عالم دین سے ملاقات کی اور اس کے بعد آپ تک آیا۔'' وہ بالکل مطمئن لہجہ میں بولا ایسے جیسے سارے فیصلے کر کے آیا ہو۔

''اگر آپ کو خدشہ ہو کہ آپ کی نسل آگے نہیں بڑھ سکتی' اور آپ کی بیوی اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں ہے تو اس صورت میں آپ دوسری شادی کر سکتے ہیں بشرطیکہ آپ دونوں کے برابری کے حقوق ادا کرنے کے قابل ہوں۔ میں اپنی نسل آگے بڑھانا چاہتا ہوں اس لیے حبیبہ کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنا میری ضرورت ہے اور مجھے امید ہے کہ آپ ساری بات اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے۔''

یہ کہہ کر وہ وہاں رکا نہیں اور تیزی سے چلتا باہر نکل گیا اس کے کیے گئے فیصلے نے صمد کو اپنی جگہ ساکت کر دیا انہیں ایسا محسوس ہوا کہ اب شاید وہ ہلنے جلنے کے قابل بھی نہیں رہے۔ انہیں افسوس ہوا کیوں بلاوجہ ایک ایسی شرط رکھی جس نے زندگی کے اس مقام پر آ کر انہیں ایک ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا جس کے دونوں طرف سوائے موت کے کچھ بھی نہ تھا۔

☆ ☆ ☆
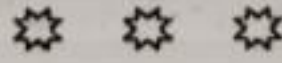
"کیا مصیبت ہے زینب تھوڑا ذرا پیچھے ہو کر لیٹو ایک تو گرمی اس قدر ہے نیند ہی مشکل سے آتی ہے اور جو آئی وہ تم نے ہاتھ مار کر خراب کر دی۔"

میں گہری نیند میں تھی جب فرہاد نے مجھے کندھا پکڑ کر ہلایا اس کا موڈ سخت خراب تھا شاید میرا ہاتھ لگنے سے اس کی نیند خراب ہو گئی تھی' میں یکدم ہی شرمندہ سی ہو گئی ایک پل میں ایسا لگا جیسے بیڈ کے دوسرے سرے پر کوئی اجنبی لیٹا ہو' میں فوراً" بیڈ کے کنارے پر ہو گئی' فرہاد کروٹ لے کر مزید دور ہو گیا اپنی نیند خراب ہونے پر وہ ابھی بھی بڑبڑا رہا تھا۔

مجھے بہت ہی عجیب لگا اس کے اس رویہ نے مجھے ایک بار پھر دل برداشتہ کر دیا میں نے ایک جھٹکے سے تکیہ اٹھایا اور نیچے فرش پر آ لیٹی' اس کے بعد ساری رات مجھے نیند ہی نہ آئی' اپنی توہین کے احساس نے مجھے سونے ہی نہ دیا اور اس کے بعد آنے والی ہر رات میرا اس بستر سے دل اچاٹ ہو گیا' بے شک مجھے فرش پر نیند نہیں آتی تھی مگر میں نیچے تکیہ رکھ کر سونے کی عادی ہونے لگی۔

حسب روایت مجھ میں آنے والی اس تبدیلی کا فرہاد پر کوئی اثر نہ ہوا شاید کچھ لوگ پتھر کی مانند ہوتے ہیں جن پر زمانے کے سرد و گرم اثرانداز نہیں ہوتے۔

☆ ☆ ☆
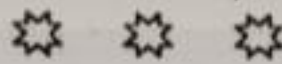
"آ جائیں آنٹی میں بالکل ریڈی ہوں۔"

حبیبہ کی آواز سن کر شاہ زین نے جو پلٹ کر دیکھا تو پلکیں جھپکنا بھی بھول گیا۔ رائل بلیو ڈریس میں وہ نظر لگ جانے کی حد تک خوب صورت دکھائی دے رہی تھی۔

"ہاں بس تمہارے انکل کا ویٹ کر رہی ہوں جانے کہاں رہ گئے۔"

نازیہ نے اپنی ساڑھی کا پلو درست کرتے ہوئے حبیبہ کا مکمل جائزہ لیا آج حنظلہ کے بیٹے کی سالگرہ تھی جس میں مریم نے اسے بڑے دل سے مدعو کیا تھا' ویسے بھی وہ جب سے آئی تھی اس کی فضہ تائی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ حالیہ ہونے والے فالج کے باعث وہ کہیں بھی آنے جانے سے قاصر تھیں اور اب وہ بھی حبیبہ سے ملنے کو بے تاب تھیں' جس کی اطلاع اسے مریم اور صباحت آنٹی دونوں دے چکی تھیں جبکہ' وہ خود بھی فضہ تائی کو دیکھنا چاہتی تھی ان سے ملنا چاہتی' یہ ہی وجہ تھی کہ اس نے مریم کو ایک بار بھی منع نہیں کیا اور ٹائم پر تیار ہو کر نیچے آ گئی۔

"آپ نے فون نہیں کیا؟ انہیں یاد تو کروائیں ہو سکتا ہے بھول گئے ہوں۔"

بمشکل اس سے نظریں ہٹا کر شاہ زین ماں کی طرف متوجہ ہوا۔

نازیہ نے بنا کوئی جواب دیے ہینڈ بیگ کے پاس رکھا اپنا سیل اٹھایا اور سالار کا نمبر ملانے لگی۔

"مجھے یقین ہے آج اس محفل میں تم سے زیادہ حسین کوئی نہ ہو گا۔" شاہ زین نے سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے اسے سراہا۔

"میں نے سنا ہے اماں بھی جب کسی خاندانی تقریب میں جاتی تھیں تو وہاں ان سے زیادہ حسین کوئی اور نہ دکھتا تھا یا شاید سب حسین ان کے سامنے ماند پڑ جاتے تھے۔"

وہ ایک بار پھر سے ماضی کی یادوں میں گم ہو گئی۔

"گاڑی نکالو شاہ زین ہمیں دیر ہو رہی ہے۔"

نازیہ آنٹی کی آواز اسے پل بھر میں ماضی سے حال کی طرف کھینچ لائی۔

"کیوں انکل ہمارے ساتھ نہیں جا رہے؟" اس نے حیران ہوتے ہوئے نازیہ کی جانب دیکھا۔

"وہ کسی میٹنگ میں ہیں فارغ ہو کر سیدھے وہیں آ جائیں گے۔"

نازیہ نے شیشے کا دروازہ دھکیلتے ہوئے اسے اطلاع دی اور وہ ان کی تقلید میں باہر آ گئی جہاں شاہ زین گاڑی اسٹارٹ کیے ان کا منتظر کھڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم کہاں سے آ رہی ہو؟"

مجھے تیار بجی سنوری دیکھ کر فرہاد کو اچنبھا ہوا اس لیے وہ پوچھے بنا نہیں رہ سکا۔

"فائزہ کے ساتھ اس کی بہن کے گھر گئی تھی۔"

اسے قطعی نظر انداز کرتی میں اندر کمرے میں آ گئی وہ بھی میرے پیچھے چلا آیا۔

"جانے سے پہلے روٹی تو پکا جاتیں کب سے بھوکا بیٹھا تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

"ہوٹل سے لے آتے۔" مختصر جواب دے کر میں نے الماری کھولی تاکہ کپڑے تبدیل کر سکوں۔

"تم نے یہ سوٹ کب بنوایا؟"

شاید اسے خیال آ گیا تھا کہ میرے تن پر موجود لباس اس کا خریدا ہوا نہیں ہے اس کے تجزیے نے مجھے حیران کیا میں جو ہمیشہ سمجھتی رہی کہ فرہاد نے مجھ پر کبھی توجہ نہ دی' آج مجھے اپنے اس خیال کی تردید کرنا پڑی۔

"پچھلی بار جب میں گھر گئی تھی اماں نے کچھ رقم دی تھی اس میں سے ہی فائزہ کے ساتھ شاپنگ پر جا کر یہ سوٹ خریدا تھا۔"

"خیریت ہے تمہاری اماں بھی تمہیں کپڑوں کے لیے کچھ دیتی ہیں آج سے پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا۔" وہ تھوڑا سا مشکوک ہوا۔

"اپنے پیسے گن لو ان میں سے کچھ نہیں لیا۔"

فرہاد کا شک محسوس کرتے ہی میں تلخ ہوئی اور بنا اس کا جواب سنے ہینگر سے کپڑے نکال کر باتھ روم میں گھس گئی' ویسے بھی اب میں نے اس کی باتوں کا اثر لینا چھوڑ دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ جیسے ہی اندر داخل ہوئی وہاں کی سج دھج دیکھ کر حیران رہ گئی ایک پل کو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ حبیبہ نہیں بلکہ معمولی لباس میں ملبوس زینب ہو جیسے وہاں موجود ہر شخص پر غرور نگاہوں سے گھور رہا ہے اس کا دل دکھ سے بھر گیا کاش ہمارے پاس کوئی ایسا آلہ ہوتا' جس سے ہم ہر عورت کے اندر چھپے احساسات کو جانچ سکتے تو ہمیں پتا چلتا کہ اپنی فیلنگز کے اعتبار سے دنیا کی ہر عورت دوسری سے مختلف ہے تو شاید ہم کسی ایک عورت کو دوسری عورت کی مثال دینے سے گریز کرا کرتے۔

"ارے وہاں کیوں کھڑی ہو آ گے آؤ تمہیں فضہ تائی سے ملواؤں۔"

اسے اپنی جگہ ساکت کھڑا دیکھ کر مریم تیزی سے اس کی جانب آئی اور حبیبہ اس کی ہمراہی میں قدم گھسیٹتی اس جانب چل دی جہاں وہیل چیئر پر موجود تائی اس عمر اور بیماری میں بھی ایک شان بے نیازی کے ساتھ موجود تھیں۔ وہیل چیئر کے پیچھے کھڑی خاتون غالباً"ان کی ملازمہ تھی جس کی نشاندہی اس کا لباس کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تائی کے لیے اورنج جوس اور ٹشو پیپر تھا جس سے وہ بار بار تائی کا منہ صاف کر رہی تھی۔ حبیبہ کے ذہنی رو بہک کر پھر وہاں چلی گئی۔

جہاں اس کی ماں بے یارو مددگار بستر پر پڑی ایڑیاں رگڑ رہی تھی تو کیا اس کی ماں دنیا کی واحد گناہ گار عورت تھی، جسے اتنی سخت سزا کے عمل سے گزرنا پڑا یا شاید آخرت کے عذاب سے وہ پکڑ بہتر ہے، جو دنیا میں ہی ہو جائے کم از کم یہ احساس تو رہتا ہے کہ ہم اپنے اللہ کو یاد ہیں وہ ہمیں بھولا نہیں ورنہ ہماری رسی دراز کر دیتا۔

"تائی یہ حبیبہ ہے میری چھوٹی بہن۔"

اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مریم آپا نے اسے تائی کے سامنے لا کھڑا کیا۔

"ہاں میں پہچان گئی یہ ہو بہو زینب جیسی ہے سوائے ایک چیز کے۔" حبیبہ چونک گئی وہ جانے کیا کہنے والی تھیں۔

"اس کی آنکھیں بالکل اپنے باپ جیسی ہیں اللہ بخشے فرہاد کی آنکھیں بھی اتنی ہی خوب صورت تھیں۔ وہ مرد تھا اس لیے اس کی آنکھوں کا بھورا رنگ اتنا نمایاں نہ ہوتا تھا جتنا حبیبہ کا ہو رہا ہے۔"

تائی نے رک رک کر بمشکل اپنے الفاظ مکمل کیے فالج کے باعث ان کی بولنے کی صلاحیت خاصی متاثر ہوئی تھی جس کا اندازہ حبیبہ کو ابھی ابھی ہوا اس نے اپنا سر تائی کے سامنے جھکا دیا کیونکہ وہ اس وقت اس ماحول میں کچھ بھی کہنے کی صلاحیت شاید کھو چکی تھی اس کا ماضی اس پل اس کے بالکل ساتھ آن کھڑا ہوا تھا۔

"جیتی رہو اللہ نصیب اچھا کرے۔" تائی نے اپنا لرزتا ہاتھ اس کے سر پر رکھ کر دعا دی۔

"آمین۔"

آہستہ آواز میں کہتی وہ وہاں سے ہٹ گئی اس فنکشن میں اسے ایشال اور اریشہ نظر نہ آئے۔ مریم نے بتایا ان دونوں نے اپنے کسی دوست کے گھر انوائیٹ ہونے کے باعث یہاں آنے سے معذرت کر لی تھی، سالار انکل بھی خاصے لیٹ پہنچے۔ حبیبہ نے دیکھا وہ اور انکل صمد ایک دوسرے کے برابر بیٹھے آہستہ آہستہ جانے کیا گفتگو کر رہے تھے اسے محسوس ہوا جیسے اس گفتگو کا محور اس کی ذات ہو اس نے ایک دو بار جب بھی نگاہ اٹھا کر دیکھا انکل سالار کو اپنی طرف بھی متوجہ پایا۔

وہ کچھ الجھ گئی اسے سالار انکل کچھ پریشان دکھائی دیئے کیوں وہ جان نہ پائی۔ گھر واپسی میں بھی سالار انکل سارے راستے خاموش سے تھے ایک دو بار نازیہ آنٹی نے پوچھا مگر کوئی جواب نہ پا کر چپ کر گئیں۔

"کیا بکواس ہے یہ دماغ تو نہیں خراب ہو گیا اس کا۔"

شاہ زین کی تیز آواز سن کر وہ وہیں سیڑھیوں کے سرے پر رک گئی۔ نیچے لاؤنج میں نازیہ آنٹی اور سالار انکل کے ساتھ مریم اور شاہ زین بھی موجود تھے، اسے سمجھ نہیں آیا کہ نیچے ایسی کیا بات ہوئی ہے۔ جس نے شاہ زین کو اتنا چراغ پا کر دیا ہے کہ وہ اپنے بڑوں کا لحاظ بھی بھول بیٹھا۔

"پلیز شاہ زین آہستہ بولو وہ سن لے گی۔"

مریم آپا کی دھیمی آواز کان سے ٹکراتے ہی وہ سمجھ گئی کہ محور گفتگو اس کی اپنی ذات ہے وہ بے اختیار ہی تھوڑا سا پیچھے کی جانب ہو گئی تاکہ اس وقت کسی کی نگاہ اس پر نہ پڑے۔

"واشت۔"

شاہ زین کی قہر زدہ آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"وہ ہستی جس کی ذات کو ایک شخص نے محض اپنی انا کی تسکین کے لیے تماشا بنا دیا ہم یہ چاہتے ہیں کہ اسے بھی کچھ پتا نہ چلے حد ہے مریم آپا کیا آپ سمجھتی ہیں کہ یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ اسے اعتماد میں لیے بغیر ہی ہم سارے مسئلے کو حل کر دیں۔" وہ مریم آپا سے مخاطب تھا۔

"میرا کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہمیں پہلے ایشال کو سمجھانا چاہیے اسے قائل کرنا چاہیے تاکہ وہ ہماری بات مان سکے اگر ایسا نہ ہو تو پھر اگلے قدم کے طور پر حبیبہ کو سب کچھ بتانا پڑے گا تاکہ پتا چلے کہ وہ کیا چاہتی ہے۔"

"مجھے سب پتا ہے وہ کیا چاہتی ہے اسے ایشال سے خلع لینا ہے اور بس وہ وقت گزر گیا مریم آپا جب وہ "طلاق" جیسے لفظ کے خوف میں صرف اس لیے جکڑی ہوئی تھی کہ اس کی ماں کی تربیت پر حرف نہ آئے اب میری محبت نے اسے وہ اعتماد بخش دیا ہے کہ وہ برے حالات کا بخوبی مقابلہ کر سکتی ہے اس لیے میں نے سوچا ہے کہ کل کورٹ میں خلع کے کاغذ جمع کروا دیے جائیں مجھے امید ہے کہ میرے اس فیصلے پر آپ سب کو کوئی اعتراض نہ ہو گا۔"

سب کے سامنے شاہ زین کا اعتراف محبت اسے اعتماد بخش گیا۔

"تم جو کہہ رہے ہو بے شک وہ سب ٹھیک ہے بیٹا مگر خلع کی درخواست جمع کروا دینا ہمارے مسئلے کا حل نہیں ہے۔"

سالار انکل کو بولنا پڑا۔

"اگر ایشال نے کورٹ میں اگر حبیبہ سے صلح پر آمادگی ظاہر کی تو ہمیں اس کی بات سننا پڑے گی کوئی بھی عدالت ایک دم اپنا فیصلہ نہیں سناتی اور پھر عدالت میں جا کر ذلیل ہونے سے اچھا ہے کہ گھر کی بات گھر میں ہی ہو جائے۔"

"لیکن انکل جب میں اس سے صلح نہیں کرنا چاہتی جب میں اس سے طلاق چاہتی ہوں تو پھر زبردستی کیسی۔"

حبیبہ سے اب مزید برداشت نہ ہوا اور وہ سیڑھیاں اتر کر سب کے درمیان آگئی۔

"تم لوگ ابھی بچے ہو شرعی نزاکتوں کو نہیں سمجھتے۔"

سالار انکل دھیمی آواز میں بولے جبکہ نازیہ آنٹی بالکل خاموش بیٹھی کسی گہری سوچ میں گم تھیں۔

"مجھے ایک دفعہ ایشال سے بات کرنے دو اگر وہ آمادہ نہ ہوا تو پھر ہم کوئی اگلا قدم اٹھائیں گے۔"

☼ ☼ ☼

آج دس دن ہو گئے تھے فرہاد کو گئے ہوئے خرچے کے نام پر جو معمولی رقم وہ مجھے دے کر گیا تھا اس میں سے چند سو میرے پاس باقی بچے تھے حالانکہ میں بہت سوچ سمجھ کر پیسہ خرچ کر رہی تھی پھر بھی اس کے جاتے ہی جاذبہ کو بخار ہوا دو دن وہ ڈاکٹر کے پاس گئی اب حبیبہ کی طبیعت خراب تھی وہ دانت نکلنے کے عمل سے گزر رہی تھی میں نے دل ہی دل میں حساب لگایا ابھی شاید اس کے آنے میں مزید دس دن باقی تھے۔

"میرا خیال ہے کہ اماں کو فون کروں کہ وہ احسان کے ہاتھ کچھ رقم بھیج دیں۔"

دوسرے ہی پل میں نے دل میں آئے اسی خیال کو رد کر دیا مجھے عجیب سا لگا اگر احسان کی بیوی کو پتا چلا تو وہ کیا سوچے گی جو بھی ہے، مجھے ان ہی پیسوں میں گزارا کرنا ہے سادیہ بھی اپنی نند کے پاس گاؤں گئی ہوئی تھی ورنہ اتنا مسئلہ نہ ہوتا وہ تو اکثر ہی میرے کام آجایا کرتی تھی باوجود کوشش کے حبیبہ کا بخار رات میں تیز ہو گیا۔

اماں نے صبح فون کیا تھا کہ میں کچھ دن ان کی طرف رہ لوں مگر چونکہ مریم کے اسکول ٹیسٹ چل رہے تھے اس لیے میں نے معذرت کر لی مگر اس پل حبیبہ کی بگڑتی حالت دیکھ کر مجھے افسوس ہوا۔

کاش میں صبح ہی رکشہ کر کے اماں کی طرف چلی جاتی تو یہ مسئلہ نہ ہوتا اب رات کے اس پہر میں کس کے ساتھ

ڈاکٹر کے پاس جاؤں وہ بری طرح الٹیاں کر رہی تھی اگر اس کی یہ حالت کچھ دیر اور رہتی تو یقیناً "ڈی ہائیڈریشن" پانی کی کمی کا شکار ہو جاتی میں تیزی سے اندر کمرے میں آئی مریم بیڈ پر بیٹھی اپنے ٹیسٹ کی تیاری کر رہی تھی جبکہ جاذبہ سو گئی تھی۔

"کیا بات ہے اماں رو کیوں رہی ہیں۔"

شاید پریشانی کے سبب میری آنکھوں میں پانی آگیا تھا جو میری معصوم بیٹی کی نگاہوں سے چھپا نہ رہ سکا۔

"کچھ نہیں بیٹا تم اپنی پڑھائی کرو حبیبہ کی طبیعت بہت خراب ہے اور میں اسے لے کر ڈاکٹر کے پاس جا رہی ہوں۔"

اسے تسلی دے کر میں نے کپڑوں تلے دبا موبائل نکالا اور باہر صحن میں آگئی وجاہت کا نمبر ملایا دوسری بیل پر ہی اس نے فون ریسیو کر لیا۔

"خیریت ہے زینب اس وقت میں کیسے یاد آگیا۔"

میں کبھی بھی اتنی رات گئے وجاہت سے بات نہ کرتی تھی اس لیے میرا نمبر دیکھ کر اسے حیرت ہوئی جس کا اظہار کیے بنا وہ نہ رہ سکا۔

"حبیبہ کی طبیعت بہت خراب ہے اسے لے کر اسپتال جانا ہے۔"

"تم اسے لے کر مین روڈ کی طرف آؤ میں پانچ منٹ میں وہاں پہنچ جاؤں گا مریم اور جاذبہ اوپر فائزہ کے پاس چھوڑ دو۔"

میں کیا چاہتی تھی وہ ایک پل میں سمجھ گیا۔

"نہیں آج کل اس کا شوہر پاکستان آیا ہوا ہے اس لیے اچھا نہیں لگتا کہ اتنی رات گئے بچیاں اس کے گھر چھوڑوں میں باہر سے لاک کر کے اوپر فائزہ کو اطلاع کر دیتی ہوں کہ وہ دونوں گھر پر اکیلی ہیں۔"

جلدی جلدی یہ سب کہہ کر میں نے فون بند کیا مریم کو ساری ضروری ہدایات دیں' حبیبہ کو اچھی طرح کپڑے میں لپیٹا اس کے فالتو کپڑے ایک شاپر میں ڈالے اور گھر کے دروازے کے باہر سے تالا لگا کر میں اپنی گلی پار کر کے مین روڈ پر آگئی مجھے علم تھا وجاہت گاڑی لے کر کہاں کھڑا ہو گا جب تک میں وہاں پہنچی وجاہت کی سفید گاڑی دور سے ہی نظر آگئی دروازہ کھولے وہ باہر ہی کھڑا تھا میرے بیٹھتے ہی اس نے بنا کوئی بات پوچھے گاڑی اسٹارٹ کر دی اور پھر چند ہی منٹوں میں' ہم شہر کے ایک بہترین اسپتال میں تھے جہاں ایمرجنسی میں حبیبہ کو ایڈمٹ کر لیا گیا اس کی حالت بہت خراب تھی اگر مجھے آنے میں کچھ دیر ہو جاتی تو جانے کیا ہوتا' پانی کی کمی کو پورا کرنے کے لیے اسے ڈرپ لگا دی گئی۔

میں نے ٹائم دیکھا رات کے دو بج گئے تھے مریم اور جاذبہ گھر میں بالکل تنہا تھیں میرا دل ہول گیا' مگر کیا کرتی مجبوری تھی حبیبہ کو اس طرح چھوڑ کر میں گھر واپس نہیں جا سکتی تھی بمشکل میں نے دو گھنٹے اور گزارے اور پھر اماں کو فون کیا جانتی تھی کہ اس وقت وہ تہجد کے لیے اٹھی ہوں گی انہیں ساری بات بتائی سوائے اس کے کہ میں وجاہت کے ساتھ اسپتال آئی ہوں انہیں بتایا کہ مجھے فائزہ کا شوہر چھوڑ کر گیا ہے۔

"پلیز اماں آپ گھر چلی جائیں دونوں بچیاں رات سے تنہا ہیں۔"

ان کے پاس میرے گھر کی دوسری چابی موجود تھی اس لیے میں نے ان سے درخواست کی۔

"تمہیں مجھے رات ہی اطلاع دینی چاہیے تھی۔" وہ خفگی سے بولیں۔

"بہر حال ابھی میں احسان کے ساتھ جا رہی ہوں تم فکر مت کرو۔" ان کے اس جملے نے مجھے مطمئن کر دیا۔

"شکریہ اماں۔"

میں فون بند کر کے وجاہت کی سمت پلٹی جو نرس کی ہدایت کے مطابق میڈیکل اسٹور سے کچھ دوائیاں خرید کر

لایا تھا وہ رات سے میرے ساتھ تھا ورنہ میں تنہا عورت کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

"میں تمہارا شکریہ کس طرح ادا کروں وجاہت میرے پاس الفاظ نہیں ہیں تم ہمیشہ اس وقت میرے کام آتے ہو جب مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا ہوتا کہ میں کیا کروں۔"

میں نے تہ دل سے اسے خراج تحسین پیش کیا حالانکہ جانتی تھی کہ 'میرے الفاظ کم ہیں اس نے بنا کچھ کہے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر مجھے تسلی دی اور پھر نو بجے تک حبیبہ کی طبیعت کافی بہتر ہو گئی اور ہم اسے ڈسچارج کروا کر گھر لے آئے جہاں ایک نیا امتحان میرا منتظر کھڑا تھا۔

☼ ☼ ☼
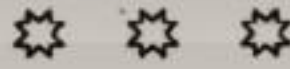
"تم نے کبھی ایسی مچھلی دیکھی ہے جسے زندہ پانی سے نکال کر کنارے پر ڈال دیا جائے اور اس کے پاس کھڑے لوگ اس کے تڑپنے کا منظر بڑی بے حسی سے دیکھ رہے ہوں۔"

اریشہ کے الفاظ حبیبہ کے حساس دل کو زخمی کر گئے اس نے نظر اٹھا کر سامنے کھڑی اس لڑکی کو دیکھا جس کی وجہ سے اس نے جانے کتنی راتیں رو رو کر گزاری تھیں جس کے ہونے سے اس کی زندگی کے کئی سال ویران کیے پھر بھی اسے اس لڑکی سے کوئی شکوہ نہ تھا۔ وہ تو پچھتائی تھی اس وقت کو جب اس نے ایشال کے اپنے سامنے آنے کی دعا کی تھی کبھی وہ چاہتی تھی کہ ایشال صرف ایک بار اسے دیکھے اور پھر تاعمر اپنے فیصلے پر پچھتائے مگر آج نہیں آج تو وقت بہت بدل گیا تھا۔

"سوتن تو پتھر کی بھی بہت اذیت دیتی ہے اور تم تو ایک جیتا جاگتا وجود ہو' حبیبہ تم شاید اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ تمہارا ہونا میرے لیے کتنی تکلیف کا باعث بن رہا ہے۔"

حبیبہ نے دیکھا یہ اریشہ اس لڑکی سے بہت مختلف تھی جسے پہلی بار اس نے نازیہ آنٹی کے گھر دیکھا تھا یہ تو کوئی اور ہی لڑکی تھی پیلی رنگت' روکھے بال' میک اپ سے عاری چہرہ' بنا کسی وجہ کے وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

"تمہاری تکلیف کا اندازہ مجھ سے زیادہ بہتر شاید کوئی نہیں لگا سکتا اریشہ وہ اذیت جو تم پچھلے چھ دنوں سے بھگت رہی ہو' میں نے پورے دس سال جھیلی ہے۔ سو چو تم چھ دنوں میں تھک گئیں' ہار گئیں اور میں تن تنہا دس سالوں میں بھی تھک کر چور نہ ہوئی شاید اس لیے کہ تمہیں ایشال سے محبت تھی اور اس کے بدلنے نے تمہیں تکلیف دی ورنہ حق ملکیت تو اس پر میرا بھی اتنا ہی تھا جتنا آج تمہارا ہے۔ اگر وہ تمہارا شوہر ہے تو نکاح میں تو میں بھی اس کے تھی پھر تم نے کس طرح اس سے شادی کر لی' کیوں نہ سوچا کہ اگر کبھی زندگی میں وہ میرے سامنے آگیا تو کیا ہو گا۔"

اس کے سوال کا اریشہ کے پاس کوئی جواب نہ تھا وہ خاموش کھڑی اپنی انگلیاں مڑورتی رہی۔

"تم نے اپنی زندگی کی شروعات ریت کے محل سے کی تھی جو تیز چلتی ہوا کے سامنے کبھی نہیں ٹھہرپاتا۔ تمہیں چاہیے تھا اس کا نام اپنے ساتھ لگانے سے پہلے قانونی اور شرعی طور پر مجھے اس سے الگ کرتیں مگر تم نے ایسا نہ کیا۔ تمہیں شاید خود پر بہت اعتماد تھا' ایشال کی محبت پر بھروسا تھا تم بہت بیوقوف تھیں اریشہ ایسے مرد کی محبت کبھی قابل اعتبار نہیں ہوتی' جو رشتوں کی نزاکتوں کو نہیں سمجھتا تم اس کے لیے صرف اس لیے اہم تھیں کہ تم اس کے قریب تھیں۔ مجھ سے فرار کے لیے اس نے تمہارا سہارا لیا اور آج تم سے فرار کے لیے وہ بے اولادی کا سہارا لے رہا ہے ٹھیک کہہ رہی ہوں نا میں۔"

سینے پر دونوں ہاتھ باندھے وہ بڑے پراعتماد انداز میں کھڑی اریشہ سے جواب طلب کر رہی تھی اور اریشہ جو اسے جانے کیا کیا سنانے کا سوچ کر گھر سے نکلی تھی اب بالکل گونگی ہو گئی حبیبہ کی باتوں نے اسے آئینہ دکھا دیا اس کے

تمام الفاظ کہیں گم ہوگئے۔

"بہرحال تم فکر نہ کرو مجھے ایشال کے ساتھ نہیں رہنا وہ کچھ بھی کرلے طلاق میرا قانونی حق ہے جو میں اس سے لے کر رہوں گی اس لیے تمہیں مجھ سے گھبرانے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"مجھے تمہارا پتا ہے حبیبہ تمہاری زندگی میں اب ایشال کی کوئی اہمیت نہیں رہی مسئلہ تو صرف ایشال کا ہے جو اپنے ضدی طبیعت کے باعث ہمیشہ وہ کرنا چاہتا ہے جس سے اسے روکا جائے۔"

وہ بیوی تھی اس لیے ایشال کی فطرت سے واقف تھی۔ "صمد انکل سے میری بات ہوگئی ہے ان کے کہنے کے مطابق میں نے آج ہی کورٹ میں خلع کی درخواست جمع کروائی ہے مجھے امید ہے ان شاء اللہ فیصلہ بہت جلد میرے حق میں ہوگا۔"

حبیبہ نے نہ چاہتے ہوئے بھی اریشہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے سمجھایا وہ شکوہ جو کبھی اسے اریشہ سے تھا آج خود بخود دور ہوگیا اور اس نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ وہ ایشال کی پہلی بیوی نہیں تھی ورنہ وہ اسے اریشہ کی خاطر بہت پہلے ہی چھوڑ چکا ہوتا چھوڑا تو اس نے اب بھی تھا' مگر اس چھوڑنے کے بعد جو تکلیف وہ اٹھا رہا تھا دوسری صورت میں یہ زندگی بھر کا روگ حبیبہ کا نصیب بن جاتا۔

✡ ✡ ✡
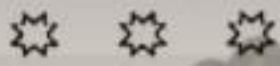
"جانے تم کیسے بھائی ہو جو صرف مجھے نیچا دکھانے کے لیے حبیبہ کو بھکا رہے ہو۔"

وہ ابھی ابھی آفس آکر بیٹھا ہی تھا جب زوردار آواز کے ساتھ دروازہ کھول کر ایشال اندر داخل ہوا اس کے ہاتھ میں دبا کاغذ دیکھ کر شاہ زین ساری صورت حال سمجھ گیا 'یقیناً' اسے آج ہی کورٹ کی طرف سے خلع کا نوٹس ملا تھا جس نے اسے آپے سے باہر کردیا۔

"السلام وعلیکم بھائی آپ بیٹھیں تو سہی۔"

شاہ زین اس کے غصہ کو قطعی نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔

"میں یہاں بیٹھنے نہیں آیا مجھے بتاؤ یہ سب کیا ہے؟" ہاتھ میں پکڑا کاغذ کا ٹکڑا اس نے شاہ زین کی ٹیبل پر پٹخا۔

"آپ نے پڑھا نہیں......"

اس نے خاصا ریلیکس ہوتے ہوئے اپنی ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی۔

"پڑھا ہے اس لیے ہی تم سے پوچھ رہا ہوں اگر' حبیبہ نے مجھ سے خلع لینا تھا تو اس وقت کیوں نہ لیا جب میں نے اسے تنہا چھوڑ کر اریشہ سے شادی کی۔ اتنے سال اس نے میرے نام پر بیٹھ کر گزار دیے جب بھی پاپا یا انکل نے اسے طلاق لے کر شادی کے لیے کہا اس نے منع کردیا' پھر اب ایسا کیا ہوا کہ جب میں نے اسے اپنانا چاہا اور وہ مجھے چھوڑنے پر تیار ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے شاہ زین اس کے پیچھے تم کھڑے ہو تم اس کی محبت میں گرفتار ہو کر یہ بھی بھول گئے ہو کہ اس کا تم سے رشتہ کیا ہے؟"

حبیبہ اس کی ملکیت تھی یہ احساس ایشال کے لہجہ میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا جس کا اندازہ اس کے الفاظ سن کر بخوبی لگایا جاسکتا تھا۔

"ایک منٹ بھائی مجھ پر اتنے الزام لگانے سے پہلے آپ صرف اپنے ہی کہے ہوئے الفاظ پر غور کریں تو شاید آپ کی سمجھ میں سب کچھ آجائے۔"

شاہ زین نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روکا۔

"آپ نے ابھی کچھ دیر پہلے خود ہی کہا کہ جب وہ تنہا تھی تب اس نے آپ کو نہیں چھوڑا تو بات صرف اتنی ہے

کہ اب وہ تنہا نہیں ہے۔ تنہا عورت مرد کو چھوڑتے ہوئے شاید ڈرتی ہے کہ 'دنیا کیا کہے گی' مگر وہ عورت جس کے آس پاس سارے رشتے موجود ہوں۔ جو اسے سپورٹ کر رہے ہوں وہ عورت کسی ایسے مرد کے نام پر اپنی زندگی برباد نہیں کر سکتی جو کبھی اس کا تھا ہی نہیں' آپ شاید بھول گئے وہ آپ کی بیوی نہیں صرف منکوحہ ہے بہت فرق ہوتا ہے ایک بیوی اور منکوحہ میں اور منکوحہ بھی ایسی جس کی دس سالوں میں آپ نے کوئی ذمہ داری پوری نہیں کی جبکہ 'آپ کے نکاح میں آنے کے بعد آپ اس کے نان نفقہ کے ذمہ دار تھے' پھر آپ نے یہ کیوں نہ سوچا کہ آپ کے چھوڑنے کے بعد وہ کہاں جائے گی۔ کبھی اتنے سالوں میں آپ نے یہ سوچا کہ وہ کن حالوں میں اپنی زندگی گزار رہی ہے۔ نہیں نا۔"

شاہ زین سانس لینے کے لیے رکا' اتنی گفتگو میں بھی اسے ایشال کے چہرے پر کوئی شرمندگی نظر نہیں آئی جس سے یہ احساس ہوا کہ اس پر شاہ زین کی باتوں کا کوئی اثر ہوا ہے۔

"جب آپ نے اس کے بارے میں یہ سب نہیں سوچا تو اب آپ یہ کیوں چاہ رہے ہیں کہ وہ آپ کی فکر کرے۔"

"مجھے پتا تھا کہ پاپا اس کی کفالت کر رہے ہیں اب چاہے نان نفقہ میں پورا کرتا یا میرا باپ بات ایک ہی تھی۔"

اس نے ڈھٹائی سے ٹانگ پر ٹانگ دھرتے ہوئے جواب دیا۔

"معاف کیجیے گا آپ کو شاید علم نہیں فرہاد انکل کے گھر کی جگہ آج جو بلڈنگ تعمیر ہے اس کا کرایہ ان تینوں بہنوں کا قانونی حق ہے اس میں جتنا حصہ مریم اور جاذبیہ آپا کا تھا اتنا ہی حبیبہ کا ہی تھا اور وہ ہی پیسہ حبیبہ کی ذات پر خرچ ہوا ہم میں سے کسی نے اس پر کوئی احسان نہیں کیا۔"

شاہ زین نے اس کی ساری غلط فہمی دور کرنا چاہی۔

"مجھے ان تمام باتوں سے کوئی سروکار نہیں ہے میرا مقصد صرف اتنا ہے کہ میں حبیبہ کو طلاق نہیں دے رہا اور تم بجائے اپنے مفاد کی خاطر ہمیں جدا کروانے کے بہتر ہے کہ اس سے صلح میں میری مدد کرو کیوں کہ سننے میں آیا ہے وہ تمہاری بات بہت مانتی ہے۔"

"وہ عاقل و بالغ لڑکی ہے اور اپنی زندگی کے لیے وہ ہی فیصلہ کرے گی جو اس کا دماغ اسے اجازت دے گا۔"

شاہ زین نے حتمی لہجہ میں بات ختم کرنا چاہی۔

"بہرحال کوئی بھی شرعی قانون مجھے دو شادیوں سے نہیں روک سکتا وہ بھی اس صورت میں جب میں اولاد کا خواہش مند ہوں اس لیے بہتر ہے کہ تم اس مسئلے سے دور رہو۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا لیکن جاتے جاتے شاہ زین کو تنبیہہ کرنا نہ بھولا۔ اس کے باہر نکلتے ہی شاہ زین مسکرا دیا وہ بے شک اس کا سگا بھائی تھا دونوں کا خون ایک ہی تھا مگر شاید تربیت میں فرق تھا اس کی تربیت نازیہ جیسی عورت کی گود میں ہوئی جو ایک حساس دل کی مالک تھی جب کہ صباحت کے لہجہ میں ایک خاندانی فخر و غرور اسے ہمیشہ جھلکتا نظر آیا وہ ہی فخر و غرور اسے ابھی ابھی ایشال کے اندر بھی دکھائی دیا۔

☼ ☼ ☼
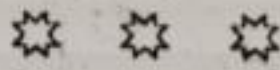
"فرہاد کا فون آیا تھا۔"

میں نے حبیبہ کو دوا کھلا کر فارغ ہوئی تھی کہ اماں نے اطلاع دی۔

"اچھا۔"

میں مختصر جواب دے کر واش روم گئی تاکہ ہاتھ منہ دھو کر اماں کو ناشتا دے سکوں کیوں کہ گیارہ بج گئے تھے اور

انہوں نے ابھی تک کچھ نہیں کھایا تھا۔
"کیا کہہ رہا تھا فرہاد۔"
میں تولیہ سے منہ پونچھ کر ان کی طرف متوجہ ہوئی۔
"اعتراض کر رہا تھا کہ تم نے اسے حبیبہ کی طبیعت کی خرابی کا نہیں بتایا اور یہ کہ تم فضہ بھابھی کو فون کرتیں اور ان کے ساتھ اسپتال جاتیں! بیٹا وہ تو بہت ناراض ہو رہا تھا کہ اس طرح کسی غیر کے ساتھ اسپتال جاتے کی کیا ضرورت تھی۔"
"آپ نے ناشتا کیا ہے؟"
میں نے ان کی بات درمیان سے ہی کاٹ کر سوال کیا۔
"ہاں چائے بنا کر پی تھی اب تم کھانا ہی بنالو مجھے ناشتے کی حاجت نہیں ہے۔"
اماں کا بجھا ہوا لہجہ اس بات کا گواہ تھا کہ فرہاد نے میرے اسپتال جانے کا سن کر اماں کو بہت کچھ سنا دیا ہے۔
"اچھا ہے ان کو بھی پتا چلے کہ ان کا داماد کس قابل ہے۔" یہ سوچتی ہوئی میں کچن میں آگئی تاکہ مریم اور جاذبہ کے لیے کچھ بنا سکوں۔

☆ ☆ ☆
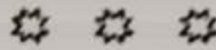
"میرا تم سے ملنا بہت ضروری ہے حبیبہ۔"
فون کے دوسری طرف موجود ایشال کا لہجہ ملتجی تھا۔
"آپ کو مجھ سے جو بھی بات کرنی ہو پلیز کورٹ میں کریں اور ویسے بھی میں آپ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔" حبیبہ نے دو ٹوک لہجہ میں جواب دیا۔
"دیکھو حبیبہ جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ اور اب بھول کر مجھ سے صلح کر لو یقین جانو تمہیں اب مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"
"مجھے سمجھ نہیں آتا ایشال آپ کس قسم کے مرد ہیں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی وہ تلخ ہوگئی۔
"وہ اریشہ جس کی خاطر آپ ساری دنیا چھوڑنے کو تیار تھے آج اس اریشہ کے بہتے آنسو آپ کو دکھائی نہیں دے رہے آپ اس سب کو نظر انداز کر کے مجھ سے دس سالہ پرانا ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑنے پر بضد ہیں' لیکن جو رشتہ ٹوٹ رہا ہے وہ آپ کو دکھائی نہیں دے رہا۔"
"میں اریشہ سے کوئی رشتہ نہیں توڑ رہا وہ میرے لیے آج بھی وہی اریشہ ہے جو دس سال قبل تھی اور سوچو ذرا اگر اس سے شادی کرتے سے تم سے میرا رشتہ ختم نہ ہوا تھا تو اب اس سے کوئی رشتہ کیسے ختم ہو سکتا ہے۔"
شاہ زین نے صحیح اندازہ لگایا تھا ایشال اس معاملے میں خاصا ڈھیٹ ثابت ہوا تھا اس سے بات کر کے حبیبہ کو جلد ہی یہ علم ہو گیا کہ اسے شاید شاہ زین سے ضد ہو گئی ہے اور وہ صرف یہ چاہ رہا ہے کہ کسی طرح اسے شاہ زین سے جدا کر دیا جائے وہ ایسا کیوں چاہ رہا تھا حبیبہ سمجھ نہ پائی۔
"جو بھی ہے ایشال یہ طے ہے کہ میرا تم سے کوئی بھی رشتہ اس دن ہی ختم ہو گیا تھا جب تم نے اریشہ کی محبت میں مجھے ٹھکرایا تھا اور ختم ہونے والے رشتے دوبارہ اس وقت تک استوار نہیں ہوتے جب تک دونوں فریقین رضامند نہ ہوں اور مجھے کبھی بھی کسی بھی حال میں اب تمہارا ساتھ نہیں چاہیے یہ میرا آخری اور حتمی فیصلہ ہے اور اس سلسلے میں کوئی بھی مجھے مجبور نہیں کر سکتا نہ تم' نہ عدالت' نہ ہی انکل' کوئی اور خدا حافظ۔ تمہارے لیے بہتر ہو گا کہ آئندہ مجھ سے اس طرح بات کرنے کی کوشش نہ کرنا اب تمہیں جو بھی کہنا ہو وہ عدالت میں ہی کہنا۔"

"ایک منٹ حبیبہ فون بند مت کرنا۔"

اس سے قبل کہ وہ فون بند کرتی ایشال بول اٹھا۔

"دیکھو حبیبہ میں تمہیں طلاق دے دوں گا لیکن میری ایک شرط ہے تم مجھ سے ایک دفعہ مل لو صرف ایک دفعہ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔" وہ یہ سب کیوں چاہ رہا تھا حبیبہ سمجھ نہ پائی۔

"بہت مشکل ہے ایشال میں آپ سے نہیں مل سکتی۔" اس کے ساتھ ہی اس نے فون بند کر دیا۔

زندگی غم کا ساگر بھی ہے
ڈوب کے اس پار جانا پڑے گا

ایشال کئی دیر تک ہاتھ میں سیل لے کر اسے گھورتا رہا اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ فون کے دوسری طرف وہ حبیبہ تھی جس نے اس کے نام پر اپنی پوری زندگی گزار دینے کا فیصلہ کیا تھا اور یہ بات وہ کئی بار اپنی ماں سے سن چکا تھا اب حبیبہ وہ نہیں تھی یہ حبیبہ اس کے ساتھ ایک پل بھی نہیں رہ سکتی تھی وقت شاید بہت بدل گیا تھا۔

"عزت اسی میں ہے کہ میں خود اسے طلاق دے دوں۔"

یہ فیصلہ کرتے ہی وہ مطمئن ہو گیا۔

(آئندہ ماہ آخری قسط ملاحظہ فرمائیں)

☼ ☼

عزہ خالد

چھوٹی سی کہانی

کل سے کشف نے رونا دھونا مچایا ہوا تھا ہوا کچھ یوں تھا کہ ایک ماہ پہلے کشف عادل صاحبہ نے ملک کی معروف مصنفہ بننے کی ٹھانتے ہوئے ایک عدد شاہکار افسانہ تخلیق کیا تھا اور مشہور و معروف میگزین کے دفتر بھیجا تھا۔ آج میگزین کے دفتر فون کرنے پر معلوم ہوا کہ انہیں تو ابھی تک وہ شاہکار موصول ہی نہیں ہوا تھا۔

کشف حیران پریشان رہ گئی تھی ایک ماہ ہو گیا تھا اور وہ افسانہ اب تک میگزین کے دفتر نہیں پہنچا تھا اگر وہ پیدل بھی افسانے لے کر جاتی تو ایک دن میں پہنچ جاتی آرام سے۔ بس یہ سننا تھا کہ کشف دھاڑیں مار مار کر روئی اور بقول حنان کے وہ بستر سے لگ گئی ہے۔

کمرے کا دروزہ کھلا تھا حنان کے ساتھ باسط کمرے میں داخل ہوا تھا کشف پر نظر پڑی تھی وہ صوفے سے ٹیک لگائے نیچے کارپٹ پر بیٹھی تھی اور ارد گرد ڈھیروں ٹشو پڑے تھے اور سامنے ٹشو کا ڈبا رکھا تھا۔

باسط اور حنان اپنی ہنسی چھپاتے ہوئے اس کے پاس بیٹھ گئے تھے۔

"بہت افسوس ہوا بہن۔۔۔ میں تمہارے افسانے کی عیادت بلکہ تعزیت کے لیے آیا ہوں۔" باسط نے آنکھوں پر ہاتھ پھیر کر نادیدہ آنسو صاف کیے اور لہجے کو زبردستی دکھی بنانے کی کوشش کی۔

کشف نے ٹشو سے اپنی آنکھیں اور ناک صاف کرتے ہوئے ایک طرف پھینکا اور کھا جانے والی نظروں سے باسط کو گھورا۔

"بکواس مت کرو۔ میں تمہارا سر پھاڑ دوں گی۔"

"توبہ یار حنان۔۔۔ بھلائی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔ میں اس سے ہمدردی کر رہا ہوں اور یہ مجھ پر غصہ ہو رہی ہے۔ خیر چھوڑو یہ بتاؤ کیا نام تھا مرحوم افسانے کا؟"

"دیا جلائے رکھنا ہے" کشف کے بجائے حنان نے جواب دیا تھا۔

"اوہ۔ تم دکھی مت ہو، ہم ہر جمعرات کی جمعرات کرماں والی سرکار کے مزار پر دیا جلانے چلا کریں گے۔۔۔ اس سے تمہارا غم غلط ہوگا۔" باسط نے مسکراتے ہوئے کہا تو کشف نے شہادت کی انگلی اٹھاتے ہوئے اسے خبردار کرنا چاہا۔

"تم۔۔۔" دونوں کے قہقہے بلند ہوئے تو کشف نے ان دونوں کے مارنے کے لیے کچھ ڈھونڈنا چاہا کچھ نہ ملا تو صوفے سے کشن اٹھا کر ان دونوں کو دے مارے۔

"ویسے تمہارا افسانہ گیا کہاں۔۔؟" اریبہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا تھا۔

"مجھے کیا پتا۔ ویسے مجھے لگتا ہے پوسٹ آفس والوں نے اڑا لیا ہوگا۔"

"ہاں بھئی تم تو بانو قدسیہ اور اشفاق احمد کی صاحبزادی ہو نا۔ تمہارے لکھے کے پیچھے ایک دنیا پاگل ہے۔" حنان نے مذاق اڑایا تھا۔

"حنان اگر تمہیں اپنی زندگی عزیز ہے تو چپ۔۔۔" کشف نے اسے ٹوکنا چاہا تھا پر وہ دوبارہ شروع ہو چکا تھا۔

"حد ہو گئی۔ ایک افسانے کے پیچھے اتنا پاگل ہونے

کی کیا ضروت ہے، ہمیں معلوم ہے تم نے کیا تیر مارے ہوں گے رج کے بونگیاں ماری ہوں گی۔ جتنی تم افلاطون، ارسطو ہو ہمیں معلوم ہے۔"

کشف کو اور کچھ سمجھ نہ آیا تو پیر پٹختے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

دو تین دن گزرے کشف کا دکھ کسی حد تک کم ہو گیا تھا، پر وہ اب بھی حیران تھی کہ آخر افسانہ گیا کہاں؟

آیئے ذرا ایک ماہ پیچھے چلتے ہیں کہ ہوا کیا تھا۔

حنان کو پاس آؤٹ ہوئے چھ ماہ ہوئے تھے اور وہ آج کل جاب کے لیے تگ و دو کر رہا تھا اپنے دوست عاصم کے توسط سے اس کی معزز سے بات ہوئی جو ایک فرم میں بہت اچھے عہدے پر فائز تھے انہوں نے حنان کو اپنی سی وی اور ڈاکومنٹس بھیجنے کا کہا تھا کہ اگر حنان کے مطلب کی کوئی جاب ہوتی تو وہ خود اس سے کانٹیکٹ کرے گا۔ ان ہی دنوں کشف صاحبہ کو لکھنے کا شوق ہوا تھا اور وہ ایک عدد افسانہ لکھنے میں کامیاب ہو گئی تھی حنان کو سی وی پوسٹ کروانی تھی اور کشف کو افسانہ۔ کشف صاحبہ نے ایک عدد سنگین غلطی

کر ڈالی سی وی والے لفافے پر میگزین کا ایڈریس لکھ دیا اور افسانے پر معیز کا ایڈریس۔

جس افسانے کی یاد میں کشف صبح و شام آٹھ آٹھ آنسو بہا رہی تھی اسے پڑھ کر معیز عباس ہنس ہنس کر بے حال ہو چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ بڑے انہماک سے ناول پڑھ رہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل سے موبائل اٹھایا جو کافی دیر سے بج رہا تھا۔ کال ریسیو کرتے ہوئے فون کان سے لگاتے ہوئے "ہیلو" کہا۔

"السلام علیکم۔۔۔ آپ کشف بات کر رہی ہیں؟"

دوسری طرف سے آتی اجنبی آواز پر اس نے فوراً موبائل فون کی اسکرین دیکھی جہاں اجنبی نمبر جگمگا رہا تھا۔

"آپ کون؟"

"میں معیز بات کر رہا ہوں۔"

"آپ معیز ہوں یا عزیز، میں آپ کو نہیں جانتی۔"

"آپ کا افسانہ میرے پاس ہے۔" معیز کی بات سن کر کشف کے حلق سے چیخ برآمد ہوئی۔

"کیا! آپ کے پاس کیسے پہنچا؟ آپ یقیناً کوئی بڑے چور ہیں جو میگزین بھیجی جانے والی ڈاک چوری کرواتے ہیں اور پھر اسے اپنے نام سے بھیج کر مشہور ہوتے ہیں۔" کشف معیز کو بولنے کا موقع دیا بغیر شروع ہو چکی تھی۔

معیز پہلے تو حیران ہوا تھا پر اس انوکھے الزام پر اس کی ہنسی چھوٹ گئی تھی۔

"دیکھا! چور ایسے ہی ہنستے ہیں۔ ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری۔" کشف کی بات پر معیز نے بڑی مشکلوں سے اپنی ہنسی روکی تھی۔

"دیکھیے محترمہ مجھے خود نہیں معلوم کہ آپ کا افسانہ مجھ تک کیسے پہنچا۔ میں خود حیران ہوں کہ آپ نے مجھے کیوں بھیجا۔"

"میرا دماغ خراب ہے، جو میں آپ کو بھیجوں گی۔"

"اب یہ تو مجھے نہیں معلوم۔"

"کیا؟" کشف نے حیرت سے پوچھا تھا۔

"یہی کہ آپ کا دماغ۔۔۔" معیز نے قصداً بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"میرا دماغ خراب ہے یا نہیں۔ پر آپ کا دماغ میں ضرور درست کر دوں گی۔ آپ کی خیریت اسی میں ہے کہ میرا افسانہ مجھے واپس کر دیجیے۔"

"اوکے میڈم۔ اور کوئی حکم؟"

"نہیں" کشف نے قصداً کال ڈسکنیکٹ کر دی تھی۔

اس بات کو ایک ہفتہ ہو گیا تھا نہ تو افسانہ آیا تھا نہ اس اجنبی نے دوبارہ رابطہ کیا تھا۔

کشف اریبہ کے مشورے پر رائٹر بننے کے خواب اور اس افسانے پر قل پڑھنے کے بعد اپنی زندگی میں مصروف ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

امی کسی عزیز کی عیادت کے لیے گئیں تو کشف نے اریبہ کو فون کر کے بلوا لیا تھا اور اب اس کے ساتھ بیٹھی کسی ناول پر تبصرے میں مصروف تھیں کہ مین گیٹ زور سے بجایا گیا تو وہ گیٹ کھولنے چل دی۔

گیٹ کھولا تو سامنے ایک خوب صورت اور اسٹائلش سی خاتون کھڑی تھی جس کی عمر تیس سے پینتیس سال تک لگ رہی تھی۔ "جی فرمائیے۔"

"ہماری گاڑی یہاں خراب ہو گئی ہے مجھے پانی پینا تھا۔" کشف نے راستہ دینے کے بجائے گیٹ سے باہر جھانک کر دیکھا تھا کچھ فاصلے پر گاڑی کا بونٹ کھولے ایک شخص کھڑا دکھائی دیا تھا کشف نے ایک بار پھر اس لڑکی کا جائزہ لیا تھا اور پھر اسے لے کر ڈرائنگ روم میں آ گئی تھی۔

"آپ بیٹھیں میں آپ کے لیے پانی لے کر آتی ہوں۔" اریبہ کو اچھی طرح سمجھا کر اس کے پاس بیٹھا گئی تھی کہ اس لڑکی پر نظر رکھے آج کل چور ڈاکوؤں

نے واردات کے نت نئے طریقے اپنا لیے ہیں۔

کشف جب پانی کا گلاس لے کر آئی تو ریبہ کو اس اجنبی لڑکی سے خوش گپیوں میں مصروف دیکھ کر اس نے سوچا تھا ایسی ہی بے وقوف لڑکیاں ہوتی ہیں جو دن دیہاڑے گھروں میں ڈکیتیاں کروا دیتی ہیں۔

"میرا نام ثمو ہے اور آپ کا؟" پانی پینے کے بعد اس نے گلاس واپس ٹیبل پر رکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"یہ کشف ہے اور میں اریبہ۔" کشف سے پہلے ہی اریبہ بول پڑی تھی کشف نے اریبہ کو گھورا تھا۔

"آپ لوگوں سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔" ثمو نے واپسی کے لیے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔

"میں اب چلتی ہوں' میرے ہزبینڈ میرا انتظار کررہے ہوں گے۔" وہ دونوں اسے گیٹ تک چھوڑنے آئی تھیں اریبہ حق میزبانی نبھانے کے خاطر۔ جب کہ کشف کو یقین تھا کہ اس کے تھیلے نما بیگ سے کسی بھی لمحے پسٹل برآمد ہو سکتی ہے۔ پر ایسا کچھ نہیں ہوا تھا وہ جب گیٹ سے باہر آئی تو اس کا شوہر گاڑی میں بیٹھا اس کا انتظار کررہا تھا وہ ان دونوں سے ہاتھ ملا کر گاڑی کی طرف بڑھ گئی تھی۔

ثمو کو گئے ہوئے تین دن ہی ہوئے تھے کہ وہ اپنی والدہ کے ہمراہ دوبارہ آگئی تھی کشف کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے بھائی کا رشتہ لے کر آئی ہے۔ کشف کے والدین کو لڑکا بہت پسند آیا تھا چٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ ہوا تھا۔

کشف عادل رائٹر تو نہ بن سکی تھی البتہ دلہن بن گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"یہ آپ کی امانت۔" معیز نے جو پیکٹ اس کی طرف بڑھایا تھا اسے دیکھ کر کشف کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔

"یہ۔ یہ آپ کے پاس کہاں سے آیا؟"

"یہ آپ نے مجھے بھیج دیا تھا شاید غلطی سے۔"

"آپ وہ فون والے حضرت ہیں۔" کشف تو اس کا نام بھی بھول گئی ابھی بھی سوالیہ نظروں سے معیز کو دیکھ رہی تھی۔

معیز نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

"بس تمہاری لکھی کہانی پڑھ کر اور تم سے بات کر کے مجھے لگا مجھے ایسی ہی خوش مزاج لڑکی کی تلاش تھی۔"

"پر آپ نے مجھے دیکھا نہیں تھا اگر میں کالی' موٹی اور بھینگی ہوتی تو؟"

"یہی جاننے کے لیے ثمو کی خدمات حاصل کیں۔" معیز نے مسکراتے ہوئے بتایا تو کشف کی حیرت میں مزید اضافہ ہوا اس دن ثمو کی آمد پلان کے تحت ہوئی تھی۔

"ہائے میرا رائٹر بننے کا خواب۔" افسانے پر نظر پڑتے ہی کشف کا دل دکھ کی اتھاہ گہرائیوں میں جا گرا تھا۔

"تم فکر مت کرو تمہاری کہانی کو میں کتابی شکل میں پبلش کروادوں گا۔" معیز نے اسے تسلی دینی چاہی تھی پر دوسری طرف کشف کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا تھا۔

"پانچ۔ چھ صفحوں کی کتاب۔ یہ ایک ایسی کتاب ہو گی۔ جس میں صرف پانچ چھ صفحے ہوں گے۔ پر سوچنے کی بات یہ ہے یہ کتاب پڑھے گا کون۔ مجھے تو کوئی جانتا ہی نہیں۔" کشف نے مصنوعی آہ بھرتے ہوئے کہا تھا۔

"میں... میں ہوں نا۔ تم لکھتی رہنا میں پڑھتا رہوں گا۔"

"ریئلی۔؟" معیز نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

کشف اس عجیب و غریب اتفاق پر ہی حیران تھی کہ دو تین دن بعد حنان کو اس مشہور و معروف میگزین کے دفتر سے انٹرویو کال آگئی تھی۔

حنان نے جب اپنی حیرت کا اظہار کیا تو کشف نے اسے ساری صورت حال بتائی تھی۔

اور بتانے کے بعد ہنس ہنس کر بے حال ہو گئی تھی حنان کی حالت بھی اس سے مختلف نہ تھی۔

نے واردات کے نت نئے طریقے اپنا لیے ہیں۔

کشف جب پانی کا گلاس لے کر آئی تو ریبہ کو اس اجنبی لڑکی سے خوش گپیوں میں مصروف دیکھ کر اس نے سوچا تھا ایسی ہی بے وقوف لڑکیاں ہوتی ہیں، جو دن دیہاڑے گھروں میں ڈکیتیاں کروادیتی ہیں۔

"میرا نام ثمو ہے اور آپ کا؟" پانی پینے کے بعد اس نے گلاس واپس ٹیبل پر رکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"یہ کشف ہے اور میں اریبہ۔" کشف سے پہلے ہی اریبہ بول پڑی تھی کشف نے اریبہ کو گھورا تھا۔

"آپ لوگوں سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔" ثمو نے واپسی کے لیے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔

"میں اب چلتی ہوں، میرے ہزبینڈ میرا انتظار کررہے ہوں گے۔" وہ دونوں اسے گیٹ تک چھوڑنے آئی تھیں اریبہ حق میزبانی نبھانے کے خاطر۔ جب کہ کشف کو یقین تھا کہ اس کے تھیلے نما بیگ سے کسی بھی لمحے پسٹل برآمد ہوسکتی ہے۔ پر ایسا کچھ نہیں ہوا تھا وہ جب گیٹ سے باہر آئی تو اس کا شوہر گاڑی میں بیٹھا اس کا انتظار کررہا تھا وہ ان دونوں سے ہاتھ ملا کر گاڑی کی طرف بڑھ گئی تھی۔

ثمو کو گئے ہوئے تین دن ہی ہوئے تھے کہ وہ اپنی والدہ کے ہمراہ دوبارہ آگئی تھی کشف کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے بھائی کا رشتہ لے کر آئی ہے۔ کشف کے والدین کو لڑکا بہت پسند آیا تھا چٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ ہوا تھا۔

کشف عادل رائٹر تو نہ بن سکی تھی البتہ دلہن بن گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"یہ آپ کی امانت۔" معیز نے جو پیکٹ اس کی طرف بڑھایا تھا اسے دیکھ کر کشف کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔

"یہ۔ یہ آپ کے پاس کہاں سے آیا؟"

"یہ آپ نے مجھے بھیج دیا تھا شاید غلطی سے۔"

"آپ وہ فون والے حضرت ہیں۔" کشف تو اس کا نام بھی بھول گئی ابھی بھی سوالیہ نظروں سے معیز کو دیکھ رہی تھی۔

معیز نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلادیا تھا۔

"بس تمہاری لکھی کہانی پڑھ کر اور تم سے بات کر کے مجھے لگا مجھے ایسی ہی خوش مزاج لڑکی کی تلاش تھی۔"

"پر آپ نے مجھے دیکھا نہیں تھا اگر میں کالی، موٹی اور بھینگی ہوتی تو؟"

"یہی جاننے کے لیے ثمو کی خدمات حاصل کیں۔" معیز نے مسکراتے ہوئے بتایا تو کشف کی حیرت میں مزید اضافہ ہوا اس دن ثمو کی آمد پلان کے تحت ہوئی تھی۔

"ہائے میرا رائٹر بننے کا خواب۔" افسانے پر نظر پڑتے ہی کشف کا دل دکھ کی اتھاہ گہرائیوں میں جا گرا تھا۔

"تم فکر مت کرو تمہاری کہانی کو میں کتابی شکل میں پبلش کروادوں گا۔" معیز نے اسے تسلی دینی چاہی تھی پر دوسری طرف کشف کا ہنس ہنس کر برا حال ہوگیا تھا۔

"پانچ چھ صفحوں کی کتاب۔ یہ ایک ایسی کتاب ہوگی جس میں صرف پانچ چھ صفحے ہوں گے۔ پر سوچنے کی بات یہ ہے یہ کتاب پڑھے گا کون۔ مجھے تو کوئی جانتا ہی نہیں۔" کشف نے مصنوعی آہ بھرتے ہوئے کہا تھا۔

"میں... میں ہوں نا۔ تم لکھتی رہنا میں پڑھتا رہوں گا۔"

"رئیلی۔؟" معیز نے اثبات میں سر ہلادیا تھا۔

کشف اس عجیب وغریب اتفاق پر ہی حیران تھی کہ دو تین دن بعد حنان کو اس مشہور و معروف میگزین کے دفتر سے انٹرویو کال آگئی تھی۔

حنان نے جب اپنی حیرت کا اظہار کیا تو کشف نے اسے ساری صورت حال بتائی تھی۔

اور بتانے کے بعد ہنس ہنس کر بے حال ہوگئی تھی حنان کی حالت بھی اس سے مختلف نہ تھی۔

فائزہ افتخار

دوسری قسط 2

ام ہانی کے تلووں کے نیچے جیسے انگارے بھرے ہوئے تھے زمین پہ لگا ہی نہیں پا رہی تھی بس نہیں چل رہا تھا کہ اڑتی ہوئی بند دروازے کے اس پار پہنچ کے سعد سے اس کی ناراضی کا سبب پوچھ لے۔ حالانکہ پوچھنا کیا... جانتی تو وہ تھی مگر پوچھتی... جواب سنتی ... تب ہی منانے اور وضاحت دینے کی نوبت آتی نا ... مگر پھر اس کے چلتے چلتے پیر تھم گئے۔

اس کے اور بند دروازے کے بیچ مہ پارہ پھوپھو کھڑی اسے خشمگیں نظروں سے گھور رہی تھیں۔

"یہ وقت ہے تمہارے گھر لوٹنے کا؟"

ہمیشہ کی طرح ان کے سرد الفاظ سے زیادہ ان کے برفیلی نظروں نے اسے حواس باختہ کر دیا۔

"جی وہ پھوپھو پتا نہیں کیسے دیر ہو گئی دھیان ہی نہیں رہا۔"

نظریں جواب دینے کے دوران بھی ان کے پیچھے والے بند دروازے پہ دستک دے رہی تھیں۔

"دھیان قابو میں رکھا کرو بی بی۔ اتنی اوسان خطا کرنے اور آپے سے باہر ہونے کی ضرورت نہیں ہے فاختاؤں کو زیادہ اونچی اڑان بھرنا راس نہیں آتی۔ ایک بلندی پہ جانے کے بعد وہ اندھی ہو جاتی ہیں۔"

"جی؟"

اس کی حیران نظروں میں مزید ہراس پیدا ہوا۔

"ولایت جانے کے خیال سے ہی تو اڑی پھر رہی ہو۔ بھابھی نے بھی چھوٹ دے رکھی ہے۔ یہ سوچے بنا کہ ابھی صرف ذکر چھیڑا ہے بات بنی نہیں ہے۔ چار دن گھومنے پھرنے اور موج مستی کرنے کے بعد وہ ٹکا سا جواب دے کر چلا گیا تو ہونہہ۔"

زہر اگلنے کے بعد وہ سر جھٹکتی ہوئی ام ہانی کو اسی حیرت کے سمندر میں ڈبکیاں کھاتا چھوڑ کے آگے بڑھ گئیں۔ ام ہانی ایک غوطہ کھا کے نکلی جھرجھری سی لی اور ان کے پیچھے لپکی۔

"پھوپھو... پھوپھو ایک منٹ۔" اور ان کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"کیسا جواب' پلیز کھل کے بتائیں مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ آپ... آپ کہہ کیا رہی ہیں؟"

"اوہو... اتنی ہی بھولی ہو ناں تم۔ اسی لیے آگے پیچھے گھوم رہی ہو اپنے اس کزن کے 'دل لبھا رہی ہو اس کا کہ تمہاری خالہ نے رشتہ جو ڈال دیا ہے مگر لڑکی یہ ولایت پلٹ لڑکے ہیں ماں کے کہنے پر نہیں کرتے زندگی کے فیصلے' ہاں گھومنا پھرنا الگ بات ہے..."

اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور سوال کرتی مہ پارہ یہ جا وہ جا۔

کتنی ہی دیر سکتے کے عالم میں کھڑے رہنے کے بعد ام ہانی ہوش میں آئی اور ان الجھے ہوئے طنز میں ڈوبے سوالوں کے جواب لینے نائلہ کے پاس پہنچی جو الگ الجھی ہوئی تھیں پہلے ہی سے۔

ایک تو سعد کا بے وقت بنا بتائے آ جانا' پھر آتے ہی کمرے میں بند ہو جانا' اس پہ رضوان کا اس کی گوشمالی کے لیے اسے طلب کرنا اور پھر یہ گھر داری کے بکھیڑے' وہ رانی کے سر پر سوار اسے دوپہر کے کھانے

ناولٹ

کے لیے ہدایت بھی دے رہی تھیں کہ ایک تو دلوا جی کو
کھانا پورے ساڑھے بارہ چاہیے ہوتا ہے 'دوسرا
مہمان بھی موجود تھا گھر میں 'مگر دھیان تھا کہ گول
کمرے میں اٹکا تھا جہاں رضوان بے چینی سے چکر
کاٹتے سعد کے انتظار میں تھے اور لو پر سے ام ہانی نے
مزید انہیں حواس باختہ کر دیا۔

"پلیز بتائیے ناں بڑی امی۔"

"ایک تو یہ مہ پارہ۔" پلاؤ کا بگھار بھونتے انہیں جی
بھر کے نند پہ تاؤ آیا۔

"بہت جلدی ہوتی ہے اسے ہر کام کی اب بھلا کوئی
تک ہے اس بے ڈھنگے انداز میں بتانے کی۔"

"مطلب۔۔وہ۔۔وہ۔۔سچ کہہ رہی ہیں۔"

"ہاں۔۔۔ میں بھی تمہیں آج رات بتانے ہی والی
تھی مگر ذرا سلیقے سبھاؤ سے۔۔۔ ایسے نہیں کہ گھما کے
سر پہ دے ماری بات۔"

لونگیں گن کے ڈالتے ہوئے وہ ناگوار سے کہنے
لگیں جبکہ ام ہانی رونے والی ہو گئی۔

"مگر۔۔۔ مگر۔۔۔ وہ تو مگر کیوں؟"

نائلہ اب کیا کیا فکر پالتیں اس کے آنسوؤں سے
ڈبڈبائی آنکھیں دیکھتیں 'مہ پارہ سے دو دو ہاتھ کرنے
جاتیں یا سعد کی مدد کو پہنچتیں 'جو وہاں باپ کے سامنے
سر جھکائے ان کا غضب سہہ رہا تھا یا پھر اس پلاؤ کے
چو چلے اٹھاتیں آخر ممتا جیت گئی۔

"رضوان پتا نہیں کب سے سعد کی کلاس لے
رہے ہیں 'مجھے تو فکر ہو رہی ہے ارے بچہ ہے 'دل
گھبرا گیا ہو گا نئی جگہ پہ۔۔۔ آگیا۔۔۔ اب کیا اس پہ
عدالت لگے گی؟ تم ذرا یہ پلاؤ دیکھنا میں ہو کے آؤں۔"

وہ چلی گئیں یہ دیکھے بغیر کہ ام ہانی ان کے پلاؤ کو
دیکھنے کے لائق بھی ہے اس وقت یا نہیں۔

☆ ☆ ☆

میں بے حس و حرکت سر جھکائے کھڑا تھا۔ ابو کی
آواز چاروں جانب گونج ضرور رہی تھی مگر میری
سماعتوں کو جھنجوڑنے میں ناکام تھی میں کچھ دیکھ رہا تھا
تو صرف اس کے نام کے ساتھ لکھا کسی اور کا نام۔۔۔
میں کچھ سن رہا تھا تو اس کی وہ کھنکتی ہنسی جو میرے لیے
نہیں کسی اور کے لیے تھی۔

"تمہیں کچھ عقل ہے یا نہیں؟ کب بڑے
ہو گے۔۔۔ تیسرے ہی دن ہاسٹل سے منہ اٹھا کے گھر
چلے آئے عجیب بچکانا پن ہے۔ میں کیا پوچھ رہا ہوں تم
سے سعد؟ آخر تم نے پڑھنا ہے کہ نہیں۔"

"کیا ہو گیا ہے آپ کو رضوان؟"

امی کے مدد کے لیے پہنچنے پہ بھی میں نے نظر اٹھا
کے دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔

"ایک دن کے لیے گھر چلا بھی آیا تو ایسا کونسا فرق پڑ
گیا پڑھائی پہ؟"

امی کی انگلیاں میرے ماتھے پہ پڑے بالوں کو محبت
سے سلجھا رہی تھیں میں پھر بھی پتھر بنا رہا۔

"نائلہ تم خاموش رہو مجھے اس سے پوچھنے دو۔"

"مجھ سے پوچھیں۔۔۔ میں نے بلایا ہے اسے اب
ماں کے کہنے پہ بھاگا آیا تو ڈانٹ بھی کھائے الٹا۔۔۔ واہ۔"

امی نے ہمیشہ کی طرح یہ بھی اپنے سر پہ لے لیا اور
میں نے ایک بار بھی انہیں ممنون نظر سے نہ دیکھا۔

"تم نے؟ حد ہوتی ہے نائلہ تم اپنی ممتا کو کنٹرول
میں رکھو ورنہ اکلوتا بیٹا نکما رہ جائے گا۔"

اور ہمیشہ کی طرح اس بار بھی میرے بے حد چاہنے
والے امی ابو میں کوئی تلخی کوئی چپقلش کوئی گرما گرم
بحث ہوئی تو وجہ میں ہی تھا۔

ان الفاظ میں کچھ تھا۔۔۔ جس نے میرے پتھر وجود
میں اچانک دراڑیں ڈالیں اور میں سر اٹھا کے امی کو
دیکھنے پہ مجبور ہو گیا۔

"آپ تو جانتے ہی ہیں وہ سعد سے ہی زیادہ قریب
ہے 'اس سے ہی دل کی بات کرتی ہے میں نے سوچا
جنید کے بارے میں اس کی رائے اور مرضی میں سعد
کے ذریعے ہی پوچھ لوں۔"

"رائے۔۔۔؟ مرضی؟"

میرے دل و دماغ میں یہ لفظ ٹن ٹن کر کے خطرے
کی گھنٹی کی طرح بجنے لگے۔

"عورتیں بہت جلد باز ہوتی ہیں۔ تمہیں ابھی سے یہ فکر ہو گئی۔ ابو ابھی تک جھنجلا رہے تھے اور امی ان کی جھنجلاہٹ کے جواب میں، جو وضاحتیں دے رہی تھیں ان سے میں جھنجلا رہا تھا۔

"جلد بازی کرنی پڑتی ہے رضوان۔ ہانی کی خالہ کا فون آیا تھا جنید نے بتا دیا ہے انہیں کہ اسے لڑکی پسند ہے ہم نے بھی تو اب کوئی جواب دینا ہے۔"

اس سے زیادہ سننے کی مجھ میں نہ ہمت تھی' نہ ضرورت رہی تھی اب میں تیزی سے مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے جانے لگا۔ ابو کے مزید خراب ہوتے مزاج کی پروا کیے بغیر' جواب میری شکایت لگا رہے تھے۔

"دیکھی تم نے اس کی بدتمیزی؟ پوچھے بغیر چلا گیا۔"

میرا رخ سیدھا کھنڈر کی جانب تھا اور میری توقع کے عین مطابق وہ وہاں مجھ سے پہلے موجود تھی۔ مگر جو وہ کر رہی تھی وہ ضرور خلاف توقع تھا ایک کوئلہ ہاتھ میں لیے وہ دیوار پہ لکھے اپنے اور جنید کے نام پہ سیاہی پھیر رہی تھی۔ میں چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا۔ کبھی کبھی جس کی ہم نے توقع بھی نہیں کی ہوتی وہ ہو جائے یا ہو رہا ہو تو احساس ہوتا ہے کہ' توقع نہ کرنے کے باوجود ہمارے دل کے اندر کہیں اس کے ہو جانے کی خواہش کتنی شدید ہوتی ہے۔

ام ہانی ہاتھ جھاڑتی ہوئی مڑی۔

"بس؟ اب خوش اسی پہ ناراض تھے ناں؟ اس وجہ سے منہ پھلائے پھر رہے تھے کل سے۔"

"جب تمہیں پتا تھا میں ناراض ہو جاؤں گا تو ایسا کیا ہی کیوں؟"

"میں کیوں کروں گی؟ پاگل ہوں کیا؟ جنید نے لکھا تھا۔"

"یعنی وہ پاگل ہے؟" میں جل اٹھا۔

"میں نے منع کیا تھا اسے سعد۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ' تمہیں اس جگہ سے کتنی محبت ہے۔ ان دیواروں سے ان اینٹوں سے' اس کنویں سے' یہاں کے چپے چپے سے تم نے کبھی یہاں پہ رینوویشن بھی نہیں ہونے دی تو تم کسی اور کا نام ان دیواروں پہ کیسے برداشت کر سکتے ہو۔"

وہ اتنے قریب آ کے اتنے نرم لہجے میں مجھے موم کر رہی تھی کہ میں پگھل گیا۔ موم نے پگھلنا ہی ہوتا ہے۔

"صرف دیواروں پہ؟" مگر میرے اس سوال کو شاید اس نے کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔

"اچھا۔۔۔ اب جانے دو غصہ یہ بتاؤ اچانک کیسے آئے؟"

"کیوں' رنگ میں بھنگ ڈال دیا میں نے؟"

موم پگھل بھی جائے تو کچھ دیر سلگ کے دھواں تو دیتا ہے۔ وہی دھواں میں اب تک اگل رہا تھا۔

"کس قسم کی باتیں کر رہے ہو۔ ایک تو تمہارا کچھ پتا نہیں چلتا کہ کب کس بات پہ ناراض ہو جاؤ اور مجھ سے تو تمہیں خاص دشمنی ہے کہ ذرا ذرا بات پہ نخرے دکھاتے ہو۔"

"تم سے دشمنی نہیں۔" میں چلتے چلتے رکا اور اپنی دھڑکنیں لمحہ بھر کو سمیٹ کر ہمت کر کے کہہ دیا ہے۔

"تم سے محبت ہے اور جن سے محبت ہو ان ہی سے ناراض بھی ہوتے ہیں۔"

کہنے کو تو کہہ ڈالا پھر بری طرح ڈر گیا بھلا یہ بھی کوئی یوں منہ پھاڑ کے کہنے والی بات تھی چلتے چلتے اور اس نے برا مان لیا تو؟ مگر نہیں وہ تو مسکرادی تھی۔

"اچھا؟ اور یہ جو میں تمہارے پیچھے پیچھے تمہاری منتیں کرتی پھرتی ہوں تمہاری فضول بے کار ناراضیوں پہ تمہیں مناتی رہتی ہوں۔ یہ بھی میری محبت ہی ہے ورنہ اتنی پروا نہیں کی کبھی میں نے کسی کی۔"

"سچ...؟"

"اور نہیں تو کیا... بدھو۔"

وہ چہرے پہ آئی لٹ کو کان کے پیچھے کرتی... مہندی کی باڑ پہ ہاتھ پھیرتی لاپروائی سے چلتی جارہی تھی۔

"سنو... یہ کیوں آیا ہے؟" اس کی لاپروائی پل بھر کے لیے ڈگمگائی' ٹالتے ہوئے کہنے لگی۔

"بس ایسے ہی گھومنے۔"

"جانتا ہوں میں اچھا؟ بتاؤ مت مجھے۔" مجھے پھر سے بگڑتا دیکھ کے وہ رکی اور ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔

"مگر میں نہیں جانتی تھی یقین کرو ابھی پتا چلا۔"

"اس کی ہمت کیسے ہوئی' رکھ کے دو لگانی تھیں اسے۔" میرے پاس تو ہر بات کا ایک ہی حل تھا رکھ کے دو لگانا۔

"پاگل ہو تم۔ ایسا تھوڑا ہی کرسکتی تھی میں۔"

"میں لگاؤں جا کے؟ ابھی روتا روتا واپس بھاگے گا۔"

"خبردار جو کوئی فضول حرکت کی تو۔"

ام ہانی نے آنکھیں نکال کے مجھے رعب میں لینا چاہا۔

"کیوں؟ بہت اچھا لگ رہا ہے کیا شادی کرلوگی اس سے؟" مجھے خود بھی محسوس ہو رہا تھا کہ میری زبان سے الفاظ نہیں۔ انگارے نکل رہے ہوں۔

"نہیں کرنا چاہتی' مگر کروں گی یا نہیں یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ سعد مجھ سے میری مرضی کون پوچھ رہا ہے۔"

اس کی بے بسی مجھ سے دیکھی نہ گئی... میں اس کے ہاتھ تھام کے بے ساختہ کہہ اٹھا۔

"میرے لیے بہت اہم ہے تمہاری مرضی میں پوچھ رہا ہوں۔"

"تمہیں بتانے کی ضرورت ہے کیا' تم نہیں جانتے؟"

چند لمحے خاموشی سے مجھے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے وہ سوال کیا جو میرے اندر کئی کھڑکیاں کھول گیا۔

"میں یہاں سے نہیں جانا چاہتی سعد... بالکل بھی نہیں۔" اور ان کھلی کھڑکیوں سے آتی تازہ ہوا نے مجھے اندر تک ٹھنڈا کردیا۔

"اور تم یہاں سے کبھی کہیں جاؤگی بھی نہیں' میں جانے ہی نہیں دوں گا۔ دیکھ لوں گا سب کو۔"

اس کے ہاتھ دبا کے میں نے یقین دلایا۔

☼ ☼ ☼
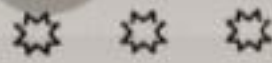
امی نے ابو کو نجانے کون سی تسلیاں دی تھیں کہ' اب ان کا موڈ قدرے بہتر تھا اور وہ کھانے کے دوران مجھ پہ شعلے برساتی نظروں سے دیکھنے سے گریز کر رہے تھے لیکن میں جانتا تھا یہ وقتی ہے۔ جو کرنے کی میں نے ٹھان لی تھی۔ اس کے بعد یہ شعلے صرف نگاہوں سے نہیں برسنے تھے۔

"ام ہانی میری خواہش تو یہ تھی کہ تمہاری گریجویشن مکمل ہوتے ہی تمہارے فرض سے آزاد ہو جاتی' مگر تمہارا الجھنگ کا شوق خیر اب تو ایک سال میں تم نے یہ شوق بھی پورا کرلیا۔"

امی کی تمہید سے ام ہانی کو اندازہ ہوگیا تھا کہ کیا ذکر چھڑنے والا ہے وہ بے چین نظر آنے لگی۔

"اور ہمارے نہ سہی تمہارے تو خاندان کا ہے۔ تمہاری سگی خالہ ہیں وہ میرے اطمینان کے لیے اتنا کافی ہے۔"

ابو نے اضافہ کیا۔ میں نے ہاتھ میں پکڑا چمچہ واپس پلیٹ میں رکھ کے سب کے چہروں پہ ایک گہری نظر ڈالی۔

"میں خود بہت مطمئن ہوں اچھا لڑکا ہے شریف خوش مزاج، خوبرو اور سب سے بڑھ کے اپنا۔" امی کی بات پہ میں نے پلیٹ پرے کھسکائی۔

"مگر میں مطمئن نہیں ہوں۔" ایک لمحے کے لیے تو سب حیران رہ گئے۔ لاتعلقی سے کباب چٹنی میں بھگو بھگو کے کھاتی مہ پارہ پھوپھو بھی۔

"تمہارا مطمئن ہونا... یا نہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا سعد، یہ ام ہانی کا معاملہ ہے اور ہم اسی سے بات کر رہے ہیں۔" ابو پرانے موڈ میں آنے لگے۔

"بالکل یہ ام ہانی کا معاملہ ہے اس کی زندگی کا آپ ایسے یکطرفہ فیصلے کیسے کر سکتے ہیں۔"

پھوپھو نے بڑی جتاتی ہوئی سی نظر امی پہ ڈالی جس کا مفہوم بھانپ کے وہ بھی جز بز ہو گئیں۔

"ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا ہم ام ہانی سے ڈسکس کر رہے ہیں۔"

"نہیں امی آپ اسے بتا رہی ہیں کہ "آپ سب کی یہی مرضی ہے اور اسے ہر حال میں جواب ہاں میں دینا ہے۔"

"سعد خاموش اب تم حد سے بڑھ رہے ہو۔"

ابو کھڑے ہو گئے میں نے بھی نشست چھوڑ دی ام ہانی دم سادھے ہراساں نظروں سے سب کو دیکھ رہی تھی۔

"یہ حد پار کر نہیں رہا بھائی جان۔ اس سے کروائی جا رہی ہے۔" پھوپھو نے ام ہانی کو گھور کے کہا اس کا رنگ مزید فق کیا۔

"میں آپ سے صاف کہہ رہا ہوں۔ یہ خیال دل سے نکال دیں کہ آپ لوگ اپنی مرضی سے جو فیصلہ کریں گے۔ ہنی کو اسے ماننا ہو گا۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔"

وارننگ دیتا میں وہاں سے نکل گیا۔ یہ دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی کہ اب وہاں اس بات کو کیا کیا رنگ

دیے جائیں گے۔ ماحول کو مزید بھڑکانے میں مہ پارہ پھوپھو پیش پیش تھیں۔

"کیا غلط کر دیا ہم نے؟ کیا یہ لڑکی ہماری ذمے داری نہیں؟ اور کیا اس کے ماں باپ زندہ ہوتے تو اس کے لیے یہ فیصلہ خود نہ لیتے؟ مگر اس لڑکی نے تو ہمیں کبھی کچھ سمجھا ہی نہیں۔ اتنی خود مختاری اور خود سری؟"

"مہ پارہ۔۔۔ تم ہانی پہ کیوں بگڑ رہی ہو۔ اس نے تو کچھ نہیں کہا یہ تو سعد ہی دن بدن۔۔۔"

"بھائی جان تو آپ کا خیال ہے سعد یہ سب بدتمیزی بلاوجہ کر کے گیا ہے؟ اس نے ہمیشہ کی طرح سعد کے کاندھے پہ رکھ کے بندوق چلائی ہے۔ ذرا سے بچے کو اس کے ماں باپ کے مقابلے پہ تن کے کھڑا کر دیا اور اب خود معصوم بنی بیٹھی ہے۔"

ام ہانی کے آنسو ٹپ ٹپ کر کے اس کی گود میں رکھے ہاتھوں پہ گر رہے تھے۔

"اور بھابھی آپ کیوں رو رہی ہیں اب؟ میں تو ہمیشہ سے کہتی آئی ہوں نہ موقع دیں اسے سعد کو ہتھیار بنانے کا۔" ان کے بھڑکانے پہ وہ اور بھی شدت سے رو دیں۔

"تم نے ہمیشہ اپنے اور میرے درمیان فاصلے رکھے ہانی۔ تم آئیں تو مجھے لگا میری زندگی میں بیٹی کی کمی پوری ہو جائے گی۔ مگر تم نے مجھے ماں تو کیا کچھ بھی نہ سمجھا کچھ نہیں کہا کچھ نہیں مانگا کوئی فرمائش کوئی ضرورت کوئی شکایت کچھ بھی نہیں۔"

"نائلہ تم بات کو کس طرف لے کر جا رہی ہو۔"

"اب بھی یہی ہوا ہے رضوان اگر اسے اس رشتے پہ کوئی اعتراض تھا تو بیٹی بن کے مجھ سے کہتی مجھ پہ اعتبار کرتی۔ لیکن اس نے سعد کے ذریعے بات پہنچائی۔"

ام ہانی کے دل کو ان آنسوؤں بھرے مان بھرے گلے سے بڑی ٹھیس پہنچی وہ اٹھ کے ان کی جانب آئی۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ کے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"ایسا کچھ نہیں ہے تائی اماں۔۔۔ میں نے کبھی کوئی فاصلہ نہیں رکھا۔ سچ تو یہ ہے کہ فرمائش یا شکایت کی نوبت ہی نہیں آنے دی آپ نے کبھی میری ہر ضرورت ماں کی طرح بن کہے پوری کی اور میں سچ کہہ رہی ہوں میں نے سعد سے بالکل نہیں کہا کہ وہ آپ سے یہ بات کرے۔ ہاں میں یہ شادی نہیں کرنا چاہتی کیونکہ میں اس ملک سے باہر نہیں جانا چاہتی تھی' جہاں میرے اماں ابا کی یادیں ہیں۔ بس آپ سے کہنے میں جھجک رہی تھی۔"

محبت سے کہتے اس نے ان کی گود میں سر رکھ دیا تو وہ پسیج گئیں اور اسی محبت سے جھک کے اس کا ماتھا چوم لیا جو مہ پارہ کو مزید سلگانے کے لیے کافی تھا۔

"تو سعد سے دکھڑا تو رویا ہو گا جو وہ اتنی سرکشی دکھا کے گیا ہے جیسے وہی تمہاری والی وارث ہو۔"

"مہ پارہ بات کو بڑھاؤ مت۔ سعد عمر کے اس حصے میں ہے جہاں اپنے بڑے ہونے کا احساس ہونے لگتا ہے۔ وہ گھر کے اہم معاملات میں دخل دے کر ہمیں اپنے ہونے کا احساس دلا رہا ہے اور بس۔۔۔"

"رضوان ٹھیک کہہ رہے ہیں اور پھر وہ ہانی سے اٹیچ بھی بہت ہے اس کے اتنے دور جانے کے خیال سے جذباتی ہو گیا ہو گا۔"

"تو ٹھیک ہے۔ اس کی ضد کی خاطر اسے بھی بٹھائے رکھیں حویلی میں ایک سے بھلی دو۔"

اور اسی ساری بحث اور ہنگامے سے دور میں جنید کا ہاتھ تھامے اسے گھسیٹتے ہوئے کھنڈر کی جانب لے جا رہا تھا۔ وہ حیران پریشان' ناگواری سے خود کو چھڑاتا پوچھتا جا رہا تھا۔

"سنو! کیا تم پاگل ہو گئے ہو۔"

اور گھسیٹتا جا رہا تھا۔۔۔ گھسٹتا جا رہا تھا اور پوچھتا جا رہا تھا۔

"مجھے کچھ نہیں پتا آخر تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔"

میں نے سیدھا اسے وہیں لا کے کھڑا کیا' جہاں اس نے ام ہانی کے نام کے ساتھ اپنا نام لکھنے کی جسارت کی تھی۔ اب وہاں پھیلی ہوئی سیاہی کے علاوہ کچھ نہیں تھا جس پہ نظر پڑتے ہی وہ چپ ہو گیا۔

"تمہیں جواب چاہیے تھا ناں ۔۔۔ یہ ہے جواب۔"

"یہ کیا حرکت ہے۔ تمہارا یہ بچکانا رویہ میری سمجھ سے باہر ہے۔" اس کی بات پہ میں طنز سے مسکرایا۔

"تمہیں لگتا ہے یہ حرکت میں نے کی ہے۔۔۔ جا کے دیکھو جنید کو تلے کی یہ سیاہی اتنی گہری ہوتی ہے کہ دھونے کے باوجود ابھی تک ہنی کے ہاتھوں سے گئی نہیں ہوگی۔"

"اوہ۔"

سمجھ دار تھا سمجھ گیا وہ بھی جو میں نے بتایا وہ بھی جو میں نے نہیں بتایا۔۔۔ میں نہیں جانتا اس نے اپنی ماں کو ۔۔۔ ہنی کی خالہ کو کیا کہہ کر مطمئن کیا بس اتنا پتا ہے کہ اگلے دو گھنٹوں کے اندر اندر وہ یہاں سے چلا گیا اور تیسرے گھنٹے میں اس کی ماما نے بڑے شرمسار انداز میں فون پہ ماما سے معذرت کرلی۔

☆ ☆ ☆

وہ گیلے بالوں کے ساتھ برآمدے میں بچھے تخت پر نیم دراز کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ شام کے سائے گہرے ہوتے ہی خنکی بڑھ جاتی ہے تو اس نے شال بھی اوڑھ رکھی تھی۔ میں ایک فاتحانہ سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھتا وہیں رک گیا۔

بس اتنی سی بات تھی۔۔۔ صرف تین گھنٹے۔۔۔ تین گھنٹوں کے اندر اندر میں اپنے اور اس کے درمیان آنے والے کسی بھی شخص کو بھگا سکتا ہوں۔

"سچ سچ بتاؤ سعد تم نے کیا کہا تھا اسے کہ وہ یوں چلا گیا۔" مجھ پہ نظر پڑتے ہی وہ پوچھنے لگی۔

"لاحول پڑھی تھی میں نے صرف۔" میں اس کے ساتھ ہی تخت پہ نیم دراز ہو گیا۔

"سعد وہ مہمان تھا۔"

اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے میں نے اس کی شال کا کونا گھسیٹا۔

"ادھر دو مجھے بھی۔۔۔ سردی لگ رہی ہے۔"

"تو اندر چلے جاؤ ناں۔۔۔ سردی لگ رہی ہے تو۔"

"نہیں۔۔۔ میں نے تخت پر نیم دراز ہو کر آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے بالوں کی مہکی مہکی ٹھنڈک مجھ پہ غنودگی طاری کر رہی تھی۔

"سعد تم کیوں کرتے ہو ایسا۔۔۔ سب پریشان ہوتے ہیں اور پھوپھو کو لگتا ہے میں تمہیں بگاڑ رہی ہوں۔"

میں نے نیند سے بوجھل آنکھیں ذرا سی کھول کے اسے دیکھا۔۔۔ شام کے اس پہر وہ کتنی سرمئی سی لگ رہی تھی۔

"تمہارے بالوں کی خوشبو سے مجھے نیند کیوں آتی ہے؟"

"میں کیا کہہ رہی ہوں تم سے اور تم۔"

"کیا میں ہمیشہ تمہاری شال میں سو سکتا ہوں؟"

"اف بدھو۔"

"اچھا۔۔۔ بس آج۔"

نیند میں ڈوبنے سے پہلے بس اس کی مسکراہٹ دیکھی تھی میں نے اور کانوں میں گونجی دور سے آتی بانسری کی دھن مدھر لے۔

☆ ☆ ☆

میرا کام پورا ہو گیا تھا ابو کا اگلا لیکچر میں نے ایک پر سکون اور ڈھیٹ سی مسکراہٹ کے ساتھ سنا اور واپس ہاسٹل چلا آیا۔

"یعنی تمہاری چھٹی حس نے تمہیں بالکل صحیح سگنل دیا تھا اور تم وقت پہ پہنچ گئے تھے۔"

شعیب نے رات کے کھانے کے بعد مال روڈ پہ میرے ساتھ ٹہلتے ہوئے ہنس کے کہا تھا۔

"اس کے بارے میں میرا دل کبھی غلط سگنل دے ہی نہیں سکتا۔"

"اس بار تو نیا ڈوبنے سے بچالی بیٹا۔ ہر بار ایسا نہیں ہوگا۔ تم اسے بتا کیوں نہیں دیتے؟"

"اسے پتا ہے۔" میرے اطمینان کا وہی عالم تھا۔

"مجھے یہ ہی پتا ہے کہ وہ بھی مجھے چاہتی ہے۔ جتنا میں اسے چاہتا ہوں اس سے بھی زیادہ۔"

"تو ر کلوٹ کیا ہے یار۔۔۔ بات کرو گھر میں قصہ ختم کر

"رکلوث ہے ناں یار... میری عمر... ابھی انیس کا ہوں... ابھی یہ بات کی ناں تو ابو کے لیکچرز کو ایک نیا رخ مل جائے گا... مگر یار وقت گزرتے کیا دیر لگتی ہے۔ پتا ہی نہیں چلے گا اور ایک کے بعد دوسرا سال گزرے گا۔ دوسرے کے بعد تیسرا۔ اکیس 'بائیس کا ہو جاؤں گا۔ ایجوکیشن بھی کمپلیٹ ہو جائے تو امی سے کہہ دوں گا کہ ہنی سے میری شادی کروا دیں سمپل۔"

میں ساری پلاننگ اسے بتا رہا تھا اور وہ محظوظ ہونے والی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھ رہا تھا۔

"اور کیا میں نے سب سوچ رکھا ہے۔"

"زندگی کو سوچنا بہت آسان ہے سعد... اور سوچ ہی سوچ میں زندگی بھی بہت آسان لگتی ہے لیکن میرے دوست... زندگی کو دھوبی پٹخا دینا بڑا زبردست آتا ہے۔"

"دھوبی پٹخا؟"

"ہاں... زندگی کو پسند ہے... سرپرائز دینا اور کبھی کبھی شاک دینا سوبی ریپیوڈ۔"

اور دور کہیں زندگی مجھے سرپرائز بلکہ شاک دینے کے لیے تیاریاں کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼
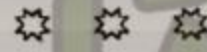
پیپل کا وہ درخت اس سرکاری دفتر کے سال خوردہ پلستر جھڑی عمارت کے سامنے ذرا سے فاصلے پہ تھا... جس کی گھنی شاخیں دور تک پھیلی نیچے کو جھک آئی تھیں۔ اور اسی ایک تنومند سی شاخ پہ ہلکے بادامی کرتا پاجامے میں ام ہانی اپنی اسکیچ بک پہ پنسل پھیرنے میں مصروف تھی۔

گاہے گاہے نظر اٹھا کے اس عمارت کو دیکھتی۔ جو گزشتہ کئی سالوں سے ویران پڑی تھی۔ اس کے عکس کو ورق پہ اتارتے ہوئے وہ اتنی مگن تھی کہ 'اپنے آسمانی دوپٹے تک کو سنبھالنے کا ہوش نہ تھا جو ہوا سے پھڑپھڑا رہا تھا۔ فضا میں ہوا کی ہلکی سی سرسراہٹ تھی۔

یا کورے کاغذ پہ پنسل کی... یا پھر پنسل کو تھامے ہاتھ کی حرکت سے گنگنا اٹھنے والی کانچ کی چوڑیوں کی اور پھر ایک اور آواز... کسی گاڑی کے زور سے بجتے ہارن کی کرخت آواز... جس پہ ام ہانی کا انہماک ٹوٹا۔

ایک ہاتھ سے اڑتے دوپٹے کو سنبھالتے اس نے بے زاری بھری نظر سامنے ڈالی... اسی عمارت کے سامنے رکی سرکاری نمبر پلیٹ والی گاڑی سے سالار اعظم دو تین لوگوں کے ہمراہ اتر رہا تھا۔

ام ہانی کی نظروں کی بے زاری جانے کیسے پل بھر میں معدوم ہو گئی۔ ہاتھ سے آنچل پھر سے چھوٹ گیا۔

☼ ☼ ☼

"تم مجھے کس بات سے ڈرانا چاہ رہے ہو آخر؟"

رات سے شعیب نے مجھے پکا ڈالا تھا آخر صبح ناشتا کرتے ہوئے میں پھٹ پڑا اور باقاعدہ اس پہ کانٹا تان لیا۔

"ڈرا نہیں رہا تمہاری بے فکری ختم کرنا چاہ رہا ہوں۔" شعیب نے میرے ہاتھ سے کانٹا چھینا اور تربوز کی قاش میں گھونپ دیا۔

"وہ کزن ہے میری... ہم ایک گھر میں رہتے ہیں۔ میری امی بھی اسے بہت پسند کرتی ہیں اور ابو بھی بہت چاہتے ہیں' کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہو گا دیکھ لینا جب مناسب وقت آئے گا اور میں یہ بات کروں گا تو سب ہنسی خوشی راضی ہو جائیں گے۔"

"لیکن اگر اس سے پہلے کسی اور کا مناسب وقت آ گیا تو؟"

شعیب کی بات پہ توس پہ جیم لگاتے لگاتے میں ٹھٹک گیا۔

"کسی اور کا؟ کون؟"

"کوئی بھی ہو سکتا ہے۔" اس نے میرے ہاتھ سے توس لے کر خود کھانا شروع کر دیا۔

"میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ کم از کم جسے چاہتے ہو اسے تو دل کی بات کہہ دو۔ ایسا نہ ہو تمہارے مناسب وقت کے انتظار میں کوئی اور تم دونوں کے

"درمیان آجائے۔"

مجھے اس بے تکی بات پہ شعیب پہ تاؤ آنا چاہیے تھا۔ مگر مجھے ہنسی آگئی۔

"درمیان میں دو لوگوں کے آیا جاتا ہے۔ ہم دو نہیں ہیں ام ہانی اور میں ایک ہیں اور ایک کے درمیان کوئی نہیں آتا۔"

☆ ☆ ☆
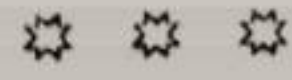
وہ پنسل لبوں میں دبائے یک ٹک اس اجنبی کو دیکھے چلی جارہی تھی۔ جس کا بنا کریز کا گرے ٹوپیس سوٹ چم چم کرتے سیاہ جوتے اور سلیقے سے ترشے بال اس کی نفاست پسندی کا ثبوت دے رہے تھے اور وہ فون کان سے لگائے اسی عمارت کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اور پیچھے چلتے دو تین لوگ کسی کے ہاتھ میں لیپ ٹاپ تو کسی کے ہاتھ میں فائلیں تھیں وہ اس وقت اچانک رکے۔ جب سالار اعظم فون جیب میں رکھتا ہوا مڑا۔۔۔ اور پھر عمارت کے گیٹ اور جالے لگی زنگ آلود سلاخوں والی کھڑکیوں کی جانب اشارے کرتا ان سے کچھ کہنے لگا۔

وہ ایک سحر کے عالم سے نکلی۔ لبوں میں دبی پنسل نکالی۔ سرعت سے اسکیچ بک کا ورق الٹا اور اگلے کورے صفحے پہ ایک اور نقش کھینچنے لگی۔۔۔ سالار اعظم کا۔

ایک ہڑک سی اٹھی تھی اس کے اندر۔۔۔ اس کا خاکہ تراشنے کی اس کے ایک ایک نقش کو محفوظ کرنے کی کیوں؟ یہ وہ بھی نہیں جانتی تھی بس اس کا ہاتھ تیزی سے حرکت میں تھا اور نظر اٹھا کے وہ بار بار سامنے دیکھ لیتی تھی اور پانچویں بار جب نظر اٹھی۔ تو وہ نظر کی حدود میں نہیں تھا۔ گیٹ سے اندر داخل ہوتے اس کے تینوں ساتھی ضرور نظر آرہے تھے۔ جس کا مطلب تھا وہ ان سے پہلے اندر جاچکا تھا۔

ام ہانی نے ایک پریشان سی نظر ادھورے اسکیچ پہ ڈالی۔ ادھورا ابھی کہاں تھا ابھی۔۔۔ مایوسی اس کے چہرے کی موتیا سی رنگت کو پھیکا کرنے لگی۔۔۔ مگر وہ ہڑک۔۔۔ وہ اس کا خاکہ ان اوراق میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کرلینے کی عجیب و غریب مگر شدید قسم کی خواہش۔۔۔ اس نے ام ہانی کو چین سے وہاں بیٹھنے نہیں دیا جیسے وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ کب اور کیسے وہ اس کا اسکیچ بنانے پہ مجبور ہوئی۔ ایسے ہی اسے یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ کب وہ درخت سے نیچے اتری کب اس پرانی عمارت کے کھلے گیٹ سے اندر داخل ہوئی اور کب اس ٹوٹے شیشے والی کھڑکی سے اندر ہال میں جھانکنے لگی۔

سالار اعظم چاروں جانب جائزہ لیتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو جو شاید اس کے ماتحت بھی تھے انہیں مختلف قسم کی ہدایات دے رہا تھا۔ ام ہانی نے چپکے سے کاپی دوبارہ کھولی۔ دیوار سے چپکائی اور اس کی پنسل تیزی سے ان نامکمل نقوش کے خطوط کو بھرنے لگی۔

"یہ سب مکمل طور پر چینج ہوگا کتنے دن لگیں گے اس میں اندازا"؟"

بات کرتے کرتے اس نے رخ اپنے ماتحت کی جانب موڑ لیا جو لیپ ٹاپ پہ اسے کچھ دکھا رہا تھا اب ام ہانی کو کوفت ہونے لگی۔ کب وہ دوبارہ رخ اس جانب کرے گا۔

"اور وہ سامنے والی بلڈنگ۔۔۔ وہ کیا ہے؟"

اب وہ دائیں جانب کھلنے والی کھڑکی سے باہر اشارہ کررہا تھا۔ ام ہانی کی پنسل پھر سے حرکت میں آئی۔

"لائبریری ہے سر۔"

"اور وہ دور۔۔۔ ریل کی پٹڑی کے پار۔"

وہ آگے بڑھ گیا۔۔۔ پھر سے اس کی نظر کی حدود کے پرے۔

ام ہانی سرعت سے کاپی پنسل اٹھائے چند منٹ کے فاصلے پہ موجود دوسری کھڑکی کے سامنے تھی۔۔۔ جہاں سے اب وہ پہلے کی نسبت کہیں زیادہ واضح نظر آرہا تھا۔

"جنرل رضا کا نمبر ملانا شاہد۔"

اپنے ماتحت سے کہتے ہوئے اچانک سالار اعظم کو کسی کی نظروں کی تپش کا احساس بہت شدت سے ہوا۔۔۔ وہ چونکا اور چوکنا ہوکے اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ ام ہانی کی جیسے جان ہی نکل گئی وہ پھرتی سے کھڑکی سے پرے ہٹی اور دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑی

ہو گئی۔

کہیں کسی کو نہ پا کے سالار نے سر جھٹک کے اس بے معنی وہم کو دور کرنا چاہا اور ہاتھ بڑھا کے اپنے ماتحت سے فون تھاما۔

"Hello saalar here"

اور بات کرتے ہوئے کھڑکی کے پار ایک آسمانی آنچل کی جھلک نے اسے دوبارہ بری طرح چونکنے پہ مجبور کیا۔

ام ہانی دیوار سے چپکی دم سادھے کھڑی تھی۔

"پتا نہیں اس نے مجھے دیکھا یا نہیں؟ نہیں نہیں نہیں دیکھا ہو گا۔"

خود کو تسلی دیتے ہوئے اس نے ڈرتے ڈرتے پھر سے اندر جھانکنا چاہا۔۔۔ وہ اب وہاں نہیں تھا۔۔۔ کہیں بھی نہیں اس کے ماتحت کوئی چارٹ پیپر پھیلائے اس پہ جھکے مارکر سے کچھ لکیریں کھینچنے میں مصروف تھے۔

ایک اطمینان بھرا سانس لیتے ہوئے وہ دوبارہ سیدھی ہوئی تو وہی اطمینان بھرا سانس سینے میں اٹک کے رہ گیا۔ وہ اس کے بالکل سامنے دو ہاتھ کے فاصلے پہ کھڑا اسے گہری نظروں سے گھور رہا تھا۔ خشک ہوتے حلق کو تر کرتے ہوئے ام ہانی نے ہاتھوں میں دبی اسکیچ بک کو اس کی نظروں کی زد میں آنے سے بچانے کے لیے اپنے پیچھے چھپانا چاہا۔ مگر اسی وقت سالار نے جھپٹ کے اسکیچ بک اس سے چھین لی۔

ام ہانی کی رہی سہی جان بھی نکل گئی۔۔۔ وہ ماتھے پہ ناگواری سے بل ڈالے اس کے ورق پلٹ رہا تھا اور ام ہانی فرار کی راہ تلاش رہی تھی وہ اپنے چھ فٹ کے وجود کے ساتھ اس کے اتنے قریب کھڑا تھا کہ وہ بھاگنے کی کوشش بھی کرتی تو اس سے ٹکرا جاتی۔

"کس کی اجازت سے بنایا ہے یہ تم نے؟"

اب سالار کی نظریں اس ادھورے سے اسکیچ پہ جم گئیں جو اتنا بھی ادھورا نہیں رہا تھا کہ وہ خود کو پہچان نہ پاتا اور پھر ام ہانی کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے اسکیچ بک کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے پھاڑ ڈالا۔ شاید اس کے ہولے ہولے کپکپاتے وجود اور پھٹی

پھٹی آنکھوں سے اسے یہ امید ہی نہیں رہی تھی کہ وہ کبھی کچھ بتا بھی سکے گی۔۔۔ مگر اپنی جان سے عزیز اسکیچ بک جس میں اس کے کئی محنت سے بنائے خاکے تھے۔ اسے دو حصوں میں ہوتا دیکھ کے وہ بول ہی اٹھی۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ اس میں میری اتنی محنت سے بنائی۔۔۔"

لیکن اس سے آگے اس کی گویائی پھر سے سلب ہو گئی۔ کیونکہ سالار نے اس کے مزید پرزے کرنے کی نیت سے اسے پھر سے دونوں ہاتھوں میں تھاما تھا۔ ام ہانی کی آنکھوں میں بے بسی سے آنسو آ گئے۔۔۔ یہ موٹے موٹے آنسو۔

اور سالار جو بے حد طیش کے عالم میں اس کے چہرے کے سامنے اسکیچ بک کے یہ دونوں حصے کئی حصوں میں تقسیم کرنے کی نیت سے آگے کیے ہوا تھا۔ وہیں رک گیا۔ اسے اب اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ سوائے ان آنسوؤں کے' وہ گھبرا کے دو قدم پیچھے ہٹا تھا۔ جیسے گہرے کنوئیں میں جھانکنے کے بعد کوئی سٹ پٹا کے پرے ہٹتا ہے کہ اس میں گر کے ڈوب ہی نہ جائے۔

اس کے کچھ دور ہوتے ہی ام ہانی نے بھاگنے کی راہ لی۔۔۔ اور وہ ہاتھ میں اسکیچ بک کے دونوں حصے تھامے گم صم کھڑا دور تک اسے بھاگتے دیکھتا رہا۔

☼ ☼ ☼

"پھر سے تم دوا لینے کے بہانے سارا دن گھر سے باہر رہی ہو۔" سلمی سر جھکائے کھڑی نائلہ کی ڈانٹ سن رہی تھی اور مہ پارہ کو تو اب بھی نائلہ کے الفاظ کم لگ رہے تھے۔ وہ اپنی زبان زہر میں بھگو کے میدان میں اتریں۔

"وہٹی کٹی تو ہو۔ دوا کس چیز کی لینے جاتی ہو سر میں درد ہے؟ بخار ہے؟ گلا خراب ہے؟ پھوٹ منہ سے گھر میں ہر طرح کی دوا رکھی ہے دادا جی کا کمرہ نہ ہوا۔ پنساری کی دوکان ہوئی۔۔۔ کیا نہیں رکھا اس میں۔"

"اور زیادہ طبیعت خراب تھی تو میں خود کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھالاتی۔ یوں نیم حکیموں کے پاس جاکے کوئی نیا روگ نہ لگوا بیٹھنا۔"

نائلہ نے شاید مہ پارہ کے زہریلے الفاظ کی سنگینی زائل کرنے کے لیے اسے پچکارا تھا ورنہ تاؤ تو انہیں بھی بہت تھا اس کے سارا دن غائب رہنے پہ۔

"میں بیگم صاحبہ۔۔۔ مجھے ڈاکٹر کی دوا راس نہیں آتی گرم بہت ہوتی ہے مجھے تو اسی حکیم کی دوا سے افاقہ ہوتا ہے ہمارا خاندانی حکیم ہے۔"

"لو۔۔۔ اللہ کی۔۔۔ شان 'خاندان کا اتا پتا کوئی نہیں اور خاندانی حکیم رکھ چھوڑا۔۔۔"

مہ پارہ کے تو چنگاریاں ہی سلگ اٹھیں۔

"جھوٹی لپاڑن۔۔۔ چھ برس کی عمر سے تو یہاں ہے ماں باپ کی شکل یاد نہ ہوگی تجھے۔ حکیم یاد رہ گیا؟"

"بس بھی کرو مہ پارہ۔۔۔ سلمٰی تم جاؤ کچن میں۔"

نائلہ کو اس تماشے سے اب گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ وہ مزاجاً" ذرا نرم خو تھیں۔

"کیوں ملازموں کے منہ لگتی ہو مہ پارہ۔" سلمٰی کے جان بچا کے کھسکنے پہ انہوں نے نند کو بھی سمجھانا چاہا۔

"حویلی کی ملازمائیں ہی ہماری ذمے داری ہیں بھابھی۔ ان کی ایسی ویسی حرکتوں سے ہماری ہی عزت پہ حرف آسکتا ہے۔ چال دیکھی تھی آپ نے اس کی ۔۔۔ کیسے مٹک مٹک کے چلتی ہے۔"

"مجھے احساس ہے اس ذمے داری کا۔ اسی لیے تو میں نے رضوان سے کہہ دیا ہے کہ اپنے ڈرائیور سے نکاح پڑھا دیں سلمٰی کا۔"

اور آدھے راستے سے کچھ پوچھنے کے لیے پلٹ کے آتی سلمٰی وہیں جم کے رہ گئی۔

"نکاح؟" مہ پارہ کا چہرہ تاریک سا ہو گیا۔

"ہاں اٹھارویں میں لگی ہے۔ بارود کا ڈھیر۔۔۔ جتنی جلدی ٹھکانے لگے اتنا اچھا۔"

سلمٰی مرے مرے قدموں سے واپس پلٹ گئی۔ ام ہانی نے اسے بالوں میں تیل لگوانے کے لیے بلایا تھا۔

بے دھیانی میں اس نے سنگھار میز سے آملے کے تیل کی بجائے ہاتھوں پہ لگانے والا لوشن اٹھا لیا۔ وہ تو شکر ہے کہ ہتھیلی پہ ڈالتے ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا' بالوں میں نہ لگا بیٹھی جلدی سے ہتھیلی بازو پہ رگڑ کے صاف کی اور تیل کی شیشی اٹھاتے ہوئے ام ہانی کو دیکھا کہ اب ایک اور ڈانٹ پڑے گی مگر ام ہانی تو شاید اس سے بھی کہیں بڑھ کے بے دھیانی کے عالم میں تھی کھوئی کھوئی نظروں سے کھڑکی کے پار دیکھتی کچھ سوچتی کچھ جاگتی اور کچھ اونگھتی۔

سلمٰی نے اس کے گہرے بھورے بالوں کی چٹیا کے بل کھولنے شروع ہی کیے تھے کہ کھڑکی سے ہوا کے دوش پہ آتی بانسری کی لے نے اس کے ہاتھ روک دیے۔۔۔ ام ہانی بھی جیسے کسی خیال سے چونکی تھی۔

"پتا نہیں۔۔۔ یہ بانسری کون بجاتا ہے؟"

ہمیشہ ہی وہ اس بانسری کی آواز پہ یہ سوال کرتی تھی اور ہمیشہ ہی سلمٰی چور سی بن کے کسی کام میں لگ جاتی تھی۔۔۔ مگر آج اس کا جی چاہ رہا تھا ہانی بی بی یہی سوال بار بار کرتی جائیں۔۔۔ یہاں تک کہ وہ جواب دینے پر مجبور ہو جائے۔

"روز ہی اس وقت سر بکھرتے ہیں۔"

"آج سر کہاں ہیں ہانی بی بی آج تو درد بکھر رہے ہیں۔ بانسری کرلا رہی ہے۔" ہانی نے مڑ کے اسے دیکھا۔ بنا کچھ پوچھے۔۔۔ بنا اس کے کچھ بتائے وہ سب جان گئی۔

"کون ہے یہ سلمٰی؟"

"ہے نہیں تھا۔۔۔" اس نے آہ بھری۔

"مگر تم آج بھی اس سے ملنے گئی تھی نا' میں جانتی ہوں۔"

"ہے کو تھا ہونے میں کونسا وقت لگتا ہے ہانی بی بی ۔۔۔ جب اس سے ملنے گئی تھی تو آنکھوں میں خواب اور دل میں بہت سی خواہشیں تھیں واپس آئی تو مالکوں نے ایک جھٹکے میں سب خواب نوچ ڈالے۔۔۔ ساری خواہشیں دل کے اندر ہی مار دیں۔۔۔ کیا کر سکتے ہیں ہم ان کے آگے۔۔۔ مختار ہیں وہ ہمارے۔"

وہ سہ رنگی چنری سے آنکھیں رگڑ رگڑ کر صاف کرنے لگی۔ جن کا کاجل آنسوؤں سے پھیل کے اس کے پھولے پھولے سانولے رخساروں تک آرہا تھا۔

"دل کا مختار کوئی نہیں ہوتا سلمی... اس پہ تو کبھی کبھی اپنا اختیار بھی نہیں ہوتا... کسی اور کا کیا ہوگا۔"

ام ہانی نے اپنا سر سلمی کے گھٹنوں سے ٹیک دیا اور آنکھیں موند کے بانسری کے سروں میں کھونے لگی جو واقعی کرلا رہی تھی آج۔

☼ ☼ ☼
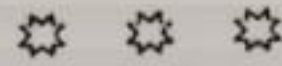
پتا نہیں کیوں مجھے ساری رات نیند نہیں آئی... بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا کچھ تھا۔ جو چھن رہا تھا 'کچھ تھا جو میں کھونے لگا تھا اور میرے پاس کھونے کے لیے اس کے سوا اور تھا ہی کیا' بے چینی ایک بے نام سے خوف میں ڈھل گئی اور میں نے صبح ہوتے ہی اسے فون کر ڈالا۔

"کچھ خاص نہیں اسکول جانے کے لیے تیار ہو رہی ہوں۔" اس کے بتانے پہ رات والی بے چینی اور اضطراب پھر سے عود کر آیا... وہی کچھ چھن جانے' لٹ جانے اور کھو جانے کا خوف۔

"ہنی تم کہیں مت جایا کرو۔" میں بے تابی سے کہہ اٹھا۔

"ارے وہ کیوں؟"

"بس... ایسے ہی۔" مجھ سے جواب نہ بن پایا۔

"بدھو گھر پہ رہ کے کیا کروں سارا دن؟" وہ کھلکھلا اٹھی۔

"کچھ بھی... پینٹنگ کرلیا کرو... اسکیچ بنالیا لو... مگر یہیں گھر میں' باہر مت نکلا کرو تم۔"

"عجیب پاگل ہو تم یہ کیا ضد ہوئی بھلا... اور تمہیں تو پتا ہے میں وہی چیز' وہی منظر پینٹ کرتی ہوں' جو میری آنکھوں کو اچھی لگے... دل کو بھائے' گھر میں کیا اپنے ہی کمرے کی تصویریں بناتی رہا کروں۔ ہزار بار کی دیکھی' باہر کچھ تو نیا مل جاتا ہے' جو تصویر بنانے پہ مجبور کرے۔"

"کچھ نیا بنایا؟" میں نے اپنی بے چینی دور کرنے کے لیے موضوع بدلنا چاہا۔

"ہاں کوشش کی... مگر پورا نہ کرسکی۔" اس کا لہجہ مدھم پڑ گیا۔

"وہ کیا؟"

"بس تھا ایک منظر... اسے دیکھتے ہی ایک خوف سا محسوس ہوا کہ کہیں پلک جھپکتے ہی یہ منظر اوجھل نہ ہو جائے اور پھر میں نے فوراً" ہی اسے اپنی اسکیچ بک میں قید کرنا چاہا... مگر... مگر سعد کچھ منظر قید کرنے کے لیے نہیں ہوتے۔ تتلی کی طرح اڑ جاتے ہیں ہاتھوں سے نکل کے۔ مگر جیسے جیسے تتلی ہتھیلی پہ رنگ چھوڑ جاتی ہے' وہ منظر بھی اپنے رنگ چھوڑ گیا ہے میری آنکھوں کی پتلیوں میں۔"

وہ کھوئے کھوئے انداز میں کہہ رہی تھی اور میں اس انجانے منظر سے جانا پہچانا حسد محسوس کر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

سوجی کے حلوے کی سوندھی سوندھی خوشبو' چکی کے پسے خالص گیہوں کے پراٹھے جو دیسی گھی میں تلے گئے تھے ان کی مہک پہ حاوی ہوگئی۔

"آج تو ناشتے پہ بڑا اہتمام ہے بھابھی۔ سعد پھر سے تو نہیں آرہا۔"

مہ پارہ کے سوال پہ کرسی سنبھالتے رضوان نے فوراً" پہلے سے ہی تنبیہہ کر ڈالی۔

"نہیں... وہ ویک اینڈ سے پہلے نہیں آئے گا اور نائلہ خبردار جو تم اس کے ڈرامے بازی میں آئیں اور اسے آنے کے لیے کہا تو۔"

"اوفوہ... ہاسٹل نہ ہوا کالا پانی ہوگیا۔"

نائلہ نے سر جھٹکتے ہوئے حلوے کی قاب رضوان کے آگے بڑھائی... اور پھر بات چھیڑی۔

"اچھا سنیں مجھے ایک بار دکھا دیجئے گا وہ ڈرائیور' دیکھ بھال کے تسلی کرلوں۔"

"اب تم ڈرائیوروں کو بھی جانچو گی۔"

رضوان نے ناگواری سے کہا... یہی ناگواری

پراٹھے کا نوالہ توڑتی مہ پارہ کے چہرے پہ بھی جھلکنے لگی۔ مگر وجہ سراسر اور تھی۔

"توبہ ہے رضوان... لڑکی کا معاملہ ہے۔ بھلے ملازمہ ہے مگر چھ سال کی عمر سے پالا ہے اسے۔ ایسے کسی اچکے لفنگے کے ہاتھ دے دیں کل کلاں کو روتی بدکتی دوبارہ ہمارے ہاں آکے بیٹھ گئی تو۔"

"جانا کہاں ہے دونوں نے... شادی کے بعد اس ڈرائیور کو فیکٹری کی بجائے یہیں حویلی کے لیے رکھ دوں گا۔ اکٹھے ہی کام کریں گے۔ تمہاری نظر کے سامنے۔"

"ہاں... مگر اس کا کوئی گھر بار تو ہوگا۔ خاندان۔"

"بھابھی... بھائی جان کو سکون سے ناشتا تو کرنے دیں۔" مہ پارہ سے اور برداشت نہ ہوا۔

"ہاں نائلہ چائے منگواؤ جلدی مجھے جلدی نکلنا ہے۔ نیا کمشنر آیا ہے قصبے میں اس سے میٹنگ ہے۔"

مہ پارہ ناشتا ادھورا چھوڑ کے اٹھ گئی تھیں ان کے تو حلق تک میں زہر بھر گیا تھا سلمیٰ کی شادی اور رشتے کے ذکر سے۔

"سب کو اپنی اپنی ذمے داریاں یاد ہیں... حتیٰ کہ نوکرانیوں کی بھی۔ ان کو بھی ٹھکانے لگانے کی فکر ہے۔ ام ہانی کا سوچ سوچ کر ان کی راتوں کی نیندیں اڑی ہوئی ہیں کہ بن ماں باپ کی بچی ہے۔ کیا منہ دکھائیں گے اوپر جاکے۔"

بڑبڑاتی ہوئیں وہ بڑے دادا کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کی دوا کا وقت تھا اور یہ ذمے داری مہ پارہ کے سر پہ ہی تھی۔

وہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے اونگھ رہے تھے۔ ان کا آلہ سماعت ان کے سینے پہ دھرا تھا۔ مہ پارہ ان کے سرہانے کھڑے ہوکے آنسوؤں سے ڈبڈبائی نظروں سے انہیں دیکھنے لگیں۔ پھر کرلا کے سوال کیا۔

"کیا میں بن ماں باپ کی نہیں ہوں... میرا فرض ادا کرنا کسی کو یاد نہیں تھا... میرے معاملے میں کسی کو خدا کا خوف نہیں آتا... ملازمہ تک کا جوڑ ڈھونڈ لیا۔ میں نظر نہیں آتی کسی کو۔"

روتے روتے وہ نیچے بیٹھ گئیں اور ان کے پلنگ کے پائے سے سر ٹیک کے سسکنے لگیں۔

"کیا میرا وجود تنکے سے بھی ہلکا ہے؟"

آلہ سماعت نہ لگا ہونے کے باعث بڑے دادا اس کی سسکیوں اور شکووں کی آواز پہ تو نہ جاگے مگر ان کی ہچکیوں سے جو ان کے پلنگ کو ہلکے ہلکے جھٹکے لگے اس سے ان کی آنکھ کھل گئی اور ان کا سر اپنے پلنگ کے پائے پہ دیکھ کے وہ ڈپٹ کے کہنے لگے۔

"کڑیئے اتھے کیوں سر رکھ کے بے گئی؟ جیوندا ہوں میں ابھی... مرا نہیں جے میرے پلنگ کی پٹی لگ کے بے گئی اے اٹھ... اٹھ شاباش۔"

✲ ✲ ✲

"مٹی کی خوشبو کتنی اچھی لگتی ہے ناں۔"

ام ہانی اپنی کلاس کے بچوں کے ساتھ کیاری میں گلاب کی نئی قلمیں لگا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ گیلی مٹی سے بھرے تھے۔

"ٹیچر اس میں پھول کتنے دن بعد لگیں گے؟"

"بہت جلدی بس روز اسے پانی دینا ہے اور حسن آپ نے اپنا یونیفارم کیوں بھر لیا مٹی سے دھیان سے بیٹا۔"

اور پھر ہاتھ جھاڑتی پانی کے پائپ کے پاس آنے لگی جہاں دو تین اور بچے گملوں پہ سرخ رنگ پھیر رہے تھے۔ ایک بچہ پھرتی سے آگے بڑھ کے پائپ تھامے ہوئے ہاتھ دھلانے میں اس کی مدد کرنے لگا۔

"کتنے خوب صورت لگ رہے ہیں یہ گملے رنگ ہونے کے بعد شاباش۔"

ہاتھ رگڑ رگڑ کے دھوتے ہوئے اس کے اسکول کے احاطے میں ایک گاڑی داخل ہوتے دیکھی۔ گیلے ہاتھوں سے ماتھے پہ آتے بال ہٹاتی وہ سیدھی ہوئی گاڑی سے اترتا سالار اعظم اسی جانب آرہا تھا لیکن اس کی حیران نظریں کیاری کے پاس کام کرتے بچوں پہ تھیں شاید ام ہانی کو وہ اب تک دیکھ نہیں پایا تھا۔

"آپ لوگ پڑھتے ہیں یہاں؟"

وہ کلاس تھری کے دلاور سے پوچھ رہا تھا۔۔۔ حالانکہ اس کا یونیفارم میں ہونا خود سالار کے سوال کا جواب تھا پھر بھی اس کے لہجے میں ایک بے یقینی سی تھی۔

"جی کلاس تھری۔"

"تو کلاس میں ہونے کی بجائے یہاں کیا کر رہے ہیں آپ؟"

"کام۔" بچے نے سادگی سے اپنے مٹی سے لپے ہاتھ آگے کر کے دکھائے۔

"کام۔۔۔ یہاں پڑھنے بھیجا جاتا ہے آپ کو یا مزدوری کے لیے۔۔۔ کہاں ہیں آپ کے پرنسپل؟"

"فرمائیے کوئی کام ہے آپ کو؟"

ام ہانی دوپٹے سے ہاتھ خشک کرتی اس کے قریب چلی آئی۔ پہلی نظر میں ہی سالار کے انداز میں پہچان کی رمق چمکنے لگی۔ مگر کمال کا اختیار تھا اسے اپنے تاثرات پوشیدہ کرنے کا۔۔۔ اگلے ہی پل وہ نظریں پھر سے ناآشنا اور اجنبی تھیں۔

"آپ کسی بچے کے ایڈمیشن کے لیے آئے ہیں۔"

"آپ کی تعریف؟" وہ خشک لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"میں ٹیچر ہوں یہاں۔"

ام ہانی نے بھی جواباً اسی سرد مہری سے نوازا۔

"ٹیچر کا کام غالباً پڑھانا ہوتا ہے۔ بچوں سے بیگار لینا نہیں۔"

"بیگار؟" وہ حیران ہوئی۔

"مجھے یہ اسکول کم اور بیگار کیمپ زیادہ لگ رہا ہے جہاں معصوم بچوں سے اس چلچلاتی دھوپ میں اس قسم کے کام لیے جا رہے ہیں۔ آپ کے پرنسپل سے بات کرنا چاہوں گا میں کہ کس حق سے وہ بچوں سے اسکول کے ایسے کام لے رہے ہیں جن کے لیے انہیں تنخواہ دار ملازم رکھنے چاہئیں۔"

"یہاں ہر کام کے لیے ملازم ہیں۔۔۔ مالی سے لے کر پیون تک اور بچے مزدوری نہیں کر رہے، ہنر سیکھ رہے ہیں۔ باغبانی بھی ایک فن ہے۔"

ام ہانی نے اگرچہ بڑے تحمل اور نرمی سے صفائی دی تھی۔ مگر اس کا طنزیہ انداز ہنوز وہی تھا۔

"بہت خوب۔۔۔ اچھا نام دیا ہے آپ نے اسے مگر ان کے غریب والدین نجانے کس کس طرح جتن کر کے یہاں کی فیس اس لیے ادا نہیں کرتے کہ "آپ انہیں پڑھانے لکھانے کی بجائے باغبانی اور رنگ سازی سکھائیں۔"

اب مزید تحمل کا مظاہرہ کرنا ام ہانی کے لیے بھی دشوار تھا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں کوئی فیس نہیں لی جاتی۔۔۔ یہ ٹرسٹ اسکول ہے۔ یونیفارم اور کتابیں تک مفت دی جاتی ہیں اور دوسری بات کہ ہنر اور فن کوئی بھی چھوٹا نہیں ہوتا اور تعلیم صرف کتابیں پڑھنے کا نام نہیں ہے۔ کچھ بھی سیکھنا علم حاصل کرنا کہلاتا ہے اور دیکھیے یہ کچھ سیکھ ہی رہے ہیں اپنے اردگرد کے ماحول کو صحت مند اور خوب صورت بنانا سیکھ رہے ہیں یہ۔۔۔ یہ بھی سیکھ رہے ہیں کہ "آگے چل کے انہیں صرف آرام دہ کاروں میں سوٹ پہن کے افسری نہیں کرنا بلکہ معاشرے میں ایک کارآمد رول بھی ادا کرنا ہے۔"

سالار کو اپنی ہی یادداشت پہ کچھ شبہ سا ہوا کہ کیا یہ وہی لڑکی تھی جو اس دن صرف آنسو بہانے اور بھاگ جانے کے سوا کچھ نہ کر پائی تھی۔

"چلیں۔۔۔ سب بچے ہاتھ منہ دھو کے وضو کر کے قاری صاحب کی کلاس میں جائیں درس کا وقت ہو گیا ہے۔"

بچوں کو لائن بنا کے اندر بھیجتے ہوئے اس نے مڑ کے سالار کو دیکھا جو کار کی جانب بڑھ رہا تھا۔

"اور ہاں ایک اور بات۔۔۔" سالار نہ چاہتے ہوئے بھی رک کر سننے لگا۔

"یہ ٹرسٹ اسکول آپ جیسے لوگوں کے لیے نہیں۔ آپ اپنے بچے کو کسی مہنگے اسکول میں داخل کرائیں جہاں اسے مٹی سے محبت سکھانے کی زحمت نہ دی جائے۔"

سالار نے اس کی غلط فہمی دور کرنے کی ضرورت نہ سمجھی اور خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ کے اسے واپس

موڑنے لگا۔

"کہاں سے آجاتے ہیں مفت کے لیکچر دینے۔"

بڑبڑاتے ہوئے وہ بچوں کی لائن درست کرانے لگی۔

"ٹیچر یہ کون تھے؟"

"تھے کوئی... غلطی سے ہمارے اسکول آگئے۔ میں نے انہیں راستہ بتادیا ہے۔" اور مڑ کے گیٹ سے نکلتی گاڑی کو دیکھ کے سوچنے لگی۔

"اچھا ہی ہوا جو میں وہ اسکیچ مکمل نہ کرسکی... کچھ منظر صرف دور سے ہی اچھے لگتے ہیں۔"

✡ ✡ ✡

"اوہ... تو وہ ٹرسٹ اسکول آپ کا ہے؟" سالار اعظم کی رضوان سے ایک غیر رسمی سی ملاقات تھی یہ اور باتوں باتوں میں ہی اسے علم ہوا۔

"ٹرسٹ ہے۔ فلاحی۔ تو ہمارا تو نہ ہوا... عوام کا ہے۔" رضوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"صحیح... میں اتفاقاً" آج ہی وہاں گیا تھا انسپکشن کے لیے۔"

"تب ہی مجھے علم ہوا تھا کہ 'نئے کمشنر صاحب بہ نفس نفیس ہر جگہ خود جارہے ہیں۔ میں بہت متاثر ہوا۔"

"میں بھی بہت متاثر ہوا یہ جان کر کہ اس علاقے کے صاحب حیثیت لوگوں کو یہاں کے عام رہنے والوں کی ضروریات کا اتنا خیال ہے۔" سالار اعظم نے رضوان کی خوشدلی سے کی تعریف کا جواب خوشدلی سے دینا چاہا۔

"کیسا لگا آپ کو اسکول کا معیار؟"

"ویل... ویسے تو سب ٹھیک ہے، مگر آپ نے جو اسٹاف وہاں یہ..." سالار کی بات ام ہانی کو آفس میں داخل ہوتے دیکھ کے ادھوری رہ گئی وہ بھی رضوان کو سلام کرتے ہی اسے دیکھ کے بالکل اسی کے انداز میں چپ ہوکے رہ گئی۔

"ارے آؤ بیٹا... تمہیں اپنے مہمان سے ملواتا ہوں۔ یہ ہمارے نئے کمشنر ہیں۔ عرصے بعد ہمارے علاقے کو کوئی اتنا فرض شناس اور ذمے دار آفیسر ملا ہے اور سالار صاحب یہ میری بیٹی ہے۔ ام ہانی۔"

"خوشی ہوئی آپ سے مل کے۔" سالار اعظم کا لہجہ سراسر رسمی تھا۔

"رضوان شاہ کی بیٹی سے مل کے ہوئی ہوگی خوشی' ایک ٹرسٹ اسکول کی معمولی ٹیچر سے مل کے تو نہیں ہوئی تھی۔"

"اوہ... لگتا ہے آپ دونوں پہلے مل چکے ہیں۔"

"میں چلتی ہوں بڑے ابو... آپ بزی ہیں گھر پہ بات کرلوں گی۔" وہ چلی گئی، مگر سالار اعظم کے پھر وہاں بقیہ تیرہ منٹ بڑی مشکل سے کٹے۔

✡ ✡ ✡

"تاجدار حرم... ہو نگاہ کرم..."

جمعے کا دن اور لاہور کا داتا دربار... ایک ہجوم تھا۔ نہ صرف لاہور کے بلکہ گرد و نواح سے کتنے ہی لوگ اس دربار کے احاطے میں نماز جمعہ کی ادائیگی کے لیے آتے تھے۔ قوالوں کی ٹولیاں جگہ جگہ بیٹھی تھیں۔ کئی اطراف سے نعتوں کی پرسوز آوازیں گونج رہی تھیں۔ عطر اور اگربتی کی مہک میں ڈوبا ہوا ماحول...

"جمعے کی نماز بھی پڑھ لیں گے۔ فاتحہ بھی ہوجائے گی مزار پہ... اور ساتھ میں یہ بھی لیتا تھا مجھے۔"

سر پہ رومال باندھتے ہوئے شعیب سیڑھیوں کے پاس چادر بچھا کے چوڑیاں اور کڑے بیچتی عورت کے پاس رکا۔

"گرل فرینڈ کے لیے؟"

میں نے ہونق پن سے پوچھا۔ ذلیل انسان جمعے کی باجماعت نماز پڑھنے کا کہہ کر یہاں مجھے اتنے رش میں گھسیٹ لایا اور اب گرل فرینڈ کے لیے چوڑیاں لے رہا تھا۔

"ابے نہیں۔ ایسی کوئی مخلوق ابھی مجھے ملی نہیں۔ یہ تو آپا کے لیے لے رہا ہوں۔"

"تو کسی اچھی جگہ سے لو۔ یہ تو ہیں بھی سب سیاہ

رنگ کی۔ عجیب بھدی سی۔"

"یہ منت کی چوڑیاں ہیں۔ اماں نے کہا تھا۔ یاد سے لاؤں آپا کی شادی کی عمر گزر رہی ہے نا۔ رشتہ نہیں آرہا۔ اب اگر اماں کا عقیدہ ہے کہ یہ چوڑیاں پہننے سے رشتہ جلدی آجائے گا تو کیا کیا جاسکتا ہے۔"

اس کی بات سے مجھے بھی دور کی کوڑی سوجھی۔

"یار شعیب۔ میری پھوپھو کی بھی ابھی تک شادی نہیں ہوئی۔ ان کے لیے بھی لے لوں؟ قسم سے امی اور ہانی دونوں بہت دعائیں دیں گی مجھے اگر واقعی ان چوڑیوں نے کام کردکھایا تو۔"

"ضرور۔ اور اگر ان کے ساتھ کسی ناکام عشق والی کہانی جڑی ہے تو یہ موٹی والی کالی چوڑیاں لو۔ وہ بھی دو عدد۔ یہ پسند کی شادی کی منت کی ہیں۔"

"واقعی؟"

"ہاں۔ لڑکیاں دور دور سے آکے لیتی ہیں۔ ان کو پہننے سے ان کی شادی وہیں ہوجاتی ہے جہاں وہ چاہتی ہیں۔ یہ ان کا ماننا ہے۔" قوالیوں کا شور اچانک تھم گیا۔

"لگتا ہے اذان ہونے والی ہے۔" اور شعیب کا اندازہ درست تھا اگلے ہی لمحے لاؤڈ اسپیکر اذان کی آواز سے گونج اٹھے۔

"چل یار۔ چھوڑ چوڑیاں۔ میں نہیں مانتا ان باتوں کو۔ نماز کا وقت ہو رہا ہے۔"

میں اسے کھینچتا ہوا آگے لے گیا یہ نہ بتایا کہ اس وقت دل میں کیا بونگا سا خیال آیا تھا کہ کاش مرد ہونے کے باوجود میں بھی یہ کانچ کی وہ بھدی موٹی کالی چوڑیاں پہن سکتا کیا پتا واقعی ان کی کرامات سے۔

☼ ☼ ☼

صرف تیرہ منٹ۔ صرف اور صرف تیرہ منٹ وہ مزید رک سکا تھا اس آفس میں اور پھر رہ نہ سکا۔ اور ایک ضروری کام یاد آنے کا کہہ کر رضوان سے معذرت کرتا نکل آیا تھا۔

اس نے محض اندازے سے اپنی کار دائیں جانب کو جانے والی سیدھی سڑک پہ موڑی تھی اور اس کا اندازہ درست تھا اس سڑک پر دور وہ سفید دوپٹے اور ہلکے کاسنی کرتے پاجامے والی لڑکی پیدل چلتی جارہی تھی۔ ڈرائیور کو کچھ دیر بعد اس نے رکنے کا کہا اور پیدل چلتا اس کے پاس پہنچا۔

"سنو۔" اس کے پکارنے پہ ام ہانی نے مڑ کے دیکھا ضرور۔ کچھ حیران بھی ہوئی اور سالار کی طرح اسے اپنے تاثرات چھپانے پہ ملکہ نہیں تھا اس لیے اس حیرت کو اس کی جانب اچھال کے وہ نظرانداز کرتی دوبارہ چلنے لگی۔

"میں تم سے مخاطب ہوں۔"

"مجھے بچپن سے سکھایا گیا ہے کہ راہ چلتوں سے مخاطب نہیں ہوتے۔" بغیر رکے اس نے جواب دیا۔

"راستے پہ اس وقت تم چل رہی ہو۔ بائی دا وے۔ اتنے بڑے آدمی کی بیٹی ہو کے پیدل جارہی ہو۔" اب کے وہ رکی اور تنک کے بولی۔

"کیوں؟ بڑے گھروں میں پیدا ہونے والے معذور ہوتے ہیں؟"

"نہیں۔ مگر عموماً احساس سے عاری ہوتے ہیں وہ انسان۔" وہ مسکرایا کہ بہرحال اسے رکنے پہ تو مجبور کر ہی دیا تھا۔

"جس میں احساس باقی نہ رہے وہ انسان ہی کہاں ہوتا ہے۔" اسے لاجواب کرنے کے بعد ام ہانی نے دوبارہ قدم بڑھائے۔

"تصویر مکمل کب کروگی؟" وہ اچانک اس کے سامنے آتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

"کبھی نہیں۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے دوٹوک جواب دیا۔

"مگر میں کوئی چیز کبھی ادھوری اور نامکمل نہیں رہنے دیتا۔"

"اور میں کوئی ایسا کام مکمل نہیں کرتی جس پہ میرا دل نہ مانے۔"

اس بار وہ آگے بڑھی تو سالار نے اس کے پیچھے اپنے قدم نہ بڑھائے۔

☼ ☼ ☼

میرا دل چاہتا تو دن کے ہر دوسرے پل اسے فون کرتا۔ اور گزرے پچھلے پل کا سارا حال سناتا۔۔۔ مگر بہرحال رات سونے سے پہلے ایک لمبی کال۔۔۔ یہ معمول تو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ بہت کچھ ہوتا تھا میرے پاس اسے سنانے کے لیے اور پتا نہیں کیوں مجھے بتانے کے لیے اب اس کے پاس زیادہ کچھ نہیں رہا تھا۔ وہ بس میری سنتی، کبھی ہنستی، کبھی ٹوکتی، کبھی بگڑتی۔

"میں کیا کروں گی ان چوڑیوں کا؟" میں نے اسے منت والی چوڑیوں کا بتایا تو وہ پھر سے ہنس دی۔

"ان کو پہننے سے شادی وہیں ہو جاتی ہے، جہاں دل چاہتا ہو۔"

"تو ایسا کرو سلمیٰ کے لیے لے آؤ۔ اس کی لو اسٹوری آج کل تباہی کے دہانے پہ ہے۔"

"اس کے لیے کیوں لاؤں؟ وہ کیا لگتی ہے میری؟" میں بری طرح چڑ گیا اور وہ کھلکھلا کے ہنسنے لگی۔ میری چڑچڑاہٹ اور کوفت اس کی ہنسی کی آبشار میں بہہ گئی۔

"تم خاموش مت ہونا ہنی۔ ہنستی رہنا۔ ہمیشہ۔"

"بدھو۔۔۔ بلاوجہ ہنستی رہوں؟ پاگل ہوں کیا؟"

"ہنستے رہنے سے پاگل نہیں ہوتے ہاں کسی کسی کی ہنسی پاگل ضرور کر دیتی ہے۔"

میری بات پہ وہ پھر سے ہنس پڑی۔ اور یہ کھلکھلاہٹ اس کے فون بند کرنے کے بعد بھی دیر تک مجھے لہروں کی طرح یہاں وہاں اچھالتی رہتی۔ یہاں تک کہ۔۔۔ کہ پھر سے وہی انجانا خوف جو گھات لگائے بیٹھا تھا۔ پھر سے مجھ پہ حملہ آور ہوا۔ میں بے چین ہو کے کچی نیند سے اٹھ کے بیٹھ گیا۔

وہی کچھ چھن جانے کا خوف۔ کچھ بچھڑ جانے کا۔۔۔ کچھ لٹ جانے کا ڈر۔۔۔

☼ ☼ ☼

بکری کا وہ ننھا سا برف کے گولے جیسا بچہ مستی میں یہاں سے وہاں گھاس پہ لوٹیں کھا رہا تھا اور ام ہانی مسکراتے ہوئے اس کا اسکیچ بنانے میں مصروف تھی۔ اس سے کچھ ہی فاصلے پہ موجود ایک بڑے سے سیاہ پتھر پر بیٹھی۔۔۔

فجر کی نماز کے بعد وہ جب صبح کی سیر کے لیے نکلتی تو اپنی اسکیچ بک اور پنسل ضرور ساتھ رکھتی۔ ایسے ہی کسی منظر کو قید کرنے کے لیے جو اس کے دل کو بھا جائے اور تب اس کی مسکراہٹ اچانک غائب ہو گئی جب اس نے جاگنگ سوٹ میں ملبوس سالار اعظم کو اس جانب آتے دیکھا۔ ام ہانی نے فوراً" اسکیچ بک بند کی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"رکو۔۔۔ مجھے بات کرنی ہے تم سے۔"

"مگر مجھے نہیں کرنی۔"

وہ تیز تیز چلنے لگی۔ سالار بھی اس کے ساتھ لمبے لمبے قدم اٹھانے لگا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ تم مت کرنا۔۔۔ صرف سن لینا۔"

"مجھے سننا بھی نہیں ہے۔ پلیز۔۔۔ آپ ایسے میرا راستہ نہ روکا کریں۔۔۔ آہ۔"

اچانک وہ درد سے کراہ اٹھی۔ تیز چلنے کی وجہ سے اور سارا دھیان ساتھ ساتھ چلتے بلاوجہ فری ہوتے سالار پہ ہونے کی وجہ سے وہ اس پتھر کو دیکھ نہیں پائی جس سے اس کا دایاں پاؤں بری طرح ٹھوکر کھا کے مڑ گیا تھا۔

وہ اپنے پیر کو تھامتی۔۔۔ درد سے آنکھیں میچتی اسی پتھر پہ بیٹھ گئی۔ اس کے انگوٹھے کا ناخن ٹھوکر کھانے سے جلد سے اکھڑ کے ایک جانب جھول رہا تھا اور خون بہہ رہا تھا۔ سالار اس کے سامنے آکھڑا ہوا تو ام ہانی نے اپنی آنسو بھری سرخ آنکھیں اٹھا کے اسے دیکھا اور اپنی سسکی روکنے کی کوشش کی۔

اپنے تاثرات چھپانے میں ملکہ رکھنے والے سالار اعظم کا پگھلتا دل اس کے چہرے سے عیاں ہونے لگا اس کے نقوش بھی اس کے دل کے ساتھ ساتھ پگھل رہے تھے جیسے وہ پیروں کے بل وہیں اس کے سامنے بیٹھ گیا اور بن کچھ کہے اس کے پیر کی جانب ہاتھ بڑھائے اور ام ہانی نے فوراً" ہی جھجک کے اپنے پیر کو

پیچھے کر دیا تھا۔

سالار نے اپنا ہاتھ مزید آگے بڑھانے کے بجائے اسے ہی آنکھ سے پیر آگے کرنے کا اشارہ کیا، مگر جب وہ انکار میں سر ہلانے لگی تو ناچار اس نے خود ہی اس کا پیر تھام کے اپنے سامنے کیا۔ ام ہانی نے مزاحمت کی کوشش کی، مگر سالار کی گرفت مضبوط تھی۔ وہ سسکی بھر کے رہ گئی۔ سالار نے جیب سے رومال نکال کے اس کے اکھڑتے جھولتے ناخن پہ رکھ کے ہلکا سا دبایا تو درد کی شدت سے تڑپ کے وہ اپنے دونوں ہاتھ اس کے رومال والے ہاتھ پہ رکھ کے رونے لگی۔

"نہیں پلیز۔"

سالار نے دوسرے ہاتھ سے نرمی سے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھ سے ہٹائے اور گہری نظر اس کے چہرے پہ ڈالی۔ درد سے بے حال ام ہانی نے اب لب بھینچ رکھے تھے اور آنکھیں زور سے میچی ہوئی تھیں۔ بند آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کے چہرے پہ یونہی نظر جمائے سالار نے اس کے ناخن کے اس بقیہ حصے کو ابھی اکھاڑنا چاہا تو وہ ہلکا سا چلا اٹھی چہرے پہ درد کہیں زیادہ بڑھ گیا اور سالار کی نظریں اور بھی گہری ہو گئیں۔

سالار دھیرے دھیرے اس کے ناخن کو جڑ سے اکھاڑ رہا تھا اور ام ہانی کے ہاتھ پھر سے اس کے ہاتھ پر جمے تھے۔ اب وہ اسے روکنے کی کوشش نہیں کر رہی تھی، مگر درد کی شدت سے رہ رہ کے اٹھنے والی چیخوں کو روکنے کے لیے اس کے ناخن قریباً" سالار کے ہاتھ کی پشت میں کھب رہے تھے اور سالار... اسے تو جیسے اس چیز کا کوئی احساس ہی نہیں تھا وہ یک ٹک اس کی بند پلکوں سے جھر جھر کر کے گرتے آنسوؤں کو دیکھتا جا رہا تھا جیسے پورے جہاں میں ان کے سوا دیکھنے لائق کوئی منظر ہی نہ ہو۔

اور آخر ناخن جڑ سے اکھڑ گیا۔ خون ابل کے بہا اور رومال کو سرخ کر گیا۔ ام ہانی جو دیر سے سسکیاں دبانے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔ سالار کا ہاتھ بے ساختہ آگے بڑھا اور اس کے آنسوؤں کو اس نے اپنی انگلیوں کی پوروں پہ چننا چاہا تو ام ہانی رونا بھول گئی۔ تڑپ کے پیچھے ہٹی۔

اس کی سرخ روئی روئی آنکھوں کی حیرت بھی سالار کی خصوصیت کو توڑ نہ سکی۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا پاؤں سالار کی گرفت سے چھڑایا وہ تب بھی اسی بے خودی میں اسے دیکھتا رہا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی وہ وہیں پنجوں کے بل بیٹھا رہا۔

وہ لنگڑاتے ہوئے وہاں سے جانے لگی تب بھی نہ ہلا۔ یہاں تک کہ چند قدم چلنے کے بعد ام ہانی نے مڑ کے اسے دیکھنا چاہا تو سالار اعظم اس پگڈنڈی کے پاس پڑے، بہت سے پتھروں میں سے اب ایک پتھر تھا۔

☼ ☼ ☼

میں نے سچ کہا تھا شعیب سے۔ میرا دل اس کے بارے میں غلط سگنل دے ہی نہیں سکتا۔ یہ عجیب بے سکونی جو کئی روز سے مجھ پہ غلبہ کیے ہوئے تھی جس کا سبب جاننے سے میں قاصر تھا اس کا جواب رات کو ہنی سے فون پہ بات ہوتے ہی مل گیا۔

"ایسے کیسے لگ گئی چوٹ؟" میں تڑپ اٹھا تھا۔ دانتوں تک کے اندر درد کی لہریں اٹھنے لگیں۔

"بس لگ گئی..." اس نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہا تھا۔

"ہاں... مگر کیسے؟"

"اب کیا دوبارہ ٹھوکر لگوا کے دکھاؤں؟" وہ جھنجلا رہی تھی۔

"خون بھی نکلا تھا؟" میں جیسے کراہ اٹھا۔ پھر سے ایک خاموش لمحہ... اور ایک مختصر جواب۔

"ہاں۔"

"تم روئیں ہنی؟" اور پتا نہیں کیوں میرے ہر سوال کے جواب میں وہ ایک ثانیے کے لیے چپ سی ہو جاتی تھی۔

"ناں... کوئی نہیں۔" اور میں جانتا تھا یہ سفید جھوٹ تھا۔

"جھوٹ... تم روئی تھیں۔ میں کہہ رہا ہوں نا تم

روئی تمہیں تو بس روئی تھی۔ تمہیں کس نے چپ کرایا ہو گا بھئی۔"

"بدھو۔۔۔ میں کوئی بچی ہوں جو ذرا سی چوٹ پر روؤں گی۔"

"میں کل ہی آتا ہوں۔"

اچانک میں نے فیصلہ کر لیا۔

"خبردار۔۔۔ اگر تم مجھے روتا ہوا نہیں دیکھ سکتے تو میں بھی تمہیں ڈانٹ کھاتا نہیں دیکھ سکتی اور کل تو کیا تم اس ویک اینڈ پہ بھی نہیں آؤ گے۔"

"کیا؟ دو دن بعد ویک اینڈ پہ بھی نہیں؟ کیوں؟" میں اس کے سفاک حکم پہ احتجاج کرنے لگا۔

"منڈے کو تمہاری پریزنٹیشن ہے بدھو۔۔۔ خاک تیاری کی ہے تم نے۔ یہاں آ گئے تو کچھ بھی نہیں کر سکو گے وہاں رہ کے کام کرو اچھا سا۔۔۔ منڈے کو زبردست سی پریزنٹیشن دو اور پھر اگلے ویک اینڈ پہ آنا۔۔۔ اوکے۔"

"اوکے۔" مرے مرے لہجے میں کہہ کر میں نے فون رکھ دیا۔

"کیا ہوا۔۔۔؟ منہ کیوں لٹکا ہوا ہے۔" شعیب نے روم میں داخل ہوتے ہی مجھ سے پوچھا۔

"میں نہیں جا رہا اس ویک اینڈ پہ۔۔۔"

"کیوں؟ حکم یار ہے کیا؟" وہ چڑانے لگا۔

"ہاں۔۔۔ اور میں اس کا کہا ٹال نہیں سکتا۔۔۔ مگر۔۔۔ یار اتنے دن اس سے دور رہنا بھی تو ایک عذاب ہے۔ مر جاؤں گا۔"

شعیب نے چند سیکنڈ غور سے مجھے دیکھا جیسے اندازہ لگانا چاہ رہا ہو کہ میں مرنے والا ہوں یا نہیں۔۔۔ پھر میرا شانہ تھپتھپا کے سنجیدگی سے کہنے لگا۔

"کبھی کبھی جدائی کچھ نہیں کہتی۔۔۔ قربت مار دیتی ہے۔"

☼ ☼ ☼
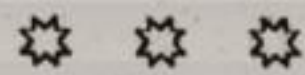
"صدیق چچا۔۔۔ اتنا سا کام کہا تھا آپ سے وہ بھی نہیں کیا۔۔۔ صدیق چچا۔" پیون کو پکارتی وہ اسکول کی راہداری میں سے گزر رہی تھی اور پھر ان کا اسٹول خالی دیکھ کے کوفت سے بڑبڑا کے رہ گئی۔

"پھر سے غائب۔۔۔ سرکاری اسکول والا حال بنا دیا ہے ان لوگوں نے۔۔۔ جس کو دیکھو بنا بتائے کبھی بھی غائب۔۔۔"

اس نے دو دن پہلے پیتل کا جو گھنٹا لا کے دیا تھا وہ ابھی تک جوں کا توں اسی اسٹول کے پاس رکھا تھا۔ گرمی کے بڑھتے ہی اس چھوٹے سے قصبے میں بجلی جانے کا دورانیہ زیادہ ہو جاتا تھا اور اسکول کے اوقات میں تو اکثر بجلی ہوتی ہی نہیں تھی۔ ام ہانی نے یہ پیتل کا گھنٹا منگوایا تھا تاکہ چھٹی' اسمبلی اور ہر کلاس کے ختم ہونے پہ اسے بجا دیا جائے۔ اب جو اسے تاؤ آیا تو اسٹول گھسیٹا اور اس پہ چڑھ کے خود ہی دیوار سے ٹانگنے لگی۔ مگر گھنٹا خاصا بھاری تھا۔ پھسل پھسل جا رہا تھا ہاتھ سے۔۔۔ اور پیر کے انگوٹھے کی چوٹ کی وجہ سے وہ صحیح طریقے سے اسٹول پہ قدم بھی نہیں جما پا رہی تھی۔

تب ہی دو ہاتھ گھنٹے پہ آ کے رکے اس نے چونک کر دیکھا یہ سالار اعظم تھا جو اس سے لینے کے بعد بڑی سہولت سے گھنٹے کو دیوار سے جھولتے ہک سے لٹکانے لگا۔ وہ خاموشی سے دیوار کا سہارا لے کر اسٹول سے اترنے لگی جو ڈگمگا رہا تھا۔ گھنٹا لٹکانے کے بعد سالار نے فوراً" ہاتھ بڑھا کے اسے کہنی سے تھاما اور اسٹول سے نیچے اترنے میں مدد دی۔

"چھوڑیں مجھے۔۔۔ نہیں گرتی میں۔"

نیچے اترتے ہی اس نے اپنا بازو سالار سے چھڑوایا۔

"کیسا ہے اب پیر کا زخم؟"

سالار اس کے انگوٹھے پہ بندھی پٹی دیکھ کے پوچھ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے اب۔۔۔" مختصر کہہ کر وہ اس سے آنے کا سبب پوچھنے ہی والی تھی کہ اسے گھنٹا بجاتے دیکھ کے ہڑبڑا اٹھی۔

"ارے۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ کیا۔۔۔ آپ۔۔۔ یہ کیوں۔"

مگر گھنٹے کی آواز میں اس کی آواز دب سی گئی۔ وہ

متوحش نظروں سے کبھی مسلسل گھنٹے بجاتے سالار کو تو کبھی جماعتوں سے نکلتے بچوں کو دیکھ رہی تھی۔

"یہ کیا کیا آپ نے؟ ابھی چھٹی ہونے میں پورے پچیس منٹ باقی ہیں۔" سالار کے رکتے ہی اس نے غصے سے کہا۔

"کیوں کہ مجھے اپنی تصویر مکمل کرانی ہے۔" وہ سکون سے کہہ رہا تھا۔ ام ہانی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا' مگر الفاظ... الفاظ جانے کہاں تھے وہ انکار کرنا چاہتی تھی۔ شدت سے... مگر انکار کی ہمت جانے کہاں تھی۔

"اب بھی دل نہیں مان رہا؟" وہ ہلکا سا مسکرایا اور ام ہانی کو لگا انکار کی وہ ہمت... وہ الفاظ سب شاید اس مسکراہٹ کی تاب نہ لا کے ہی کہیں چھپ گئے تھے۔

"کہاں بناؤ گی اسکیچ؟ یہیں؟ یا نہر کنارے؟" اب ام ہانی نے ہتھیار ڈال دیے۔

"نہر کنارے کل صبح۔"

☆ ☆ ☆
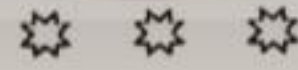
مجھے صبح کی پہلی پھٹنے سے بھی خوف آ رہا تھا۔

نجانے کیوں یہ چپتی بلکتی جس سے بھری رات اتنی عزیز ہو رہی تھی۔ جی چاہ رہا تھا اس رات کو اپنی آغوش میں ایسے بھر لوں کہ یہ کہیں جا نہ سکے دن کا اجالا آنے کی ہمت نہ کر سکے۔

میں نہیں جانتا تھا آنے والی صبح کی ہیبت مجھ پہ ابھی سے کیوں طاری ہو رہی تھی۔

میں نہیں جانتا تھا وہ کیا تھا۔ جو مجھ سے چھن جانے والا ہے... میں نہیں جانتا تھا۔ میں کیا کھونے والا ہوں۔ اور صبح کو ہونے سے روکنا' میرے بس میں نہیں تھا۔

صبح ہو کے رہی... کیا کچھ' چھن جانے اور کھو جانے کو روکنا میرے بس میں تھا؟

شاید...

شاید وہ بھی نہیں...

دور کہیں... کچھ تھا۔ جو مجھ سے دھیرے دھیرے چھن رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

کورے ورق پہ دھیرے دھیرے وہ ساحر نقوش ابھر رہے تھے اور ام ہانی حیرت میں تھی۔ کہ اس چہرے کو ایک نظر دیکھنے کے لیے بھی کتنا حوصلہ چاہیے اور وہ... وہ ایک نظر میں دو دو بار دیکھ رہی تھی۔

نظر اٹھاتی تو سامنے وہ... نظر جھکاتی۔ تو گود میں رکھی کاپی کے ورق پہ وہ...

"ہو گئی مکمل؟" ام ہانی نے تھکن سے بھرپور انداز میں ایک گہری سانس لی تو کب سے ایک زاویے پہ بیٹھے سالار نے پوچھا۔ وہ اثبات میں سر ہلا کے رہ گئی۔

"شو می" ام ہانی نے سٹپٹا کے کاپی بند کی تو سالار نے اس کے ہاتھ سے لے لی۔ پہلی نظر اس اسکیچ پہ ڈالتے ہی اس کی آنکھوں میں حیرت نظر آئی۔

"اس میں میری آنکھیں بند کیوں ہیں؟"

"وہ... میں نے... میں نے اس تصویر میں آپ کو سوتا ہوا دکھایا ہے۔"

"مگر میں نے یہ تصویر جاگتے میں بنوائی ہے بتاؤ... کیوں میری آنکھیں بند دکھائی ہیں تم نے؟" وہ اس کے چہرے پہ نظر جمائے پوچھ رہا تھا اور وہ نظر چرا رہی تھی۔

"بتاؤ ام ہانی۔" آخر ہانی نے نظر اٹھائی تو وہ اب تک اسے اسی انداز میں دیکھ رہا تھا۔ آخر جھنجلا اٹھی۔

"اس لیے نہیں بنائی۔"

"کس لیے؟" وہ مزید حیران ہوا۔

"آپ... آپ نا... آپ دیکھتے بہت ہیں۔" اس کے بے چارگی بھرے شکوے پہ سالار مسکرا اٹھا۔

"تو آنکھوں کا اور کام کیا ہے؟"

"آپ کی نگاہوں سے تو میں نظر چرا لیتی ہوں... مگر... مگر وہ تصویر جو بنا رہی ہوں اس پہ سے کیسے نظر ہٹاؤں اس لیے آنکھیں بند دکھا دیں کہ سکون سے تصویر تو مکمل کر سکوں۔"

سر جھٹکتے ہوئے وہ گلہ بھی کر رہی تھی اور ساتھ

ساتھ اپنی چیزیں بھی سمیٹ رہی تھی۔ کتنی دیر ہوگئی یہاں سے اب سیدھا اسکول کے لیے نکلنا ہوگا" اس نے گھڑی میں وقت دیکھنے کے لیے کلائی چہرے کے سامنے کی تو سالار نے اس کی وہی کلائی تھامی اور جھٹکے سے اپنی جانب کھینچا وہ اس کے سینے سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ ابھی سنبھلنے نہ پائی تھی کہ سالار نے اسے بالکل ہی بے جان کر ڈالا۔ اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں بھر کے۔

"اب کیسے بند کرو گی میری آنکھیں؟"

"چھوڑیں مجھے" سرگوشی سی نکلی اس کے کپکپاتے لبوں سے۔

"اور نہ چھوڑوں تو؟ رو دو گی؟" جواب میں ام ہانی کی آنکھوں کے کٹورے آنسوؤں سے بھر گئے۔ سالار نے دھیرے سے اپنے ہاتھ اس کے رخساروں سے ہٹائے۔

"میں نہ تو تم سے یہ پوچھوں گا کہ تم کسی اور کو چاہتی ہو یا نہیں... تمہاری زندگی میں کوئی اور ہے یا نہیں... میں یہ پوچھنے کی زحمت بھی نہیں کروں گا کہ تم انگیج تو نہیں... میں یہ بھی نہیں جاننا چاہتا ام ہانی... کہ تم مجھے پسند کرتی ہو یا نہیں... مجھے تم اچھی لگی ہو... بس یہ کافی ہے۔"

وہ دم بخود اسے سنتی جا رہی تھی اور وہ کہتا جا رہا تھا۔

"اور جو مجھے اچھے لگتے ہیں وہ میرے ہو جاتے ہیں ام ہانی... اب تم میری ہو۔"

☼ ☼ ☼
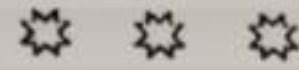
میرے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ جیسے تیز ہواؤں کے جھکڑ چل رہے ہوں۔ کلاس روم میں نہیں جیسے کسی لق ودق صحرا میں کھڑا ہوں جہاں چاروں جانب ریت اڑ رہی ہو۔ ریت کی کرکراہٹ مجھے اپنے دانتوں تک پہ محسوس ہو رہی تھی اور پلکوں پہ بھی... میں نے پلکیں مسلنا چاہیں۔

"سعد ڈو یو گیٹ دا پوائنٹ"

سر مختار کی آواز بازگشت بن کے گونجی... میں نے پلکیں مسل کے حیرت سے انہیں دیکھا۔ مجھے تو لگا تھا اس صحرا میں اس اڑتی ریت میں دور دور تک سوائے میرے اور کوئی نہیں ہے۔ پھر سر مختار یہاں کیسے... ریت کے اڑتے بگولوں کے پار ان کا ہیولا سا نظر آ رہا تھا۔

"سعد آئی ایم ٹاکنگ ٹو یو۔" اور پھر شعیب... جانے وہ بھی کہاں سے کود پڑا اور میرا بازو پکڑ کے زور سے ہلایا۔

"سعد..." میں جیسے ہوش میں آگیا۔ ریت تو یہیں اڑ رہی تھی۔ کلاس روم میں... جھکڑ یہیں چل رہے تھے... میں گھبرا کے اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا تمہیں سنائی نہیں دے رہا" سر مختار طنز سے مجھ سے پوچھ رہے تھے۔

"Excuse me sir" "ایکسکیوز می سر!"

مجھ سے اس کے علاوہ کچھ اور نہ کہا گیا اور میں تیزی سے کلاس روم سے نکل آیا طویل راہداری... سیڑھیاں... پھر ایک اور طویل راہداری... وسیع و عریض گراؤنڈ اس اڑتی ریت اور سائیں سائیں نے میرا تعاقب ہر جگہ کیا۔

کچھ تھا جو کھو رہا تھا... کچھ تھا جو چھن رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"جو مجھے اچھے لگتے ہیں... وہ... میرے ہو جاتے ہیں ام ہانی اور آج سے تم میری ہو۔"

ام ہانی کو ایسا لگا ضرور اس کی سماعتوں نے دھوکا کھایا ہے۔ وہ گنگ سی اسے دیکھتی رہی پھر کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"مم... مگر..."

لیکن اسی وقت سالار کی انگلی اس کے لبوں پہ آ کے ٹھہر گئی۔ وہ ایک پل میں سوہنی کے کچے گھڑے کی طرح چناب کی تند لہروں کے سپرد ہو گئی۔

"اس کے بعد اگر مگر کی گنجائش نہیں رہتی۔" وہ کہہ رہا تھا اس کے لبوں پہ انگلی رکھے اور کچا گھڑا لہروں پہ اچھل رہا تھا۔

"جب کسی کے ہو جاتے ہیں تو بس ہو جاتے ہیں۔
سوال نہیں کرتے۔ جواب نہیں مانگتے۔"
اور کچا گھڑا ان لہروں میں کہیں کھو گیا۔۔۔۔ سپردگی کی انتہا تو یہی ہوتی ہے نا۔

☼ ☼ ☼
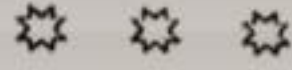
میں خالی خالی نظروں سے سامنے گراؤنڈ میں کچھ لڑکوں کو فٹ بال کھیلتے دیکھ رہا تھا جب شعیب میرے پاس آکے تشویش سے کہنے لگا۔
"سعد۔۔۔"
میں نے ان ہی خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا اور پتا نہیں اسے میرے چہرے پہ کیا نظر آیا جو اس کی تشویش خوف میں بدل گئی۔
"کیا ہوا ہے تمہیں سعد؟"
"کیا ہوا ہے؟" میں نے الٹا سوال کیا۔
"یہ تو تمہیں پتا ہوگا۔۔۔ کتنی محنت کی تم نے اپنی پریزنٹیشن پہ۔۔۔ اور سر کے سامنے ایسے بلینک ہوگئے جیسے۔۔۔ ہوا کیا ہے آخر؟"
"پتا نہیں۔۔۔ تم صحیح کہہ رہے ہو۔۔۔ میں واقعی بلینک ہو گیا تھا۔ کورے کاغذ کی طرح۔۔۔ ریت کے جھکڑ میں اڑتے ایک معمولی تنکے کی طرح۔۔۔ یہاں سے وہاں اڑتا ہوا۔۔۔ بے مقصد۔"
"کیا ہانک رہے ہو؟"
"میں سچ کہہ رہا ہوں شعیب اچانک بیٹھے بٹھائے پتا نہیں کیا ہو گیا تھا۔ ایسا لگا میرے اندر سے سب کچھ غائب ہو گیا ہو۔۔۔ کسی نے میری روح تک کھینچ لی ہے۔ خالی پن بالکل خالی۔"
"یار تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔"
شعیب نے مجھے بازو سے پکڑ کے اٹھایا۔
"شاید نیند نہ پوری ہونے کی وجہ سے۔۔۔ جا۔۔۔ ہاسٹل جا کے سو جا۔"
"جب میرے اندر کچھ رہا ہی نہیں۔۔۔ تو نیند کہاں رہی ہوگی۔"

☼ ☼ ☼

"تو پیا سے مل کے آئی ہے۔۔۔
بس آج سے نیند پرائی ہے۔"
ام ہانی قدم کہیں رکھ رہی تھی۔ پڑتے کہیں اور تھے۔ آنچل جھول کے پیروں تک آرہا تھا۔ لبوں پہ ایک مسکراہٹ تھی جو چھپائے نہ چھپتی تھی اور آنکھوں میں ایک خود فراموشی کی کیفیت۔ سلمیٰ پودوں کو پانی دیتے گنگنا رہی تھی۔
"تو لاکھ چلے ری گوری تھم تھم کے۔۔۔"
ام ہانی کو یوں ڈولتے قدموں کے ساتھ حویلی داخل ہوتے دیکھا تو حیران رہ گئی۔ اسے تو اس وقت اسکول ہونا چاہیے تھا۔
"ہانی بی بی۔۔۔"
"مگر ہانی تک اب کوئی آواز نہیں پہنچ رہی تھی۔ نہ پہنچ سکتی تھی۔ اس کے کانوں میں تو بس ایک ہی بازگشت تھی۔
"تم آج سے میری ہو۔"
"ہانی بی بی اسکول نہیں گئیں آپ؟"
وہ سلمیٰ کے پاس سے گزرنے لگی تو سلمیٰ نے پانی کا پائپ پرے کرتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔
"کچھ بول کیوں نہیں رہیں آپ ہانی بی بی۔"
اور وہ کیسے بولتی اس کے لبوں پہ تو ابھی تک وہ انگلی دھری تھی۔ شش۔۔۔ چپ۔۔۔
اور وہ اس عالم بے خودی میں اس کے پاس سے گزر کے چلی بھی گئی۔ سلمیٰ نے حیرت سے دیکھا اور پھر سر جھٹکتے ہوئے دوبارہ پانی کا چھڑکاؤ کرتے گنگنانے لگی۔
"تو ہے پگلی کہیں کے لوگ سکھی۔"

☼ ☼ ☼
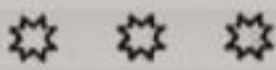
"نفوس کے ہوتے ہوئے بھی وہاں مکمل خاموشی تھی۔ علاوہ پنکھے کی ہلکی سی سرسراہٹ کے اور سالار کے کانٹے' چمچے کے کبھی کبھار آپس میں ٹکرانے کی آواز کے۔۔۔
سالار اعظم اپنی مخصوص سنجیدگی کے ساتھ کھانا کھانے میں مصروف تھا۔ اس سنجیدگی بھرے تاثرات

میں ہلکی سی تھکن کی آمیزش لیے اس کے سامنے بیٹھی اماں جان کھانے کے دوران گاہے بگاہے اس پہ نظر ڈال لیتی تھیں جیسے کچھ کہنا چاہ رہی ہوں، مگر سالار نے ایک بار بھی نظر اپنی پلیٹ سے نہیں ہٹائی تو انہیں ناچار گفتگو میں پہل کرنے کی ہمت کرنی پڑی۔

"میں سوچ رہی تھی کچھ دنوں کے لیے نورین کے پاس چلی جاؤں۔"

"چلی جائیں۔" بنا نظر اٹھائے اس نے کہا۔

"لیکن پھر بات کچھ دنوں کی نہیں رہے گی وہ جلد واپس نہیں آنے دے گی۔ روز روز اتنا سفر کرکے میں امریکا جا بھی تو نہیں سکتی۔"

وہ رکیں کہ شاید وہ کچھ کہے، مگر وہ اب پلیٹ میں مزید سلاد لے رہا تھا انہیں شبہ سا ہوا کہ پتا نہیں اس نے ان کی بات سنی بھی ہے یا نہیں۔

"اور وہ امید سے بھی ہے... سوچتی ہوں۔ ایک دو مہینے رک جاؤں... اکتوبر میں جاتی ہوں تاکہ اس کی ڈلیوری کے دوران اس کے پاس رہوں۔"

وہ پھر سے رک کر کسی جواب کی آس لیے اسے دیکھنے لگیں، مگر اب وہ اپنے فون پہ کوئی میسج پڑھ رہا تھا۔

"تم کیا کہتے ہو؟"

ان کے تیسری بار مخاطب کرنے پہ سالار کے چہرے پہ واضح بے زاری نظر آنے لگی۔

"میں کیا کہوں جیسے آپ کی مرضی... جب جانا چاہیں، بتادیں... میں ٹکٹ بنوا دیتا ہوں۔"

"تمہاری بہن شادی کے چھ سال بعد پہلی بار امید سے ہے اور تم نے اسے ایک بار بھی فون نہیں کیا۔"

"میرے فون کرنے سے کیا ہوگا۔" وہ نیپکن سے ہاتھ صاف کرتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"اسے خوشی ہوگی بیٹا۔"

"اسے خوش رکھنا میری ڈیوٹی میں شامل نہیں ہے۔" وہ رکھائی سے کہتا آگے بڑھا۔ اماں جان کے چہرے کی تھکن مزید بڑھتی ہوئی نظر آنے لگی۔

پھر سالار کو کچھ خیال سوجھا اور وہ رک کر کہنے لگا۔

"آپ ایک دو دن میں طے کرلیں کہ آپ کو ابھی جانا ہے یا دو ماہ بعد... کیوں کہ مجھے ایک کام ہے آپ کے ہوتے ہوئے ہو جائے تو بہتر ہوگا ورنہ مجھے دسمبر تک انتظار کرنا ہوگا آپ کے واپس لوٹنے کا۔"

وہ کم ہی اتنی طویل بات کرتا تھا ان سے۔

"کیا کام؟"

"شادی کرنا ہے مجھے۔"

مختصر جواب دے کر وہ انہیں حیران پریشان چھوڑ کے اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

ام ہانی اسی خواب جیسے پل کے سحر میں تھی۔ ہونٹوں پہ وہی انگلی اب تک یوں دھری تھی کہ صبح سے رات ہوگئی۔ وہ ایک لفظ تک نہ کہہ پائی۔ سعد کی کال دوبارہ آئی۔ فون بجتا رہا، مگر وہ کیا بات کرتی کیسے کرتی۔

یونہی بستر پہ کروٹیں بدلتے بدلتے اس بانسری کی صدا پھر سے سنی تو بے چین ہوکے کمرے سے نکلی اس کی توقع کے عین مطابق سلمیٰ برآمدے کے فرش پہ بیٹھی گھٹنوں میں سر دیے رو رہی تھی۔

"اسے کوئی منع کردے ہانی بی بی نہ چھیڑے ایسے سر نہ بلائے مجھے۔ میں نہیں جاسکتی اس سے ملنے۔"

"نہیں جاؤ گی تو وہ ایسے ہی ساری رات بانسری بجا بجا کے تمہیں پکارتا رہے گا۔" وہ اس کے پاس ہی فرش پہ بیٹھ گئی۔

"اب اس نے ساری رات نہیں ساری عمر ہی میری راہ تکنی ہے۔ بیگم صاحبہ نے ابھی بتایا ہے۔ اس چودھویں کو وہ میرا نکاح کررہے ہیں۔"

"تو تم انہیں بتادو انہیں تمہاری شادی ہی کرنی ہے تو خدا داد سے کردیں۔"

"نہیں کریں گے جی... حویلی کی نوکرانیوں کی شادیاں حویلی کے ملازموں سے ہی ہوتی ہیں تاکہ وہ ہمیشہ یہیں رہیں اور پھر ان کے بچے بھی... ہم نسل در نسل غلام رہتی ہیں بی بی... اور خدا داد... وہ ذات کا

کمہار ہے۔۔۔ میرے لیے سب چھوڑ چھاڑ کے حویلی کی چاکری کرنے بھی گیا تو کرے گا کیا؟ نکھٹو کو سوائے صراحیاں گھڑنے اور بانسری بجانے کے آتا ہی کیا ہے۔"

اسے روتا دیکھ کے ام ہانی کا دل بھی بھر آیا۔

"تو اب کیا ہوگا سلمیٰ؟"

"جو ہمیشہ ہوتا آیا ہے ہانی بی بی۔۔۔ جدائی۔"

ایک تیر سا ام ہانی کے دل کے پار ہو گیا۔ وہ تڑپ کے اٹھی اور بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں داخل ہوئی جہاں فون نجانے کب سے بج رہا تھا۔

"کہاں تھی تم۔۔۔ کب سے فون کر رہا ہوں؟" اس کی آواز سن کے میں جی اٹھا ورنہ صبح سے ان ہی ریت کے بگولوں میں تنکا بنا اڑ رہا تھا۔

"بس۔۔۔ ایسے ہی۔۔۔ دل نہیں لگ رہا تھا۔۔۔ عجیب سی ایک اداسی تھی تو ٹہلنے چلی گئی۔"

"مجھے پتا ہے کیوں پریشان ہو تم؟"

"کیا پتا ہے؟" وہ چونک اٹھی تھی۔ اس کی دھڑکنیں تیز ہونے کی آواز مجھے فون پہ بھی سنائی دیں۔

"کیوں کہ میں ٹھیک نہیں ہوں۔ طبیعت خراب ہے میری۔"

میں نے پورے وثوق سے کہا اور وہ پریشان ہو گئی۔

"اوہ۔۔۔ کیا ہوا تمہیں؟"

"یہ تو تمہیں پتا ہونا چاہیے مجھے تو فوراً پتا چل جاتا ہے اگر تمہاری طبیعت خراب ہو تو یا تم پریشان ہو جیسے ابھی بھی میں جان گیا ہوں۔ اب بتاؤ۔۔۔ میں سچ کہہ رہا ہوں نا؟"

"نہیں۔۔۔ میں تو بس وہ سلمیٰ کی وجہ سے۔۔۔ خیر چھوڑو بہت رات ہو گئی۔ تم سو جاؤ۔"

"نہیں۔ تم کہو۔" میں جانتا تھا اس کے دل پہ بوجھ ہو گا تو وہ سو نہیں پائے گی اس لیے اسے اکسانے لگا۔

"تم کہو ہنی میں ساری رات بھی سن سکتا ہوں۔"

"ساری رات؟"

"بس تم بولتی جاؤ۔ کچھ بھی۔۔۔ چاہے سلمیٰ کے بارے میں ہی سہی۔" اور وہ کہتی رہی۔۔۔ میں سنتا رہا۔۔۔ یہاں تک کہ اس کی ہی آواز نیند سے بوجھل ہو گئی۔ فون بند کرنے کے بعد میں بھی بڑی طمانیت سے آنکھیں موند کے لیٹ گیا جیسے میں نے اس کی پریشانی سنی نہ ہو۔ بلکہ خود پہ لے لی ہو۔

اگلی صبح کئی روز کے بعد میں قدرے حواسوں میں تھا۔۔۔ جاگنگ کے دوران یہ بات نوٹ کر کے شعیب نے فوراً" پوچھ بھی لیا۔

"وہ اس لیے کہ جان گیا ہوں۔۔۔ کل بیٹھے بٹھائے میرا کیا کھو گیا تھا۔"

"کیا کھو گیا تھا؟"

"اس کی ہنسی۔۔۔" شعیب میرے جواب پہ مسکرا دیا۔۔۔ میں اسے یقین دلانے لگا۔

"ہاں شعیب وہ اداس تھی نا اس لیے میں خالی خالی سا ہو گیا تھا۔"

☼ ☼ ☼
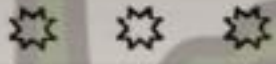
"بلیک کافی۔۔۔"

سالار نے اخبار کھول کے اپنے سامنے پھیلاتے ہوئے ملازم سے کہا۔ اماں بیگم خاموشی سے ملازمہ کو اس کے سامنے کافی رکھتے اور سلائس پہ پی نٹ بٹر لگاتے دیکھتی رہیں اور جیسے وہ کچن کی جانب مڑا پوچھنے لگیں۔

"سالار۔ کون ہے وہ لڑکی؟" سالار نے اخبار چہرے سے ہٹا کے انہیں ایسی عجیب سوالیہ نظروں سے دیکھا کہ وہ خود تذبذب میں آ گئیں کہ شاید انہوں نے کوئی بہت ہی نامعقول بات پوچھ لی ہے۔

"وہی۔ جس سے۔۔۔ جس لڑکی سے تم شادی کرنا چاہتے ہو۔" گڑبڑا کے انہوں نے وضاحت دی مگر اس وضاحت نے سالار کی پیشانی کے بلوں میں کچھ اور اضافہ کر دیا۔

"آپ جان کے کیا کریں گی؟" سالار کے خشک لہجے کے جواب میں ان کا لہجہ مزید کمزور اور پھس پھسا ہوا۔

"ماں ہوں تمہاری۔" سالار کے چہرے کی ناگواری

چھلک چھلک جارہی تھی۔ کافی کا آخری گھونٹ بھرتے "اخبار تہ کر کے واپس میز پہ رکھتے اور میز سے اپنا چشمہ اور فون اٹھا کے کھڑے ہوتے" سالار کو وہ خاموشی سے دیکھتی گئیں اور پھر مایوس انداز میں کہہ اٹھیں۔

"تو نہیں بتاؤ گے۔" جاتے جاتے سالار رکا اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی سراسر احسان جتاتے انداز میں بتانے لگا۔

"ام ہانی۔ یہیں رہتی ہے۔ اچھے گھرانے کی ہے۔"

"خود بھی بہت اچھی ہوگی۔ مجھے یقین ہے میرے بیٹے کا معیار بہت اونچا ہے۔ خدا اسے تمہارے اور تمہیں اس کے حق میں بہت نیک اور مبارک کرے۔"

وہ جانتی تھیں کہ وہ ان کے دعا مکمل ہونے سے پہلے ہی یہاں سے جاچکا ہوگا۔ پھر بھی دل کھول کے خدا کے حضور دعائیں مانگنے لگیں۔

☼ ☼ ☼
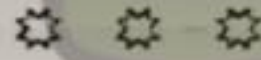
دونوں اس نہر کے کنارے اس بڑے سے پتھر پہ بیٹھے تھے۔ سالار اسے دیکھتا جارہا تھا اور وہ اپنی گود میں رکھے ہاتھوں کو۔

"کیا سوچ رہی ہو۔"

"کچھ خاص نہیں۔ سلمیٰ کے بارے میں۔"

"سلمیٰ؟"

سالار کے ماتھے پہ شکن نمودار ہوگئی۔

"یہ کون ہے جسے تم میرے ساتھ بیٹھ کے سوچ رہی ہو۔"

"ہماری ملازمہ؟"

ام ہانی کے سادگی سے کہنے پہ اب سالار کو اپنی برہمی چھپانا مشکل لگنے لگا۔

"ملازمہ؟ ام ہانی۔ آج سے تمہاری سوچوں میں ایسے لوگوں کا داخلہ ممنوع ہے۔"

اس کے لہجے میں ایسی واضح تنبیہہ تھی کہ وہ گڑبڑا اٹھی۔

"نہیں۔ میں تو بس ایسے ہی۔ دراصل وہ جسے پسند کرتی ہے۔ وہ۔۔۔"

سالار نے اس کی بات درشتگی سے کاٹ دی۔

"وہ کسے پسند کرتی ہے' کسے نہیں یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ تمہارے لیے بس یہ جاننا اہم ہے کہ مجھے یہ بات بالکل بھی پسند نہیں ہے کہ تم میرے ساتھ ہوتے ہوئے کسی اور کے بارے میں سوچو بھی۔"

پل بھر میں وہ مہربان سے اتنا نامہربان ہو جاتا تھا کہ ام ہانی سہم جاتی تھی۔ اب بھی چپ چاپ سر جھکا کے رہ گئی۔ سالار اسے غور سے دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

"اب رو دو گی؟"

"نہیں تو۔" آنسوؤں سے رندھی آواز میں بولی۔

"ام ہانی۔ میں اپنے قیمتی وقت میں سے یہ لمحے نکال کے تمہارے پاس اس لیے آیا ہوں کہ تم اپنی بات کہو۔ میری سنو۔" اس کا لہجہ پھر سے مہربان پا کے وہ ہلکی پھلکی ہو گئی۔ پھر تمہید باندھتے ہوئے کہنے لگی۔

"پتا ہے سالار۔ کچھ دن پہلے گھر میں میری شادی کی بات چلی تھی۔ میرا ایک کزن۔"

اور سالار کو اس کی بات کاٹنے کا جیسے شوق سا لاحق ہو چکا تھا۔

"وہ جو بھی ہے اس کی قسمت میں صرف مایوسی اور ناکامی ہے۔۔۔ میں نے کہا ناں۔۔۔ تم میری ہو چکی ہو۔"

"ہاں۔ ٹھیک کہتے ہیں آپ۔" وہ مسکرائی۔

"تقدیر نے شاید اسی لیے اس بات کو شروع ہونے سے پہلے ختم کر ڈالا۔ مگر گھر میں سب سنجیدہ ہیں اب۔ وہ میری شادی جلد از جلد کرنا چاہتے ہیں۔"

"اچھی بات ہے۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں۔" اس کی سادہ سی بات نے ام ہانی کو اتنا بڑا دلاسا دیا کہ وہ مطمئن سی ہو گئی۔ اس کی نظر نہر کے پار والے جامن کے درخت پہ گئی۔ جس کی شاخوں میں شام کی لالی سے لڑتا سورج دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی نظروں کے تعاقب میں سالار نے بھی اسی جانب نظر اٹھائی۔

"وہاں کیا دیکھ رہی ہو؟"

"وہ دیکھیں۔ سورج کی لالی۔ اور۔ اس درخت کی شاخوں میں سے۔ جھلکتا یہ منظر کتنا خوب صورت لگ رہا ہے۔"

ابھی اس کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ سالار اٹھ کے اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ کچھ اس طرح کہ اس کے وجود نے ام ہانی کی بصارت کی آخری حد کو بھی اپنے حصار میں لے لیا۔ اب ام ہانی کو صرف وہ اور صرف وہ ہی نظر آ رہا تھا۔

اس کے جانے کے بعد بھی۔۔۔

اور حویلی واپس آنے کے بعد بھی۔۔۔

بس وہی نظروں میں سمایا ہوا تھا۔ جیسے پتلیوں میں جم کے رہ گیا ہو۔

"ہانی بی بی۔ ہانی بی بی۔"

سلمیٰ کے روتے ہوئے پکارنے پہ اس کی محویت ختم ہوئی۔ وہ روتی بلکتی باہر سے آ رہی تھی۔

"وہ مر جائے گا ہانی بی بی وہ تو سن کے ہی مرن جوگا ہو گیا۔ آپ نے ہی کہا تھا کہ اس سے مل کے آؤں۔ اسے بتاؤں۔ کہ میں کسی اور کی ہونے جا رہی ہوں۔ شاید وہ کچھ کرے۔۔۔ نہیں ہانی بی بی۔۔۔ وہ کیا کرے گا کچھ۔۔۔ وہ تو اگلا سانس لینے جوگا بھی نہیں رہا۔"

وہیں فرش پہ اس کے سامنے بیٹھ کے وہ بین ڈالنے لگی۔

"پتا نہیں کس دل سے میں نے اسے بتایا۔ وہ کچھ نہیں کر سکے گا ہانی بی بی۔ اب میں کسی اور کی ہو جاؤں گی۔"

"جب کسی کے ہو جاتے ہیں۔۔۔ سلمیٰ۔ تو بس ہو جاتے ہیں۔۔۔" یہ ام ہانی نہیں۔ اس کے اندر۔ اندر سالار اعظم بول رہا تھا۔

"نہیں بی بی۔ جب ہمارا ہونا یا نہ ہونا ہی ہمارے بس میں نہیں ہے تو کسی کا ہونے پہ کیا زور۔ میں کم ذات۔ اسی حویلی کی تو شہزادیاں بھی روایتوں کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ آپ نے دیکھا نہیں مہ پارہ بی بی کی جوانی کیسے رل گئی۔۔۔ برابر کا جوڑ نہ ملنے پہ۔ تو بھلا ایک کمی کمیں کی کون سنے گا۔"

امیر ہانی کا دل سکڑ گیا۔ وہ اٹھی اور اندر جاتے ہی

فون پہ نمبر ملانے لگی۔

اور میں کھل اٹھا۔

"جب سے آیا ہوں۔ پہلی بار تم نے فون کیا ہے مجھے، ورنہ ہمیشہ میں ہی کرتا ہوں۔"

"سنو۔ تم سے ایک کام تھا۔" وہ بہت سنجیدہ لگ رہی تھی۔

"کچھ منگوانا ہے میں نے۔"

"کہو ناں... کیا چاہیے... یہاں لاہور میں بہت اچھی اچھی چیزیں ملتی ہیں۔ جو کہو گی... لادوں گا۔"

میں پرجوش ہو گیا۔ وہ بھلا کہاں کرتی تھی فرمائشیں۔

"چوڑیاں۔"

"ہاں۔ ضرور۔ بہت ڈھیر سی۔ کون سے رنگ کی۔"

"نہیں بدھو۔ وہ والی... منت کی... وہ جو تم بتا رہے تھے کہ ان کو پہننے سے۔ اوفوہ۔ تم نے ہی تو کہا تھا۔" وہ جھجکی... پھر ہچکچائی... پھر جھلا کے کہہ اٹھی۔

مجھے ہنسی آگئی۔

"اچھا۔ وہ جن کو پہننے سے نہ صرف شادی جلدی ہو جاتی ہے بلکہ وہیں ہو جاتی ہے جہاں خواہش ہو۔"

"ہاں۔"

"یار اپنے لیے منگواؤ ناں کچھ۔ میں نہیں لانے والا سلمیٰ کے لیے۔" میں مایوس ہو گیا۔ منگوایا بھی کچھ تو سلمیٰ کے لیے۔

"سلمیٰ کے لیے نہیں۔ اپنے لیے منگوا رہی ہوں بدھو۔"

"سچ؟" میں ہواؤں میں اڑنے لگا۔

"صبح ہی لے کر آتا ہوں۔"

اور اس نے جلدی آنے سے منع بھی نہیں کیا۔

میں اسی رات پیکنگ کرنے لگا۔

"اب بیٹھے بٹھائے چل پڑے ہو۔ ویک اینڈ پہ چلے جانا۔" شعیب نے مجھے بیگ میں کپڑے ٹھونستے دیکھ کے بلاوجہ کا مشورہ دیا۔

"چپ کر۔ ویک اینڈ میں تین دن باقی ہیں۔ میں نہیں رک سکتا۔ پہلی بار تو اس نے مجھ سے کچھ مانگا ہے۔"

"اور وہ بھی تمہارے مطلب کا۔"

"ہاں۔ اور ابو بھی دو دن کے لیے کراچی گئے ہوئے ہیں انہیں پتا بھی نہیں چلے گا۔ میں صبح جاؤں گا۔ اگلی صبح واپس۔"

اور پھر بیڈ پہ گر گیا۔ اس کے ملنے کے تصور نے میرے وجود میں عجیب سی سرشاری بھر دی تھی۔

"شعیب... دیکھ... اسے ملنے کے خیال سے ہی مجھ میں جان پڑ گئی ہے۔ جی اٹھا ہوں۔"

"میں نے تجھے کہا تھا ناں سعد۔ کبھی کبھی جدائی کچھ نہیں کہتی۔ قربت مار دیتی ہے۔"

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

بشریٰ احمد

"فراز بہت اچھا لڑکا ہے۔ عابدہ باجی کو وہ تمہارے لیے بہت پسند ہے۔ بظاہر کوئی ایسی خامی بھی..."

"مامی آپ اتنے مزے کے کٹلس کیسے بنا لیتی ہیں۔ میں نے پچھلی بار بھی گھر جا کر آپ کی ریسپی ٹرائی کی تھی لیکن ایسے کٹلس نہیں بنے واہ مزا آ گیا۔" شمائل نے تیسرا کٹلس اٹھا کر پلیٹ میں ڈالا اور بے ساختہ تعریف بھی کی۔

"تم بات ٹال رہی ہو۔" میں نے اسے مصنوعی خفگی سے گھورا۔

"افوہ مامی میں اس لیے تو آپ لوگوں کے ہاں رہنے نہیں آئی کہ ممی کی طرح آپ بھی ایک موضوع لے کر میرا پیچھا پکڑ لیں۔ کوئی اور اچھی سی بات کریں نا۔ بلکہ آئیں دونوں مامی' بھانجی بیٹھ کر کوئی اچھی سی مووی دیکھتے ہیں۔" شمائل کے انداز پر مجھے ہنسی آ گئی۔

"اچھی سی مووی میں بھی تو یہ ہی کچھ ہوتا ہے۔ ایک ہیرو' ایک ہیروئین اور فلم کے اختتام پر ان کی شادی۔"

"خیر آج کل ایسی موویز نہیں بن رہیں مامی جان یہ آپ انیس سو ساٹھ کے زمانے کی بات کر رہی ہیں لیکن اگر' آپ کی بات کو درست تسلیم کر بھی لیا جائے تو بندہ کچھ کچھ ہیرو تو لگے پھر شادی کے متعلق سوچا جا بھی سکتا ہے۔ فراز کو دیکھا ہے آپ نے کس قدر عام سا بندہ ہے۔ کیا میرے ساتھ سوٹ کرے گا وہ۔"

شمائل پوچھ رہی تھی میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔ آئیڈیلزم صرف آج کے دور کی بچیوں کا نہیں بلکہ شاید ہر دور کی لڑکیوں کا مسئلہ ہوتا ہے۔ اور ایسے گھرانے جہاں شادی بیاہ کا فیصلہ کرتے وقت بچیوں کی رائے کو اہمیت دی جاتی ہے۔ اس آئیڈیلزم کی وجہ سے والدین کو بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

عابدہ باجی میری اکلوتی نند ہیں اور شمائل ان کی اکلوتی بیٹی۔ ہر ماں کی طرح عابدہ باجی کی بھی یہ ہی خواہش تھی کہ مناسب عمر میں بیٹی کو اس کے گھربار کا کر دیں۔

شمائل خوب صورتی کے مروجہ پیمانوں پر پوری اترتی تھی سو' چھوٹی عمر سے ہی اس کے لیے رشتے آنا شروع ہو گئے تھے۔ جب تک اس کی تعلیم کا سلسلہ مکمل نہیں ہو گیا عابدہ باجی خود ہی سہولت سے رشتے والوں کو ٹالتی رہیں' پھر اکلوتی بیٹی کا رشتہ وہ پوری چھان پھٹک کے بعد کرنا چاہتی تھیں۔ کسی ایسے ویسے رشتے پر تو انہوں نے خود غور تک کرنے کی زحمت گوارا نہ کی تھی' لیکن شمائل کا تعلیمی سلسلہ مکمل ہونے کے بعد اس کے لیے جو بھی معقول رشتہ آیا عابدہ باجی نے سنجیدگی سے اس پر غور و خوض کیا پر۔

جب شمائل کی رائے لینے کا مرحلہ درپیش آتا تو شمائل ان رشتوں میں کوئی نہ کوئی مین میخ نکال کر صاف انکار کر دیتی۔ کچھ عرصہ تو عابدہ باجی نے تحمل سے کام لیا لیکن اب ان کی برداشت کی حد ختم ہونے کو تھی۔ ویسے بھی آج کل شمائل کے لیے جو پروپوزل آیا تھا وہ عابدہ باجی کے خیال میں ہر لحاظ سے بہترین تھا۔ فراز' عابدہ باجی کی خالہ زاد بہن کا بیٹا تھا لڑکا میرا بھی دیکھا بھالا تھا۔ پڑھا لکھا' برسرروزگار' مختصر سا کنبہ اور سب گھر والے انتہائی ملنسار اور وضع دار' وہ لوگ۔ بہت

چاہت سے شمائل کا رشتہ مانگ رہے تھے۔

عابدہ باجی اور سبحان بھائی نے تو سوچ کر جواب دینے کے لیے رسمی سی مہلت مانگی تھی مگر' جب انہوں نے اپنی لاڈو سے رائے لی تو وہ اس رشتے کو بھی خاطر میں نہ لائی۔ وجہ صرف اتنی سی تھی کہ فراز اس کے خوابوں کے شہزادے جیسا نہ تھا۔ سچ یہ تھا کہ فراز بہت خوب صورت نہ تھا لیکن' بدصورت بھی نہ تھا۔ وہ قابل قبول شکل و صورت اور درمیانی قد و قامت کا ایک سلجھا ہوا اور شریف النفس لڑکا تھا۔

عابدہ باجی ایسے اچھے رشتے کو ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہ رہی تھیں۔ انہوں نے شمائل کو سمجھانے کی ذمہ داری ہمارے کندھوں پر ڈال کر اسے ہمارے پاس رہنے بھیج دیا تھا۔

شمائل عارفین کی لاڈلی بھانجی تھی تو' مجھے بھی کچھ کم عزیز نہ تھی۔ سترہ برس قبل جب میری شادی ہوئی تھی تو شمائل کوئی پانچ' چھ برس کی بہت پیاری سی بچی

تھی۔ ان دنوں سبحان بھائی (عابدہ باجی کے شوہر) کی ملازمت یہیں اسی شہر میں تھی۔ عابدہ باجی کا گھر ہمارے گھر سے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ شمائل کی شامیں اپنی نانو کے ہاں گزرتیں۔ وہ اپنی نانی اور ماموں کی تو لاڈلی تھی ہی، مجھے بھی اس پیاری سی بچی سے چند ہی دنوں میں بہت انسیت اور لگاؤ ہو گیا تھا۔ وہ عام بچوں کی طرف ہرگز شرارتی نہ تھی بلکہ، بہت تمیز یافتہ بچی تھی۔ اپنے سے دونوں چھوٹے بھائیوں کو بھی تمیز، تہذیب سکھانے کی کوشش میں ہلکان ہوئے رہتی۔ اس کی معصومانہ اداؤں سے پورا گھرانہ محظوظ ہوتا پھر کچھ برسوں بعد سبحان بھائی کا ٹرانسفر دوسرے شہر ہو گیا۔

عابدہ باجی کا آنا جانا شوہر اور بچوں کی چھٹیوں سے مشروط ہو گیا۔ میری ساس کے انتقال کے بعد ان کا آنا مزید محدود ہو گیا ہاں شمائل اب بھی اپنی چھٹیاں ہمارے ہاں ہی گزارتی۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کی ہمارے ساتھ وابستگی مزید گہری ہی ہوئی تھی۔ قدرت نے مجھے تین بیٹوں سے نوازا تھا باوجود خواہش کے، ہمیں بیٹی جیسی رحمت سے نہ نوازا گیا۔ میں شمائل کو ہی بیٹیوں کی طرح چاہتی تھی اور اب اس نٹ کھٹ سی بیٹی کو سمجھانے کا مشکل مرحلہ درپیش تھا۔

عابدہ باجی نے بہت آس سے شمائل کو ہمارے ہاں بھیجا تھا۔ انہیں قوی امید تھی کہ جو کام وہ نہ کر سکیں، وہ میں کرلوں گی۔ یعنی شمائل کو فراز کے رشتے پر راضی کر لوں گی، لیکن شمائل فراز کا نام سننے پر ہی تیار نہ ہو رہی تھی۔ میں نے عابدہ باجی کو فون کر کے صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔

"ٹھیک ہے میں عارفین سے کہتی ہوں کہ وہ سمجھائے اسے۔" اور عابدہ باجی نے یقیناً "فوراً" ہی عارفین کو فون کھڑکا دیا تھا۔ رات کھانے کے بعد عارفین نے شمائل کو اپنی اسٹڈی میں آنے کا کہا اور مجھے گرم گرم چائے بنا کر لانے کا آرڈر جاری کیا۔ میں حسب حکم چائے بنا کر مگ ٹرے میں سجائے اسٹڈی میں چلی آئی۔

عارفین پہلی بار بھانجی سے اس موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ ماموں، بھانجی کی آپس میں لاکھ بے تکلفی سہی لیکن شمائل اس موضوع پر عارفین کے سامنے بات کرنے سے ہچکچا رہی تھی اور شاید اسی جھجک اور گریز کو بھانپتے ہوئے عارفین نے اتنے دنوں شمائل کو سمجھانے کا کام میرے سپرد کر رکھا تھا۔ میری ناکامی پر مجبوراً" انہیں اس کام کا بیڑا خود اٹھانا پڑا۔

"اگر یونیورسٹی میں کسی کو پسند کرنے لگی تھی بیٹا تو ہمیں کھل کر بتاؤ۔ لڑکا اچھا ہوا تو میں خود عابدہ باجی کو قائل کرلوں گا۔" وہ شمائل سے نرمی سے استفسار کر رہے تھے۔

"ہائے اللہ ماموں کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ قسم لے لیں کہ ایسی کوئی بات نہیں۔" شمائل بوکھلا کر وضاحت دینے لگی عارفین اور میں دونوں ہی مسکرا دیے تھے۔

"پھر اپنی امی کو کیوں ستا رہی ہو۔ فراز بہت اچھا لڑکا ہے۔ اس کے لیے ہاں کیوں نہیں کر دیتیں۔" عارفین نے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔

"میری کون سا شادی کے لیے عمر نکلی جا رہی ہے عارفین ماموں!" شمائل ٹھنکی تھی۔

"یہ میرے سوال کا جواب تو نہیں۔" عارفین نے مسکرا کر بھانجی کو دیکھا۔ شمائل مدد طلب نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔

"مسئلہ صرف اتنا سا ہے عارفین کہ شمائل نے لائف پارٹنر کے لیے جو خاکہ ذہن میں تراشا ہوا ہے فراز اس خاکے پر پورا نہیں اترتا۔" میں نے شمائل کی مشکل آسان کی۔

"اوہ یعنی آئیڈیل کا چکر ہے۔" عارفین نے بات سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔ شمائل کی خاموشی نے عارفین کی بات کی تائید کی تھی۔

"قصور تمہارا نہیں ہے بیٹا جی۔ جوانی میں بندے کو ایسی ہی ہری ہری سوجھتی ہے۔" عارفین مسکرائے تھے۔ میں اس مسکراہٹ سے جھلکتی تھی۔ میری چھٹی حس جتا رہی تھی کہ اب عارفین کیا مضمون باندھنے

والے ہیں۔

"جوانی میں اس آئیڈیل کے پیچھے ہم بھی بہت خوار ہوئے ہیں۔ بیٹا!" عارفین شمائل سے مخاطب تھے۔

میں نے گہری سانس اندر کھینچی میری چھٹی حس نے صحیح موقع پر الارم بجایا تھا۔

"جب تمہاری مما اور نانی نے میرے لیے رشتہ ڈھونڈنا شروع کیا تو میں نے انہیں صاف صاف بتا دیا تھا کہ لڑکی میں کون کون سی خصوصیات ہونی چاہیں، ورنہ میں شادی کے لیے قطعی حامی نہیں بھروں گا۔"

"اچھا مثلاً" کن خوبیوں اور خصوصیات والی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے تھے آپ۔" شمائل نے دلچسپی سے استفسار کیا۔ عارفین مزید ترنگ میں آگئے تھے۔

"تمہارے ماموں جوانی میں بہت اچھی شاعری کرتے تھے انہیں بیوی بھی ایسی چاہیے تھی جو جیتی جاگتی غزل ہو۔" عارفین کے کچھ بولنے سے پہلے ہی میں بول پڑی تھی۔ عارفین قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

"ہاں بھئی کچھ ایسا ہی سراپا تراش رکھا تھا ہم نے اپنی شریک حیات کے حوالے سے گورا رنگ، دراز قد، متناسب سراپا، ستواں ناک، پنکھڑیوں جیسے لب، غلافی آنکھیں، مترنم آواز، شیریں بیان۔"

"اف اللہ ماموں بس کریں۔ آدھی باتیں تو میرے سر پر سے گزر رہی ہیں۔" شمائل کو زوروں کی ہنسی آئی تھی۔

"تمہاری مما اور نانو کی سمجھ میں بھی یہ باتیں نہ آتی تھیں۔ خصوصاً" اماں تو سخت خفا ہوتی تھیں، کہتی تھیں پرستان کی پریوں جیسے لڑکی کہاں سے ڈھونڈوں تیرے لیے، میں جواب میں کہتا کہ اماں جب آپ کے گھر شہزادوں جیسا بیٹا جنم لے سکتا ہے تو اس شہر کے کسی گھر میں کوئی شہزادی بھی تو بستی ہوگی۔"

عارفین دلکش مسکراہٹ چہرے پر سجائے ماضی کی یادوں میں کھوئے ہوئے تھے اور میں اپنے بے پناہ وجیہہ اور خوبرو شوہر کو خاموشی سے تکتے ہوئے یہ سوچ رہی تھی کہ، وقت نے عارفین کا کچھ بھی تو نہیں بگاڑا وہ آج بھی کتنے وجیہہ اور خوبرو ہیں۔"

"پھر کیا ہوا ماموں۔" شمائل دلچسپی سے استفسار کر رہی تھی۔

"ہونا کیا تھا اماں اپنے رشتے کے بھتیجے کی شادی میں شرکت کے لیے خانیوال گئیں اور وہاں اماں کو تمہاری مامی نظر آگئیں۔ دھیمے مزاج کی، سلیقہ مند اور سلجھی ہوئی لڑکی۔ بس اماں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ میری مرضی جانے بغیر وہاں میری بات پکی کر دی نہ صرف بات پکی کر دی بلکہ، دو مہینے بعد شادی کی تاریخ بھی مقرر کر دی۔ میں نے بہت شور مچایا لیکن بے سود۔ دو مہینے بعد میں دولہا بنا اپنی بارات کے ہمراہ خانیوال پہنچا ہوا تھا دل میں موہوم سی امید تھی کہ، تمہاری مامی میرے تخیلاتی خاکے پر پوری اترتی ہوں گی مگر شادی کے بعد امید تو ٹوٹی سو ٹوٹی، دل بھی بہت بری طرح ٹوٹا۔ ایک عرصے تک تو میرے تیور بہت بگڑے اکھڑے رہے۔

آئیڈیل نہ مل سکنے کا غم جھنجلاہٹ اور اضطراب میں بدل گیا لیکن، جب وقت گزرا تو اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ تمہاری مامی بہت خدمت گزار اور وفا شعار بیوی ثابت ہوئیں۔ مجھ جیسے لاڈ پیار میں بگڑے بچے کو انہوں نے خوب قابو میں کر لیا۔" عارفین مجھے دیکھتے ہوئے شرارتی انداز میں مسکرائے۔ میں بھی مسکرا دی جبکہ شمائل کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

"ہنسنے کی نہیں ہو رہی بھانجی جان۔ میں تمہیں یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ آئیڈیل وائیڈیل کے چکر سے باہر نکلو۔ میری مثال سامنے رکھو آئیڈیل نہ مل سکا مگر آئیڈیل زندگی میسر آگئی۔ گھر میں ہمیشہ امن آشتی کا دور دورہ رہا۔ تمہاری مامی نے اپنے سے وابستہ تمام رشتوں کو بخوبی نبھایا۔ تابعدار بہو، ملنسار بھاوج، خدمت گزار بیوی بہترین ماں۔۔۔۔"

"اور بہت کیوٹ سی مامی۔" شمائل نے عارفین کی بات کاٹتے ہوئے بہت پیار سے مجھے دیکھا تھا۔ میں مسکرا دی تھی۔ عارفین اب شمائل کو فراز کے لیے قائل کرنے کے لیے مزید دلائل دے رہے تھے۔ امید تھی کہ وہ بھانجی کو قائل کر لیں گے۔ عارفین کو بولنے کا فن تو خوب آتا تھا۔ اب بھی کس خوب

صورتی ہے انہوں نے تین فقروں میں میری پوری زندگی کا تجزیہ کردیا تھا۔ یہ ایک طرح کا خراج تحسین بھی تھا، لیکن خوش ہونے کے بجائے میرے لبوں پر تھکی تھکی سی افسردہ مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

انہوں نے شمائل کو کتنے سرسری سے انداز میں بتایا تھا کہ 'شادی کے بعد ان کے تیور اکھڑے اکھڑے تھے۔ مجھے آج بھی اپنی ازدواجی زندگی کے وہ اولین دن یاد تھے جب شوہر کے بگڑے اکھڑے تیور سہتے سہتے میرے اعصاب چٹخنے لگتے تھے۔ میں بہت آرزوؤں اور ارمانوں کے ساتھ عارفین کی زندگی میں شامل ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼
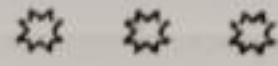
جن دنوں میرے لیے عارفین کا رشتہ آیا تھا۔ نادر کے والدین نے بھی میرے لیے دست سوال بلند کیا تھا۔ نادر میرا چچازاد بھائی تھا۔ درمیانے قد اور معمولی نین نقش والا نادر کسی طور میرا آئیڈیل نہ تھا۔ امی، ابو کا ووٹ نادر کی طرف ہی تھا۔ وہ اپنا تھا اور دیکھا بھالا بھی لیکن جب مجھ سے رائے مانگی گئی تو میں نے عارفین کے حق میں فیصلہ دیا۔ میری ساس نے عارفین کی جو تصویر میرے والدین کو دکھائی تھی وہ تصویر اب میری ڈائری میں محفوظ تھی۔ میں روز رات کو سونے سے پہلے اس اپالو کے نین نقش حفظ کرتی اور اپنی خوش قسمتی پر رشک کرتی، خاندان کی کسی لڑکی کو ایسا شاندار بر نصیب نہ ہوا تھا۔

میں عارفین جیسے شخص کے ہی تو خواب دیکھتی تھی۔ بڑی باجی کبھی میری باتیں سنتیں تو سمجھاتیں کہ، اس دنیا میں آئیڈیل ملنا بہت مشکل ہے اور میں تصوراتی خواب و خیال کی دنیا سے باہر آجاؤں۔

"یہ تو صرف میرے خواب ہیں باجی۔ ظاہر ہے امی، ابا جہاں میرا رشتہ طے کریں گے آپ لوگوں کی طرح میں بھی چپ چاپ سر جھکا کر پیا دیس سدھار جاؤں گی۔" میں باجی کو تسلی دیتی۔

لیکن جب عارفین کا رشتہ آیا تو میں نے امی، ابا کی رائے کا احترام کرنے کے بجائے تابعداری سے انہیں اپنی خواہش سے آگاہ کردیا۔ ابا بہت روشن خیال باپ تھے انہوں نے میری مرضی کو مقدم رکھا اور عارفین کے ساتھ میری نسبت طے کردی۔

میرا شمار اپنے خاندان کی خوب صورت لڑکیوں میں ہوتا تھا۔ دلہن بن کر مجھ پر روپ بھی خوب آیا میری کزنز مجھے چھیڑ رہی تھیں کہ، مجھے دیکھ کر عارفین کے ہوش اڑ جائیں گے۔ ہوش تو میرے اڑے جب، میرا گھونگھٹ پلٹنے کے بعد عارفین نے ناقدانہ نگاہوں سے میرا جائزہ لیا اور سپاٹ سے انداز میں مجھے باور کروا دیا کہ 'میں ان کی امیدوں پر پورا نہیں اتری اور یہ کہ میں ان کی اماں کی پسند ہوں تو مجھے کوشش کرنا ہوگی کہ میں کم از کم اماں کی امیدوں پر پورا اتروں۔ میری توقعات کا شیش محل دھڑام سے زمین بوس ہوا تھا۔ میں عارفین جیسی حسین جمیل نہ سہی لیکن گئی گزری شکل و صورت کی مالک بھی نہ تھی۔ آج سے پہلے تو مجھے ہمیشہ سراہا ہی گیا تھا لیکن، یہ بھی سچ تھا کہ میں عارفین کے آئیڈیل والے تصور پر پورا نہ اتری تھی۔ شادی کے بعد جب سسرالی عزیزوں کے ہاں دعوتیں شروع ہوئیں تو ہر جگہ عارفین سے یہ ہی سوال کیا جاتا۔

"ہاں بھئی اب تو خوش ہو مل گئی آئیڈیل دولہن۔" یہ شرارت میں کیا جانے والا عام سا مذاق تھا خاندان میں سب ہی عارفین کی آئیڈیل والی ضد سے واقف تھے، سو اسی حوالے سے ان سے چھیڑ چھاڑ کرتے تھے۔ سوال کرنے والے کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوتا کہ، عارفین نخوت بھرے انداز میں میری جانب انگلی اٹھا کر کہیں گے۔

"آئمہ اور میری آئیڈیل کیسی بات کرتی ہیں آپ عائشہ چچی۔" میرے چہرے کا رنگ تو فق ہوتا، سو ہوتا بے چاری عائشہ چچی بھی گڑبڑا کر بات پلٹنے کی کوشش کرتیں۔ وہ تضحیک بھرے لہجے میں اپنی یادداشت سے کھرچ کر بھی نہیں مٹا سکتی۔

معمولی معمولی باتوں پر عارفین کا پارہ ہائی ہوجاتا وہ

لوگوں کی پروا کیے بغیر مجھے بے نقط سنا ڈالتے۔ میری ساس بہت شفیق خاتون تھیں۔ وہ مسلسل مجھے تسلی دلاسے دیے جاتیں۔

"عابدہ کے بعد میرے تین بچے فوت ہوئے۔ بہت منت مرادوں کے بعد عارفین میری گود میں آیا تھا ہمیشہ ہتھیلی کا چھالا بنائے رکھا اس لیے لاڈ پیار میں بگڑ گیا ہے۔ میری بچی تیرا انتخاب اسی لیے کیا ہے کہ 'تو مجھے بہت دھیمے مزاج کی لڑکی لگی تھی۔ میرے بگڑے بیٹے کو تو ہی سدھار سکتی ہے۔" عارفین کی غیر موجودگی میں اماں مجھے سمجھاتی رہتیں۔ میں چپ چاپ ان کی باتیں سنتی اور اثبات میں گردن ہلا دیتی۔ کمپرومائز کے سوا اب چارہ ہی کیا تھا۔

اچھے دنوں کی آس میں مجھے یہ وقت صبر و برداشت سے کاٹنا تھا میکے جاتی تو نادر اور عارفہ کی ہنستی مسکراتی زندگی بے نام سی خلش میں مبتلا کر دیتی۔ عارفہ میری کزن تھی اور اب نادر کی بیوی۔ معمولی شکل و صورت والی عارفہ کو نادر نے رانی بنا کر رکھا ہوا تھا۔ میں اپنی اور عارفہ کی زندگیوں کا موازنہ نہ کرتی اور پھر ان سوچوں پر خود کو ملامت کرتے ہوئے عارفہ کی خوشیوں کے سدا قائم رہنے کی دعا کرتی۔

وقت گزرتا رہا۔ عاشر کی پیدائش کے بعد میرے ساتھ عارفین کا رویہ قدرے بہتر ہو گیا۔ یاسر کے بعد عارفین مزید بدل گئے تھے وہ اب ایک نرم خو شوہر کا روپ دھار رہے تھے اور جب عارفین کے رویے میں بہتری آئی تو گھر کے مالی حالات ابتری کا شکار ہو گئے۔

عارفین ایک نیم سرکاری ادارے میں اچھی پوسٹ پر تعینات تھے، وہ ایک مالیاتی اسکینڈل میں زبردستی ملوث کر دیے گئے۔ دوسروں کا قصور عارفین کے سر تھوپا گیا۔ انکوائری کمیٹی ان افسران پر مشتمل تھی جن سے دوران ملازمت عارفین کی کبھی نہ بنی تھی بغیر کسی قصور کے انہیں ملازمت سے برخاست کر دیا گیا۔ وہ دور بہت ابتلا اور آزمائش کا دور تھا۔

عارفین شدید ترین ڈیپریشن میں مبتلا ہو گئے۔ مزاج میں در آنے والی چڑچڑاہٹ اور کڑواہٹ مجھے ہی بھگتنا پڑی۔ ساس کا انتقال ہو گیا تھا۔ ڈیڑھ برس کا عمار میری گود میں تھا۔ عارفین اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے عدالت چلے گئے تھے۔ ایک مدت تک کیس چلا، گھر کا سارا جمع جتھا اسی کیس پر لگ گیا۔ معمولی ملازمت کرنا عارفین کی شان کے خلاف تھا، اور پہلی ملازمت کی برخاستگی کے بعد ڈھنگ کی ملازمت ملنا مشکل تھی گھر میں فاقوں کی نوبت آیا چاہتی تھی۔ عابدہ باجی اور سبحان بھائی نے اس کڑے وقت میں بہت ساتھ دیا بے شک وہ قرض کا کہہ کر رقم دیتے تھے لیکن اس آڑے وقت میں تو ان کے علاوہ کوئی قرض بھی دینے پر تیار نہ تھا۔

سبحان بھائی کے فراہم کیے ہوئے سرمائے سے ہی عارفین نے ایک سپر اسٹور کھول لیا (اور اس کے لیے انہیں کیسے راضی کیا وہ ایک الگ داستان ہے) پھر اللہ اللہ کر کے کیس کا فیصلہ ہوا عارفین کو باعزت بری کر دیا گیا ملازمت بھی بحال ہو گئی لیکن اب عارفین ملازمت کے حق میں نہ تھے انہوں نے استعفیٰ دے دیا۔ بقایا واجبات کی وصولی سے سبحان بھائی کا قرضہ اتارا گیا اور مزید سرمایہ کاروبار میں لگا دیا اللہ کے فضل سے کاروبار چمک اٹھا۔ گھر میں خوشحالی در آئی۔ بچوں کو اچھے اسکولوں میں داخل کروا دیا لیکن ابھی میرے اچھے دن شروع نہ ہوئے تھے۔

عارفین کے ایک قریبی دوست نے رازداری کا وعدہ لے کر بتایا کہ 'عارفین آج کل ایک عورت کے چکر میں ہیں۔ وہ عورت ان کے سپر اسٹور کی باقاعدہ گاہک تھی، حیرت کی بات تھی کہ وہ بہت زیادہ خوب صورت بھی نہ تھی لیکن ادائیں دکھا کر مردوں کا جی لبھانے کا فن اسے خوب آتا تھا عارفین بھی ان ہی اداؤں کے اسیر ہو گئے۔ میں عارفین کے مزاج سے آگاہ تھی اگر اس بات کو بنیاد بنا کر ان سے لڑائی جھگڑا کرتی تو، وہ طیش میں آ کر کوئی انتہائی قدم بھی اٹھا سکتے تھے۔ تین بیٹوں کی ماں ہونے کے باوجود میں کتنی کمزور اور بے بس عورت تھی' ڈر کے مارے میں نے عابدہ باجی تک سے یہ ذکر نہ کیا۔ میں اللہ سے گڑگڑا کر دعا

کرتی کہ عارفین راہ راست پر آجائیں اور ہماری ازدواجی زندگی کسی المناک انجام سے دوچار نہ ہو۔

میں نے یہ سارا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا تھا اور میرے رب نے مجھے مایوس نہ کیا۔ اس عورت کے ایک اور عاشق نے عارفین کو ڈرا دھمکا کر اس عورت سے قطع تعلق پر مجبور کردیا اور یہ ساری تفصیل مجھے بصیر بھائی (عارفین کے دوست) اور ان کی بیوی نے ہی بتائی تھی۔ عارفین کو تو آج تک یہ علم ہی نہیں کہ میں ان کی زندگی کے اس گوشے سے بھی واقف ہوں۔ اس شخص کی سنگت میں تمام عمر مجھے پریشانیوں اور مصائب کے سوا کچھ نہ ملا۔

عارفین بلاشبہ میرے آئیڈیل تھے لیکن ان کے سنگ میں آئیڈیل زندگی نہ جی سکی جبکہ عارفین آج اس بات کا برملا اعتراف کرتے ہیں کہ 'انہوں نے میرے ساتھ ایک آئیڈیل زندگی گزاری ہے۔ قدرت کی کیا ستم ظریفی تھی کہ جس کو اپنا آئیڈیل نہ مل سکا اس نے ایک مطمئن اور آسودہ زندگی گزاری اور جس کو آئیڈیل مل گیا اس کو زندگی میں ایک پل سکون کا میسر نہ آیا لیکن میں باوجود خواہش کے یہ بات عارفین کو نہیں جتا سکتی۔ مجھے ان کی غیر متوازن شخصیت کا علم ہے اگر ایک پل وہ میری خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے مجھے سراہ سکتے ہیں تو' میری کسی بات پر طیش میں آکر مجھے بے بھاؤ کی سنا بھی سکتے ہیں۔

عمر کے اس دور میں جب میرے بچے جوانی کی سرحد پر قدم رکھنے ہی والے ہیں میں عارفین کو ان کی زیادتیوں کا احساس دلا کر لڑائی جھگڑا مول لینے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ بچوں کی نظر میں ان کی ماں ایک آئیڈیل ماں ہے اور مجھے دنیا جہان کے تمغوں سے بڑھ کر عزیز ہے۔

☆ ☆

زرنین آرزو

"رملہ... رملہ"

امی کی آواز رملہ کے کانوں تک بخوبی پہنچ رہی تھی مگر وہ سنی ان سنی اسی زاویے پر کسلمندی سے بستر پر پڑی رہی۔ اسے نہ امی کے پکارنے میں کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی ڈرائنگ روم سے آتے فلک شگاف قہقہوں سے کوئی رغبت۔ ڈرائنگ روم میں یقیناً" شاندار محفل جمی ہوگی اور اس شاندار محفل کا محرک صرف اور صرف شاہ میر ہوگا۔ وہی شاہ میر جو اس حویلی کے بزرگوں کی آنکھ کا تارا تھا۔ جو تایا ابا کا انتہائی ضدی اور لاڈلا بیٹا تھا۔ اور جس کی خواہش تھی کہ وہ جب بھی گھر

مکمل ناول

لوٹے تو گھر کا ایک ایک فرد خواہ وہ ملازم ہی کیوں نہ ہو۔ اس سے آکر ملیں۔ اس کی خدمت میں حاضری دیں اور اس کی اس عادت سے رملہ کو خصوصی طور پر چڑ تھی۔ اور...

"رملہ۔"

امی آوازیں دیتی اس کے کمرے میں آگئیں۔

"تم یہاں پوستیوں کی طرح بستر پر پڑی ہو۔ جبکہ تمہیں معلوم بھی تھا کہ آج شاہ میر آرہا ہے۔ حویلی کے سبھی افراد اس کی آؤ بھگت میں لگے ہیں اور ایک تم ہو کہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائے کمرے میں بند ہو۔"

"اوفوہ امی۔ اب کیا مجھے اپنے کمرے میں بھی بیٹھنے کی اجازت نہیں۔"

حسب توقع امی کی زبان سے شاہ میر کی آؤ بھگت کا قصہ سن کر رملہ کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ جب شاہ میر اسے کوئی اہمیت نہیں دیتا تو بھلا وہ کیوں شاہ میر کو فرشی سلام جھاڑے اور کیوں اس کی جی حضوری کرتی پھرے... اسے بخوبی اندازہ تھا۔ مناہل کی موجودگی میں بھلا شاہ میر کسی اور کو گھاس کیوں ڈالے گا اور اسے تو کسی قیمت پر وہ نہیں پوچھے گا۔

ڈرائنگ روم سے آتے بلند قہقہوں میں مناہل کی مترنم ہنسی کو وہ بخوبی پہچانتی تھی۔ سب کتنے مسرور تھے۔ کسی نے بھی تو اس کی کمی محسوس نہیں کی تھی۔ ہاں مناہل کے ہوتے ہوئے بھلا اس کے بارے میں سوچنے کی کسی کو فرصت کہاں...؟

جھلتے ہوئے خیالات پوری سفاکی سے اس کے ذہن میں دندناتے رہے۔ اس کا رنگ متغیر ہو گیا اور آنکھوں میں خشونت سی ابھرنے لگی۔

"وہ ہرگز ہرگز ڈرائنگ روم کا رخ نہیں کرے گی۔"

حالانکہ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی غیر ارادی طور پر ڈرائنگ روم کی طرف قدم بڑھائے تھے۔ دل میں شاہ میر کو ایک نظر دیکھ لینے کا خیال چٹکیاں بھرنے لگا تھا۔ وہ اتنے دنوں بعد حویلی لوٹا تھا۔ اس کے آنے سے ایک گھنٹہ قبل وہ مناہل کی تیاریاں دیکھتی رہی تھی۔ گلابی رنگ کی فرنچ شیفون کی ساڑھی، تراشیدہ بال اور ہلکا پھلکا سا میک اپ' وہ بڑی اسمارٹ اور دلکش نظر آرہی تھی۔

"تو یہ سارا اہتمام صرف شاہ میر کے آنے کی خوشی میں تھا۔"

رملہ اندر ہی اندر بے حس سی ہو گئی۔ اس کا دل گھبرانے لگا اور چہرے پر محرومی کے سائے لرز گئے۔

"تو منائل' شاہ میر پر بھی فتح حاصل کر لے گی؟ اور وہ اسی شکست سے دوچار ہو جائے گی جو اس کا ازلی مقدر ہے دفعتاً" اس کے اندر یہ تکلیف دہ احساس جاگ اٹھا۔

منائل سے شدید کھنچاؤ کا یہ رد عمل کب سے شروع ہوا۔ اس کا اندازہ رملہ کو خود بھی نہیں تھا۔ نفرت کا یہ سبق شاید بچپن کی منزلوں سے شروع ہوا تھا اور پھر زندگی کے پھیلاؤ پر اس کے لیے نفرت تہہ در تہہ جمتی چلی گئی اور سالوں کے جمود نے ان تہوں کو ٹھوس چٹانوں میں بدل دیا تھا۔

منائل سے اس کی نفرت کا عمل اس وقت شروع ہوا جب وہ اپنے ابو سے اٹھلا اٹھلا کر کھلونوں کی فرمائش کرتی۔ اسے جلانے کے لیے۔ اس کے سامنے ہی ان سے لپٹ جاتی۔ ان سے ڈھیروں محبتیں وصول کرتی۔ شاید وہ جانتی تھی نا کہ وہ باپ جیسی نعمت سے محروم ہے۔ وہ باپ کی محبت کو ترستی ہے۔ وہ انہیں یاد کر کے روتی ہے۔

ان دنوں وہ صرف دس برس کی تھی جب بابا شدید بیماری کے باعث آنکھیں موند گئے تھے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ وہ اس دکھ سے بلک اٹھی۔ اس نے انگلیوں کی پوروں سے ان آنکھوں کو کھولنے کی دیوانہ وار کوشش کی تھی۔ مگر وہ اپنی اس کوشش میں ناکام ہو گئی۔ تب وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپتی رہ گئی۔ مگر اس کی چیخ و پکار کا ان بند آنکھوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔

"آہ اس کے بابا ہمیشہ کے لیے چلے گئے۔"

اس کے دل میں اس زخم نے گہرا گھاؤ ڈال دیا۔ دل یہی سوچ سوچ کر تڑپتا رہا کہ اب اس کی ناز برداریاں کرنے والا اس دنیا میں نہیں رہا۔

☆ ☆ ☆
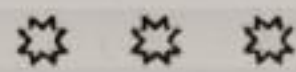
وہ ابتدائی جماعتوں میں ہمیشہ اول آتی تھی۔ اس کا ذہن بہت تیز تھا۔ پورے اسکول میں کوئی اس کا مد مقابل نہیں تھا۔ نہ پڑھائی میں' نہ کھیلوں میں' مگر بابا کے گزر جانے کے بعد جیسے اس کا دل پڑھائی سے اچاٹ سا ہو گیا۔ امی نے بہت بار اسے پیار سے سمجھایا تھا۔ کہ وہ اپنی توجہ' اپنا دھیان پڑھائی میں لگائے۔ کم از کم گریجویشن ہی کر لے۔ مگر بابا کے چلے جانے کے بعد اس کا دماغ جیسے بالکل بند ہو گیا تھا۔ جہاں وہ کتاب اٹھاتی' چند ہی صفحے پڑھنے کے بعد اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگتا تھا۔ اور سر میں درد ہونے لگتا تھا۔ نگاہوں کے سامنے بابا کا سراپا لہرا جاتا۔ جب بھی وہ بے طرح اداس' تنہا اور اکیلی ہوتی تو تب بابا کی خوب صورت آنکھیں اس کے سامنے آجاتیں اور کہتیں۔

"بیٹا اداس کیوں ہو؟ میں تمہارے پاس ہوں۔"

تو ایک لمحے کو وہ اپنا غم بھلا دیتی۔

اور پھر یوں ہوا کہ وہ ایف اے سے آگے پڑھ ہی نہ سکی۔ صبح صبح جب سارے کزنز کاروں اور بسوں میں اسکول اور کالج چلے جاتے تو وہ اندر ہی اندر کڑھ کر رہ جاتی۔ اس کا دل آگے پڑھنے کو مچل مچل اٹھتا مگر پھر وہی کرب انگیز کیفیت اس پر طاری ہو جاتی۔

"پتا نہیں تمہارا کیا بنے گا رملہ.... سبھی بچے ڈگریاں حاصل کر لیں گے۔ مگر تو ان سب میں جاہل رہ جائے گی۔" امی سرد آہ بھرتیں۔

"ایف اے کی تعلیم بھی کچھ کم نہیں ہوتی۔" وہ امی کی بات سے سو فیصدی اتفاق کرتی تھی مگر وہ رملہ ہی کیا' جو اپنی ذات پر کوئی حرف آنے دے۔ یا کسی کو اپنی شخصیت کو روندنے کی اجازت دے دے۔

"شاہ میر ڈاکٹر بن رہا ہے۔ عاطف انجینئرنگ میں ہے۔ دوسری لڑکیاں بھی ایم۔ اے' بی۔ اے کر رہی ہیں۔ ان تعلیم یافتہ لڑکیوں کی موجودگی میں بھلا خاندان کے لڑکے تجھے کیوں پوچھیں گے۔ منائل فائن آرٹس پڑھ رہی ہے۔ تم دیکھ لینا۔ شاہ میر اور عاطف وغیرہ کی نظر انتخاب سب سے پہلے منائل پر ہی پڑے گی۔"

"سو واٹ۔"

منائل کی تعریف پر رملہ چیخ اٹھی۔

"رملہ۔"

امی غصے ہو گئیں۔

"بجائے حقیقت ماننے کے حجت پر آمادہ ہو۔ مجھے کیا۔ وقت گزر جانے پر خود ہی سر پکڑ کر روؤ گی۔ جب تنہا رہ جاؤ گی تو کوئی پوچھنے والا بھی نہیں ہو گا۔"

"میں بزدل نہیں ہوں۔ تنہا جینے کا حوصلہ ہے مجھ میں۔" وہ انگوٹھے سے اپنی جانب اشارہ کرتی تو امی کے چہرے پر تفکر کے تاثرات پھیل جاتے۔

"خدا اس لڑکی کو عقل دے اور اس کے نصیب اچھے کرے۔"

گرمیاں ہوتیں تو سب لڑکے ہوسٹلز سے چھٹیاں گزارنے گھر آجاتے۔ اور حویلی میں ایک ہلچل سی مچ جاتی۔ اس مشترکہ خاندان کے سرپرست بڑے ابا تھے۔ جو ہر سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ جن کے فیصلے کے آگے کسی کو بھی سر اٹھانے کی ہمت نہ تھی۔ جن کی ہر بات پتھر پر لکیر کے مترادف ہوتی تھی۔ لڑکوں کے واپس آتے ہی خاندان کی لڑکیوں کا زیادہ تر وقت آئینے کے سامنے گزرتا۔ نت نئے تفریحی پروگرام بنتے۔ تاریخی مقامات کی سیر' پکنک۔ وہ اودھم مچتا کہ خدا کی پناہ۔ مگر رملہ ان سب باتوں سے بے نیاز الگ تھلگ رہتی۔ اس نے کبھی بھی ان تفریحات میں حصہ لینے کی کوشش نہیں کی تھی اور اگر کبھی اس کا دل ان لوگوں کے ساتھ جانے کو مچل اٹھتا تو احساس کمتری غالب آجاتا اپنے کم پڑھے لکھے ہونے کا احساس' اپنے تنہا ہونے کا خیال' پیارے پاپا سے جدائی کا کرب۔

ایسے کرب انگیز لمحات سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے وہ اپنی واحد پناہ گاہ' اپنے کمرے میں ہوتی۔ جہاں وہ رو رو کر۔ اپنے من کی آگ بجھانے کی کوشش کرتی۔ مگر دل کی جلن کم ہونے کی بجائے اور بڑھ جاتی۔

"رملہ۔" امی کے لہجے میں کرختگی مزید نمایاں ہو گئی۔

"فوراً اٹھو اور جا کر ڈرائنگ روم میں شاہ میر سے ملو۔ بلکہ یوں کرو کہ تم اس کے لیے کافی اپنے ہاتھوں سے بنا کر لے جاؤ۔"

"امی مجھ سے کسی قسم کی توقع مت رکھیں۔ میں آپ کے ان شاہ میر صاحب کی زر خرید ملازمہ نہیں ہوں۔" رملہ کے کورے جواب پر امی کے نتھنے پھڑکنے لگے۔

"وہ اتنے عرصہ بعد گھر لوٹا ہے۔ ذرا کچھ لحاظ ہی کر لو۔"

"تو کیا ہوا۔ جیسے دوسرے کزنز آتے ہیں۔ ویسے ہی وہ بھی چلا آیا۔ اب اسے اہمیت دینا لازمی تو نہیں اور پھر آپ سب کے ہوتے ہوئے میری کیا ضرورت رہ جاتی ہے اسے پوچھنے کی۔" وہ کوشش کے باوجود بھی کھل کر مناہل کا نام نہ لے سکی۔

"بدتمیز لڑکی۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ وہ تمہارے تایا ابا کا نور نظر ہے۔ اگر اسے تمہارے نظر انداز کرنے کی بات بری لگ گئی تو تمہاری خیر نہیں۔ اس کے ماتھے پر ایک معمولی سی شکن بھی تمہارے تایا ابا کو ناگوار گزرتی ہے اور تم ہو کہ تمہیں کسی بات کی پروا ہی نہیں۔ اور پھر سوچو اگر تم شاہ میر کے آگے پیچھے پھرو گی۔ میرا مطلب اس کی خاطرداری کرو گی تو ہو سکتا

ہے وہ تمہارے بارے میں سوچنے پر آمادہ ہو جائے۔ ورنہ مناہل جیسی لڑکی کی موجودگی میں تمہاری ذات سو پردوں کے پیچھے جا چھپتی ہے لوب۔"

"یہاں منائل سے میرا مقابلہ کیوں۔۔۔؟" رملہ کے سینے میں جیسے ناقابل برداشت سی جلن ہونے لگی۔

"تمہارا مقابلہ ہر حال میں بنتا ہے۔ میں ماں ہوں تمہاری لور یہ چاہتی ہوں کہ کسی لائق لڑکے کی نگاہ انتخاب تم پر پڑ جائے لور شاہ میر اس خاندان کا بہترین لڑکا ہے لوب۔"

"مجھے آپ کے اس بہترین لڑکے سے کوئی سروکار نہیں۔"

"کیوں سروکار نہیں۔" امی اسے بری طرح ڈانٹنے لگیں۔

"تو کہیں کی شہزادی ہے ناں۔ اعلا تعلیم یافتہ اور حسن کی ملکہ ہے' جو سب تیرے پیچھے پیچھے آئیں اور تجھے کسی کی پروا نہیں۔ ارے میں تو۔۔۔"

"امی پلیز۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔" اس نے ہاتھ سے کنپٹیاں دبائیں۔

"تو تم شاہ میر سے ملنے نہیں چلوگی۔" امی نے اسے غصے سے گھورا۔

"بالکل نہیں۔ میرے لیے سارے کزنز ایک جیسے ہیں۔ جب میں کسی لور کے لیے نہیں گئی تو پھر میں خصوصاً" اس سے کیوں ملنے جاؤں۔ چلو اگر میں نہیں گئی تو وہ ہی آجاتا مجھ سے ملنے۔ اس کی ٹانگیں تو نہیں ٹوٹ جاتیں۔" وہ تنخ سے ہوا تھی۔

یعنی کہ اب نوبت یہاں تک آگئی کہ وہ خود کو پسند کروانے کے لیے شاہ میر کے آگے پیچھے پھرے۔ پہلے ہی منائل جیسی لڑکیوں نے اسے اہمیت دے کر سر پر چڑھا رکھا ہے۔

دفعتاً" اسے کانوں میں شاہ میر اور منائل کے ملے جلے قہقہے سیسے کی مانند اتر آئے۔

"بہت بدتمیز ہوتی جارہی ہو تم۔" امی غصے سے باہر نکل گئیں۔

وہ رات کھانے کے لیے بھی کمرے سے باہر نہیں نکلی۔ غم و غصہ جیسے ہنوز دل میں بھرا ہوا تھا۔ امی کی باتوں سے اسے ہمیشہ تکلیف پہنچتی تھی اور خاص طور پر جب وہ اس کا مقابلہ منائل سے کرتے ہوئے منائل کے گن گاتی تھیں اپنا مقابلہ نہ منائل سے چاہتی تھی اور نہ کسی اور سے مگر پھر بھی چاہے ان چاہے اس کی ذات کو منائل کے مقابل گھسیٹ لیا جاتا تھا۔

"یہ منائل آخر اس کا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ دیتی۔"

اس منائل نے ہمیشہ ہی اس کے ساتھ زیادتی کی تھی۔

اسے برسوں پہلے کی وہ رات ہنوز یاد تھی جب پچھلے صحن میں چارپائیاں بچھی تھیں اور منائل اپنے ابو کے سینے پر سر رکھے ان سے جنوں اور پریوں کی کہانیاں سن رہی تھی۔ اتنی بڑی ہونے کے باوجود اس میں بچپنا باقی تھا۔ اس وقت وہ چودہ برس کی تھی اور رملہ بارہ برس کی۔ وہ چچا جان سے کہانیاں سننے کے ساتھ ساتھ ان سے رملہ کی شکایتیں بھی لگا رہی تھی۔ کبھی گڑیا چھین لینے کی شکایت تو کبھی کتاب پھاڑ دینے کی شکایت۔ رملہ دوسری چارپائی پر لیٹے ہوئے انہماک سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ منائل کی بکواس سن کر وہ اندر ہی اندر تلملا کر رہ گئی۔ دل تو چاہا کہ جا کر اس منائل کی بچی کا منہ نوچ لے۔ مگر وہ بے بس سی اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی۔

اس لیے کہ وہ جانتی تھی۔ وہ اس دنیا میں تنہا ہے۔ اس لیے وہ آنکھوں میں آنسو لیے چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی آئی اور بابا کی تصویر سے لپٹ کر بری طرح رو دی۔ پھر تھوڑی ہی دیر بعد سب کچھ بھول بھال اپنے ہاتھوں میں پریوں کی کہانیوں کی کتاب پکڑے دوبارہ صحن میں چلی آئی تو اسے دیکھتے ہی منائل نے چارپائی سے نیچے چھلانگ لگائی اور اس کے ہاتھ سے کتاب چھین کر دوبارہ چچا جان کے پاس چارپائی پر جا بیٹھی۔ رملہ روتے ہوئے تیزی سے اس کے پیچھے لپکی اور اس کے بال اپنی مٹھیوں میں پکڑ لیے۔

"رملہ چھوڑو منائل کے بال۔"

چچا جان نے غصے سے رملہ کے گال پر زوردار طمانچہ دے مارا۔

رملہ کانپ کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"خبردار جو آئندہ مناہل کو ہاتھ بھی لگایا ہو تو۔" چچا جان کے لہجے میں غراہٹ تھی۔

مناہل کی ہنسی ابھری۔۔۔۔ روح کو جلانے والی ہنسی۔ اس کے منہ پر طمانچہ پڑنے کو اس نے بہت انجوائے کیا تھا۔ رملہ اندر ہی اندر لہولہان ہو گئی۔

اور اس طمانچے کی جلن آج بھی اس کے داہنے رخسار پر ابھر آتی تھی۔

اس طرح کے اور بھی بہت سے واقعات رونما ہوئے جنہوں نے اس کے اندر کی نفرت کو اور بڑھا دیا تھا۔ مناہل ہر وقت نوکیلے کانٹے کی طرح چبھنے لگی تھی۔ اور یوں محرومیت اور مایوسی کی بے رحم فضا میں اس کی زندگی رینگتے ہوئے بڑھنے لگی۔ یہ کربناک احساس ذہن نشین ہو گیا کہ اس بھرے پرے گھر میں وہ بالکل اکیلی ہے۔ کوئی اس کا نہیں۔ اس اکیلے پن کے زہر نے اس سے جیسے اس کا اعتماد چھین لیا تھا۔ اس کا صرف خود پر سے ہی نہیں۔ بلکہ ساری دنیا پر سے اعتماد اٹھ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼
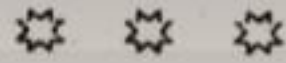
رات کھانے کی میز پر اسے موجود نہ پا کر شارمین اسے بلانے چلی آئی۔ اس پورے گھر میں اس کی صرف شارمین سے بنتی تھی۔ وہ شارمین سے اپنے دل کی ہر بات آنکھیں بند کرکے کر لیتی تھی۔

"کھانے کی میز پر سب تمہارے منتظر ہیں رملہ۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"بھلا کیوں؟"

"بس ایسے ہی۔"

"رملہ ذرا میری طرف دیکھو۔ اور مجھے بتاؤ یہ تم آخر شاہ میر سے اتنا چڑتی کیوں ہو۔"

"میرے پاس اتنا فالتو وقت نہیں کہ اس شخص کے بارے میں سوچ سوچ کر ہلکان ہوتی پھروں۔" رملہ نے آنکھیں چرا لیں۔

"تم اس کے بارے میں سوچتی ہو۔ جبھی تو اسے اپنے اعصاب پر سوار کرکے گوشہ نشین ہو گئی ہو۔"

بھئی نارمل بی ہیو کرو۔ عام اور سرسری انداز میں اسے ملو۔ یوں الگ تھلگ رہ کر تم اس پر واضح کردو گی کہ وہ تمہیں ذہنی طور پر پریشان کرتا ہے اور اسی لیے تم اس کے سامنے سے گھبراتی ہو۔" شارمین کی باتوں پر جیسے سارے بدن کی آگ اس کے چہرے پر آگئی۔

"میں کسی سے نہیں گھبراتی۔"

"تو پھر کھانے کی میز پر چلو۔"

"پرامس۔ کل کھانا کھانے ضرور ڈائننگ روم میں چلوں گی۔ مگر اس وقت میرے سر میں شدید درد ہے۔" شارمین چند لمحے اس کی مضمحل آنکھوں میں جھانکتی رہی پھر ایک گہرا سانس بھر کے بولی۔

"آل رائٹ۔ آج چھوڑے دیتی ہوں۔ مگر کل سے تم سب کچھ نارمل انداز میں کرو گی۔ اور اس حجرے سے باہر نکل آؤ گی۔"

☆ ☆ ☆

اگلا دن خاصا چمکیلا تھا۔ نیلے آکاش پر نمیالے بادل اڑتے پھر رہے تھے۔ فضا میں سرمئی سے غبار گھلا ہوا تھا۔ ساری نوجوان پارٹی کی محفل اندر بڑے کمرے میں جمی تھی مگر رملہ ان سب میں مل بیٹھنے کی بجائے لان میں مالی' خانساماں اور دھوبی کے ڈھیر سارے میلے کچیلے بچوں کے ساتھ کرکٹ کھیل رہی تھی۔ بھاگ دوڑ سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ تبھی بلا گھماتے ہوئے اس کی نظر سامنے اٹھ گئی وہ شاہ میر تھا۔ جس کے برابر مناہل مسکرا مسکرا کر باتیں کرتے ہوئے چلی آرہی تھی۔ وہ بھی ہولے ہولے مسکراتے ہوئے سر ہلا رہا تھا۔ ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر دفعتا" ہی اس کے حلق میں جیسے منوں تلملی گھل گئی۔ دل اندر ہی اندر جلنے لگا۔

اپنے اندر کی سنسناہٹ کو نظر انداز کرنے کی خاطر وہ بچوں کے ساتھ اور زور زور سے شور مچا کر کھیلنے لگی۔ وہ اپنا سارا غصہ گیند پر اتار رہی تھی۔ زوردار شارٹ لگا رہی تھی۔ مناہل اس کے قریب سے گزرتے ہوئے رک سی گئی۔

"رملہ۔"

"کیا ہے۔" وہ زوردار انداز میں بلا گھماتے اس کے قریب آگئی۔

"تم نہیں چل رہیں کیا؟ سب جا رہے ہیں۔"

"کہاں۔" رملہ نے بھنویں سکیڑ لیں۔

"پکنک پر۔"

"نہیں۔ میں کہیں نہیں جا رہی۔" وہ قدرے جھنجلاہٹ سے بولی۔

"کیوں نہیں جا رہی ہو۔" مناہل ایک انداز سے بولی۔

مناہل کی یہی ادائیں دوسروں کو گھائل کر دیتی تھیں۔ دوسروں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا لیتی تھیں۔ اس وقت بھی وہ یقینا" ساتھ کھڑے شخص کو مرعوب کرنے کے لیے اپنی اداؤں کا جادو جگا رہی تھی۔

"بس میری مرضی۔" رملہ کے لہجے میں تلخی سی گھل گئی۔

"بری بات۔ اچھے بچے ضد نہیں کیا کرتے۔" پہلی بار شاہ میر نے مداخلت کی۔ اس کے لبوں پر مدھم مسکراہٹ تھی۔ جو یقینا" مناہل کی سنگت کے طفیل تھی۔ وہ اس کی دشمن اول کے ساتھ کھڑا برابر مسکرا رہا تھا۔ رملہ کے لہجے میں آگ سی اتر آئی۔

"دیکھیں مسٹر۔ آپ اپنے کام سے کام رکھیں۔" وہ سیدھا مقابل کی آنکھوں میں دیکھتے بولی تھی۔

تبھی وہ چونکی۔ جیسے کوئی بھولی بسری یاد ذہن کے کسی گوشے میں اچانک نکھر آئی ہو۔ یہ آنکھیں۔ یہ آنکھیں اس کے لیے اجنبی تو نہ تھیں۔ لمحہ بھر کو سارے وجود میں سنسناہٹ سی دوڑ کر سناٹا چھا گیا۔

شاہ میر سامنے کھڑی لڑکی کو یوں بے باکی سے اپنی طرف دیکھتے پا کر قدرے جھینپ سا گیا۔

"میری بھی عادت نہیں کہ دوسروں کی ذاتیات میں دخل اندازی کروں۔ میں تو صرف اس لیے تمہیں چلنے کو کہہ رہا ہوں کہ مناہل تمہارے چلنے پر زور دے رہی تھی۔"

اوہ تو یہ کرم نوازی مناہل کے طفیل تھی۔

نفرت کا ایک ریلہ اس کے اندر سے اُمڈ آیا۔ اس نے نفرت بھرے انداز میں ہونٹ سکوڑے۔

"بہت نوازش آپ کی۔"

"رملہ۔ اگر تمہیں نہیں جانا تو نہ جاؤ۔ مگر یوں بدتمیزی کرنا تمہیں قطعی زیب نہیں دیتا۔" مناہل آگے بڑھی۔

"میں نے تم سے بات نہیں کی۔" رملہ نے گیند کو زوردار ہٹ لگائی۔

"بدتمیز۔" وہ برہم سی ہو گئی۔ وہ اگر ایک دم ایک طرف نہ ہو جاتی تو مٹی سے لتھڑی ہوئی گیند اس کے کپڑوں سے ٹکراتی ہوئی گزر جاتی۔ رملہ زور سے ہنس دی۔

اس کے اس طرح کھلکھلا کر ہنسنے پر شاہ میر نے لحہ بھر کو چونک کر اسے دیکھا۔ اس ایک لحہ کو خود پر مرکوز ہوتی آنکھوں میں کیا کچھ نہیں تھا۔ فسوں خیزی۔ قوس و قزح کے رنگوں کا نکھار۔ رملہ یکلخت سرخ پڑ گئی۔ اور پھر ان نگاہوں کے سحر سے بچنے کے لیے لپک کر گیند کی طرف بھاگی۔ دل نہ جانے کیوں مدھر سے انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔

اس شخص کے عام سے دیکھنے کے انداز پر یہ اندر ہی اندر اتنا اودھم کیوں؟

یہ دل کے اندر جوار بھاٹا کیوں......؟

گیند پکڑ کر اس نے بلاارادہ گردن گھما کر اس شخص کی جانب دیکھا۔ جو اسے نظرانداز کر کے مناہل کے سنگ آہستہ آہستہ پورچ کی جانب بڑھ گیا تھا۔ دکھ کی تیز دھار رملہ کے وجود کو کاٹنے لگی۔ وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے تیزی سے اپنے کمرے میں جا گھسی اور بے قراری سے کمرے میں یہاں سے وہاں ٹہلنے لگی۔

"شاہ میر اس خاندان کا بہترین لڑکا ہے۔ اور اس کی نگاہ انتخاب مناہل پر ہی پڑے گی۔ مناہل جیسی لڑکی کی موجودگی میں تمہاری ذات سو پردوں کے پیچھے جا چھپتی ہے۔"

اس کے اندر رامی کا ہیولا چلا رہا تھا۔

"خدایا!" اس نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

وہ خود کو مناہل کے مقابلے پر ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر یہ مقابلہ از خود بن گیا تھا۔

"تم دیکھ لینا رملہ۔ وہ شاہ میر پر ضرور حاوی ہو کر رہے گی۔ وہ تو ہمیشہ سے ہی تمہارا حق مارتی چلی آ رہی ہے۔ تمہاری خوشیاں لوٹ کر وہ خوش ہوتی ہے۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی یہ سفاک سوچ اس کے اندر اُمڈ آئی۔ اور ساتھ ہی چھم سے مناہل کا پیکر بھی نگاہوں کے سامنے روشن ہو گیا۔ ناکامی کا خوف جیسے اس کی رگ رگ میں بسنے لگا۔

وہ رات تک اپنے کمرے میں گھسی ان جلتی سوچوں سے خود کو سلگاتی رہی۔ رات کھانے کی میز تک وہ خود کو بمشکل گھسیٹ لائی۔ شارمین اس کے بالکل برابر بیٹھی تھی۔

"یہ تمہارا چہرہ کیوں اترا ہوا ہے۔"

"میں ٹھیک ہوں۔"

مدھم لہجے میں خود کو سنبھالتے ہوئے وہ مضبوط نظر آنے کی کوشش کرنے لگی۔ بالکل سامنے بیٹھے شاہ میر اور مناہل بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے۔ انہیں ایک دوسرے میں گم دیکھ کر اس کی طبیعت پھر سے مکدر ہونے لگی۔

باتیں کرتے کرتے شاہ میر نے جھک کر مناہل کے کان میں جانے کیا کہا کہ وہ زور سے ہنس دی۔

"بدتمیز۔ محفل میں بیٹھنے کے آداب بھی نہیں معلوم۔" ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے دونوں ہی بہت زہر لگ رہے تھے۔

رملہ کا موڈ بگڑنے لگا۔ اندر ہی اندر بے چینی سی بڑھنے لگی۔ وہ کھانا کھائے بغیر ہی اٹھنے لگی کہ شرجیل بول اٹھا۔

"کہاں جا رہی ہو رملہ۔ کھانا تو کھا کر جاؤ۔"

"مجھے بھوک نہیں۔"

"تمہیں بھوک نہ لگنے کی بیماری کب سے شروع ہو گئی۔"

عاطف نے کھاتے کھاتے کہا تو شاہ میر نے چونک کر

سامنے بیٹھی لڑکی کی جانب دیکھا' جو ہر وقت خفا خفا سی رہتی تھی۔ وہ جب سے یہاں آیا تھا اس نے ایک بار بھی اس لڑکی کو مسکراتے اور دوسروں میں گھلتے ملتے نہیں دیکھا تھا۔ پتا نہیں وہ اتنی چڑچڑی اور بد دماغ کیوں تھی؟

"ڈاکٹری اصول کے مطابق جلنے کڑھنے والوں کو بھوک کم لگتی ہے۔" شاہ میر نے پہلی بار مداخلت کی۔

رملہ نے لب بھینچ لیے۔

تو گویا اب وہ اس کی ذات کے بخیے ادھیڑے گا۔ سب کے سامنے اسے ذلیل کرے گا۔

"بیٹھ جاؤ رملہ۔ اور کھانا کھاؤ۔"

امی کو یہی فکر رہتی تھی۔ اس کا امیج خراب نہ ہو جائے۔ خصوصاً" اس خاندان کے لائق فائق لڑکوں کے سامنے۔ جو چھٹیاں گزارنے یہاں جمع ہوئے تھے۔

"امی آپ ہر وقت میرے پیچھے نہ پڑی رہا کریں۔" وہ بدتمیزی سے بولی۔

"بڑی بات ہے رملہ۔ یوں کھانے کی ٹیبل سے سوکھے منہ نہیں اٹھ جایا کرتے۔" ممی نے سرزنش کی۔

"لگتا ہے آج رملہ بیگم کا موڈ کچھ زیادہ ہی آف ہے۔" شاہ میر نے بڑی احتیاط سے سامنے موجود برہم برہم سی لڑکی کی آنکھوں میں جھانکا۔

"آپ کو اس سے مطلب۔" وہ تڑخ گئی۔

"کوئی مطلب نہیں؟" شاہ میر خجالت آمیز انداز میں مسکرادیا۔

"رملہ تم بہت بدتمیز ہوتی جارہی ہو۔ چھوٹے بڑے کی تمہیں تمیز ہی نہیں رہی" امی نے غصے سے اسے گھورا۔

جس لڑکے کے سامنے وہ اس کے نمبر بنانا چاہ رہی تھیں۔ جس لڑکے سے وہ اسے تصور ہی تصور میں منسوب دیکھ رہی تھیں۔ اس لڑکے سے بدتمیزی انہیں بہت کھلی۔ خدا جانے اس لڑکی کو کب عقل آئے گی۔ وہ تو اسے سمجھا سمجھا کر ہار گئی تھیں۔ ایک یہ بدتمیز لڑکی تھی اور دوسرے وہ منابل تھی۔ شاہ میر کے برابر بیٹھی وہ کتنی تہذیب یافتہ لگ رہی تھی۔ وہ نوٹ کر رہی تھیں۔ شاہ میر کا جھکاؤ منابل کی طرف ہو رہا تھا۔

امی کی ڈانٹ پر سب کے سامنے تذلیل کے احساس سے رملہ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور آنکھیں پانیوں سے لبالب بھر گئیں۔ وہ منابل کے سامنے کسی قسم کی ڈانٹ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

"ہاں سب ہی میرے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ میں تنہا جو ہوں اس دنیا میں۔ کوئی بھی میرا نہیں۔"

آنسوؤں نے جیسے اس کے گلے میں پھندا سا ڈال دیا۔

وہ تیزی سے اپنے کمرے میں چلی آئی اور دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر بری طرح رو دی۔ لمحوں بعد ہی شارمین اس کے تعاقب میں چلی آئی۔

"پلیز رملہ۔ یوں رو رو کر خود کو تکلیف مت دیا کرو۔ بہادر بنو۔ ان سب کی باتوں کا سامنا کرنے کی عادت ڈالو۔ اگر تم ہمیشہ ہی ان سب کی ذرا ذرا سی باتوں کو دل پر لگاتی رہیں تو جینا مشکل ہو جائے گا۔"

وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے سمجھانے والے انداز میں دھیرے دھیرے بولتی رہی۔

"تم خود ہی بتاؤ شارمین۔ وہ سب مجھ سے کتنی تلخی سے پیش آتے ہیں۔ جانتے ہیں ناں وہ کہ میں تنہا ہوں۔ میرے سر پر باپ کا سایہ نہیں۔ جبھی تو جس کے دل میں جو آئے کہہ ڈالتا ہے۔ انہیں روکنے والا جو کوئی نہیں۔"

وہ اسے امی کی ڈانٹ کا اتنا افسوس نہیں تھا جتنا منابل اور شاہ میر کے سامنے اپنی اہانت کا دکھ تھا۔

"فضول باتیں مت سوچا کرو رملہ۔ سب ہی تو تمہارے اپنے ہیں۔ ذرا دل کی آنکھوں سے دیکھو۔ سب تمہیں چاہتے ہیں۔ جانے یہ اوٹ پٹانگ خیالات کس نے تمہارے ذہن میں بھر دیے ہیں۔"

"تم بھی ان کی طرف داری کرنے لگیں شارمین۔"

"میں کسی کی طرف داری نہیں کر رہی۔ بلکہ حقیقت بتا رہی ہوں کہ سب تمہارے ہمدرد ہیں بڑے ابا کو تمہارا کتنا خیال رہتا ہے۔ ہر ہر لمحے تمہارے

بارے میں فکر مند رہتے ہیں۔"

"تو کیا تم مناہل کو بھی میرا ہمدرد کہو گی؟ شاہ میر کو میرا ساتھی کہو گی۔ جو ہمیشہ ہی مجھے جلانے کے نئے نئے طریقے اختیار کرتا رہتا ہے۔ زہر لگتے ہیں مجھے وہ دونوں۔" وہ مسلسل انگاروں کی طرح سلگ رہی تھی۔

"منابل کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ البتہ شاہ میر کے سلسلے میں تمہارا مشاہدہ غلط ہے۔ وہ بہت نفیس شخص ہے۔ بے حد دردمند اور محبت کرنے والا۔" شارمین شاہ میر کی طرف داری میں بولی تو رملہ تلخ ہو گئی۔

"ہاں صرف منابل کے لیے۔"

"اچھا چھوڑو ان فضول باتوں کو۔ پکچر کا پروگرام ہے چلو۔"

بسا اوقات اپنی بد دماغی میں وہ شارمین کو بھی کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی جو اس کی پھوپھی زاد تھی۔ اور گریجویشن کے بعد آج کل فارغ تھی۔ اس نے ایک لمحے کو رملہ کی جانب دیکھا اور پھر باہر نکل گئی۔

لمحہ بھر کو رملہ کو تاسف سا ہوا۔

وہ کیوں دوسروں کا غصہ ناحق شارمین پر اتارتی ہے۔ ذرا کی ذرا اس کا دل چاہا کہ بھاگ کر جائے اور شارمین کو منالے۔

وہ ابھی اسے جا کر منانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ شرجیل تیزی سے اس کے کمرے میں داخل ہوا اور پیچھے پیچھے شاہ میر بھی۔ یہ بھلا شاہ میر اس کے کمرے میں کیوں؟ اسے منابل سے فرصت مل گئی! وہ آج پہلی بار اس کے کمرے میں آیا تھا۔ وہ سٹپٹا کر بیٹھے سے کھڑی ہو گئی۔

"رملہ۔" شرجیل اس سے دو قدم کے فاصلے پر آن کھڑا ہوا۔

"رملہ۔ چلو ناں پکچر پر بہت مزا آئے گا۔"

"نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی۔"

اس نے صاف کورا جواب دے دیا۔ حالانکہ چند لمحوں پہلے وہ شارمین کی ناراضی کا خیال کر کے جانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ مگر سامنے شاہ میر کو دیکھ کر اس کا چہرہ یکلخت سخت ہو گیا اور آنکھوں میں خشونت کے ساتھ ساتھ وحشت بھی بھر گئی۔

"کیوں؟" اس کے صاف جواب دینے پر شاہ میر اچانک ہی ایڑیوں پر گھوما اور سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھتے پوچھنے لگا۔

"بس میرا موڈ نہیں ہو رہا۔"

"ہر وقت موڈ پر انحصار نہ کیا کرو۔ کبھی کبھار دوسروں کی خوشی کی خاطر کچھ کرنے میں دل کو راحت ملتی ہے۔" وہ پتا نہیں اسے کیا سمجھانا چاہ رہا تھا۔

"میں اس وقت لیکچر سننے کے موڈ میں نہیں۔"

"ذرا یہ بتاؤ۔ یہ غصہ ہر وقت تمہاری ناک پر کیوں دھرا رہتا ہے۔ جانتی ہو اتنا غصہ کرنے سے تمہاری ناک ٹیڑھی ہو جائے گی۔" وہ دھیمے دھیمے مسکرا رہا تھا۔

"تو پھر۔" اس کی مسکراہٹ رملہ کو اپنا تمسخر اڑاتی لگی۔

وہ صاف طور پر کہہ دینا چاہتی تھی۔ اس کا ہر پروگرام اس لیے غارت ہو جاتا ہے کہ وہ منابل کا وجود برداشت نہیں کر سکتی اور دوسرے تمہارا منابل سے بے تکلف ہونا مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ بولو کیا تم منابل کو میری خاطر نظر انداز کر سکتے ہو۔

اپنے لب سختی سے بھینچ کر اس نے خود کو کچھ بھی کہنے سے باز رکھا۔

"پلیز رملہ۔ ضد چھوڑ دو۔ سچ خوب انجوائے کریں گے اور آج سب خرچہ بھی شاہ میر ہی کر رہا ہے۔" شرجیل ملتجی نگاہوں سے رملہ کو دیکھ رہا تھا۔

"تم ضرور جاؤ گی رملہ۔" دفعتاً شاہ میر کا لہجہ سخت ہو گیا۔ وہ اس سے اس کی مرضی نہیں معلوم کر رہا تھا۔ وہ اس پر رعب جماتے ہوئے اپنا فیصلہ ٹھونس رہا تھا۔ رملہ نے گھبرا کر اس شخص کی جانب دیکھا جس کا رویہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ یہ یکایک اس شخص کو اس کی ذات سے دلچسپی کیوں ہو گئی بھلا؟

"دیکھو کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔" وہ اس کے بالکل قریب آکر سیدھا اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا تھا۔

اف ان آنکھوں میں جانے کیا تھا؟ کوئی گلاب پیام ۔۔۔ کوئی ان کہا جذبہ؟ یا کوئی سندر سا احساس۔ وہ ان آنکھوں میں لمحہ بھر کو بھی نہ دیکھ سکی۔ پلکیں خود بخود جھکتی چلی گئیں۔

"تو پھر چل رہی ہو ناں۔" وہ نرمی سے پوچھ رہا تھا۔

"ہوں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا سر اثبات میں ہل گیا۔

"گڈ گرل۔"

شاہ میر نے ہلکے سے اس کے سر پر چپت لگائی تو کتنے بہت سے رنگ اس کے چہرے پر بکھر گئے۔ آنکھوں میں چمک سی لہرا گئی۔ خوشی سے سرشار وہ ہولے ہولے کانپتی رہی۔ اگر وقت اور قسمت اس پر مہربان ہو جائے تو وہ مناہل کو اچھا سبق دے سکتی ہے اور۔۔۔۔

"ہرے۔ ونڈر فل۔۔۔ مزا آگیا۔" شرجیل اس کے ماننے پر خوشی سے ہوا میں مکہ لہراتے ہوئے بولا۔

"واپسی پر چائنیز میں سوپ بھی پکا شاہ میر۔۔۔ رملہ کے جانے کی خوشی میں۔"

"اوکے۔" شاہ میر نے حامی بھرلی۔

رملہ کی آنکھوں میں ستارے سے جھلملانے لگے۔ خوشی کی بے قرار لہریں اس کے وجود میں سرکنے لگیں۔ تو کیا وہ اتنی اہم ہو گئی شاہ میر کے لیے کہ وہ اس کی خاطر ہر شرط قبول کرنے پر تیار تھا۔

"آؤ شاہ میر۔ سب کو چل کر یہ خوش خبری سنائیں کہ رملہ بھی جا رہی ہے اور خصوصاً" شارمین کو۔ وہ پاگل لڑکی تو بہت خفا ہے اس کے نہ جانے سے۔"

شرجیل۔ شاہ میر کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اور وہ ساکت سی وہیں کھڑی رہ گئی۔ اس خوش کن مہک کو محسوس کرتی رہی جو اس شخص کے آجانے سے کمرے میں رچ بس گئی تھی۔

☼ ☼ ☼
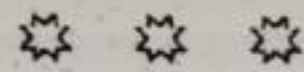
امی ٹھیک کہتی ہیں۔ شاہ میر کے آس پاس رہنے سے وہ اس کے دل میں گھر بنانے میں کامیاب ہو جائے گی۔ سچ ہے بڑوں کے تجربات جھٹلانے سے انسان اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔ وہ یکلخت ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔ ہواؤں میں اڑنے لگی تھی۔

آج وہ بہت اچھی طرح تیار ہو گی۔ آج وہ وہی انداز اپنائے گی جو مناہل کا ہے۔ مناہل میں ناز و ادا ہے۔ چلبلا پن ہے۔ اسی لیے وہ ہر ایک پر چھا جاتی ہے۔ اسے بھی شاہ میر کا دل جیتنے کے لیے ویسا ہی بننا پڑے گا۔

کسی غیر مرئی طاقت کے زیر اثر اس نے اپنی وارڈ روب سے اپنا خوب صورت ترین لباس نکالا۔ ننھے ننھے آویزے کانوں میں سجائے۔ بالوں کو کندھوں پر پھیلایا اور ہلکا ہلکا میک اپ کر لیا۔ وہ کتنی دیر آئینے کے سامنے اپنے سراپے کا جائزہ لیتی رہی۔ کبھی قریب ہو کر کبھی دور کھڑے ہو کر مگر دل مطمئن نہ ہوا۔ مناہل کا مخصوص سراپا اپنی مخصوص خوشیوں کے ساتھ بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتا رہا۔ آئینے میں اس کے برابر روشن ہوتا رہا۔ تنگ آکر رملہ نے زمین پر پاؤں مارا۔ تب ہی ہارن کی آواز پر وہ کمرے سے باہر آئی۔

پورچ میں سبھی موجود تھے۔ اسے دیکھتے ہی شارمین اس سے لپٹ گئی۔ اس کی ساری خفگی دور ہو گئی تھی۔

"اف اللہ رملہ۔ اتنی اچھی لگ رہی ہو۔ اتنی اچھی کہ آج تو کسی نہ کسی کا قرار ضرور لٹے گا۔"

"ہٹ پاگل۔" رملہ اس کے یوں کہنے پر سرخ پڑ گئی۔ نگاہوں کے سامنے اس خوبرو سے شاہ میر کی شبیہ لہرا گئی۔ دل کی دھڑکنیں تیز تر ہو گئیں۔

اسی لمحے شاہ میر اور مناہل ساتھ ساتھ آتے دکھائی دیے۔ لمحوں بعد ہی رملہ کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

"ہونہہ۔ اگر مناہل کو ساتھ لے کر جانا ہی تھا تو میرے چلنے پر کیوں اصرار کیا۔" رملہ کے اندر یکلخت ہی دھواں سا بھر گیا۔ اس کے جاگتے میں دیکھے ہوئے خواب جیسے بکھرنے لگے۔ اس کے چاروں اطراف میں جیسے اندھیرا ہی اندھیرا چھا گیا۔ یوں جیسے وہ اپنی قوت بینائی ہی کھو بیٹھی ہو۔

"ارے تم بھی جا رہی ہو۔ چلو اچھا ہے۔ گھر میں رہتیں تو خوامخواہ بور ہی ہوتیں۔"

مناہل کے لہجے میں استعجاب تھا۔ حیرت تھی۔ یوں جیسے سامنے کھڑی لڑکی کا سب کے ساتھ جانا کوئی ناقابل یقین حقیقت تھی۔

مناہل کا انداز رملہ کے اندر چنگاریاں سی بھر گیا۔ وہ اندر ہی اندر سلگ گئی اور اندر کی یہی تپش اس کے لہجے میں بھی در آئی۔

"تم سے کم از کم میں اپنی بوریت دور کروانے ہرگز نہ آتی۔"

"خیر میرا وقت اتنا بھی فالتو نہیں کہ تم پر ضائع کرتی پھروں۔" مناہل نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔

"یہی وقت دوسری غیر ضروری باتوں پر تو خوب ضائع کرتی ہو۔"

رملہ کے حلق میں تلخی سے گھلنے لگی۔ دل تو چاہا آگے بڑھ کر اس کا منہ نوچ لے جو ہر ہر لمحے اس کی خوشیوں پر ڈاکہ ڈالنے چلی آتی تھی۔ جو اپنا زیادہ وقت شاہ میر کے اطراف میں گھوم پھر کر اسے اپنی جانب راغب کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ ہونہہ۔ اس کی سو بلا سے۔ چاہے وہ کالے چور کو اپنی جانب راغب کرے یا کسی اور کو.... اسے اس لڑکی کی کارگزاریوں سے کوئی سروکار نہیں۔

مگر اندر ہی اندر یہ شکست خوردگی کا احساس کیوں بڑھتا جا رہا ہے۔ اور....

"بری بات رملہ۔ یوں اس طرح...." مناہل کے مزید بولنے کا ارادہ شاہ میر نے مداخلت کر کے ملیامیٹ کر دیا۔

"مناہل۔ رملہ میں اتنی عقل ہے کہ وہ اچھے برے کی تمیز کر سکے۔ اس لیے تمہیں کوئی ضرورت نہیں فضول قسم کا لیکچر دینے کی۔"

"مگر شاہ میر۔ میں تو اسے صرف اتنا کہنا چاہ رہی کہ ہر وقت کے انگارے چبانا اچھی بات نہیں ہوتی اور ...."

"میرے خیال میں انسان اگر اپنے کام سے کام رکھے تو زیادہ بہتر ہے۔" شاہ میر نے قدرے درشت لہجے میں کہا۔

"اچھا اب مزید وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں پکچر شروع ہونے کو ہے۔ تم لوگ جلدی جلدی گاڑیوں میں بیٹھو۔"

شاہ میر کی بات پر مناہل کے چہرے پر غصے کے تاثرات ابھر آئے۔ اس کی باتوں اور اس کے انداز کی تلخی اسے بہت ناگوار گزری تھی وہ شاہ میر کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھنے کی بجائے شرجیل وغیرہ کی گاڑی میں جا بیٹھی۔

شاہ میر نے مناہل کی خفگی کی پروا کیے بغیر سامنے کھڑی لڑکی سے کہا جس کے لبوں پر شاداب تبسم پھیل پھیل گیا تھا اور جس کے چہرے پر کہکشاں سی بکھرنے لگی تھی۔

زندگی میں پہلی مرتبہ کسی نے اس کی طرف داری کرتے مناہل کو ڈانٹا تھا۔ فتح مندی کا ایک روح پرور احساس جیسے اس کے چاروں اطراف میں پھیل گیا۔ وہ ہواؤں کے دوش پر چلتی ہوئی پچھلی سیٹ پر جا بیٹھی۔ شاہ میر بھی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کی بجائے چابی عاطف کو تھما کر اس کے برابر آن بیٹھا۔ انجانی خوشیوں نے جیسے رملہ کو گھیر لیا۔ اسے یوں لگا جیسے آسمان اس کے قدموں میں جھک آیا ہو۔

شرجیل کی گاڑی میں صبا' مناہل اور فرہاد بیٹھے تھے۔ اور شاہ میر کی گاڑی میں رملہ' شاہ میر' شارمین اور عاطف۔

پکچر اچھی تھی یا بری۔ رملہ کو اس کا ہوش ہی کہاں تھا۔ وہ تو اپنے برابر بیٹھے شاہ میر کی موجودگی سے دم بخود سی بیٹھی تھی۔

رملہ کے لیے یہ ساعتیں یکلخت بہت اہم ہو گئیں۔ اس شخص کو اپنے اتنے قریب پا کر جیسے اس کا من مچل مچل رہا تھا۔ جبھی اس کے دل نے بے اختیار تمنا کر ڈالی۔

کاش! یہ لمحات امر ہو جائیں۔
کاش! یہ خوشیاں تاحیات اس کا مقدر رہیں۔

یہ شخص جانے کیوں اس کے حواسوں پر چھا رہا ہے۔ اس کے اعصاب پر سوار ہوا جا رہا ہے۔ گھنگھریالے سیاہ بال۔ خوب صورت نقوش۔ وہ اپنے لمبے قد سمیت اس کی آنکھوں میں جھلملانے لگا تھا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور اپنے برابر بیٹھے شخص کو دیکھا۔ وہ اپنے دوسری طرف بیٹھے عاطف سے دھیرے دھیرے کچھ کہہ رہا تھا۔ مناہل ابھی تک ناراض تھی۔ اس لیے وہ دوسری جانب بیٹھی تھی۔

واپسی پر شاہ میر نے سب کو چائنیز میں سوپ پلایا۔ فرہاد' شرجیل' صبا اور عاطف بھی آپس میں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ رملہ چوری چوری کتنی ہی دیر تک سامنے بیٹھے شخص کو دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھیں اس کے بابا سے بہت ملتی جلتی تھیں۔ اس کا انکشاف اس پر اس لمحے ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

ان سب کے ہنسنے کی آواز پر وہ اپنے خیالات سے چونکی اور دیکھا۔ شاہ میر کے لبوں پے بڑی جاندار مسکراہٹ تھی۔

"شاہ میر۔" مناہل کی آواز یکلخت رملہ کے کانوں میں زہر بن کر اتر آئی۔

"شاہ میر۔ کل آپ میرے ساتھ الحمرا چل رہے ہیں۔ وہاں کتابوں کی بہت اچھی نمائش لگی ہے۔"

وہ ادائے دلبری سے بولی۔

"آل رائٹ۔" شاہ میر نے کندھے اچکائے اور تبھی رملہ کی طرف دیکھا۔

"رملہ تم بھی کل ہمارے ساتھ چلوگی الحمرا"

"رملہ بھلا وہاں جا کر کیا کرے گی۔ کون سا اس نے گریجویشن کرنی ہے اور پھر اس کتابوں سے کوئی خاص دلچسپی بھی نہیں۔ اگر دلچسپی ہوتی تو یہ اپنی تعلیم مکمل کر لیتی۔" مناہل کی باتیں سنسناتے تیر کی طرح اس کے دل میں ترازو ہو گئیں۔

دفعتاً" رملہ کو لگا جیسے مناہل نے اسے بھری محفل میں ذلیل کر دیا ہو۔ اس کے بدن میں ہزاروں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ اسے نیچا کرانے کا موقع ہو اور مناہل ہاتھ سے جانے دے۔ ناممکن وہ اپنی تعلیم' قابلیت کا رعب شاہ میر کے ساتھ ساتھ اس پر بھی جمارہی تھی۔ رملہ کو یوں محسوس ہوا جیسے سبھی اس پر ہنس رہے ہیں۔ اس کا تمسخر اڑا رہے ہیں۔

وہ اندر ہی اندر درد کی شدت سے بلبلا اٹھی۔ زبان سے کچھ کہنا چاہا مگر آواز گھٹ کر رہ گئی۔ رملہ کی اڑی رنگت کو شاہ میر نے واضح طور پر محسوس کیا۔ مناہل کی باتیں شاہ میر کو بھی کچھ اچھی نہیں لگیں سامنے بیٹھے لڑکی کی آنکھوں میں جیسے گہرا اضطراب تھا۔ اور یہ اضطراب جانے کیوں شاہ میر کو بے چین سا کر گیا۔ کسی کی دل آزاری اسے قطعا" منظور نہیں تھی اور یہ لڑکی تو ہمیشہ سے سب سے الگ تھلگ رہتی تھی۔ خود میں گم۔ پتا نہیں کن محرومیوں کے تحت اس نے اپنے چاروں طرف اونچی دیوار تان لی تھی۔ وہ اس لڑکی کے اندر جھانکنا چاہتا تھا۔ انسانیت کے ناطے اس کی ڈھارس بندھانا چاہتا تھا۔ اسے زندگی کی طرف لانا چاہتا تھا۔ مگر۔۔۔

"رملہ۔" شاہ میر نے بھیگی پلکوں والی لڑکی کو دوبارہ مخاطب کیا۔

"تم نے بتایا نہیں تم بھی ہمارے ساتھ الحمرا چل رہی ہو ناں۔"

مقابل کے لہجے کی ہمدردی' مقابل کی آنکھوں میں ہویدا ترس۔ اسے اس کی ہمدردی نہیں چاہیے۔ اسے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے وہ جذبات و احساسات چاہیے تھے' جو وہ مناہل پر لٹاتا تھا۔ اس کے جیون میں' جو خلا تھا وہ صرف اور صرف پیار و محبت سے ہی پر ہو سکتا تھا شاہ میر کی محبت سے۔ شاہ میر کی چاہت سے۔

"نہیں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اپنے لہجے کی تلخی کو دبا نہ سکی۔

"کیوں۔۔۔ انکار کی وجہ۔"

وہ نہ جانے کیا جاننے پر مصر تھا۔ یہ شخص آخر کرید کرا سے زخمی کیوں کرنا چاہتا ہے۔ شاید وہ بھی مناہل

کے ساتھ ملا ہے۔ جبھی تو وہ اس کی زبان سے اس کی کم مائیگی اور کم تعلیم یافتہ ہونے کا اقرار سننا چاہتا ہے۔
دفعتاً" رملہ کو لگا جیسے اسے اردگرد سبھی کچھ ڈول رہا ہے۔ سب گول گول گھوم رہا ہے۔ وہ اگر اس گھٹن زدہ ماحول میں ایک لمحہ بھی مزید رکی تو اس کا سانس رک جائے گا اس کا دل جیسے تاریکی میں ڈوبتا جا رہا تھا۔
"شرجیل۔ مجھے گھر لے چلو۔" اس کے ہاتھ پاؤں بالکل ہی ٹھنڈے ہو گئے تھے۔
"کیا بات ہے رملہ۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔" شارمین اس کے چہرے پر پھیلتی ہوئی ویرانی کو دیکھ کر پریشان ہوا ٹھی۔ اس کی آنکھوں میں وحشت بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ سب اس کی بگڑتی حالت سے پریشان ہو اٹھے۔
"چلو گھر چلیں۔" شارمین نے اسے کندھوں سے تھاما ہی تھا کہ وہ لہرا کر ڈھے گئی۔
"یہ سب منائل کی وجہ سے ہوا ہے۔ یہ اچھی طرح جانتی ہے کہ رملہ کتنی حساس ہے۔ مگر پھر بھی یہ اس کے دل پر چٹکی بھرنے سے باز نہیں آتی۔" شارمین نے غصے سے منائل کی طرف دیکھا تو وہ اندر ہی اندر چور سی بن گئی۔
"کم از کم وقت اور موقع تو دیکھ لیا کرو منائل۔" شرجیل نے بھی اسے سرزنش کی۔
"اوفوہ۔ اب مجھے کیا اندازہ تھا کہ محترمہ اتنی نازک مزاج ہیں کہ میری ذرا سی بات پر ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جائیں گی اور پھر میں نے کون سا جھوٹ بولا تھا۔ انٹر سے آگے اس نے صاف طور پر پڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔ اب میں اس کا دل رکھنے کو اسے ماسٹرز کی ڈگری کا حقدار تو قرار نہیں دے سکتی ناں۔"
وہ ذرا بھی شرمندہ نہیں لگ رہی تھی۔
"تم کم از کم اپنی زبان پر تو قابو رکھ سکتی ہو ناں۔"

☼ ☼ ☼
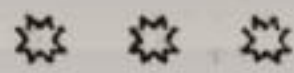
وہ سب کے سب رملہ کے کمرے میں موجود تھے۔ سامنے پڑی بے سدھ لڑکی سبھی کو تشویش میں مبتلا کر گئی تھی۔ ڈاکٹر اسے انجکشن لگا کر گیا تھا۔ اور ساتھ میں کسی ذہنی صدمہ کا اثر بتایا تھا۔
"خدایا۔ میری بچی کی کیا حالت ہو گئی۔" امی کو بہت تاسف ہو رہا تھا۔ اسے برا بھلا کہتی تھیں۔ باپ کے گزرنے کے بعد وہ جس طرح حساس اور زود رنج ہو گئی تھی۔ اسے محسوس کرنے کی بجائے وہ الٹا اسے ہر بات کے لیے مورد الزام ٹھہرانے لگی تھیں۔ ایک بار بھی تو انہوں نے اس کے اندر جھانک کر اس کی محرومیوں اور اس کی تنہائیوں کو جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔
"رملہ۔" اسے ہوش میں آتے دیکھ کر انہوں نے اسے محبت سے پکارا۔
"رملہ کیا ہوا تھا بیٹے۔" وہ آنکھوں پر بازو رکھے خاموش لیٹی رہی۔ بدن بری طرح ٹوٹ رہا تھا۔ دماغ چکرا رہا تھا۔ بخار میں شدت ہنوز باقی تھی۔
"کچھ تو منہ سے بولو رملہ۔ کیا ناراض ہو مجھ سے۔" امی نے اس کے تپتے چہرے کو چھوا۔
"چچی پلیز آپ اسے آرام کرنے دیں۔ ڈاکٹر تاکید کر گیا ہے کہ اسے وقت پر دوا کھلاتی رہیں ان شاء اللہ کل تک طبیعت سنبھل جائے گی۔" شاہ میر کی آواز پر رملہ چونکی۔ تو وہ بھی وہیں موجود ہے۔ وہ کیا سمجھے گا۔ وہ اتنی بزدل اور کمزور ہے کہ منائل کی باتوں کو دل پر لے بیٹھی اور اس حالت کو پہنچ گئی۔
"میں ٹھیک ہوں۔" اسے دکھانے کو وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ سر درد کی شدت سے پھٹا جا رہا تھا۔
"ارے رے لیٹی رہو۔ تمہیں بہت تیز بخار ہے۔" شارمین اس کی طرف بڑھی۔
"میں ٹھیک ہوں۔ مجھے بخار نہیں ہے۔"
وہ خود کو مضبوط ظاہر کرنا چاہتی تھی۔ وہ اندر سے بالکل مجروح نہیں۔ اسے کسی کی باتوں سے کوئی تکلیف نہیں پہنچتی۔ وہ بہت بہادر ہے۔ مگر چکراتے سر اور تیز بخار نے اس کی ساری بہادری کا پول کھول دیا۔ غنودگی کے باعث وہ اپنا سر تکیے سے لمحہ بھر کے

لیے بھی نہ اٹھا سکی۔

اور پھر پتا نہیں وہ کب تک بے سدھ رہی۔

صبح سورج کی کرنوں نے کھڑکی کے راستے اس کے چہرے کا طواف کیا تو اس نے مندی مندی آنکھیں کھول کر گردوپیش کا جائزہ لیا۔ اس کے بیڈ کے دوسری طرف شارمین موجود تھی۔ شارمین پر نظر پڑتے ہی پچھلی رات کے سارے لمحات ایک تواتر کے ساتھ ذہن کے پردے پر پھر روشن ہو گئے۔ اسے رونا آنے لگا۔

"رملہ ... یہ کیا حالت بنالی ہے تم نے اپنی۔"

شارمین نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"شارمین تم جانتی ہو ناں کل رات مناہل نے میری کتنی تذلیل کی تھی۔ اس کا طنزیہ لہجہ... اس کا برتری کا احساس... اور... اور وہ شاہ میر بھی اس کے ساتھ مل گیا تھا۔ ان دونوں نے مل کر مجھے بہت زیادہ تکلیف دی ہے۔ میں مناہل کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔"

سارا غم، سارا غصہ آنسوؤں کے ساتھ بہہ نکلا۔ جو زخم مناہل اور شاہ میر نے دیے تھے وہ ان پر ابھی تک بلبلا رہی تھی۔

"ارے تم پھر رونے لگیں۔ میں نے تمہیں کتنی مرتبہ سمجھایا ہے کہ فضول قسم کی باتوں کو دل سے مت لگایا کرو اور مناہل کی تو عادت ہے بکواس کرنے کی۔ مگر شاہ میر کو تم غلط مت سمجھو۔ کل رات اس کا رویہ تم سے غلط نہیں تھا۔"

"تم آخر شاہ میر کی وکالت کیوں کرنے لگتی ہو۔" وہ جھلا گئی۔

"صرف اس لیے کہ وہ ایک مخلص اور صاف گو شخص ہے۔ مناہل کی باتوں کا اس نے بھی برا منایا تھا۔ اب اگر مناہل ہی بے حس بنی رہے تو اس میں شاہ میر کا کیا قصور..."

"شاہ میر کا قصور ہے۔ اس کی توجہ نے ہی مناہل کو اتنا سر چڑھا لیا ہے کہ وہ کسی کو انسان نہیں سمجھتی۔ بڑا غرور آگیا ہے اس میں شاہ میر کی رفاقت سے اور..."

اس کی باتوں پر شارمین کتنی دیر اس کی آنکھوں میں جھانکتی رہی۔ اور پھر جیسے کسی نتیجے پر پہنچ گئی۔

"رملہ ... تم کہیں شاہ میر کو پسند تو نہیں کرنے لگیں۔"

"مجھے تو وہ شخص ایک آنکھ نہیں بھاتا۔"

شارمین کی بات پر ذرا دیر کو سارے وجود میں سنسنی سی پھیل کر سناٹا چھا گیا تھا۔ وہ آنکھیں چرا گئی۔ اور مزید پتلی حالت تب ہو گئی جب شاہ میر کھلے دروازے سے اندر چلا آیا۔ دل میں درد کی ایک لہر سی اٹھی جو پورے وجود میں پھیلتی چلی گئی۔

"اب کیسی طبیعت ہے۔" مہربان سی مسکراہٹ سمیت وہ پوچھ رہا تھا۔

"زندہ ہوں۔" اس کا چہرہ یکلخت تپ کر سرخ ہو گیا۔

یہ شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کی یہ حالت کیونکر ہوئی۔ پھر بھی لاپروا بنا اس سے ہمدردی جتانے چلا آیا۔ وہی ہمدردی جس سے اسے نفرت تھی۔

"رملہ مجھے افسوس ہے کہ مناہل کی باتوں نے تمہیں دکھ پہنچایا۔ اس کے لیے میں..."

"پلیز چلے جائیے آپ... چلے جائیے یہاں سے۔ مجھے کسی کی ہمدردی نہیں چاہیے۔" مقابل کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ چیخ اٹھی۔ اس کی مٹھیاں بھنچ گئی تھیں۔ درد کی ایک تیز لہر غصے کی صورت بل کھاتی اٹھی اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔

شاہ میر اس کی اتنی بدتمیزی پر لمحہ بھر کو ساکت رہ گیا۔

ایسا اہانت آمیز انداز... ایسی بد دماغی اور کھردرا پن۔ لمحوں بعد ہی شاہ میر کا چہرہ جیسے سرخ ہو گیا۔

اس نے ایک قہر برساتی نظر اس بد دماغ لڑکی کی نذر کی جس میں دنیا جہاں کی نفرت تھی غصہ تھا۔

رملہ اندر ہی اندر کانپ سی گئی۔ ان نگاہوں کی تپش اس سے برداشت نہ ہو سکی اور پلکیں خود بخود جھک گئیں۔

"سنو بد تہذیب لڑکی۔ تم ہمدردی تو کیا نفرت کے

قابل بھی نہیں ہو۔"

اس کا لہجہ سرد تھا۔ وہ ایڑیوں پر گھوما اور تیز تیز قدموں سے کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے اٹھتے قدموں کی تیزی اس کے جذبات کی تندہی کی گواہ تھی۔

"یہ کیا کیا تم نے رملہ۔ بہت بے وقوف ہو۔ وہ تم سے ہمدردی کرے۔" شارمین نے اسے سرزنش کرنی چاہی۔

"مت نام لو میرے سامنے ہمدردی کا۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔ نفرت ہے۔" وہ یکلخت مارے وحشت کے چلانے لگی۔۔۔ اور لمحوں بعد ہی غشی کی حالت میں چلی گئی۔ اس کا بخار پھر سے تیز ہو گیا تھا۔ وہ ساری رات اذیت میں گزری جیسے انگاروں پر لوٹتی رہی ہو۔ بخار کی شدت میں بار بار اس پر غنودگی طاری ہو جاتی تھی۔ جب بھی آنکھ کھلتی۔ دو قہر برساتی نفرت انگیز آنکھیں خود پر جمی ملتیں۔ اور کانوں میں وہ سرد سا جملہ اتر آتا۔

"سنو بدتہذیب لڑکی۔۔۔ تم ہمدردی تو کیا' نفرت کے قابل بھی نہیں ہو۔"

اور پھر پورا ہفتہ گزر گیا اس کا بخار اترتے اترتے۔

وہ شعوری اور لاشعوری طور پر اس شخص کی منتظر رہی جو اس دن کے بعد سے دوبارہ اس کے سامنے نہیں آیا تھا۔ یقیناً" وہ اس سے بہت خفا تھا۔ جب ہی ایک بار بھی اس کی طبیعت کا پوچھنے نہیں آیا تھا۔

اس شخص کی بے اعتنائی پر رملہ کا دل دکھ کر رہ گیا۔

اس کی جگہ اگر مناہل بیمار ہوتی تو وہ دن رات اس کے سامنے رہتا۔ اپنے ہاتھ سے اسے دوا پلاتا۔ اس کی صحت یابی کے لیے دعا گو ہوتا۔ اسے get well soon کا کارڈ دیتا۔۔۔

شاہ میر کا رویہ ان دنوں اس سے کچھ زیادہ ہی سرد ہو گیا تھا۔ یہ رملہ نے بارہا محسوس کیا تھا۔ وہ اسے غیر اہم اور معمولی ہستی سمجھ کر نظرانداز کر جاتا تھا۔ اس کی نگاہیں اگر غلطی سے اس کی نگاہوں سے جا ملتیں تو اسے ان آنکھوں میں اپنے لیے بے زاری اور اکتاہٹ نظر آتی۔

مگر ان آنکھوں میں مناہل کے لیے پیار ہی پیار تھا۔ نرمی تھی۔

★ ★ ★

جانے وہ کتنی دیر یہاں سے وہاں ٹہلتی رہی جب ہی اسے اپنی پشت پر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ گھبرا کر پلٹی اور گردن گھمانے پر جیسے ساری کی ساری برف بن گئی۔

وہ سلگتی آنکھیں اضطراب سمیٹے اس کے وجود کے آرپار ہو رہی تھیں۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو اس وقت۔" لہجہ میں ہلکی سی غراہٹ تھی۔

"کچھ نہیں۔" اس لہجے کی کرختگی کو نظرانداز کرتے رملہ نے بھاگ جانے کی نیت سے ادھر ادھر دیکھا۔

"کچھ نہ کچھ تو ضرور کر رہی ہو۔" مقابل کا لہجہ مزید درشت ہو گیا۔ یہ لہجہ مناہل سے بات کرتے سمے کیسا شہد آگیں' ہو جاتا ہے اور یہی لہجہ اسے سامنے پا کر زہر اگلنے لگتا ہے۔ جانے پاگل دل ہر ہر لمحے کیوں اپنا موازنہ مناہل سے کرنے لگتا تھا۔

"اور اگر یہی سوال میں آپ سے کروں تو۔۔۔" وہ سلگتے لہجے میں بولی۔

"تو فضول ہو گا۔ رملہ بیگم۔ میں تمہاری گستاخیاں بہت عرصے سے برداشت کرتا آرہا ہوں۔ مگر اب مجھ سے بات کرنے سے پہلے ذرا تمیز کے دائرے میں رہنا۔ سمجھیں۔"

کاٹ دار لہجہ۔ جس میں غیض و غضب بھی تھا اور درشتی بھی۔ رملہ لمحہ بھر کو بھی دبتی نہ لگ رہی تھی۔ بلکہ مزید بھڑک گئی۔

"مسٹر میں آپ کی ملازم یا غلام نہیں ہوں جو میں آپ کے سامنے عاجزی برتتی پھروں اس کی ضرورت تو صرف انہیں ہے جنہیں آپ سے کچھ مطلب ہے۔" وہ باوجود کوشش کے مناہل نہ نام نہ لے سکی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا۔۔۔؟"

رملہ کو اس کی نظروں کی کاٹ اپنے روم روم میں

پیوست ہوتی محسوس ہوئی۔ یہ آنکھیں ابو سے کتنی ملتی جلتی ہیں۔ خوب صورت' کشادہ اور گہری گہری آنکھیں۔ وہ سارعب میں آئے ایک ٹک ان آنکھوں میں دیکھے گئی۔ دل چاہا کہ ایک قدم آگے بڑھ کر ان زندگی سے بھرپور آنکھوں کو چھولے۔

"کچھ نہیں۔" اس کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ وہ واپس جانے کو مڑی تو وہ لپک کر اس کے سامنے آگیا۔

"تمہیں اس بات کا مطلب بتانا ہو گا رملہ بیگم۔ ورنہ۔۔۔" وہ اس کے بالکل نزدیک کھڑا تھا حالانکہ اسے اس کا کوئی حق نہیں تھا۔

"میں خود کو اس سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں پاتی۔"

اس نے اپنا دوپٹا سنبھالتے ہوئے کہا جو ہوا کے زور دار ریلوں سے پھڑپھڑا رہا تھا۔ اس کے بال کھل کر کندھوں پر بکھر گئے تھے۔

"تم تو پھر اس وقت تک یہاں سے ایک قدم بھی ہل نہیں سکتیں جب تک کہ میری بات کا جواب نہیں دے دیتیں۔" اس کے لہجے میں چٹانوں کی سی سختی تھی۔

"دیکھیں۔ آپ میرا سر مت کھائیں۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔ مجھے جانے دیں۔"

اس نے سائیڈ سے ہو کر تیزی سے برآمدے کی جانب بڑھنا چاہا۔ شاہ میر نے ایک جست میں اس کا راستہ روک لیا اور اسے بازوؤں سے پکڑ لیا۔ وہ کانپ سی گئی۔

اف وہ اس سے کس قدر وحشی ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شعلوں کی لپک تھی۔

"چھوڑیں مجھے۔" وہ خشک ہوتے گلے کے ساتھ چلا اٹھی اور بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا۔ شاید کوئی آجائے۔ شاید کوئی اسے جلاد صفت شخص سے اس کی جان بچالے۔

"تمہیں ہر قیمت پر بتانا ہو گا۔ کیا سوچ کر تم نے ایسی گھٹیا بات کہنے کی کوشش کی ہے۔ جلدی بتاؤ۔ ورنہ۔"

"خدا کے لیے مجھے جانے دیں۔"

مارے بے بسی کے آنسو اس کے دائیں بائیں ایک تواتر سے لڑھکنے لگے۔

وہ سراپا شعلہ بنا تھا۔ وہ اس کی چاہت کی تمنائی تھی۔ وہ اس کی نفرتوں اور خشونت کی متقاضی نہیں تھی۔

"سنو رملہ بیگم۔" اس نے ایک لمحہ کو رک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا اور نفرت سے بولا۔

"تم اس قابل نہیں کہ تم سے محبت کی جاسکے۔ مجھے تم سے نفرت ہے۔ شدید ترین نفرت۔"

اس نے سفاکی سے کہتے ہوئے اسے ایک زوردار جھٹکا دیا اور پھر اسے بے دردی سے ایک طرف دھکیل کر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔ اپنی باتوں کا رد عمل دیکھے بغیر کہ اس کا وہ سرد سا روح کو کھینچ لینے والا لہجہ اس لڑکی کا دل زخمی کر گیا تھا۔

دفعتاً" رملہ کو لگا اس کے اردگرد اندھیروں کا جمود بڑھتا جا رہا ہے۔ دکھ کی تیز لہریں جیسے آن واحد میں دل میں اتر آئیں۔

"مجھے تم سے نفرت ہے' شدید ترین نفرت۔۔۔"

ہر طرف سے یہی صدا بلند ہو رہی تھی۔ ہر چیز قہقہے لگاتی لگ رہی تھی۔ وحشت زدہ سی ہو کر رملہ نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

وہ بمشکل اپنے بے جان ہوتے وجود کو گھسیٹ کر اپنے کمرے میں لائی اور بیڈ پر گر کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ اس کی آنکھوں میں دھند سی بھرتی جا رہی تھی اور رگوں میں آگ۔

"تو گویا آج وہ شخص اس سے اپنی ازلی نفرت کا اظہار کر ہی گیا۔"

اس نے ذرا ڈھکے چھپے لفظوں میں منال کا نام لیا تو وہ ہتھے سے ہی اکھڑ گیا۔ ایک دم بھڑک اٹھا۔ ہاں کیوں نہ بھڑکتا۔ آخر کو وہ اس شخص کی محبت تھی۔ اور اپنی محبت کی رسوائی کس کو منظور ہوتی ہے۔

مگر وہ اس کی محبت کی رسوائی تھوڑی کر رہی تھی۔ وہ تو اسے بتانا چاہ رہی تھی کہ' اسے اس شخص سے کوئی

سروکار نہیں کہ وہ اس کی محبت اور نفرت کا اندازہ لگاتی پھرے یا پھر اس کی خفگی سے خوفزدہ ہوتی پھرے۔ اس کی نفرت مناہل کے لیے تو معنی خیز ہو سکتی ہے۔ مگر اس کے لیے نہیں۔ وہ اپنے اندر جھانکتے جیسے گھبرا رہی تھی۔

اس کی نفرت اس کے لیے معنی رکھتی ہے جبھی تو اس کی روح میں گہرے گہرے گھاؤ ابھر آئے تھے۔ کبھی نہ مندمل ہونے کے لیے۔ اور پھر نفرتوں کی اس سرد آگ میں جلتے جلتے جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

✡ ✡ ✡
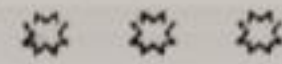
آنکھ کھلی تو دن کافی چڑھ آیا تھا۔ اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹاتے ہوئے باہر جھانکا۔ سنہری روپہلی دھوپ لان میں چمک رہی تھی۔ اس نے درد کی شدت سے پھٹتے سر کو تھام لیا اور چائے لیے برآمدے میں آگئی۔

رات والا واقعہ باربار اس کی نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ وہ زہر میں بجھے الفاظ مسلسل اس کے دل میں گھاؤ ڈال رہے تھے۔

اس نے ایک گہرا سانس بھرا اور کپ لبوں سے لگا لیا جبھی اس کی نگاہ سامنے اٹھ گئی۔ لان میں کرسی پر وہی دشمن جاں براجمان لیپ ٹاپ پر مصروف تھا۔ دل میں درد کی ایک لہر سی اٹھی۔

”شاہ میر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جو تم میرے دشمن اول بن بیٹھے ہو۔ تم نے اپنی نفرت کی انتہا کر ڈالی ہے مجھ پر اور محبت کی انتہا مناہل پر کرو گے۔ میری دشمن پر جو زندگی کے ہر ہر لمحے مجھے شکست دے کر خوش ہوتی ہے۔ تو کیا تم بھی میری دشمن کا ساتھ دو گے شاہ میر۔ شاہ میر مجھے شکست سے خوف آتا ہے۔

مگر بدنصیبی تو یہی ہے کہ ہر بار اسی شکست سے مجھے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ بچپن سے لے کر اب تک میں اس کیفیت میں گھری رہی ہوں اور اب اب بھی یہی میرا مقدر ہے۔ میں نے تو سوچا تھا اب کی بار جیت میری ہوگی اور مناہل ہار جائے گی۔ مگر نہیں۔ وہ میری بھول تھی۔ نادانی تھی۔ اس دفعہ بھی ہمیشہ کی طرح جیت مناہل کی ہی ہو گی۔ اور میں ہار جاؤں گی۔“ اوہ خدایا!

کیا میری قسمت میں جیت نہیں۔“

وہ ایک ٹک اس ستمگر کو دیکھتے ہوئے سلگتی سوچوں سے خود کو سلگا رہی تھی۔ سرخی مائل گندمی رنگت، سیاہ گھنگھریالے بال الجھے الجھے ماتھے پر بکھرے ہوئے۔ مضبوط ہاتھوں کی انگلیاں لیپ ٹاپ کے کی بورڈ پر تھرکتی ہوئیں۔ اور گہری گہری برفیلی آنکھیں۔ اس شخص کو دیکھتے دل خوامخواہ دھڑکنے لگتا تھا اور سارے تن من میں سنسناہٹ سی دوڑ جاتی تھی۔

یہ کیسا عجیب سا مقام تھا، ایک شخص اس کی زیست میں اہمیت اختیار کرتا جارہا تھا اور وہ اپنے دل کے گرد کوئی دیوار کھڑی نہ کر سکی تھی۔

اس دم اس شخص کی نگاہیں اس پر آن پڑی تھیں۔ ان آنکھوں کے تاثرات یکلخت بدل گئے۔ وہ یہاں سے بھی ان آنکھوں کے گلابی پن کو نفرتوں میں ڈھلتا دیکھ سکتی تھی۔ اس کے ہونٹ سختی سے بھنچ گئے تھے۔

رملہ نے گھبرا کر اپنی نگاہوں کا زاویہ بدل لیا۔

اس دم مناہل چائے کی پیالی ہاتھ میں تھامے وہاں آ گئی اور رملہ پر ایک طنزیہ نگاہ ڈال کر اس کے قریب سے ہوتے ہوئے برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر شاہ میر کی طرف بڑھ گئی۔ اس نگاہ میں سبھی کچھ تو تھا۔ فتح مندی کا احساس، طنز کی چبھن۔ برتری کا احساس۔ رملہ نے کرب سے ہونٹ کاٹ لیے۔

”یہ چائے آپ کے لیے۔“ مناہل نے چائے کا کپ شاہ میر کی طرف بڑھا دیا۔

”تھینکس۔ اس وقت چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی۔“ اس نے مسکرا کر کپ تھام لیا۔

”تھینکس کے ساتھ ساتھ سوری کہنے کو بھی تیار رہیں۔“ وہ منہ پھلائے نخرے سے بولی۔

”وہ کیوں بھلا۔۔۔؟“ ”وہ اس لیے کہ آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ مجھے شاپنگ پر لے چلیں گے۔ مگر ابھی تک اس پر کوئی عمل درآمد نہیں ہوا۔“

"اوہ واقعی۔ میں تو بھول ہی گیا تھا۔ دراصل اس سلسلے میں لاپروائی میری بھی نہیں۔ تمہیں تو پتا ہے کہ آج کل میرے رزلٹ کا چکر ہے۔ اس لیے دوستوں کے ساتھ مل کر ہوسٹل واپس جانے کا پروگرام بنا رہا ہوں۔"

"کب جارہے ہیں۔ پہلے تو آپ نے اس کا ذکر نہیں کیا۔"

"آج ہی جانا ہے۔"

"اور واپس کب لوٹیں گے۔"

"ایک ہفتہ بعد۔ مگر تم اداس نہ ہونا۔ تمہیں باقاعدگی سے کال بھی کروں گا اور Text بھی۔"

وہ بہرحال اتنی اونچی آواز میں ضرور بول رہا تھا کہ اس کی آواز بخوبی وہاں تک جا پہنچے جہاں پہنچانی مقصود تھی۔

اور پھر وہ مزید وہاں نہ رک سکی اور اپنے کمرے میں جا چھپی۔ وہ خوامخواہ اس کے جانے پر اداس ہو رہی تھی۔

وہ چلا جائے گا تو مناہل کو بھی اسے مزید جلانے کا موقع نہیں ملے گا۔ وہ بھی انتظار کی اس آگ میں جلے گی جس آگ میں وہ ہمیشہ سے جلتی آرہی ہے۔

اور پھر ایسا ہوا کہ وہ چلا گیا۔ وہ اس سے مل کر بھی نہیں گیا۔ وہ لاشعوری طور پر منتظر رہی۔ شاید وہ جانے سے پہلے ایک بار اس کے سامنے چلا آئے۔ اور اپنے گزشتہ رویے پر معذرت کے ساتھ ساتھ اس پر اپنے نرم لہجے کی پھوار برسا دے۔ اس کے کانوں میں اپنی چاہت کا مدھ برسا دے۔

"او پاگل لڑکی... تم میرا انداز بھی نہیں سمجھ پائیں۔ نفرتوں کے پردے میں تم سے شدید محبت پوشیدہ ہے۔ آؤ میں تمہارا ہاتھ تھام کر آکاش کے اس پار لے چلوں جہاں کوئی ہمیں جدا نہ کرپائے۔ ہمارا پریم امر ہے۔ ہمارا تعلق اٹوٹ ہے۔"

وہ جارہا تھا اور وہ بالکنی میں جھکی اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی... آف وائٹ کلر کے عوامی سوٹ میں وہ اپنے اونچے قد سمیت آکاش کی بلندیوں کو چھوتا لگ رہا تھا۔ بہت شاندار... وہ سب سے مسکراتے ہوئے جدا ہو رہا تھا جبکہ مناہل کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ جاتے جاتے اس کی نگاہیں غیر ارادی طور پر اس بالکنی پر آن رکی تھیں، جہاں وہ بدتہذیب لڑکی ریلنگ پر جھکی تھی۔

اسے اپنی طرف دیکھتے پاکر رملہ کا دل جیسے اچھل کر حلق میں آگیا۔

اس کے جانے کے بعد دن بڑے اداس' بڑے ویران ویران گزر رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے زندگی میں بڑی کمی آگئی ہو۔ جیسے بہت کچھ کھو گیا ہو۔ جیسے خوشیاں روٹھ گئی ہوں۔ قدم قدم پر وہ ستمگر بے حد یاد آتا تھا۔

☼ ☼ ☼

ان دنوں مناہل ہر وقت موبائل کانوں سے چپکائے ملتی تھی۔ کبھی تیزی سے Text کرنے میں مصروف ہوتی۔ رملہ کو سو فیصدی یقین تھا۔ یہ لگاوٹ' یہ بے قراری صرف اور صرف شاہ میر کے لیے ہے۔ بہت بار اس نے کان لگا کر اس کی گفتگو سننے کی کوشش کی تھی۔ مگر مناہل بھی بہت چالاک تھی۔ موبائل کی گھنٹی بجتے ہی کمرے سے باہر چلی جاتی۔ یا پھر لان میں ٹہلتے کتنی کتنی دیر باتوں میں مگن رہتی۔ وہ شخص ڈاکٹر بن رہا ہے۔ اس کے باوجود اس کے پاس اتنا فالتو وقت ہے۔ جو اس لڑکی کے ساتھ باتوں میں ضائع کرتا پھرے۔ بڑا فارغ ڈاکٹر ہے۔ وہ ستا چہرہ لیے مناہل کا ایک ایک انداز بغور دیکھا کرتی۔

اس شام مناہل لان میں اترنے والی دو سیڑھیوں میں سے ایک پر بیٹھی موبائل کان سے لگائے ہوئے تھی۔

"اگر تمہارا اصرار ہے تو آج شام مل سکتی ہوں۔ مگر کل ممکن نہ ہو گا۔ کیونکہ کل میرا کزن واپس لوٹ رہا ہے اور اس کی موجودگی میں وقت نکالنا مشکل ہوتا ہے۔" مناہل کے ان جملوں پر رملہ ٹھٹک سی گئی۔

یہ مناہل کس سے بات کر رہی ہے۔ یہ شاہ میر تو نہیں لگتا۔

"ہاں بھئی وہ کزن ہم سب کا لاڈلا ہے۔ اس لیے وہ ہم سب سے خصوصی توجہ کی توقع رکھتا ہے۔ ویسے سچ کہوں۔ اگر تمہارا میری زندگی اور میرے دل پر اختیار نہ ہوتا تو وہ شخص جیون ساتھی بنانے کے لیے آئیڈیل تھا۔ پتا کیا کتنی ہی لڑکیاں ہیں جو اس کی رفاقت کے لیے آہیں بھرتی ہیں۔" مناہل ذرا کی ذرا رکی اور پھر دوسری طرف کی بات سن کر ہنسنے لگی۔

"میں نے آج تک اس کے لیے آہیں نہیں بھریں ... اور۔"

بات کرتے کرتے مناہل کی نظر عین پشت پر کھڑی رملہ پر پڑی تو اس کا چہرہ یکبارگی پیلا پڑ گیا۔ اس نے جھٹ موبائل بند کر دیا۔ اور لمحوں بعد ہی خود کو سنبھالتے پوچھنے لگی۔

"ارے رملہ تم؟ خیریت تو ہے۔"

"خیریت ہے یا نہیں۔ یہ تو تم بتاؤ گی۔"

رملہ نے تیکھے انداز میں کہا۔ وہ بڑی مشکوک نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ لمحہ بھر کو اسے اپنے اندر بڑی کمینی سی خوشی اترتی محسوس ہوئی تھی۔

تو اصل قصہ یہ تھا۔ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے اور وہ خوامخواہ اسے اپنا رقیب سمجھتے ہوئے اپنا خون سلگاتی رہی۔ خود کو تڑپاتی رہی۔

"کیا مطلب۔" مناہل انجان بننے کی خوب اداکاری کر رہی تھی۔

"یہ تم موبائل پر ہر وقت کس کے ساتھ لگی رہتی ہو۔ پہلے میں سمجھتی تھی کہ شاہ میر ہو گا۔ مگر یہ تو کوئی دوسرا ہی چکر ہے۔"

"دوسرا چکر۔" وہ لمحہ بھر کو ٹھٹکی۔

"تمہیں اس سے کیا۔ چاہے پہلا چکر ہو یا دوسرا ... تم کیوں اس بھونڈے انداز میں میری ذاتیات میں دخل اندازی کرنے پر تلی ہو۔"

"کیوں دخل اندازی نہ کروں۔ یہاں تم نے شاہ میر کو دیوانہ بنا رکھا ہے اور دوسری طرف کوئی اور ہے جس کے ساتھ مصروف رہتی ہو کون ہے وہ ... اور شاہ میر کو کیوں دھوکا دے رہی ہو۔"

دل ایک لمحے کو خوش تھا کہ راستے کا کانٹا خود بخود نکل گیا۔ مگر ذہن میں ایک خلش سی ابھر آئی۔ کیا وہ شاہ میر کی خوب صورت آنکھوں میں اداسی اور شکستگی دیکھ پائے گی۔ وہ آنکھیں جو اس کے بابا سے مماثلت رکھتی ہیں۔ وہ ان آنکھوں میں دھندلاہٹ اترتے کیسے دیکھ پائے گی۔

دراصل جس سے سچی محبت کی جائے' اسے دکھ نہیں دیا جاتا۔ اس کے لیے سب کچھ تیاگ دیا جاتا ہے اور ... وہ عجیب قسم کے جذبات سے دوچار ہو رہی تھی۔

"میں بھلا شاہ میر کو کیوں دھوکا دینے لگی؟" مناہل کے ماتھے پر ناگوار سی شکنیں ابھر آئیں۔

"کیا تم شاہ میر سے محبت نہیں کرتیں۔ پھر یہ یکایک اتنی بڑی تبدیلی کیونکر۔"

"شٹ اپ رملہ۔ یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں شاہ میر سے محبت کرتی ہوں۔ کسی سے ہنس بول لینے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ انسان اس کے لیے دل میں گہرے جذبات رکھتا ہے۔ اس سے محبت کرتا ہے۔"

اس کی بات پر وہ غصے سے سرخ پڑ گئی تھی۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو مناہل؟ میں نے خود اپنے کانوں سے سنا اور اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ تمہاری بے تابیاں۔ تمہاری بے چینیاں شاہ میر کے لیے اور ..."

"پلیز رملہ۔ اسٹاپ اٹ۔ خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ۔ اس قسم کی فضولیات کے بارے میں تم جیسی لڑکی ہی سوچ سکتی ہے۔ جس کا زندگی کے بارے میں نظریہ بہت محدود ہے۔ میرے ذہن میں تو ایسا خیال کبھی نہیں آیا۔"

"لیکن ... مگر۔" رملہ ہکلا کر رہ گئی۔

"میں ہمیشہ سے آفتاب کو پسند کرتی ہوں۔ آفتاب میرا کلاس فیلو ہے اور ہم دونوں میں بے حد انڈر اسٹینڈنگ اور ذہنی ہم آہنگی ہے۔ وہ بہت بار اپنے والدین کو ہمارے گھر بھیجنے کا کہہ چکا ہے۔ مگر میں ہی

اپنے گھر کے حالات کے باعث اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرپائی۔ میں جانتی ہوں۔ اس گھر میں سب کچھ بڑے ابا کی پسند و ناپسند کے مطابق چلتا ہے۔ اس لیے میں ایسا وقت آنے تک کسی طوفان کو دعوت نہیں دینا چاہتی۔"

"جب تم جانتی ہو کہ بڑے ابا حقیقت جان کر تمہیں زندہ زمین میں گاڑ دیں گے تو بھی تم نے ایک غیر خاندان کے شخص سے دلی وابستگی کیوں بڑھائی۔ بڑے ابا بہت سخت ہیں۔"

"بڑے ابا اپنی زندگی گزار چکے۔ اب زندگی گزارنے کی باری ہماری ہے اور میں اپنی زندگی کا فیصلہ اپنی مرضی سے کروں گی۔" منال کے لہجے سے بغاوت کی بو آرہی تھی۔

وہ سرتاپا کانپ گئی۔ حویلی میں آنے والے طوفان کا سوچ کر وہ سراسیمہ ہوگئی۔ حالانکہ اس کی باتیں سن کر' اس کے انکشاف پر اس کے ذہن پر چھائے دشمنی کے سارے پردے ایک ایک کرکے اٹھتے چلے گئے تھے۔ اتنا عرصہ وہ ناحق ایک غلط فہمی کی بنا پر خود کو اندر ہی اندر سلگاتی' تڑپاتی رہی۔ بچپن سے اس کے اندر جمی دھند نے اس سے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں مفقود رکھیں۔ اور نفرت کا وہ جذبہ جو منال کے لیے بے حد گہرا اور مضبوط تھا' اس جذبے نے اسے اس لڑکی سے ہمیشہ دور رکھا۔ اس سے متنفر کیے رکھا۔

تو کیا اب کی بار اسے منال کے ہاتھوں شکست فاش نہیں ہوگی؟

تو کیا اب کی بار جیت اس کا مقدر ٹھہرے گی؟

مگر...... مگر وہ شاہ میر۔ وہ تو اس سے اپنی نفرت کا برملا اظہار کرچکا۔ پھر کوئی امید کیونکر بندھے......؟ اس شخص کی نفرت اس کے لیے، بہت جان لیوا تھی۔

"مگر منال۔ اگر شاہ میر کے دل میں تمہارے لیے کوئی جذبہ ہوا تو؟" وہ مشینی انداز میں بولی تھی۔

"اوہ کم آن۔ ڈونٹ بی اسٹوپڈ۔ شاہ میر ایک کھلے ذہن کا پڑھا لکھا شخص ہے۔ وہ دوستی اور محبت کے فرق کو بخوبی پہچانتا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ ہم صرف اچھے دوست ہیں۔ اور بس۔ وہ میرے متعلق کسی قسم کی فضولیات کو ذہن میں جگہ نہیں دے گا۔"

"یہ تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہو۔ میں نے خود بہت مرتبہ شاہ میر کی آنکھوں میں تمہارے لیے جگنو چمکتے دیکھے ہیں۔"

"پلیز رملہ۔"

اس نے کچھ اس انداز سے کہا کہ رملہ ایک لمحے کو خاموش ہوگئی۔ البتہ اس کے اندر کہیں سکون اتر گیا تھا۔ تو منال اور شاہ میر کے قصے میں منال اسے نہیں چاہتی۔ وہ کسی اور کے نام کی مالا جپ رہی ہے۔

مگر، مگر شاہ میر۔

لمحہ بھر کو اندر اترنے والا سکون اضطراب میں بدل گیا۔

مگر شاہ میر سو فیصدی منال کی محبت میں گرفتار ہے۔

"رملہ۔ ایک وعدہ کرو مجھ سے۔" منال کی بات نے اسے سلگتے خیالات سے باہر نکال لیا۔

"کیسا وعدہ۔"

"میرے اور آفتاب کی راہیں ہموار کرنے میں میرا ساتھ دوگی۔ بڑے ابا کو اس تعلق اور رشتے پر قائل کرنے کی کوشش کروگی۔"

"میں..." اس کا حلق خشک ہوگیا۔ بڑے ابا کے غصے سے تو بھی کانپتے تھے۔ پھر بھلا وہ کیا شے تھی۔

"ہاں تم' وہ سب سے زیادہ تمہیں ہی چاہتے ہیں۔"

"مگر..."

"تو اگر مگر' اگر تمہیں مجھ سے ذرا بھی ہمدردی ہے تو تمہیں میری قسم' تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا۔" وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولی تو رملہ سر جھکا کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

دن اس طرح گزرتے چلے گئے۔ اسے لاشعوری طور پر شاہ میر کا انتظار تھا۔ وہ ایک ہفتہ کا کہہ کر گیا تھا مگر

ایک مہینہ ہونے کو آیا تھا وہ ابھی تک لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ وہ ایک ایک دن جیسے اس کے انتظار میں گزار رہی تھی۔ مناہل نے جب سے اس کی غلط فہمی دور کی تھی اسے لگتا تھا جیسے اس کے اندر کا جلتا الاؤ یکلخت ٹھنڈا پڑ گیا ہو۔ جیسے اس کے اندر جلتی آگ کے شعلے پھولوں میں تبدیل ہو گئے ہوں اور اس لڑکی کے لیے اس کے اندر کوئی عناد' کوئی بغض باقی نہیں رہا۔ ساری عداوت' ساری دشمنی آن واحد میں اڑنچھو ہو گئی۔

یہ چاہت کے معاملے بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ اس کے راستے میں مداخلت کرنے والا ہر دوست' دشمن بن جاتا ہے اور ساتھ دینے والا ہر دشمن دوست۔

اور پھر ایک دن بغیر اطلاع دیے شاہ میر واپس چلا آیا۔ لبوں پہ وہی ازلی سنجیدگی لیے۔ گیٹ کے اندر قدم رکھتے ہی اس کی نظر سامنے لان میں بیڈ منٹن کھیلتی رملہ پر پڑی۔ اس کے مدمقابل مناہل تھی۔ جبکہ شارمین ان کے پوائنٹس بتاتی جا رہی تھی۔

تب ہی' شٹل کاک اچھالتے مناہل کی نظر شاہ میر پر پڑی تو وہ ریکٹ پھینک پھانک اس کی طرف لپکی۔

"ارے شاہ میر۔ آپ کے اتنے دن لگا دیے۔ جائیے میں آپ سے بات نہیں کرتی۔ ایک ہفتے کا وعدہ کر کے گئے تھے اور پورے ایک مہینے بعد لوٹ رہے ہیں۔"

"بس فرصت ہی نہ مل سکی۔"

اس کے سنجیدہ چہرے پر مزید سنجیدگی چھا گئی۔ مناہل کے عقب سے نظر آتی لڑکی کو دیکھ کر گزشتہ تمام واقعات اور اس کی تمام بدتمیزیاں ذہن کے پردے پر نمایاں ہو گئی تھیں۔ وہ سب کچھ بھول سکتا ہے مگر اپنی تذلیل اور اہانت نہیں۔

اس کی آنکھوں میں ہویدا غصے کی لہریں جیسے رملہ کے دل میں دراڑیں ڈال گئیں۔

"کیسا جرمانہ بھرنا ہو گا مجھے۔"

"یہی کہ ایک عدد پکچر کے ساتھ ساتھ کسی شاندار ہوٹل میں دعوت۔" شارمین نے چٹکیوں میں منصوبہ بتایا تو مناہل نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

"بالکل بالکل۔"

"او کے... میں تیار ہوں۔ مگر اب اندر جا کر مجھے بزرگوں سے مل لینے دو۔ یہاں کھڑے کھڑے میرا سوکھنے کا کوئی ارادہ نہیں۔" رملہ کے وجود کو یکسر نظر انداز کیے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے اندر کی جانب بڑھ گیا۔

"تم کیا سوچ رہی ہو۔" مناہل نے رملہ کا کندھا ہلایا۔

"کچھ نہیں۔" اس کی آواز میں ہلکی سی لرزاہٹ تھی۔

وہ اسے کیا بتاتی۔ اس شخص کے سرد رویے پر اس کے اندر اداسی کی نامعلوم سی کہر چپکے چپکے گرنے لگی ہے۔ اس شخص کی غصیلی آنکھیں اور اجنبی لہجہ اسے اندر تک چھید ڈالتا ہے۔

وہ چاہنے کے باوجود مناہل کو اپنا دل کھول کر نہ دکھا سکی۔

وہ اپنی سوچوں میں گم تھی کہ اسی وقت شرجیل چلا آیا اور ان تینوں سے بولا۔

"آؤ اندر چلیں۔ شاہ میر سے مل آتے ہیں۔"

شرجیل نے اندر کی جانب قدم بڑھائے تو مناہل اور شارمین نے اس کے تعاقب میں قدم بڑھا دیے مگر رملہ وہیں کھڑی رہی۔

"آؤ نا بھئی۔" شرجیل نے گردن گھمائی۔

"نہیں تم لوگ جاؤ۔"

اس شخص کی آنکھوں میں ہویدا نفرت اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ وہ جانتی ہے۔ وہ اسے اوروں سے کمتر سمجھتا ہے۔ وہ اسے کوئی ارزاں سی شے گردانتا ہے۔ جبھی تو مناہل کے سامنے وہ اسے گھاس تک ڈالنا پسند نہیں کرتا۔

"لڑکی یوں بار بار مراقبے میں جانا ٹھیک نہیں۔" شرجیل کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"آؤ۔" مناہل نے کہا۔

"نہیں۔"

"چلتی ہو سیدھی طرح کہ نہیں۔ خدا کی قسم ورنہ اٹھا کر لے جائیں گے۔" شارمین نے آنکھیں دکھائیں اور اسے بازو سے پکڑ کر اندر کی طرف لے چلی۔ وہ اس کے ساتھ گھسٹتی چلی گئی۔

"یار تم شاہ میر کا سامنا کرنے سے اتنا گھبراتی کیوں ہو۔" شارمین نے اس کے ساتھ چلتے چلتے سرگوشی کی۔

"نہیں تو۔" اس نے جھوٹ بولا۔

"اچھا تو پھر اسے دیکھتے ہی تمہارا رنگ کیوں اڑ جاتا ہے۔"

"محض تمہاری غلط فہمی ہے۔" اس نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔

اندر ڈرائنگ روم میں صبا بڑے ٹھاٹھ سے صوفے پر بیٹھی انگریزی میگزین دیکھ رہی تھی۔

"کیا شان ہے۔" مناہل نے بہن کے ہاتھوں سے میگزین جھپٹے کہا۔

"کہاں غائب تھے تم سب کے سب؟" صبا نے خفگی سے پوچھا۔

"باہر لان میں تھے۔ یہ شاہ میر کہاں ہے۔" شرجیل نے ادھر ادھر دیکھتے پوچھا۔

"وہ بڑے ابا کے کمرے میں ہیں۔ کوئی میٹنگ ہو رہی ہے۔" صبا نے اطلاع فراہم کی۔

"میٹنگ۔" شارمین تشویش سے بولی۔ دراصل بزرگ میٹنگ صرف اسی وقت کیا کرتے تھے جب انہیں کوئی اہم فیصلہ کرنا مقصود ہوتا تھا۔ اس لیے شارمین کا پریشان ہونا درست تھا۔ شارمین کے ساتھ ساتھ باقیوں کے چہرے پر بھی پریشانی کے تاثرات ابھر آئے تھے۔

"خدا خیر کرے۔ ضرور کوئی طوفان آنے والا ہے۔" رملہ کی بڑبڑاہٹ ان سب نے بھی سنی۔

"طوفانوں سے گھبرانے والے اے آسماں نہیں ہیں ہم۔" شرجیل نے سینہ پھلاتے ہوئے کہا تو باوجود پریشانی کے ان سب کی ہنسی نکل گئی۔ اس دم عاطف اور فرہاد اندر چلے آئے۔

"کیا بات ہے بھئی۔ تم سب کے چہروں پر بارہ کیوں بج رہے ہیں۔"

"فرہاد بھائی وہ اندر میٹنگ ہو رہی ہے۔" شارمین نے بھائی کی طرف دیکھا۔

"تو پھر اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔"

"ہے ناں۔" مناہل بولی۔

"ویسے اتنا تو مجھے علم ہے کہ اندر سب کی قسمتوں کا فیصلہ کیا جا رہا ہے۔" فرہاد نے یہ خوفناک خبر سنا کر ان سب کے دل دہلا دیے۔ ان سب کے رہے سہے حواس بھی گم ہو گئے۔

"اللہ فرہاد ڈراؤ تو نہیں۔" صبا گھبرا کر بولی۔

"تم لوگوں کے ڈرنے سے کیا ہو گا۔ اب تک تو فیصلہ ہو بھی چکا ہو گا۔" عاطف بولا۔

"کیا فیصلہ ہوا ہو گا۔" شارمین نے سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیری تھی۔

"میرے پاس کوئی جادو ہے۔ جو یہاں بیٹھے بیٹھے پتا چلا لوں۔" عاطف جھنجلایا۔

"جادو تو خیر تمہارے پاس موجود ہے۔ ہر وقت تو کالے علم کے زور پر لڑکیوں کو پھانسنے کے چکر میں رہتے ہو۔" شارمین نے اس کا پول کھولا۔

"اب یہ اور بات ہے کہ لڑکیاں موصوف کی شکل دیکھتے ہی رفوچکر ہو جاتی ہیں۔" شرجیل نے کہا تو سب ہنس دیے۔

"ارے واہ۔ تم کیا جانو کہ اس صورت پر لڑکیاں تھوک کے حساب سے مرتی ہیں۔" وہ فخر سے سینہ پھلا کر کہنے لگا جیسے کوئی بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہو۔

"وہ تو ہم ہی ہیں، جو انہیں لفٹ نہیں کراتے۔"

"ہاں اسی لیے ناں کہ ان کے ہائی ہیل والے سینڈل تمہاری مزاج پرسی نہ کر جائے۔" شارمین نے اس کا مذاق اڑایا۔

"جی نہیں۔ خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ وہ تو سڑکوں پر دوڑتی ہوئی میرے فراق میں گاتی پھرتی ہیں۔ بے دردی بالما تجھ کو میرا حسن یاد کرتا ہے۔"

عاطف نے باریک آواز نکالتے ہوئے بے سرے انداز میں گلا پھاڑا تو رملہ کی ہنسی نکل گئی۔

"تم ایسی باتیں کہاں سے سیکھتے ہو۔" شارمین نے ہنسی پر قابو پاتے سوال کیا۔

"چار سال سے یونیورسٹی میں کوئی جھک تو نہیں مار رہا۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"تو کیا تم وہاں یہی سب سیکھنے جاتے ہو۔" شرجیل مسکرایا۔

"بالکل۔ ارے وہاں پڑھنے کا تو صرف ایک بہانہ ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ آج میں چچا جان سے کہوں گی کہ تم بے مہار ہوتے جارہے ہو اس لیے تمہارا کوئی بندوبست کردیں۔ قسم سے یونیورسٹی جاکر تم انسان بننے کے بجائے رومیو کے ساتھ ساتھ مسخرے بھی بنتے جارہے ہو۔ خوب نام روشن کرو گے اپنے باپ دادا کا اور۔۔۔"

رملہ نے شہادت کی انگلی اٹھا کر اسے دھمکی دی۔ مگر اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

اسی دم شاہ میر اندر چلا آیا تھا۔ اسے دیکھ کر رملہ پر گھبراہٹ سی طاری ہوگئی۔

رملہ نے وہاں سے کھسک جانے کی نیت سے اٹھی تو شارمین نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اٹھنے نہیں دیا۔

اس نے میگزین اپنے چہرے کے سامنے کرلیا اور بظاہر ورق گردانی میں مصروف ہوگئی۔ لیکن اس کی تمامتر توجہ اس شخص کی جانب تھی جو لبوں پہ دلکش مسکراہٹ سجائے ان سب سے ہلکی پھلکی گفتگو کررہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں زندگی کی چمک تھی۔ وہی چمک جو منال کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ابھرتی تھی۔

"ویسے ایک بات ہے شاہ میر۔ آج تم حد سے زیادہ خوش نظر آرہے ہو۔ کہیں کوئی لاٹری تو ہاتھ نہیں لگ گئی۔" عاطف نے پوچھا۔

"لاٹری ہی سمجھو۔ آج میری زندگی کا سب سے اہم فیصلہ ہوا ہے۔ وہ بھی میرے حق میں۔"

وہ محبت پاش نظروں سے سامنے بیٹھی منال کو دیکھ رہا تھا۔ منال جو اس کے دل کا قرار تھی۔ جو نجانے کب سے اس کے اندر سانس لے رہی تھی۔ جس کے ساتھ کی تمنا اس نے بہت بار کی تھی اور اب اسی ساتھ کو امر کرنے کا فیصلہ بزرگوں نے کیا تھا۔

"اوہ تو اس کا مطلب۔ بڑے ابا نے تمہاری زندگی کا فیصلہ کردیا۔"

"بالکل۔" شاہ میر کے لبوں پر تبسم تھا۔

"کون ہے وہ خوش نصیب۔"

"بتادوں گا۔ اتنی جلدی کیا ہے۔"

"شاہ میر کا موبائل بج رہا تھا۔ وہ موبائل کان سے لگا کر باہر نکل گیا تو صبا بولی۔

"اس شاہ میر کو آج ہونے والی میٹنگ کا بخوبی علم ہے۔ یہ اس میٹنگ میں موجود تھا۔ اس لیے اس سے بزرگوں کے فیصلے کے متعلق پوچھنا ہوگا۔"

"تم بالکل ٹھیک کہتی ہو۔ ہمیں شاہ میر کو اس معاملے میں گھیرنا ہوگا۔" شرجیل نے ہاں میں ہاں ملائی۔

رملہ جب سے چپ بیٹھی تھی۔ بزرگوں نے کیا فیصلہ کیا؟ کس کا جوڑ کس کے ساتھ ملایا گیا۔ اسے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے ذہن سے تو شاہ میر کی وہ محبت لٹاتی آنکھیں چپک کر رہ گئی تھیں جو مسلسل منال پر جمی تھیں۔

"آج میری زندگی کا سب سے اہم فیصلہ ہوا ہے۔ وہ بھی میرے حق میں۔۔۔؟" رملہ کے اندر اس کا جملہ گونجا۔

یکلخت جیسے اس کے چاروں اطراف میں اندھیرا سا پھیل گیا۔ وہ اتنی کم عقل نہیں تھی کہ شاہ میر کی نظروں میں منال کے لیے ہویدا جذبات سمجھ نہ سکے۔

اف اگر وہ منال کا ہوگیا تو وہ ساری زندگی تڑپتی رہ جائے گی۔ وہ شاہ میر کے بغیر زندہ نہیں رہ سکے گی۔

تو کیا وہ ایک بار پھر شکست سے دوچار ہو رہی ہے؟

اس شکست سے جو ازل سے اس کا مقدر ہے۔

اس کے اندر جیسے درد سوبل کھا کر اٹھا۔ اس کے

آنکھوں کے سامنے پانیوں کی ایک چادر سی تن گئی۔ وہ تیزی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی اور اندر سے دروازہ بند کرلیا۔

"کاش یہ دروازہ تب کھلے جب اس کی سانسیں ہمیشہ کے لیے بند ہو چکی ہوں۔"

☆ ☆ ☆
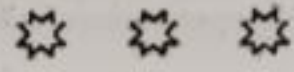
اور پھر بڑے ابا نے شاہ میر کے کامیاب ہونے کی خوشی میں ایک بہت بڑی پارٹی دے ڈالی اور پارٹی دیتے بھی کیوں نا۔ ان کے لاڈلے اور اکلوتے بیٹے نے پورے میڈیکل کالج میں ٹاپ کیا تھا۔ پارٹی شام کو تھی۔ سب ہی بہت ایکسائیٹڈ تھے۔ وہ بھی بجھے بجھے دل سے اس تقریب کی تیاریوں میں حصہ لے رہی تھی۔

ای نے اس کی اور شارمین کی ڈیوٹی حویلی کی صفائی ستھرائی پر لگائی تھی۔ گو کہ ملازمین بھی اس صفائی میں شریک تھے۔ لیکن جانے کس جذبے کے تحت رملہ نے شاہ میر کے کمرے کی صفائی اپنے ذمہ لے لی۔ اس کے کمرے میں اس کی مخصوص خوشبو رچی بسی تھی۔ وہ کتنی دیر اس کے بیڈ پر بیٹھی رہی۔ دل چاہا اس کے بیڈ پر لیٹ کر آنکھیں موند لے اور ابدی نیند سو جائے۔ یہ احساس کتنا خوشگوار ہے۔

وہ اس کے ریک پر رکھی کتابیں جھاڑ رہی تھی۔ جب ہی اسے اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ تب ہی گردن گھمانے پر وہ برف بن گئی۔ اس کی عین پشت پر شاہ میر کھڑا تھا۔ سخت اور سنجیدہ چہرہ لیے۔

وہ اس کی سرخ سرخ آنکھوں میں دیکھ کر ڈر سی گئی۔ جانے اس سے کیا جرم سرزد ہو گیا جو اس کی آنکھوں سے لپکتی غصے کی چنگاریاں اس کا وجود بھسم کردینے پر تلی تھیں۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" چھوٹتے ہی اس کے لبوں سے غراہٹ آمیز انداز میں نکلا۔

"وہ... وہ آپ کے کمرے کی صفائی۔"

"تمہیں کس نے حق دیا ہے میرے کمرے کی صفائی کا...؟" وہ اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"وہ... میں۔"

خشک ہوتے حلق سمیت وہ اندر ہی اندر لرز رہی تھی۔ کوئی بعید نہیں۔ وہ طیش میں آکر اس کے منہ پر طمانچہ رسید کردے۔ اس سے اس کا انداز حد سے زیادہ سراسیمہ کردینے والا تھا۔

"اب اگر جواباً" میں بھی تمہیں دھکے مار کر اس کمرے سے نکال باہر کروں تو...؟" اس کی پیشانی کے بل اور گہرے ہو گئے۔

"میں اس دن کی بے عزتی نہیں بھولا جب تم نے نفرت اور بدتمیزی سے مجھے اپنے کمرے سے نکل جانے کو کہا تھا۔"

اوہ تو وہ اب تک اس دن کی بات ذہن میں رکھے ہوئے ہے جب اس نے بیماری کی حالت میں اسے کمرے سے باہر جانے کو کہا تھا۔

رملہ کے اعصاب کو جیسے ایک دھچکا سا لگا۔ تو گویا اس شخص کی نفرتوں کی ابتدا وہیں سے ہوئی تھی۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ ایک معمولی بات کا وہ اتنا گہرا اثر لے گا تو وہ کبھی ایسا نہ کرتی۔ یا پھر اس سے اپنی بدتمیزی کی معافی ہی مانگ لیتی۔

"دیکھیں اگر آپ کو میرے اس دن کے رویے سے آپ کو کوئی تکلیف پہنچی ہے تو میں معافی چاہتی ہوں۔" وہ رک رک کر بولی۔

"معافی۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا۔

"تم کیا سمجھتی ہو۔ تمہاری ایک معافی تمہاری پچھلی تمام بدتمیزیوں کا ازالہ کردے گی۔ یا پھر ہمارے درمیان کی کشیدگی کو معدوم کردے گی۔ مائنڈ یو رملہ بیگم۔ میں اپنی انسلٹ کو آسانی سے بھلا دینے والوں میں سے نہیں۔ مجھے نہ تمہاری معافی کی ضرورت ہے اور نہ تمہاری اس لیے فوراً" اس کمرے سے باہر نکل جاؤ۔" وہ اس کی توہین کر رہا تھا۔

دفعتاً" رملہ کا چہرہ تپ اٹھا۔

"دیکھیں شاہ میر۔ آپ کو میری توہین کرنے کا کوئی حق نہیں۔"

"اور تمہیں ہر کسی کی توہین کرنے کا حق ہے؟ کیا چاہتی ہو تم۔ یہ دنیا تمہارے موڈ کے مطابق چلے' میں تمہارے پل پل بدلتے رویوں کے تابع رہوں۔ تم نے مجھے کیا چابی سے چلنے والا کھلونا سمجھ لیا۔ جس کے اپنے کوئی جذبات و احساسات نہیں۔" وہ آج اس پر اپنے اندر کا سارا زہر انڈیل دینے کے درپے تھا۔

"یہ' یہ میں نے کب کہا...؟"

"اور سنو اگر اس رات تم نے مناہل کے بارے میں ایک لفظ بھی غلط کہا ہوتا تو میں تمہارا منہ توڑ کر رکھ دیتا۔ کان کھول کر سن لو۔ جو بھی میرے پیار کی راہ میں حائل ہونے کی کوشش کرے گا میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

اس کا سرخی مائل گندمی چہرہ تپ کر اور سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی انگارہ ایسی آنکھوں میں رملہ سے ایک لمحے کو بھی دیکھا نہیں گیا۔

تو گویا اس نے کھلم کھلا آج اس کے سامنے مناہل سے محبت کا اعتراف کر ہی لیا؟ کیسی ستم ظریفی ہے؟ مناہل اسے نہیں چاہتی۔ مگر وہ اس کے لیے مرا جا رہا ہے اور وہ جو اس کی محبت کی اسیر ہے۔ پور پور اس کی محبت میں ڈوبی ہے' وہ اس کی نفرتوں کی حق دار ہے۔ وہ اندر سے باہر تک سلگ اٹھی وہ شخص لاکھ اس کی محبت سہی مگر وہ اپنی توہین قطعی برداشت نہیں کرے گی۔ اسے اپنی عزت نفس ساری دنیا سے بڑھ کر عزیز ہے۔

"مسٹر شاہ میر۔ یہ محض غلط فہمی ہے آپ کی کہ میں آپ کی راہ میں حائل ہو رہی ہوں اور ویسے آپ ہوتے کون ہیں مجھے دھمکی دینے والے۔"

"یہ صرف دھمکی ہی نہیں محترمہ۔ میں اس پر عمل بھی کرنا جانتا ہوں۔" وہ ایک قہر آلود نگاہ اس کے وجود پر ڈال کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے بعد رملہ سے بھی وہاں ایک لمحہ نہ رہا گیا۔ اپنی توہین اور شکست کے احساس سے اس کا دل چاہ رہا تھا کہ چیخ چیخ کر روئے۔ اتنا کہ دل کا سارا درد آنسوؤں میں بہہ جائے اور اس دنیا کو پتا چل جائے کہ وہ ستمگر اب تک اس سے کیسا ناروا اور ظالم رویہ رکھے ہوئے ہے۔

☆ ☆ ☆

شام کو اس کا تیار ہونے کو قطعی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر پھر بھی بے دلی سے تیار ہوئی۔ اگر کمرے میں بند رہتی تو تایا ابا کے سوالوں کے جواب کون دیتا اور دوسرے امی کے ہزاروں باتیں کون سنتا۔ شارمین نے صبح سے ہی اس کے لیے گولڈن ساڑھی استری کر دی تھی حالانکہ اتنی جھلملاتی ساڑھی پہننے کو اس کا دل نہیں کر رہا تھا مگر شارمین کی خفگی کے خیال سے اس نے بادل ناخواستہ ساڑھی زیب تن کر لی۔ ہلکے سے میک اپ کے بعد اس نے بال خوب صورت انداز سے شانوں پر پھیلا دیے اور کانوں میں ننھے آویزے پہنتے آئینے کے سامنے خود پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالی۔ وہ بہت دلکش لگ رہی تھی۔ مگر آنکھوں میں ایک بے نام سی اداسی آکر ٹھہر گئی تھی۔ اور اس اداسی نے اس کی شخصیت کو مزید دلنواز بنا دیا تھا۔ مگر وہ مطمئن نہیں تھی۔ شاہ میر صرف مناہل کا دیوانہ ہے اور... وہ' وہ اس کے لیے ایک بے مایہ سی شے ہے۔

وہ کسی کام سے تیزی سے برآمدے کی سیڑھیاں اتر رہی تھی کہ تبھی سامنے سے آتے شاہ میر کو دیکھ کر وہ ڈگمگا سی گئی۔ ہائی ہیل کی وجہ سے سنبھلا ہی نہیں گیا۔ گرنے کے خوف سے اس نے سختی سے آنکھیں میچ لیں۔ مگر گرنے سے پہلے ہی وہ سنبھال لی گئی۔ اس دشمن جاں' اس سنگدل شخص نے اسے اپنے بازوؤں میں تھام کر گرنے سے بچا لیا تھا۔ اس سے وہ اس کے اتنا قریب تھی کہ اس کی معطر سانسوں کی گرمی کا احساس کسی برق کی طرح اس کے وجود سے ٹکرایا رملہ نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ عجیب سے نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ درشت تھا اور ہونٹ بھینچے ہوئے۔ وہ گھبرا کر اس کی بانہوں سے نکل آئی۔

"سنبھل کر چلا کرو۔"

وہ سختی سے بولا۔ تو وہ خفت سے سرخ پڑ گئی۔ دل ابھی تک دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔

"معاف کیجیے گا پاؤں پھسل گیا تھا۔"

"ہونہہ پاؤں پھسل گیا تھا۔" اس نے غراہٹ آمیز انداز میں اس کے جملے کو دہرادیا۔

"میں خوب جانتا ہوں تم جیسی لڑکیوں کے ہتھکنڈوں کو۔۔۔ میں تمہاری اداؤں سے گھائل ہونے والا نہیں۔"

"منہ سنبھال کر بات کیجیے شاہ میر صاحب۔" ضبط کی شدت سے اس کی آواز لرز رہی تھی۔ "آپ جیسے پڑھے لکھے شخص کو اس طرح کی گری ہوئی باتیں زیب نہیں دیتیں۔"

اس نے اسے آخر سمجھا کیا تھا۔ وہ لاکھ اس کے اندر سانس لیتا ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اسے اپنی جانب راغب کرنے کے لیے ایسے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتی پھرے۔ وہ اتنی ارزاں ہرگز نہیں۔ اس تذلیل پر جیسے اس کی آنکھیں پانیوں سے لبالب بھر گئیں۔ ہونٹ کاٹ کر اس نے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کی مگر ہزار ضبط کے باوجود آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کر گالوں پر بہہ نکلے۔

"میرے سامنے رو کر خود کو مظلوم ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں۔" اس نے کرختگی سے کہا۔ اس کے آنسوؤں نے شاہ میر کو مزید اشتعال دلا دیا تھا۔

"شاہ میر' آپ۔۔۔" اس نے کچھ کہنا چاہا مگر آنسوؤں نے جیسے اس کے گلے میں پھندا سا ڈال دیا۔ اس شخص کے چہرے پر کرختگی ہی کرختگی تھی۔

وہ اس کی بات پوری ہونے کے انتظار میں رکا نہیں۔ وہ اس پر ایک تیکھی نگاہ ڈال کر اندر کی جانب بڑھ گیا اور رملہ آنکھوں میں امڈتی ساون کی بدلیوں کو روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

"ارے رملہ۔ تم یہاں اکیلی کھڑی کیا کر رہی ہو؟ چلو اندر مہمانوں میں چل کر بیٹھو۔" مناہل کی آواز پر وہ مڑی۔ میرون رنگ کے لباس میں وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ "ریناسے ملواؤں اور ہاں آفتاب بھی ساتھ ہی ہے۔" آفتاب کا نام لیتے ہی اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ رخساروں پر حیا کی لالی چھا گئی۔

"سچ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟" رملہ کو آفتاب کو دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا۔ اس لیے وہ لمحوں پہلے کی تلخی کو بھلا بیٹھی۔

"تم نے پوچھا ہی کب تھا۔"

"اچھا اب تو پوچھ لیا ناں۔ چلو جلدی سے ملواؤ۔ اور ہاں اگر وہ مجھے پسند آگیا تو تبھی میں تمہارے رشتے کی منظوری دوں گی۔" اس نے خالص بزرگوں کے انداز میں کہا تو مناہل ہنس دی۔

اندر ڈرائنگ روم میں ایک خوش شکل لڑکی اور ایک خوبرو نوجوان بیٹھا تھا۔ مناہل نے رملہ سے ان کا تعارف کروایا تو رملہ بولی۔

"مناہل اکثر آپ کی تعریف کرتی تھی۔ سو آج ملاقات بھی ہو گئی۔"

"ذرہ نوازی ہے جناب کی۔" رینا مسکرائی۔

"آفتاب بھائی ایک بات پوچھوں آپ سے۔" رملہ نے از خود آفتاب سے رشتہ داری قائم کی اور اس لمحے قریب بیٹھی مناہل کے کان میں گھس گئی۔

"جیجا جی تو ابھی کہنا مناسب نہیں ہو گا۔"

"بکو مت۔" مناہل کانوں کی لوؤں تک سرخ ہو گئی۔

"آپ کیا پوچھ رہی تھیں رملہ۔" آفتاب کے سوال پر رملہ سیدھی ہو بیٹھی۔

"یہی کہ کیوپڈ کے تیر نے آپ پر کتنے عرصہ میں ـــ"

"رملہ فضول کی بکواس نہیں۔" مناہل نے تیزی سے رملہ کی بات کاٹ کر اسے مزید کچھ کہنے سے باز رکھا۔

"ارے بھئی پوچھنے دو ناں۔ تمہارے بھی علم میں اضافہ ہو گا۔" آفتاب نے شوخی سے مناہل کو دیکھا۔

"پلیز" "آفتاب۔" وہ بری طرح جھینپ گئی۔

"محترمہ ابھی سے موصوف پر اتنا رعب۔ جب سسرال جاؤں گی تو تب کیا ہو گا۔" رملہ نے مسکراتے ہوئے چھیڑا۔

"قسم سے رملہ میں تمہیں مار بیٹھوں گی۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ آخر کو پریکٹس تو جاری رہنی

چاہیے۔ کل کو یہی تو آگے جاکر کام آئے گا۔" رملہ کی بات پر آفتاب خوب صورت سا قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

"رملہ لگتا ہے کوئی اسکرو ڈھیلا ہو گیا ہے تمہارا۔ جب ہی تو نان اسٹاپ بولے چلی جا رہی ہو۔"

منابل کی بات کا وہ بڑا برجستہ جواب دینا چاہتی تھی جب ہی سامنے سے آتے شاہ میر کو دیکھ کر وہ اپنی جگہ جمی رہ گئی۔ تھوڑی دیر پہلے کی تذلیل نگاہوں کے سامنے گھوم گئی۔

تقریب کا انتظام باہر لان میں تھا۔ اور شاہ میر' منابل کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے اندر ڈرائنگ روم کی طرف چلا آیا تھا۔ منابل کو بے تکلفی کے ساتھ ایک اجنبی کے قریب بیٹھے دیکھ کر جیسے اس کے دل پر گھونسہ سا پڑا۔

"یہ اجنبی کون۔۔۔؟" وہ کھل کر پوچھ نہ سکا۔ البتہ منابل کی طرف سخت نگاہوں سے دیکھا۔

"تم اندر کیوں آن بیٹھیں منابل۔ مہمان باہر ہیں۔ اور ابا بھی تمہارا پوچھ رہے ہیں۔"

"دراصل میں اپنے مہمانوں کے پاس بیٹھی ہوں۔" منابل کا انداز لگاوٹ بھرا تھا۔

"کیا مطلب؟" شاہ میر کو اپنے سوال کے عجیب ہونے کا احساس تھا۔ مگر منابل کا اس اجنبی کے قریب بیٹھنا اسے بہت کھل رہا تھا۔

"شاہ میر یہ آفتاب ہیں میرے کلاس فیلو اور یہ ان کی بہن رملہ۔ دراصل ان دونوں کو میں نے آج خاص طور پر مدعو کیا ہے۔ تاکہ میں آفتاب کو بڑے ابا اور باقی گھر والوں سے ملوا سکوں۔"

منابل کہہ رہی تھی اور رملہ کا سانس سینے میں ہی اٹک گیا۔

شاہ میر کا ردعمل اس کی توقع کے عین مطابق تھا۔ منابل کی بات پر شاہ میر کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا اور آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو منابل۔"

"دیکھیں شاہ میر! میں اک صاف گو اور اسٹریٹ فارورڈ لڑکی ہوں۔ مجھے بات کو گھما پھرا کر کرنے کی عادت نہیں۔ میں اور آفتاب ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور ایک ساتھ زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔"

منابل کی بات پر شاہ میر کو لگا جیسے اس کے پیروں میں کوئی گولا سا پھٹا ہو۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی آنکھیں دھواں دھواں ہو رہی تھیں۔ وہ لمحہ بھر کو بھی اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ سکا اور بے جان سا گرنے کے انداز میں صوفے پر ڈھے گیا۔

رملہ اپنی جگہ برف بنی بیٹھی تھی۔ اس نے اس شخص کی آنکھوں میں چھپے خاموش طوفان کو دیکھ لیا تھا۔ اسے احساس تھا۔ شاہ میر کا دل دکھ سے پھٹ رہا ہو گا۔ دفعتاً" اس کا دل چاہا وہ اس کی راہوں کے سارے کانٹے اپنی پلکوں سے چن لے۔ مگر وہ اسے اس قابل سمجھتا ہی کب تھا۔

سلگتی سوچوں سے رملہ نے ابھر کر دیکھا۔ وہ ہکلائے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"یہ۔۔۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو منابل۔"

"یہ درست ہے شاہ میر۔ میں آفتاب سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔" اس کے کہنے پر شاہ میر چپ ہو گیا' بے حد چپ۔

وہ لڑکی جسے اس نے اپنے دل کے قریب محسوس کیا۔ وہ اتنی ستمگر کیوں نکلی؟ کیوں آخر؟

وہ اس سے ہزاروں سوال کرنا چاہتا تھا' مگر کچھ نہ پوچھ سکا اور لڑکھڑاتے قدموں سے باہر چلا گیا۔ رملہ کا دل چاہا۔ سرعت سے اٹھے اور اس شخص کا ہاتھ تھام کر کہے۔

"میں جانتی ہوں شاہ میر دل ٹوٹنے پر ایسی ہی حالت ہو جایا کرتی ہے۔ میرا بھی دل اسی طرح ٹوٹا ہے' تو کیا ایسا نہیں ہو سکتا۔ دو ٹوٹے دل اک دوسرے کو سنبھال لیں۔ دو ٹوٹے دل اک دوسرے کا درد بانٹ لیں۔ ایک دوسرے کی راہوں کے کانٹے چن لیں۔"

اور پھر اگلے روز شاہ میر نے منابل سے شادی سے خود ہی انکار کر دیا تو جیسے حویلی میں طوفان سا آگیا۔ بڑے ابا بہت سیخ پا ہو گئے۔ انہوں نے پیار سے' غصے سے شاہ میر کو سمجھانے کی کوشش کی' مگر اس کا جواب انکار ہی رہا۔

وہ بڑے ابا کو کیا بتاتا شادی دو دلوں کے سنگم کا نام ہے۔ ساری عمر کے جبر کا نہیں۔ اس کے دل پر گہری چوٹ لگی تھی وہ جانتا تھا۔

اگر اس کی شادی زبردستی منال سے ہو بھی گئی تو ساری زندگی انگاروں پر گزر جائے گی۔ نہ وہ خوش رہ سکے گا اور نہ منال۔ اسے اس بات کا دکھ نہیں تھا کہ منال نے کسی اور کو اپنی زندگی میں شامل کر لیا۔ اسے غم اس بات کا تھا کہ اس کی چاہت یک طرفہ تھی اور یک طرفہ چاہت سوائے دکھ کے اور کچھ نہیں دیتی۔

بڑے ابا اپنے اکلوتے اور لاڈلے بیٹے کی ضد کے آگے خاموش ہو گئے۔ البتہ شاہ میر کے اندر بڑی بے چینی تھی اور یہ بے چینی اس دن سوا ہو گئی جب آفتاب کے والدین منال کے لیے سوال بن کر چلے آئے۔

بڑے ابا نے سب کے مشترکہ فیصلے پر اس رشتے کو قبول کر لیا۔ منال آفتاب کے ساتھ منگنی کروا کر بے حد مسرور تھی۔ بہت شاداں و فرحاں تو اس نے اپنی محبت کی منزل پا ہی لی۔

جس دن منال کی منگنی آفتاب سے ہوئی اس دن شاہ میر بے حد اداس ہو رہا تھا۔ اس ساری رات وہ گھر نہیں آیا اور رملہ اس کے انتظار میں رات دو بجے تک برآمدے میں یہاں سے وہاں ٹہلتی خود کو تھکاتی رہی۔ اسے اندازہ تھا۔ شاہ میر توڑ پھوڑ کی کیسی منزلوں سے گزر رہا ہے۔

اور پھر کتنے ہی دن یوں ہی ویران ویران سے گزر گئے۔ شاہ میر گھر والوں کے لیے جیسے اجنبی بن گیا تھا۔ وہ بیشتر وقت گھر سے باہر گزارتا۔ راتوں کو دیر سے گھر لوٹتا۔ اس نے جیسے خود کو ساری دنیا کے لوگوں سے کھینچ لیا تھا۔ یہ بات سب کے لیے تشویش ناک تھی۔ مگر رملہ کے لیے تو جیسے زندگی اور موت کا سوال تھا۔ وہ اپنی محبت کو یوں تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

کاش وہ اس کے لیے کچھ کر پاتی۔

✡ ✡ ✡
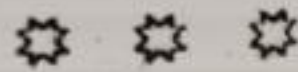
جھینگروں کے شور کے ساتھ رات کا آغاز ہوا۔ وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی اونگھتی رہی۔ شاہ میر ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔

اس دم دور کہیں سیاہ بادلوں کے سینے میں آسمانی برق لہرائی۔ وہ مایوس ہونے کے ساتھ ساتھ ڈر بھی گئی۔ وہ جا کر آتا کیوں بھول گیا تھا؟ کہاں چلا گیا تھا؟ وہ کب تک اس کا انتظار کرے۔

شاں شاں کرتی ہوائیں ہیبت ناک آوازیں پیدا کر رہی تھیں۔ جب ہی شاہ میر کی گاڑی کی آواز پر وہ گڑبڑا کر سیدھی ہو بیٹھی۔ سامنے دیکھا وہ کار لاک کر کے تھکے تھکے قدموں سے اس کی طرف آ رہا تھا۔

دفعتاً" رملہ کا دل دھڑک اٹھا۔ اس کے آ جانے سے زندگی کا کیسا انوکھا احساس ہو رہا تھا۔

"آ۔ آپ آ گئے۔" وہ لپک کر اس کے قریب آ گئی۔

"تمہیں اس سے مطلب؟" اس کی نظریں کاٹ دار تھیں اور منہ آگ برسا رہا تھا۔ وہ سفید پڑتے چہرے کے ساتھ کھڑی رہ گئی۔ بہت سے آنسو آنکھوں میں جھلملا گئے۔ "آپ اب تک کہاں تھے؟"

"تم اپنے کام سے کام نہیں رکھ سکتیں کیا۔ کیوں ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑی ہو۔"

"وہ۔ میں آپ کی منتظر تھی۔ اگر۔ اگر آپ کہیں تو آپ کے لیے کھانا لے آؤں۔" وہ لرز رہی تھی۔ کانپ رہی تھی۔

"یا وحشت۔ تم مجھے پاگل کر دو گی۔" وہ کڑوے انداز میں کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

رملہ کچن کی طرف آ گئی۔ وہ اگر کھانا نہیں کھانا چاہتا تو اس۔ تھکے ہارے شخص کے لیے ایک کپ چائے تو بنا ہی سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے چائے پی کر اس کے تھکے ہوئے اعصاب سکون پا جائیں۔ وہ اس سے درخواست بھی نہیں کر سکتی تھی۔

وہ اپنی زندگی کو دکھوں کی آماجگاہ نہ بنائے۔ وہ اس سمت مڑ کر نہ دیکھے جہاں منزلوں کے بجائے راکھ اڑتی ہے۔

وہ چائے کا کپ لیے اس کے اداسیوں بھرے

کمرے میں آگئی۔ بنا دستک دیے۔ کمرے میں زیرو پاور کا بلب جل رہا تھا۔ ہر چیز عجیب سی دھند میں لپٹی نظر آرہی تھی۔ وہ بالکل سامنے صوفے میں دھنسا میز پر ٹانگیں رکھے بیٹھا تھا۔ اس کی انگلیوں میں سگریٹ دبا تھا۔ تو گویا اس نے سگریٹ پینا بھی شروع کر دی۔ رملہ کا دل دکھ سا گیا۔

یہ وہ شخص ہے جو اپنی خوش لباسی کے باعث پورے خاندان میں مشہور تھا۔ اس سے وہ کتنا شکستہ، کتنا دل گرفتہ نظر آرہا تھا۔ ٹائی ڈھیلی ہو کر گلے میں جھول رہی تھی اور سیاہ بال پیشانی پر بکھرے تھے۔

"سنیے...." اس نے دھیرے سے پکارا تو شاہ میر نے کوئی جنبش نہیں کی۔ اسی زاویے پر آنکھیں موندے پڑا رہا۔

"شاہ میر...." اس نے دوبارہ پکارا تو اس نے تڑپ کر آنکھیں کھول دیں۔ اف اس کی آنکھیں لال انگارا ہو رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں لحہ بھر کو دیکھنا بھی رملہ کے لیے دشوار ہو گیا۔

"کیوں آئی ہو یہاں؟" اس کے لہجے کی غراہٹ اسے ہمیشہ بوکھلا دیتی تھی۔

"وہ... وہ چائے...."

"کس نے کہا تھا تمہیں چائے لانے کو۔" وہ غصے کی زیادتی سے دھاڑا تو وہ دہل کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ مقابل کی آنکھوں اور چہرے سے وحشت برس رہی تھی اور ہونٹ سختی سے بھینچے ہوئے تھے۔

"وہ... میں...." باوجود کوشش کے الفاظ اس کے حلق سے نکل نہیں پا رہے تھے۔

"بولو.... جواب دو۔" اس نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔

"وہ میں خود ہی...."

"شٹ اپ...." وہ قہر برساتی آنکھوں میں دنیا جہان کا تنفر سمیٹے اسے بری طرح گھور رہا تھا۔

"تمہیں کسی نے اختیار دیا ہے مجھ پر اپنی مرضی چلانے کا۔ جاؤ چلی جاؤ یہاں سے۔ نکل جاؤ میرے کمرے سے۔ مجھے تم جیسی عورتوں سے سخت نفرت ہے۔ خوامخواہ دوسروں کے گلے پڑ جاتی ہیں۔"

وہ آتشیں لہجے میں کہتے دو قدم اس کی طرف بڑھ آیا تو وہ مارے سہم کے جلدی سے چائے سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر دروازے کی طرف لپکی۔

"اسے لیتی جاؤ۔" وہ سنی ان سنی کر کے دروازے سے باہر نکلنا چاہتی ہی تھی کہ وہ ایک جست میں اس کی راہ میں حائل ہو گیا۔ رملہ نے دہل کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آگ ہی آگ تھی۔ جس میں اسے اپنا وجود جلتا محسوس ہوا۔

"آخر آپ مناہل کا غصہ مجھ پر کیوں اتار رہے ہیں۔ میں...." اس کا باقی کا جملہ لبوں میں ہی رہ گیا۔ مقابل کے زوردار طمانچے نے اسے اپنا جملہ مکمل نہیں کرنے دیا۔ وہ لڑکھڑا کر دور جا گری۔ آنکھوں کے سامنے رنگ برنگے نقطے سے پھیلنے سکڑنے لگے۔

"تمہیں ہمت کیسے ہوئی مناہل کا نام لینے کی.... تم اس کی برابری کرنے چلی ہو۔"

تو گویا مناہل بے وفا ہونے کے باوجود اسے بے حد عزیز تھی۔ یہ بڑی تکلیف دہ بات تھی۔

دکھ کی ایک لہر اندر سے اٹھی جو آنکھوں میں سیلاب بن کر اتر گئی۔ آنسوؤں نے اس کے سارے چہرے کو بھگو ڈالا۔ اس کا جوڑ جوڑ ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔

وہ چند لمحے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتا رہا اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتے باہر نکل گیا۔ اس رات وہ بستر پر نڈھال پڑی خود کو مضبوط بنانے کی کوشش کرتی رہی۔ اپنی ذات کی تحقیر بہت دکھ دیتی ہے۔

☆ ☆ ☆

اس صبح مناہل موبائل پر آفتاب سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی، جب ہی اپنی پشت پر کسی کی موجودگی کا احساس کر کے وہ پلٹی۔ اس کے عین پیچھے شاہ میر تھا۔ آنکھوں میں طوفان سمیٹے اور چہرے پہ وحشت لیے۔

"تم نے میرے ساتھ اتنا ظلم کیوں کیا مناہل۔" مناہل نے اس کی طرف دیکھا۔ جانے وہ اس سے کیا سننا چاہتا ہے۔

"میں نے کیا ظلم کیا؟" وہ حیرت سے آنکھیں کھولے اسے دیکھ رہ گئی۔ "یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے مناہل۔ تم نے اتنے دنوں مجھ سے مراسم بڑھائے رکھے۔ مجھ سے دوستی کیے رکھی۔ میرے آگے پیچھے پھرتی رہیں۔ میری پسند و ناپسند کو اپنائے رہیں۔ تمہاری اس رویے اور اس لگاوٹ کو میں محبت سمجھ بیٹھا اور جب میں نے تمہیں زندگی کا ساتھی بنانے کا سوچا تو تم نے اپنی راہ بدل لی۔۔۔ تم مجھ سے اس طرح بے وفائی نہیں کر سکتیں مناہل۔"

اس کی باتوں پر مناہل سلگتا ذہن لیے اپنی جگہ جمی رہ گئی۔ چہرے کی ساری آگ جیسے یکلخت ہی اس کے چہرے پر آگئی تھی۔

"بے وفائی؟ کیسی بے وفائی شاہ میر صاحب، جو کچھ سوچا اور سمجھا وہ آپ کے ذہن کا فتور تھا۔ میں نے آپ کو صرف اپنا اچھا دوست سمجھا اور ہم میں جو بے تکلفی تھی وہ ایک کزن کی حیثیت سے تھی۔ اب مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ اس محبت سمجھ بیٹھیں گے۔"

"مناہل ادھر میری طرف دیکھو۔ تم شاید میرے جذبات کو سمجھ نہیں پا رہیں۔ میں تمہیں آفتاب سے بڑھ کر چاہوں گا۔ میں تمہارے قدموں میں ساری دنیا کی خوشیاں ڈھیر کر دوں گا۔"

"مجھے آپ کی ذہنی حالت پر شک ہو رہا ہے۔ میں آپ پر واضح کر چکی ہوں کہ آپ کے اور میرے راستے جدا ہیں۔ میں صرف آفتاب کو چاہتی ہوں۔"

"ہرگز نہیں، تم ایسا نہیں کر سکتیں" وہ جھنجلایا۔

"آپ کون ہوتے ہیں میری زندگی میں دخل دینے والے یہ میری زندگی ہے اور میں اسے اپنی پسند کے مطابق گزاروں گی۔ براہ کرم آج کے بعد میرے منہ مت لگیے گا۔ کیونکہ آج کے بعد اگر آپ نے مجھ سے اس انداز میں بات کی تو میں آپ کا بالکل بھی لحاظ نہیں کروں گی۔"

وہ بدتمیزی سے اپنی بات مکمل کر کے کھٹ کھٹ کرتی اندر چلی گئی اور شاہ میر نڈھال سا برآمدے کے ستون کے ساتھ لگ گیا۔

مایوس سا باہر نکل گیا۔ شام تک اس کے ایکسیڈنٹ کی خبر آگئی۔ اس خبر سے سب ہی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بڑے ابا ڈھے سے گئے۔ امی نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔

"جب سے مناہل کی منگنی ہوئی ہے۔ بچے کی یہ حالت ہو گئی۔ نہ کھانے پینے کا ہوش اور نہ کپڑے پہننے کا۔ رات گئے گھر لوٹتا ہے۔ بھائی صاحب۔ اسے درد کے بھنور سے نکالنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی شادی کر دیں۔ اس کی توجہ دوسری طرف ہو گئی تو وہ اس غم کو بھول سکے گا۔ شرجیل نے مجھے صاف بتایا ہے کہ وہ مناہل کو بہت پسند کرتا تھا۔"

"لیکن مناہل سے شادی سے اس نے خود ہی انکار کیا ہے۔" بڑے ابا چونکے۔

"مناہل آفتاب کو جو پسند کرتی تھی۔" امی نے مدھم لہجے میں کہا تو بڑے ابا کتنی دیر کمرے میں یہاں سے وہاں ٹہلتے رہے۔

تو ان کے بیٹے کا دل ٹوٹا ہے۔ جس نے اس سے جینے کی آرزو چھین لی۔ انہیں جلد از جلد کوئی فیصلہ کرنا ہو گا۔ انہیں شاہ میر کی زندگی کے اس خلا کو پر کرنا ہو گا۔ کسی ایسی لڑکی کو اس کی زندگی میں شامل کرنا ہو گا جو اس کے دل سے اس صدمے کو بھلا کر محبت بھر دے۔

"کیا ایسا ہو سکتا ہے ہم شاہ میر کی شادی رملہ سے کر دیں۔" بڑے ابا کو رملہ ویسے ہی بہت پسند تھی۔

"رملہ۔۔۔"

امی حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات لیے ایک لمحے کو ساکت رہ گئیں۔ تو کیا ان کی رملہ کا نصیب ایسا شاندار ہو سکتا ہے کہ شاہ میر جیسا لڑکا اس کا جیون ساتھی بنے، ان کی برسوں کی خواہش اس طرح اچانک پوری ہو جائے گی۔ اس کا انہیں جیسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

"میرے خیال میں ان کی شادی جلد رکھ دیتے ہیں۔ مناہل کی شادی سے بھی پہلے۔" بڑے ابا نے حتمی فیصلہ کر کے کہا۔

☆ ☆ ☆

سب گھر والے شاہ میر کو دیکھنے ہسپتال آئے تھے۔ اسے کافی چوٹیں آئی تھیں۔ اس کا بایاں بازو کہنی تک پلستر میں جکڑا ہوا تھا۔ اسے اس مجروح حالت میں دیکھ کر رملہ کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے تھے۔ اس کا دل چاہا وہ اس ستمگر کے قدموں میں سر رکھ کر اتنا روئے کہ اس کا دل پسیج جائے۔

"اب کیسی طبیعت ہے شاہ میر کی۔ زخم زیادہ گہرے تو نہیں۔" بڑے ابا نے تشویش سے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر دوائیں رکھتی نرس سے پوچھا۔

"نہیں۔ یہ زخم چند دنوں میں بھر جائیں گے، مگر ان کا پلستر اترنے میں وقت لگے گا۔" اسی دم شاہ میر کے لبوں سے کراہ نکلی تو بڑے ابا اس کی طرف مڑ گئے۔

"شاہ میر بیٹے۔ اب کیسی طبیعت ہے تمہاری۔" انہوں نے شفقت سے اس کا ہاتھ تھامتے پوچھا تو اس نے آنکھیں کھول دیں اور دھیرے سے مسکرا دیا۔

"میں ٹھیک ہوں بابا جان۔ آپ خوامخواہ پریشان ہو جاتے ہیں۔"

"بابا جان پلیز مجھے گھر لے چلیں۔ یہاں میرا دم گھٹتا ہے۔"

اس نے اپنے اطراف میں ان چہروں کو دیکھا جو اس کے اپنے تھے۔ مگر اس میں وہ چہرا نہیں تھا جسے وہ برسوں سے دل میں رکھے ہوئے تھا۔ لیکن اب وہ اس کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لڑکی نے جس بے رخی اور رکھائی سے اس کا دل توڑا تھا' اس کی انسلٹ کی تھی وہ کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔

"کیوں نرس کیا شاہ میر کو ہم گھر لے جا سکتے ہیں۔" بڑے ابا نے نرس کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔

"ابھی ان کے زخم تازہ ہیں۔ ان کا ایک ہفتہ یہاں رہنا ضروری ہے۔"

"تو سن لیا تم نے بیٹا۔" انہوں نے محبت سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

"تو بابا جان۔ یہ ہسپتال والے تو ویسے بھی چھوٹی سی تکلیف کو بہت بڑا بنا دیتے ہیں۔ اگر یہ ہم جیسے مریضوں کو جلد فارغ کر دیں تو ان کا کاروبار ٹھپ نہ ہو جائے۔ بس بابا مجھے لے چلیے۔" وہ بچوں کی سی ضد سے بولا۔

تب ہی اس کی نگاہ شار مین کے عقب سے نظر آتی رملہ پر پڑی۔ اس کے ماتھے پر شکنوں کا جال سا ابھر آیا۔

"بابا جان یہ آپ پوری پبلک کو کیوں اٹھا لائے۔"

"بس بیٹا۔ بات ہی اتنی پریشانی کی تھی کہ کوئی بھی گھر پر رہنے کو تیار نہیں تھا۔"

اور پھر ڈاکٹرز کے لاکھ منع کرنے کے باوجود شاہ میر گھر چلا آیا۔ بڑے ابا اس کی تیمارداری اور دیکھ بھال کے لیے نرس کا انتظام کرنا چاہتے تھے۔ مگر شاہ میر نے سختی سے منع کر دیا۔ آخر کو وہ بڑے ابا کا بیٹا تھا۔ ان ہی کی طرح ضدی اور ہٹ دھرم۔

اس کی تیمارداری کے لیے رملہ نے کمر باندھ لی۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا۔ بھلے شاہ میر غصہ کرے۔ وہ اس کی ایک نہیں سنے گی۔ وہ اپنی خدمت سے اسے تندرست ہونے میں مدد دے گی۔ وہ اسے زندگی کی طرف لوٹنے پر مجبور کر دے گی۔ وہ ایک نیا عزم لیے ہوئے تھی۔

اسی دن وہ سوپ کا پیالہ لیے اس کی خواب گاہ کا بھاری پردہ اٹھا کر اندر آئی تو وہ آنکھیں موندے پڑا تھا۔ قدموں کی چاپ پر اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں تو رملہ لمحہ بھر کو بھی اس کی مضمحل آنکھوں میں نہیں دیکھ پائی۔ ان آنکھوں سے عجیب سا کرب جھلک رہا تھا۔ پتا نہیں اپنے ٹھکرائے جانے کا احساس تھا یا دھوکا کھانے کا احساس جو لال ڈوروں کی صورت نمایاں تھا۔

"تم۔" اسے سامنے دیکھ کر شاہ میر کی پیشانی پر کتنی بہت سی سلوٹیں ابھریں۔

"یہ سوپ پی لیجیے۔" اس کے درشت لہجے کو نظر انداز کر کے وہ اس کے قریب چلی آئی اور اس کے بیڈ کے قریب پڑی کرسی کی پشت پر آن کھڑی ہوئی۔

"قطعی نہیں۔ تمہیں آخر ضرورت کیا ہے مجھ پر رحم کھا کر تیمارداری کرنے کی۔ ملازم مر گئے ہیں کیا؟" وہ

سمجھا۔ مجھ پر یہ مہربانی کر کے مجھے اس ناروا رویے کا احساس دلانا چاہتی ہو' جو میں نے تم پر روا رکھا۔" وہ تلخی سے کہتے ہوئے زخمی انداز میں مسکرا دیا۔

"یہ آپ کا اپنا احساس ہے، جو آپ کو ہر ایک کے بارے میں غلط انداز میں سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔" وہ حد سے زیادہ پر اعتماد تھی۔

"احساس۔" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ یوں جیسے اپنا مذاق اڑا رہا ہو۔

"ہاں شاید یہ میرا اپنا ہی احساس تھا' جو میں آنکھیں بند کیے اس بے وفا کی محبت میں ڈوبا رہا۔ یہ جانے بغیر کہ وہ تو کسی اور کی تھی اور یہ بھی میرا احساس تھا جو اپنے ارد گرد کسی اور کے خلوص کو محسوس نہ کر سکا۔"

آخری جملہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لبوں سے بڑی آہستگی سے پھسلا تھا اس کی پوری بات سننے سے رملہ کے کان قاصر رہے۔

"پلیز زیادہ نہ بولیں۔ آپ کے زخم تازہ ہیں۔"

"کون سے زخم۔ دل کے یا اس وجود کے۔" وہ یک ٹک اس کے چہرے کو دیکھے گیا۔

اس کا دل چاہا وہ اس لڑکی سے پوچھ لے۔ وہ اس کے اتنے درشت رویے کے باوجود اس سے بد دل کیوں نہیں ہوئی؟ وہ کیوں اس کے اہانت آمیز رویے کو بھلائے اس کی تیمارداری پر کمربستہ ہے۔ وہ جس لڑکی کا چہرا دیکھنا چاہتا تھا اس نے ایک بار بھی اس کے کمرے میں آکر جھانکا تک نہیں تھا اور یہ لڑکی اس کے لیے حاضر خدمت تھی۔

یوں بستر پر پڑے رہنے سے وہ خاصا قنوطی ہو رہا تھا۔ اس لڑکی کے ساتھ کی گئی ساری زیادتیاں اسے یاد آ رہی تھیں۔

"سنو تم مجھے لاچار سمجھ کر مجھ سے ہمدردی جتا رہی ہو۔" اس کی ذہنی رو پھر سے بھٹکنے لگی۔

"یا۔ یا پھر کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہے جو تم میرا دن رات خیال رکھے ہوئے ہو۔ ورنہ آج کل کے مطلبی دور میں کون کسی کو پوچھتا ہے۔ چلی جاؤ' نکل جاؤ میرے کمرے سے۔ تم ساری لڑکیوں کا ایک سا وطیرہ ہوتا ہے۔ پہلے تو ہنس ہنس کر ہم جیسوں کو پھانستی ہیں اور جب دیکھتی ہیں کہ بندہ بے وقوف بن گیا ہے تو اپنا دامن جھٹک کر تڑپتا چھوڑ جاتی ہیں۔ جیسے منال نے کیا۔ اور جیسا اب تم کر رہی ہو۔ تم بھی مجھے چھوڑ کر چلتی بنو گی۔"

اس کے لہجے میں زہریلی کاٹ تھی۔ وہ بے ربط بول رہا تھا۔ اسے خود بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہہ رہا ہے؟ اور کسے کہہ رہا ہے؟ رملہ کا دل چاہا اسے کہہ دے۔" اپنی تھکن مجھے دے دو۔"

"دیکھیں شاہ میر۔ اتنا غصہ کرنے سے آپ کی طبیعت مزید خراب ہو جائے گی۔ ڈاکٹر نے آپ کو اتنا بولنے سے منع کیا ہے۔ آپ پلیز یہ سوپ پی لیجیے۔ پھر بے شک بعد میں اپنے اندر کا سارا غصہ مجھ پر انڈیل دیجیے گا۔" اس کی بات پر وہ لحہ بھر کو سر جھکا کر رہ گیا۔

وہ اسے برداشت کیوں کر رہا ہے۔ وہ اسے شرمندہ کر رہی ہے۔ وہ اس کی اتنی باتیں کیوں سن رہا ہے۔ وہ بے چینی سے ہونٹ کاٹنے لگا۔ جیسے کوئی چیز اسے اندر ہی اندر بے چین کیے دے رہی تھی۔

"نہیں۔ تمہارے ہاتھ کا بنا ہوا سوپ کبھی نہیں پیوں گا۔" وہ بے حد تھکا تھکا تھا۔ اس کی بچوں جیسی ضد پر بے ساختہ رملہ کی ہنسی نکل گئی۔

"کیوں نہیں پئیں گے۔ آپ کو تو بس خوامخواہ ہی ضد کرنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ ہر ایک کو تنگ کر کے آپ کو سکون ملتا ہے۔"

"ہاں مجھے سکون ملتا ہے اور تم اتنا مزاج کس لیے دکھا رہی ہو مجھے۔ لگتا ہے میرا کام بوجھ بن گیا ہے تم پر' یا پھر تم بھی بے زار ہو چکی ہو۔ لیکن اس میں شاید تمہارا بھی قصور نہیں۔ میری قسمت ہی ایسی ہے۔ جس سے ہلکی سی بھی توقع لگاؤں وہ پلو چھڑانے لگتا ہے۔" وہ چپ چاپ کھڑی رہ گئی۔ وہ اسے کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔

بہت سے آنسو اس کی آنکھوں میں جھلملا گئے۔ وہ جانے کو مڑی تو وہ ایک دم ہی پکار اٹھا۔ "میری تم سے درخواست ہے کہ تم اس کمرے کا رخ کبھی نہ کرنا۔ پتا

نہیں تمہیں دیکھتے ہی میں کیوں بے قابو ہونے لگتا ہوں۔ میں تمہاری انسلٹ نہیں کرنا چاہتا۔ نہ ہی تمہیں کوئی اذیت دینا چاہتا ہوں۔ اس لیے پلیز تم بھی اپنا راستہ بدل لو۔ مجھے کوئی دکھ نہیں ہوگا۔ میں اب دوسروں کے آنکھیں بدل لینے کا عادی ہو گیا ہوں۔"

لمحوں بعد ہی اس کی ناراضی اور اکھڑپن ماند ماند سا تھا اور گہری گہری آنکھیں مضطرب اس کے چہرے پر نرم سی اداسی پھیل گئی تھی۔

وہ اس کی کسی بھی بات کا جواب دیے بغیر چپ چاپ باہر نکل گئی اور اسے مایوسیوں کے اندھیروں میں چھوڑ گئی۔ تو کیا وہ بھی اس سے روٹھ گئی۔ تو کیا وہ اس کی طرف اب پلٹ کر بھی نہیں دیکھے گی۔ کیا اسے اس کا انتظار کرنا چاہیے یا نہیں۔

اس معذوری کی حالت نے جیسے اسے حد سے زیادہ قنوطی بنا دیا تھا۔ وہ جان گیا تھا۔ دوریوں کی اذیتیں کتنی وحشت ناک ہوتی ہیں۔ ٹھکرائے جانے کی اذیت کتنی جان لیوا ہوتی ہے۔

وہ اس لڑکی کو اپنے رویے سے بہت مرتبہ رلا چکا ہے۔ اس پر اپنی نفرتیں عیاں کر چکا ہے اور اس کا اندازہ اسے اب ہو رہا تھا۔ یہ نفرتیں انسان کو اندر سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیتی ہیں۔ اس لڑکی کی آنسوؤں بھری جھلملاتی آنکھیں جیسے اس کے دل و دماغ سے چپک کر رہ گئی تھیں۔

وہ تو محرومیوں کا شکار انتہائی بے ضرر لڑکی ہے۔ جس کی آنکھوں میں اس نے اپنے لیے بارہا عجیب سے رنگ دیکھے ہیں اور ہمیشہ نظر انداز کیا ہے؟ اسے تاسف ہونے لگا۔

یہ غالباً "اس لڑکی کا دل دکھانے کی سزا ہے کہ وہ اپنی منزل سے دور ہے۔ اس لڑکی کے بارے میں اس کی سوچیں انتہائی غلط تھیں۔ اس نے اسے غلط پہچانا تھا۔

کھٹکے کی آواز پر اس نے دیکھا' بڑے ابا کھڑے تھے۔

"بابا جان آپ؟"

"میں دیکھ رہا ہوں وہ لڑکی رملہ دل و جان سے دن رات تمہاری خدمت پر جتی ہے اور اسی سبب تم خاصے ہشاش بشاش نظر آرہے ہو۔"

"جی۔۔۔" وہ اتنے دنوں سے شاید اس کے وجود کا عادی ہو گیا تھا۔

"اور اگر اسی لڑکی کو ساری عمر کے لیے تمہاری خدمت سونپ دی جائے تو۔۔۔" وہ مسکرائے۔

"مطلب۔۔۔" وہ ہکا بکا رہ گیا۔

جیسے وہ مطلب سمجھتے ہوئے بھی۔۔۔ سمجھنا نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ اکھڑ مزاج تھا۔ اتنے دنوں اس سے بد دماغی سے پیش آیا تھا۔ اس کی عزت نفس کو اس نے بارہا مجروح کیا تھا تو کیا وہ لڑکی اتنی آسانی سے قبول کرے گی۔

اسے جیسے اپنے ذہن پر کنٹرول نہیں رہا تھا جو ان چاہی بے تکی باتیں سوچنے پر تلا تھا۔

"مطلب ہم نے تمہاری اور رملہ کی شادی کا سوچا ہے۔ دیکھ پتر۔۔۔ میں تم سے تمہاری مرضی معلوم کرنے نہیں آیا۔ صرف بتانے آیا ہوں کہ تم ذہنی طور پر اس بندھن کے لیے تیار ہو جاؤ۔ میں تمہاری زندگی کو خوشیوں سے بھرا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہیں مجھ پر اعتبار تو ہو گا کہ میں تمہارے لیے کبھی کوئی غلط فیصلہ نہیں کر سکتا۔"

"جی۔۔۔" وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا' مگر کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

"گڈ۔۔۔ تم نے میرا مان رکھ لیا بیٹا' مجھے تم پر فخر ہے۔"

بڑے ابا اس کی پیشانی پر بوسا دے کر باہر نکل گئے اور کتنی دیر تکیے پر سر گرائے اسی زاویے پر پڑا رہا۔

یہ وقت کے دھارے اس کی زندگی کو کس سمت لیے جا رہے ہیں؟

آنسوؤں بھری دو نگاہیں پھر سے ذہن کے پردے پر جھلملا گئیں۔ اسی لڑکی کی غیر موجودگی کا ایک لمحہ جیسے صدی بن گیا تھا۔ کاش وہ اس لمحے کہیں سے آجائے اور وہ اس سے اپنے گزشتہ بد تمیز رویوں کی معافی مانگ لے۔

شاہ میر نے چونک کر سر اٹھایا۔ بعض اوقات دل

سے نکلی دعا لمحوں میں شرف قبولیت حاصل کرلیتی ہے۔

"آپ کی دوا کا وقت ہوگیا ہے' اس لیے مجھے آنا پڑا۔" اس نے خود سے اپنے آنے کا مدعا بیان کردیا۔ شاید وہ یہ نہ سمجھے۔ وہ اسے جونک بن کر چمٹ گئی ہے۔ وہ اسے خود سے مزید بے زار نہیں ہونے دے گی۔ وہ مستعدی سے اس کے سائیڈ ٹیبل کی طرف بڑھی۔ ٹیبلٹس نکالیں' گلاس میں پانی انڈیلا اور اس کی طرف گھومی۔

"یہ دوا کھالیں۔"

"اور اگر نہ کھاؤں تو۔۔۔"

"دوا تو آپ کو ہر حال میں کھانی ہوگی۔ جب تک آپ دوا نہیں کھائیں گے میں آپ کے سر سے نہیں ٹلوں گی' جو کہ آپ کو قطعی گوارا نہیں ہوگا۔"

"اور اگر گوارا ہوجائے تو۔۔۔" وہ سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ بہت گہرا اور غیر مبہم جملہ تھا۔ وہ فقرے کی ساخت پر غور کرتی رہ گئی۔

"آپ یہ دوا کھالیں۔"

"کیوں تنگ آگئی ہو مجھ سے' اس لیے جلد از جلد یہاں سے کھسکنا چاہتی ہو۔"

"آپ کچھ بھی سمجھتے رہیں۔ مجھے فرق نہیں پڑتا۔" اس کی آنکھیں پھر سے بھیگنے لگیں۔

وہ اس کی ایک نگاہ التفات کو مرجائے گی اور اس بے خبر کو خبر نہ ہوگی۔ "سنو رملہ' کیا تم اپنا دل میری طرف سے صاف کرسکتی ہو۔" وہ یکلخت پوچھنے لگا۔

رملہ نے دیکھا۔ وہ پچھلے دنوں کی نسبت خاصا پرسکون نظر آرہا تھا۔ اس کے لبوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ یوں جیسے اس کی روح شدید قسم کے بوجھ سے آزاد ہوگئی ہو۔ جیسے اس کے سر سے کوئی بڑا بوجھ سرک گیا ہو۔

"سنو کیا تم مجھے معاف کرسکوگی۔"

"یہ کرم نوازی کس لیے؟" وہ تو ہمیشہ سے اس کے لبوں سے اپنے لیے جلتے سلگتے فقرے سننے کی عادی تھی۔ پھر یہ تبدیلی کیونکر؟ یہ پتھر میں جونک کیسے لگ گئی۔

نہ چاہتے ہوئے بھی کتنے بہت سے آنسو پلکوں کی باڑھ پھلانگ آئے۔

"رو رہی ہو کیا۔ مگر اب ان آنسوؤں کا کیا سوال؟" وہ مسکرا اٹھا۔ بہت نرمی سے کہہ رہا تھا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اب ہم یہ زندگی ایک ساتھ گزاریں گے۔ بہت خاردار کانٹوں سے الجھ کر تم تک پہنچا ہوں۔ اب اگر تم مجھے دھتکاروگی بھی تو پیچھے نہیں ہٹوں گا۔" دھندلاتی آنکھوں سمیت وہ گرنے کو تھی' لیکن سنبھال لی گئی۔

"دیکھو سنبھل کے۔ ابھی ہم نے بہت سا سفر اکٹھے طے کرنا ہے۔"

اس کی بے تحاشا گہری گہری آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ دفعتاً رملہ کو لگا اس کی تمام محرومیوں کا ازالہ ہوگیا ہو۔ اس کی تنہائیوں میں گنگناہٹیں شامل ہوگئی ہوں۔

☼ ☼

حمیرا نوشین

اے دل میں آ

"اماں سب کے کپڑے استری کر کے رکھ دیتی ہوں لائٹ کا کوئی بھروسا نہیں عین وقت پر دغا دے جاتی ہے پھر رسک کاہے کو لینا۔" وہ جو سلیمہ بیگم کے سر میں تیل لگا رہی تھی ایک دم چھوڑ چھاڑ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ایسی بھی کیا جلدی ہے دو دن پڑے ہیں شادی میں کل کر لینا۔" انہیں ہادیہ کا اس طرح مالش کرتے ہاتھ روک دینا بہت ناگوار گزرا' کتنا سکون مل رہا تھا۔ اس کے تیزی سے حرکت کرتے ہاتھوں سے آنکھیں مندی جا رہی تھیں۔

"نہیں ناں اماں۔۔۔" وہ منمنائی۔

"اچھا جا کر لے اور دیکھ ذرا دھیان سے پریس کرنا کہیں قیمتی سوٹوں کا بیڑہ غرق کر دو۔" وہ جانتی تھیں کہ وہ اب جان نہیں چھوڑے گی سو اجازت دینی ہی پڑی۔

"کام چور' ہڈ حرام مجال ہے جو کوئی کام پورا کر دے۔ سسرال میں جا کے اپنا چونڈا تو اکھڑوائے گی ہی ساتھ ہی ماں کی ناک بھی کٹوائے گی وہ بڑبڑاتے ہوئے وہیں برآمدے میں پلنگ پر لیٹ گئیں پل بھر میں ان کے خراٹوں کے سُر فضا میں بکھرنے لگے ابھی آنکھ لگے بمشکل پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ' وہ افتاں و خیزاں آئی اور ماں کو جھنجوڑ کر اٹھا دیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔

"کیا ہوا؟ کرنٹ تو نہیں لگ گیا۔" اس کے ٹپ ٹپ بہتے آنسوؤں سے وہ پریشان ہو گئیں۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"پھر یہ بن موسم برسات کیوں ہو رہی ہے۔" وہ جھنجلا گئیں ہادیہ نے قمیص ان کے سامنے کر دی۔

"میں نے تو پہلے ہی کہا تھا دھیان سے کام کرنا' جلا دی ناں قمیص۔"

"قمیص نہیں جلی یہ دیکھو۔۔۔"

"ہائے میں مر گئی۔" انہوں نے سینے پہ دو ہتھڑ مارے۔

"مجھے تو پہلے ہی پتا تھا کہ دشمن ہمیں کبھی چین نہیں لینے دیں گے آج اپنی گناہ گار آنکھوں سے دیکھ لیا۔ ہائے۔۔۔ کیسے کیسے وار ہو رہے ہیں ہم پہ' اللہ ہی ہمیں دشمنوں کے شر سے بچائے اور تو یہ رونا دھونا بند کر" جلدی سے جا کر شاپر لے کر آ اور تو اس قمیص کے قریب مت جانا" انہوں نے تنبیہہ کی۔ ہادیہ دوڑ کر شاپر لے آئی انہوں نے قمیص اس میں ڈال کر الماری کے اوپر پھینک دی اور گہری سوچ میں پڑ گئیں۔

"ابا کو دکھانا ان کی پارسا بھابھی کے کرتوت۔ کیسے جادو ٹونے کروا رہی ہیں ہم پر۔ ماں بیٹیاں پتا نہیں کیا کیا پڑھ کر ہم پر پھونکتی رہتی ہیں۔" "صبح بھی میں چھت پر کپڑے پھیلانے گئی تو تائی امی نے مجھے بلا کر میرے اوپر کچھ پھونکا اور کہنے لگیں روز بروز بڑی پیاری ہوتی جا رہی ہو میں نے تو جلدی سے نیچے آ کر رگڑ رگڑ کر منہ دھویا اور چاروں قل پڑھ کر اپنے اوپر پھونک ماری۔"

"ہائے رشیدہ جنم جلی کن جنموں کا تو' ہم سے بدلہ لے رہی ہے اللہ کرے یہ سوئیاں تیرے کلیجے کو چھلنی کریں' جو تو نے میری معصوم بچی کی قمیص میں جادو کے ذریعے لگوائی ہیں۔ اس سے کہاں برداشت ہو گا کہ میری ہادیہ کے اچھے رشتے آئیں ہائے۔۔۔ میرا

صبر پڑے تم پر۔ ساری عمر مجھے چین نہ لینے دیا۔ ساس کو جانے کیا گھول گھول کر پلاتی رہی کہ مرتے دم تک اسی کے گن گاتی رہیں' اب میری بچی کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑ گئی ہے۔"

"بات سن" وہ بولتے بولتے اس کے قریب ہوئیں "اپنے ابا کو بتانے کی غلطی مت کرنا وہ کہاں یقین کریں گے کہ ان کی دودھ دھلی بھابھی نے یہ کارنامہ کیا ہے وہ تو الٹا ہمیں ہی قصوروار ٹھہرا دیں گے۔"

"سچ کہہ رہی ہو اماں۔ پر اب کریں گے کیا۔ مجھے تو یوں لگ رہا ہے میرے پورے جسم میں سوئیاں چبھ رہی ہیں میرا تو دل بیٹھا جا رہا ہے" ہادیہ نے اٹھ کر پنکھا تیز کر دیا۔ "کرتی ہوں کچھ شام کو ٹوپی والے سائیں بابا کے پاس جاؤں گی وہ ہی اس کا کوئی حل نکالیں گے۔"

"مگر اماں وہ تو بہت پیسے مانگتے ہیں ہم کہاں سے بندوبست کریں گے۔" وہ فکر مند ہوئی۔

"تو فکر نہ کر خرچے میں سے پیسے بچا بچا کر جو میں نے کمیٹی ڈالی تھی پچھلے مہینے ہی تو نکلی ہے' میں نے سنبھال کر رکھی ہوئی ہے۔ اسی سے ہی کام چلا لوں گی' اپنی بچی کے لیے مجھے کچھ تو کرنا ہی پڑے گا ایسے ہاتھ پہ ہاتھ دھرے تھوڑی بیٹھوں گی دشمنوں کے خاک ڈلواؤں گی" وہ دیوار کی طرف نظر کر کے نفرت سے بولیں۔

"اب شادی میں کیا پہن کر جاؤں گی۔"

"سائیں بابا سے واپسی پہ تجھے سوٹ بھی دلوادوں گی اور ہاں خوب اچھا سا تیار ہو کے شادی میں شرکت کرنا۔ فہمیدہ کے بیٹوں کے آس پاس رہنا بڑا ڈاکٹر بنا ہے اور چھوٹا انجینئر بن رہا ہے۔ دونوں میں سے کسی کو بھی پسند آگئی تیرے تو نصیب ہی کھل جائیں گے۔ فہمیدہ تو ویسے ہی اللہ میاں کی گائے ہے اسے قابو کرنا کونسا مشکل کام ہے' تو دیکھنا دشمنوں کے تو سانپ لوٹ جائیں گے۔" انہوں نے ایک بار پھر اپنی اور رشیدہ بیگم کی مشترکہ دیوار کی طرف خوں آشام نگاہوں سے دیکھا گویا دیوار نہ ہوئی خود ان کی جٹھانی صاحبہ ان کے روبرو کھڑی ہوں۔

شام کو اپنے مجازی خدا کے آنے سے پہلے وہ ہادیہ کو لے کر سائیں بابا کے آستانے پہ پہنچ گئیں۔ انہوں نے ہادیہ اور کیس کو دیکھتے ہی بتا دیا کہ 'بچی پر کالا جادو کروایا ہے اور کروانے والا آپ کا قریبی رشتے دار ہے۔ وہ تو پہلے ہی سمجھ چکی تھیں' سائیں بابا کی بات نے مہر ثبت کر دی۔ انہوں نے گارنٹی دی کہ کام ہو جائے گا' دشمنوں کا یہ وار ان پہ ہی چل جائے گا اپنی بچی کا مطلوبہ جگہ پر رشتہ پکا سمجھیں۔ پندرہ ہزار کا خرچہ آئے گا۔ پندرہ ہزار کا سن کر ان کا دل ہل گیا مگر کام بھی ضروری تھا "پندرہ ہزار تو بہت زیادہ ہیں کچھ غریبوں کا خیال کریں۔" ان کی بات سن کر سائیں بابا جلال میں آ گئے۔

"بی بی غریبوں کی خدمت کے لیے ہی ہم یہاں بیٹھے ہیں اور یہ روپیہ ہم اپنے لیے نہیں مانگتے' موکلوں کے ذریعے کام کرواتے ہیں انہیں بھینٹ دینی پڑتی ہے تب کہیں جا کے کام ہوتا ہے۔"

منت سماجت کر کے بڑی مشکل سے انہیں دس ہزار پہ راضی کیا۔ کام ہو جانے کی صورت میں ایک قیمتی سوٹ اور پانچ کلو مٹھائی دینے کا وعدہ الگ کیا۔ سائیں بابا نے قمیص کے ساتھ کا دوپٹا اور ٹراؤزر لانے کا بھی کہہ دیا کہ "اس سوٹ کی کوئی چیز گھر میں نہ رہے ورنہ نقصان ہونے کا اندیشہ ہے" انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور وہاں سے واپسی پہ ہادیہ کی پسند کا چھ ہزار کا سوٹ بھی خرید لیا اور مطمئن ہو کر گھر آ گئیں۔

✡ ✡ ✡

اگلے دن سائیں بابا کی پڑھی ہوئی چینی کھیر میں ملائی اور جٹھانی کو دینے چل دیں آنکھ بچا کر تعویز بھی بیڈ کے گدے کے نیچے دبا دیے۔ وہ سارا دن اسی خیال سے خوش ہوتی رہیں کہ رشیدہ کی بیٹیاں گھر کی دہلیز پہ بیٹھی عمر گنوا دیں گی اور میری ہادیہ کسی ڈاکٹر/انجینئر کے ساتھ رخصت ہو گی وہ تصور میں اپنے آپ کو فہمیدہ کے بیٹوں میں سے کسی ایک کو داماد کے روپ میں بلائیں لیتی دیکھ رہی تھیں۔

"اماں اب اٹھ بھی جاؤ' درزن سے سوٹ کا پتا کرنے چلتے ہیں۔" سدا کی جلد باز ہادیہ ان کے سر پر آن کھڑی ہوئی۔

"لو چار گھنٹے پہلے تو سوٹ دے کر آئی ہوں ابھی کہاں سیا ہو گا۔ شام کا وعدہ کیا ہے اس نے۔ بڑی مشکل سے ساڑھے پانچ سو سلائی پہ راضی کیا تھا ورنہ وہ تو ہاتھ ہی نہیں لگا رہی تھی۔ تھوڑی دیر صبر کر لو مغرب

تک چلیں گے، مجھ سے نہیں بار بار اپنے پاؤں تڑوائے جاتے کل سے اب تک یہ وقت آگیا اسی کتر بیونت میں لگی ہوئی ہوں" وہ قدرے خفگی سے بولیں تو ہادیہ چپ سادھے کھڑی رہی۔

"اب کھڑی کھڑی منہ کیا تک رہی ہو کبھی ماں کا احساس بھی کرلیا کرو۔ چل ٹانگیں دبا میری، چل چل کر گھٹنے ہی ٹوٹ گئے میرے تو۔" انہوں نے ٹانگیں سیدھی کیں اور وہ ماتھے پہ بل ڈالے ماں کے پاؤں دبانے لگی۔

مغرب کا اس نے بے صبری سے انتظار کیا جیسے ہی ماں نے نماز مکمل کی وہ انہیں لے کر درزن کے ہاں چل دی۔ تیار سوٹ دیکھ کر ہادیہ کا دل باغ باغ ہو گیا اپنے ساتھ لگا کے دیکھا سوٹ بڑا ہی پیارا لگ رہا تھا۔

آہ.... وہ تکلیف سے چلائی اور اپنا ہاتھ اماں کے سامنے کردیا وہ بھی ہادیہ کی تکلیف اور انگلی میں چبھی سوئی دیکھ کر حق دق رہ گئیں ان کا پورا وجود سناٹے میں آگیا۔ نئے سوٹ میں بھی سوئیاں۔

"تیرا بیڑہ غرق ہو جائے رشیدہ" وہ دل میں جٹھانی کو کوس کر رہ گئیں۔

"سوری ہادیہ میرے اندر یہ بڑی گندی عادت ہے ترپائی وغیرہ کرتے ہوئے سوئی مشین پہ لگانے کی بجائے قمیص میں لگا دیتی ہوں اور پھر اس میں سے نکالنی یاد ہی نہیں رہتی" درزن نے شرمندگی سے کہتے ہوئے سوئی کھینچ کر اس کی انگلی کو آزاد کیا اور ہادیہ کی انگلی سے ننھا سا خون کا فوارہ بہہ اٹھا۔

"کیا مطلب...." دونوں ماں بیٹی اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"آنٹی میں اپنی اس عادت پہ قابو پانے کی بہت کوشش کرتی ہوں مگر پھر بھول جاتی ہوں۔ میری اس غلط عادت کی وجہ سے کتنی خواتین کے ہاتھ اور جسم زخمی ہوئے اور سوئیوں پر میرا خرچہ الگ ہوتا ہے۔ کتنے ہی پتے سوئیوں کے منگواتی ہوں چند روز میں ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ آپ نے جو اس سے پہلے سوٹ سلوائے تھے اس میں بھی کئی سوئیاں لگی ہوں گی آپ مہربانی کرنا دھیان سے اس میں سے سوئیاں نکال کر مجھے بھجوا دینا" درزن ان کی حالت سے قطع نظر اپنی کہے جارہی تھی اور وہ دونوں ساکت آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔

مرے قدموں سے وہ گھر پہنچیں تو صدمے سے سلیمہ بیگم کا برا حال تھا۔ شوہر کی محنت کی کمائی سے جوڑے پیسوں سے نکلی کمیٹی کے اس طرح مٹی میں رل جانے کا غم انہیں رلائے دے رہا تھا مارے غم کے ان دونوں نے شادی میں بھی شرکت نہ کی ابھی، بیسی (کمیٹی) ٹھکانے لگنے کا زخم ہلکا نہیں ہوا تھا کہ اگلے دن شام کو ان کی جٹھانی رشیدہ بیگم ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبا لیے حاضر ہو گئیں اور ان کے نہ نہ کرنے کے باوجود پورا رس گلا ان کے منہ میں ٹھونس دیا۔

"آپ لوگوں کی دعا سے میری مریم کا رشتہ فہمیدہ باجی نے اپنے ڈاکٹر بیٹے کے لیے مانگا ہے۔ میں نے تو فوراً "ہاں کردی، دیکھا بھالا لڑکا ہے ڈاکٹروں کی تو آمدنی کا کوئی حساب ہی نہیں اور پھر فہمیدہ باجی اتنی اچھی عادت کی ہیں، میری مریم کے تو نصیب ہی کھل گئے، بس یامین بھائی آجائیں تو ان سے مشورہ کر کے منگنی کی رسم کا دن طے کر لیتے ہیں۔"

سلیمہ بیگم کے حلق میں رس گلا اٹک کر رہ گیا، رس گلے کی شیرینی کڑواہٹ میں بدل کر پورے منہ میں پھیل گئی، آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے۔

رشیدہ بیگم، دیورانی کی اندرونی حالت سے بے خبر اپنی بیٹی کا اتنا اچھا بر ملنے پر خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھیں اور اندر کچن میں آنسو بہاتی ہادیہ سائیں بابا کے دیئے ہوئے تعویز ایک ایک کر کے چولہے میں ایسے جھونک رہی تھی جیسے سائیں بابا اور اس کے موکلوں کو آگ میں بھسم کر رہی ہو۔

✡ ✡

فرحین اظفر
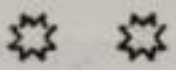
سوہا اور رما یا دونوں بہنیں اپنی ماں کے ساتھ گھر کی اوپری منزل میں رہائش پذیر ہیں۔ ان کے والد کی وفات ان کے بچپن میں ہی ہو گئی تھی۔

گھر کی نچلی منزل میں ان کے تایا اور تائی اپنی دو بیٹیوں عفت اور نائلہ کے ساتھ رہتے ہیں۔ تایا اکثر بیمار رہتے ہیں۔

حدید، انس، عفت اور نائلہ کے خالہ زاد ہیں۔ نائلہ، انس میں دلچسپی رکھتی ہے۔ مگر انس، سوہا سے شادی کرنا چاہتا ہے اور اپنی پسندیدگی کا اظہار اپنی خالہ اور سوہا کی تائی کے سامنے کر دیتا ہے۔ خالہ کو بے پناہ دکھ کا احساس ہوتا ہے، مگر بظاہر راضی خوشی اس کا رشتہ لے کر اپنی دیورانی کے پاس جاتی ہیں۔ سوہا کی والدہ یہ رشتہ خوشی خوشی قبول کر لیتی ہیں۔

نائلہ باقاعدگی سے اپنے والد کو اسپتال لے کر جاتی ہے۔ وہاں اسپتال کے کلرک شبیر حسین عرف شبو سے روابط بڑھ جاتے ہیں کہ اچھے برے کی تمیز کو بھول جاتی ہے۔

سوہا اور انس کی شادی کی تقریبات بہت اچھے طریقے سے انجام پاتی ہیں اور سوہا رخصت ہو کر انس کے گھر آ جاتی ہے۔

حدید کسی کو ڈراپ کرنے جاتا ہے اور اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔

سوہا کے اکیلے پن کی وجہ سے عفت اس کے پاس رک جاتی ہے۔ گھر کے کاموں کے علاوہ حدید کا بھی خیال رکھتی ہے۔

حدید، عفت کے دل میں اپنے لیے پسندیدگی کو جان لیتا ہے اور سوچ لیتا ہے کہ اس بار خالہ کو مایوس نہیں کرے گا۔

نائلہ، شبیر حسین سے ملنا نہیں چھوڑتی اور آخر کار اپنی عزت گنوا بیٹھتی ہے، جس کا اندازہ اس کی ماں کو بھی ہو جاتا ہے اور وہ اپنی عزت بچانے کے لیے حدید کے ساتھ نائلہ کی شادی کا فیصلہ کر لیتی ہیں اور اس بات کا اظہار انس اور رما سے بھی کر دیتی ہیں۔

ساتویں قسط

(اب آگے پڑھیے)

وہ کمرے میں ڈریسنگ کے آگے کھڑا اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کھول رہا تھا۔ جب سوہا کی دلدوز چیخوں سے پورا گھر گونج اٹھا۔ گھڑی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ وہ بری طرح گھبرا کے باہر بھاگا۔

باہر کا منظر اس کے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھا۔

سیڑھیوں کے اختتام پر سوہا بے ہوش پڑی تھی جبکہ نائلہ بری طرح روتے ہوئے اس پر جھکی ہوئی تھی۔ حدید کو پاس آتے دیکھ کر اس نے حدید کو بتانے کی کوشش کی کہ یہ سب ہوا کیسے، مگر حدید کے اپنے حواس مفلوج ہوئے جا رہے تھے۔

وہ بے تحاشا کپکپاتے ہاتھوں سے ایمبولینس کا نمبر ملا رہا تھا۔ ذرا دیر بعد ایمبولینس کا کان پھاڑ دینے والا سائرن گلی میں گونجتا ہوا دور ہوتا چلا گیا۔

سفید دیواروں اور سفید فرش سے پھوٹتی ٹھنڈک پر موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ بے آواز ہلتے لبوں پر قرآنی آیات کا ورد جاری تھا۔ خوفزدہ آنکھوں سے سہمے ہوئے آنسو کپکپا کر ابھرتے اور لڑھک کر اپنی قدر و قیمت کھو دیتے۔ ہر دل فریادی تھا۔ ہر آنکھ پرنم۔

حدید کو جب بھی سوہا کی چیخیں یاد آئیں۔ سر سے پیر تک جسم کے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ نائلہ کو رہ رہ کر سوہا کا خاموش زرد چہرہ یاد آتا۔ ندامت کی ایک لہر اس کے اندر سر اٹھاتی، لیکن بہت دیر تک اپنا تاثر جما نہیں پاتی تھی۔ وہ سب سوچیں جھٹک کر چچی جان اور ماہا کو سنبھالنے لگی۔

وہیں ایک طرف عفت بڑی خاموشی سے دل ہی دل میں سوہا کی زندگی کی سلامتی مانگنے میں مصروف تھی۔ لب بے آواز جنبش کر رہے تھے۔ آنسوؤں کی جھڑی میں روانی اور کپکپاتے ہاتھوں میں گھومتی تسبیح۔ کسی بہت اپنے، بہت پیارے کی جان مشکل میں پڑ جانے کی گواہ تھی۔ آپریشن تھیٹر کے اوپر لگی سرخ بتی کافی دیر سے روشن تھی اور جب تک یہ بتی جلتی تھی ایک ایک لمحہ گویا پل صراط پر سے گزر رہا تھا۔

انس دونوں ہاتھوں میں سر گرائے بیٹھا تھا۔ سوہا کا چہرہ، اس کی چمکتی نگاہیں اور مسکراتے لب دل و دماغ میں روشن تھے اور امید کے دیے کی لو لڑکھڑا رہی تھی۔

ڈاکٹرز نے اتنی ایمرجنسی میں ایسا بگڑا ہوا کیس لینے سے پہلے ہی زچہ اور بچہ کی زندگی کی طرف سے کوئی امید افزا بات کرنے سے معذرت کرلی تھی اور یہی چیز تھی جس نے سب کی جان ہتھیلیوں پر نکال رکھی تھی۔ کتنے کٹھن جان کنی کے لمحات گزرے، جب آپریشن تھیٹر کے باہر ڈاکٹر کی صورت دکھائی دی۔

"ماں خیریت سے ہے۔ مگر ہمیں افسوس ہے کہ ہم بچے کی جان نہیں بچا سکے۔" وہ اور کیا کیا تفصیلات بتا رہی تھی۔

انس کی آنکھوں کے سامنے سارا منظر دھندلا گیا۔ ایک ننھی معصوم جان اس وقت بڑی سی چادر میں لپٹی اس کے بازوؤں میں سکون سے سو رہی تھی۔ اس کی سماعتیں کچھ سننے کے قابل نہیں رہی تھیں اور نگاہوں میں سوہا کے معصوم چہرہ گھوم رہا تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ دنیا میں آنکھ کھولنے سے پہلے ہی دنیا سے موڑ لینے والا معصوم ننھا پاکیزہ وجود اپنی ماں کے سارے نین نقش چرا لایا تھا۔

ہو بہو وہی شکل، وہی لب، رخسار، پیشانی اور آنکھیں؟ کھلنے سے پہلے ہی ہمیشہ کے لیے بند ہو چکی تھیں۔ اس نے اپنی آنکھوں سے آنسو باہر نکلتے دیکھے۔ پھر اپنے کپکپاتے لب اس کی ٹھنڈی ننھی منی پیشانی پر رکھ دیے۔

☆ ☆ ☆
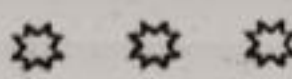
وہ جب سے ہوش میں آئی تھی ایک لمحے کے لیے بھی اس کے آنسو تھمے نہیں تھے۔ کمرے میں سب ہی موجود

تھے۔ عفت بہت دیر تک اسے گلے سے لگا کر تھپکتی رہی۔
یہ سچ تھا کہ اس کی ممتا کو کسی صورت چین نہیں مل رہا تھا۔ اپنے جس بچے کے خواب اس نے اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے دیکھے تھے۔ خیالوں میں اس سے باتیں کی تھیں۔ اس کی پہننے کی، برتنے کی ڈھیروں چیزیں، کپڑے رومال، پاؤڈر، شیمپو، کھلونے کیری کاٹ کتنے ارمانوں اور شوق سے خریدی تھیں۔ وہ سب چیزیں اب مل کر اس کا دل بھینچ رہی تھیں۔ اس کا کلیجہ منہ کو آرہا تھا۔ آنکھیں جل رہی تھیں اور آنسو اپنے بس میں نہیں تھے۔ پھر بھی سب اس کی صحت اور جان کی سلامتی کے لیے خدا کے شکر گزار تھے۔
یہی کیا کم تھا کہ اتنے بڑے حادثے سے زندہ سلامت بچ گئی تھی وہ۔ ورنہ ڈاکٹرز نے تو جواب دے دیا تھا کہ اس کی اپنی جان کی بھی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ سب اسے سمجھا سمجھا کر تھک چکے تھے۔ اور وہ امی کے سینے سے لگی بلک رہی تھی۔
انس اور خاندان کے دوسرے مرد حدید کے ساتھ بچے کی تدفین کے لیے جاچکے تھے۔ خاندان میں جس کو پتا چل رہا تھا وہ عیادت و تعزیت کے لیے پہنچ رہا تھا۔
"بس کرو سوہا کیوں اس قدر رو رہی ہو۔ جانے والے واپس تو نہیں آسکتے نا۔"
ماما دکھے دل سے مستقل اس کی دل جوئی میں لگی تھی۔ کافی دیر بعد جب انس نے کمرے میں قدم رکھا تو وہ ان دونوں کو تنہا چھوڑ کر باہر نکل گئی۔
سوہا کا نڈھال کمزور وجود اس کے دل میں سوئی چبھو گیا۔ اسے یک دم ہی سوہا کے نقصان کا اندازہ ہوا۔ وہ دھیرے سے اس کے قریب پہنچا۔ بائیں ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھاما اور دایاں ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔
دبی دبی سسکیاں حلق سے آزاد ہونے کے لیے اسی لمس کی منتظر تھیں، متلاشی تھیں۔ وہ اس کے سینے میں سر چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔
انس کی آنکھوں سے دو قطرے نکل کر بالوں میں جذب ہوگئے۔

☼ ☼ ☼
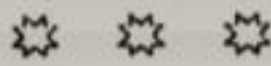
"میرا خیال ہے مجھے اب گھر جانا چاہیے۔" سب سے پہلے نائلہ نے جانے کی بات کی تھی۔
"ہوں۔" وہ کسی گہرے دھیان سے چونکا۔ "پتا نہیں تمہیں آنا بھی چاہیے تھا یا نہیں۔"
وہ بہت دھیمی آواز میں بڑبڑایا تھا۔ نائلہ نے چونک کر اسے گھورا مگر حدید اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔
"چلو۔ گھر چھوڑ آؤں۔" وہ پژمردہ سا اٹھ کھڑا ہوا۔
حادثہ بڑا ہو یا چھوٹا۔ ایک ہی خاندان کے تمام افراد بالواسطہ یا بلاواسطہ، کم یا زیادہ اس سے متاثر ضرور ہوتے ہیں اور یہ حادثہ بلاشبہ چھوٹے کے حاشیے میں نہیں آسکتا تھا۔
انس کے بچے کی جان چلی گئی تھی۔ وہ باپ بننے سے پہلے ہی اس خوشی سے اتنی بڑی نعمت سے محروم ہوگیا تھا اور بیوی کی جان جاتے جاتے بچی تھی۔
"کسی کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ یوں ہوجائے گا۔" اس نے دل ہی دل میں افسردگی سے سوچا۔
نائلہ ان بیویوں میں سے نہیں تھی جن سے ہر بڑی چھوٹی بات اور اچھی بری سوچ بانٹ لینا ان کے مردوں کا تفاخر ہوتا ہے۔
وہ یوں بھی اپنے دھیان میں گم تھی۔ اس نے اپنی پلاننگ کو بڑی عمدگی، صفائی اور کامیابی سے عملی جامہ پہنایا تھا۔ کسی کو بھنک بھی نہ پڑی تھی اور سوہا اتنی بڑی خوشی سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔ کسی اور کو تو کیا خود سوہا کو خبر نہیں

تھی کہ اس نقصان کی ذمہ دار سراسر نائلہ ہے۔
یونہی سوچوں میں گم حدید کے پیچھے پیچھے قدم رکھتی وہ بیرونی دروازے سے تھوڑا ہی دور تھی جب ایک جانی پہچانی آواز پر ٹھنک گئی۔ بیرونی دروازے کے پاس ہی وہ رخ موڑے کھڑا کسی نرس سے راز و نیاز میں مگن تھا۔
"شبیر حسین؟"
ایک لمحے کے لیے نائلہ کو اپنی آنکھوں تلے اندھیرا چھاتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے وہیں رک کر دو تین بار سر جھٹکا پھر' نظر جھکا کر اور چہرہ حتی الامکان چھپا کر آگے بڑھی۔ حدید آگے نکل چکا تھا۔ اس کے قدموں نے بھی رفتار پکڑی۔ اس بات سے بے خبر کہ چندیل کا ٹھہرنا اس کے لیے کیا عذاب کھڑا کرنے والا ہے۔
نرس کو چلتا کر کے وہ بڑے خراماں خراماں انداز میں اس کے پیچھے ہو لیا تھا۔ پان سے رنگے سرخ ہونٹوں پر مسکراہٹ اور نگاہوں کی ہوس بھری چبھن کسی پرانی شناسائی کی گواہی دے رہی تھی۔

☆ ☆ ☆
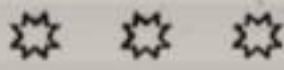
وہ کتنی دیر اپنے جیون ساتھی کے سینے سے لگی روتی رہی تھی' مگر بے قراری کو قرار نصیب نہ تھا انس دیر تک اس کا سر تھپکتا رہا۔ اس کے آنسو پونچھتا رہا اور وہ روتے ہوئے سوچ گئی۔
"یہی تسلیاں اور دلاسے آج سے پہلے میرے دامن میں ڈال دیتے تو آج شاید یہ نوبت نہ آتی۔" سوجی ہوئی آنکھوں میں سرخی نمایاں تھی۔
انس دکھے دل سے اسے دیکھے گیا۔ وہ بنا کچھ کہے ناخن کھرچتی رہی۔ کہنے کو کیا بچا تھا اب۔ اور پہلے کونسا انہوں نے آنے والے وقت کے لیے پلاننگ کی تھی۔ وہ تو پچھلے کئی دنوں بلکہ ہفتوں سے انس کی بے اعتنائی کا شکار تھی۔ تو کیا یہ ناراضی اتنے بڑے نقصان کا ازالہ کر سکتی تھی۔
"نہیں نہیں۔" اس کا دل تکرار کرتا رہا۔
"تم ڈس چارج ہو کے کہاں جاؤ گی۔" کچھ دیر بعد انس نے کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا۔
"امی کے یہاں جاؤں گی ظاہر ہے۔" وہ ترنت بگڑے تیوروں سے بولی۔
"گھر چلی چلو۔" اس کے برعکس انس کا لہجہ نرم تھا۔
"کیوں! مجھے نائلہ سے اپنی خدمت کروا کر اس کا احسان اپنے سر لینے کا کوئی شوق نہیں۔" انس چند لمحوں کے لیے بالکل چپ رہ گیا۔
"اس نے کب احسان جتایا ہے تم پر۔ یا اگر میں لاعلم ہوں تو بتا دو۔" احساس بے بسی سے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔
"آج بھی اسی کا تذکرہ اسی کی حمایت۔"
"اس نے نہیں جتایا تو کیا ہوا۔ وہ کہے یا آپ بات تو ایک ہی ہے۔" وہ تنفر سے بول اٹھی۔
"خود پر گزری زیادتی اور بے پایاں نقصان کے احساس نے اس کے دل و دماغ میں زہر بھر دیا تھا۔ جس کی تلخی اس کی زبان میں آگئی تھی۔ وہ چاہتی بھی تو انس کو دل سے معاف کرنے کے لیے خود کو تیار نہیں پاتی تھی۔ لیکن اس سارے حادثے کا ذمہ دار بلکہ' کم و کاست انس کو ٹھہرانے کے لیے دل و جان سے تیار تھی۔
میاں بیوی ایک دوسرے کا ایسا لباس ہوتے ہیں جو' ہزار ہا رنگوں سے سجا ہوتا ہے۔ لیکن یہ سارے رنگ ایک دوسرے کے وجود کے ہوتے ہیں۔ اتنے رنگوں کے درمیان کسی تیسرے کے نام کا ایک معمولی سا ٹانکا بھی برداشت نہیں ہوتا۔ اس پیرہن میں اگر برائے نام کا پیوند لگ جائے تو' زندگی کی تمام تر زبوں حالی بہ زبان خود دنیا

کے سامنے آشکار ہو جاتی ہے۔ مگر یہاں قصہ جدا تھا۔
سوہا کے لباس میں نائلہ کے نام کا پیوند نہیں تھا۔ باقاعدہ گل کاری کی جا رہی تھی۔ اور انس کو اس کا کوئی احساس نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

اسے اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے ابھی پانچ منٹ ہی گزرے تھے۔
صوفے پر بیٹھے ٹھنڈے پانی کو گھونٹ گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے اس نے اندھیرے گھر کی ویرانی پوری شدت سے محسوس کی۔ اور احساس ہوا کہ پانچ منٹ نہیں وہ پورے پانچ گھنٹے سے یہاں بیٹھا ہے۔ ایسے ہی تنہا اداس اور اکیلا۔ دل پر چھایا بوجھل پن کئی گناہ بڑھتا ہوا محسوس ہونے لگا۔
گلاس کو بائیں جانب صوفے پر لڑھکا کر اس نے بیلٹ کھولی۔ شرٹ باہر نکالی۔ اور ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کر کے خود بھی ڈھیلے ڈھالے انداز میں بیک سے ٹیک لگالی۔ موبائل کی بے جان اسکرین اس کی نظروں کے سامنے بجھی پڑی تھی۔
چند دن پہلے تک یہ موبائل ماہا کے میسجز اور کالز سے سارا وقت گنگناتا رہتا تھا۔ ہر تھوڑی دیر بعد موبائل کی بیپ سے اس کے لبوں پر مسکراہٹ چمکتی اور اب۔ ان باکس میں میسج تھے تو بزنس کے متعلق اور وہ بھی چند ایک۔ اور کاروباری لوگوں اور جان پہچان کے لوگوں کی لمبی لمبی کالز تھیں۔ پورے کال لاگ میں کہیں ماہا کی کال نہیں تھی۔ اس کا نمبر نہیں تھا۔ ان باکس میں کہیں اس کی کھٹی میٹھی شرارت نہیں تھی۔ اس نے گہری سانس بھر کے بے ارادہ ہی ماہا کا نمبر ڈائل کر دیا۔
سوہا پر گزرنے والے حادثے کا علم اسے ہو چکا تھا۔ اس نے اپنی ساس سے فون پر افسوس کا اظہار بھی کیا تھا۔ مگر اس کے بعد نہ ماہا نے فون کیا تھا نہ کوئی بات کی تھی۔
ماہا کو تو پتا نہیں مگر یہ وقت خود اس نے بہت ضبط سے گزارا تھا۔ ماہا ان چند دنوں میں اس کے دل کی مکین بن چکی تھی۔ وہ اس کے بغیر جینے کا تصور دل سے نکال چکا تھا۔ پھر اب کیسے رہ سکتا تھا۔
خاموش اپارٹمنٹ میں دوسری جانب جاتی ہوئی رنگ ٹون کی آواز پر تیز ہوتی دھڑکنیں وہ خود با آسانی سن رہا تھا لیکن۔ ٹوں ٹوں کی آواز آئی اور۔ رابطہ منقطع ہو گیا۔ اس نے مایوسی سے سیل کو دیکھا۔ پھر چونک گیا۔ ڈور بیل کی آواز بہت زور سے گونجی تھی۔
"اس وقت کون آ گیا۔" وہ پژمردگی سے چلتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ آنے والا بہت جلدی میں تھا۔ اتنی دیر میں تین بار بیل ہو چکی تھی۔ اس نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ مگر سامنے کھڑی شخصیت پر نظر پڑتے ہی اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔
"تم.... ؟ یہاں...." بدقت تمام اس نے خود کو بولنے کے قابل کیا تھا۔
اگلے ہی لمحے سامنے کھڑی عورت پھوٹ کر روتی ہوئی اس کے سینے سے لگ چکی تھی۔

★ ★ ★

عفت اور ماہا سوہا کے سامنے سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ وہ ذرا دیر پہلے ہی ہاسپٹل سے گھر آئی تھی۔ امی، تائی امی کے پاس نیچے ہی رک گئی تھیں۔
"میں بھی تمہارے لیے یخنی بنا دیتی ہوں۔ رات میں پھر بغیر مرچ کا سالن بنا دوں گی۔" عفت چند لمحے کی بے معنی خاموشی کے بعد یہی کہہ سکی۔
ماہا ہنوز سر جھکائے سوچوں میں گم تھی۔ اور سوہا بچے کے لیے خریدے گئے ایک ننھے سے بنیان کو ہاتھ سے

سہلا رہی تھی۔ انس اس کے ساتھ اندر آنے کے بجائے دروازے سے ہی اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ یہ بات اس کے موڈ کی خرابی کی طرف معمولی سا اشارہ تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو سوہا سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی ہوتی۔ مگر اس وقت وہ اپنی ماں اور بہن کے ساتھ شوہر کی غیر موجودگی میں کافی سکون محسوس کر رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں عہد کر رہی تھی کہ وہ انس کی مطلق پروا نہیں کرے گی۔ اور اسے بالکل ایسے ہی نظر انداز کرے گی جیسے اس نے سوہا کو کیا تھا۔

"حسیب بھائی کا کوئی فون آیا تھا۔"

"پتا نہیں۔" کمرے کی خاموشی میں ماہا کی آواز بے تاثر تھی۔

"کیا مطلب۔"

"میں فون دیکھتی ہی نہیں۔" وہ سر جھکا کر ہی بیٹھی رہی۔

سوہا سے مزید کوئی سوال نہیں کیا گیا۔ اس کے دل میں دونوں بہنوں کے نصیب پر تاسف کی لہر سی اٹھی۔ ایک بے وفا نہیں تھا تو کردار پر داغ لیے بیٹھا تھا۔ ایک باکردار تھا تو کس قدر سنگدل اور کٹھور بن گیا تھا۔ اس نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ ماہا اور اس کی زندگی میں سے زیادہ ٹریجک زندگی کس کی ہے۔ پھر چند لمحوں بعد ہی اسے اپنا وجود ہی مظلوم اور قابل رحم لگنے لگا۔

اس نے ابھی ابھی اپنی جان پر کھیل کر بھی اولاد کو کھو دیا تھا اور ماہا۔ شکر تھا کہ اس کے ساتھ ایسا کوئی حادثہ نہیں ہوا تھا۔ وہ اگر چاہتی تو ابھی بھی حسیب کے ماضی کو بھلا کر ایک خوشگوار زندگی کا آغاز کر سکتی تھی۔ پھر وہ کیوں یہ تنہائی کا عذاب بھوگ رہی تھی۔

"کیا میں اسے سمجھاؤں کہ جو ہو گیا اسے بھول کر نئے سرے سے..." اور اگر بدلے میں اس نے یہی بات مجھ سے کر دی تو..."

وہ ماہا کے سپاٹ چہرے کو دیکھتی سوچتی رہی۔

☆ ☆ ☆

وہ بے حد الجھن اور تشویش بھری نظروں سے سامنے بیٹھے وجود کو سسکتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کے جسم پر پڑے متعدد نشان گواہ تھے کہ اسے کسی نے بری طرح زدوکوب کیا ہے۔

اس کے دیے گئے پانی کے گلاس کو غٹاغٹ چڑھانے کے بعد وہ پھر سے رونا شروع کر چکی تھی۔ وہ چند لمحے تذبذب کے عالم میں سوچتا رہا۔ کہ کوئی بات کرے۔ کچھ پوچھے یا اس کے سنبھلنے کا انتظار کرے۔

پندرہواں منٹ شروع ہوتے ہوئے اس کے اعصاب جواب دے گئے۔

"اب کچھ بتانا پسند کرو گی یا صرف رونے کا پروگرام لے کر آئی ہو۔"

دل میں اٹھتے تشویش بھرے جذبے کے برعکس اس کا لہجہ بہت تلخ اور طنزیہ تھا۔ جواباً" اس نے بمشکل تمام ضبط کر کے آنسو پونچھے۔

"میں... حسیب میں..." اس نے پھر آنسو پونچھے۔

"میں تم سے معافی مانگنا چاہتی ہوں۔ پلیز مجھے معاف کر دو۔" اس نے حسیب کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ مگر دوسری طرف کوئی ری ایکشن نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆
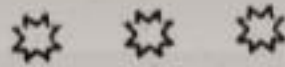
نائلہ کا رویہ حسب معمول بہت اکھڑا اور روکھا پھیکا سا تھا۔

حدید بڑے غور سے اس کی اٹھا پٹخ دیکھتا ماتھے کے بل گنتا رہا۔ یوں لگتا تھا اسے سوہا پر گزرنے والے حادثے کا کوئی افسوس نہیں' افسوس تھا تو صرف اس بات کا کہ سوہا چند دن میکے میں گزار کر پھر ہٹی کٹی ہو کر اس کے اعصاب پر سوار ہونے آرہی تھی۔ سوچ کا زہریلا ناگ بار بار پھن اٹھا کر اسے ڈستا اور ہر بار وہ تکلیف سے تڑپ جاتی۔

حدید آفس سے آکر نہانے جا چکا تھا جب دروازے پر دستک ہوئی۔

"ذرا دیکھیں تو سہی۔ دروازے پر ہے کوئی۔" اس نے دوبار حدید کو آواز دی۔ پھر کوئی جواب نہ پا کر پیر پٹختی دروازے تک گئی۔

اپنے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے حدید کو غسل خانے سے برآمد ہوتے دیکھا۔ اس کی جھنجلاہٹ اور غصے میں ایک دم اضافہ ہوا۔ اسے لگا حدید جان بوجھ کر انجان بن رہا ہے اور' جان بوجھ کر غسل خانے سے دیر سے نکلا۔

"کیا مصیبت ہے۔" اس نے پھاڑ کھانے والے انداز میں دروازہ کھول کر پوچھا۔ مگر آنے والا لمحہ اور سامنے کھڑے شخص کی شکل اسے گنگ کر گئی۔

"تم..." کچھ بولنے کی کوشش میں اس کے ہونٹ بے آواز پھڑ پھڑ کر گئے۔

سامنے ہی شبیر حسین پان سے رنگے دانت اور ہونٹ لیے جلوہ افروز تھا۔

"کک۔ کون ہو تم۔"

اس نے انجان بننے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے گھبرا کر اندر صحن کی طرف دیکھا۔

"لو ہمیں بھول گئیں شہزادی۔" اس کے انداز وہی پرانے تھے۔ گہرے مراسم کی نشانی جیسے۔

"اب کیا یہ بھی یاد دلانا پڑے گا کہ ہم کون ہیں۔"

وہ یوں آسانی سے ٹلنے والا نہیں تھا۔

آن کی آن میں نائلہ کی جان پر بن گئی۔ حدید کسی بھی لمحے کمرے سے باہر آسکتا تھا اور انس آفس سے۔

"کیا چاہتے ہو۔ اب کیوں آئے ہو۔"

"ارے ایسے کھڑے کھڑے کیا خاک بات ہوگی۔ اندر چل کر اطمینان سے..."

"دماغ ٹھیک ہے کہ نہیں۔ یہ میرے..." اس کی بات منہ میں رہ گئی۔ حدید اندر کمرے سے پکار کر آنے والے کی بابت پوچھ رہا تھا۔

"چلے جاؤ خدا کے لیے یہاں سے جاؤ۔" لمحہ بھر میں اس کی شکل رونے والی ہو گئی۔

"ابھی جاؤں تو پھر کب آؤں۔"

اس کا اطمینان دیدنی تھا۔ نائلہ کا جی چاہا سامنے پڑے بڑے سارے پتھر سے اس کا سر توڑ کر قصہ تمام کردے۔

"کل... کل دوپہر میں' اب جاؤ خدا کے لیے۔" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا اور وہ دبی دبی آواز میں چیخ پڑی۔

حدید باہر آرہا تھا۔ اب شبیر حسین کے ہٹنے کا انتظار کرنا فضول تھا۔ وہ لمحہ بھر میں دروازہ بند کرنے ہی والی تھی کہ شبیر کے عقب سے انس کا چہرہ نمودار ہوا۔ اسے لگا اس کی سانس رک چکی ہے۔

☼ ☼ ☼
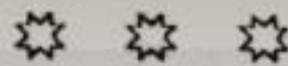
وہ لاؤنج کے صوفے پر بیٹھا بے زاری سے اس عورت کو دیکھے جا رہا تھا۔ جو اس کی منت پچھلے آدھے گھنٹے سے کر رہی تھی۔ کہ اسے چند دن کے لیے اپنے پاس رہنے کی اجازت دے دے۔

حسیب کی سوچیں آپس میں بے طرح الجھی پڑی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کرے اور کیا کہے۔ سامنے بیٹھی عورت جھوٹی' مکار اور دھوکے باز تھی۔ یہ تو اسے یقین تھا۔ لیکن اس کا اجڑا حلیہ اور دگرگوں حالت کچھ اور کہانی سنا رہے تھے۔ آنکھیں یقین کر رہی تھیں۔ دل جھٹلا رہا تھا اور دماغ میں مسلسل تنبیہی گھنٹی بج رہی تھی۔

"اب تم مجھ سے کیا چاہتی ہو یہ بتاؤ۔" کتنی دیر بعد وہ بے تاثر لہجے میں بولا تھا۔

"بس تھوڑے سے دن کے لیے مجھے۔۔۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔ کچھ اور کہو۔"

"پلیز حسیب۔ وہ میرا سابقہ شوہر بھوکے شیر کی طرح ڈھونڈ رہا ہے مجھے۔ میرا دنیا میں کوئی نہیں رہا۔ میں کہاں جاؤں اب۔" اس پر رقت طاری تھی۔

"دیکھو اگر تمہیں رقم کی ضرورت ہے تو۔۔۔"

"مجھے رقم کی نہیں۔ تمہارے سہارے کی ضرورت ہے۔" وہ لجلجا رہی تھی۔

"تو کہیں اور جا کر ڈھونڈو سہارا۔ میں تمہیں کوئی سہارا۔۔۔"

حسیب کہتے ہوئے اٹھا ہی تھا کہ اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ وہ اس کے قدموں پر گری سسک رہی تھی۔ غصے کی ایک تیز لہر اس کے وجود میں دوڑ گئی۔

اس نے کس قدر مشکل سے اپنی زندگی کو سیٹ کیا تھا۔ اس کی دی ہوئی نشانی کو کلیجے سے لگا کر رکھنے کے جرم کی سزا اپنی بیوی سے ناراضی کی صورت میں بھگت رہا تھا۔ اور اب یہ بلا پھر جان سے چمٹنے کو آگئی تھی۔

اس نے ایک لمحے میں فیصلہ کر کے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔ اور بیرونی دروازے کی طرف ہلکا سا دھکیل دیا۔

"تم بھی اسی وقت یہاں سے چلی جاؤ۔ کسی بھلائی کی امید مت رکھنا مجھ سے۔"

وہ اپنی زبوں حالی کی بدولت ہلکے سے دھکے سے جھٹکا کھا کر لڑکھڑائی اور سنبھلتے سنبھلتے بھی دہلیز پر گر گئی۔ اگلے ہی لمحے وہ پھر ایک قدم آگے بڑھ کے حسیب کے قدموں میں تھی۔

"نہیں نہیں۔ تم ایسا نہیں کر سکتے۔ تم اتنے پتھر دل نہیں ہو سکتے۔"

وہ بری طرح بلک رہی تھی۔ حسیب کے پیروں سے چمٹ رہی تھی اور مستقل اس کا غصہ بڑھا رہی تھی۔

اس نے آخری بار ایک جھٹکے سے اسے اٹھا کر اپارٹمنٹ کے باہر دھکیل دیا۔

پڑوس میں رہنے والے مسٹر شرجیل اور مسز شرجیل اس وقت گھر پر نہیں تھے۔ ورنہ اس ہنگامے کی آوازیں ان تک ضرور پہنچتیں اور کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ اس سے استفسار کرتے۔

سالوں کی محنت سے بنایا گیا کردار اور عزت اسے ہر چیز سے بڑھ کر عزیز تھی۔ جس پر حرف آجانے کا خیال بہت زور آور تھا۔ اس نے تیزی سے اسے باہر دھکیل کر دروازہ سختی سے لاک کر دیا۔

باہر سے ابھی بھی اس کے رونے اور منتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ مستقل دروازہ ناک کر رہی تھی۔

اس نے صوفے پر تھرکتے موبائل کو دیکھا۔ ماہا کی کال آرہی تھی۔

"او نو!"

شدید ترین ٹینشن میں گھر کر اسے اپنے اعصاب کشیدہ محسوس ہو رہے تھے۔ موبائل کی مسلسل بجتی بیپ۔ دروازے پر دستک۔

ابھی ذرا دیر پہلے تک اسے ماہا کی کال کا شدت سے انتظار تھا۔ اور اب اس کال کو ریجیکٹ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ اس قدر منتشر ذہن کے ساتھ اس سے بات کرنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ جبکہ وہ پہلے ہی

شک میں مبتلا تھی۔ اور باہر ہوتی دستک کی آواز بھی اس تک جا سکتی تھی۔

کال ڈس کنکٹ کرتے ہوئے اس نے نفرت اور بے چارگی کے ملے جلے تاثرات سے باہر دھڑ دھڑاتے دروازے کو دیکھا۔ اور پژمردہ قدموں سے جا کر بیڈ روم میں بند ہو گیا۔

بیڈ روم کی چوکھٹ میں تختی ہے جسے دروازے کی کسی نامعلوم جھری کو چیرتی اس کی آواز یہاں تک آ رہی تھی۔ وہ اب بھی مسلسل ناک کر رہی تھی۔ لیکن یہ آواز اب بہت مدہم ہو چکی تھی۔ حسیب کو یقین تھا۔ وہ کچھ دیر بعد تھک کر مایوس ہو کر وہاں سے چلی جائے گی۔ وہ اپنے کپڑے لے کر واش روم میں گھس گیا۔

☼ ☼ ☼
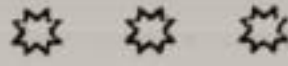
پل پل کر کے گزرتا ہوا دن، پل پل کر کے اس کی ٹینشن میں مسلسل اضافہ ہی کر رہا تھا۔ اس گھر میں آنے والے اول دن سے لے کر آج تک کبھی وہ کچھ نہیں ہوا تھا جو اب اس کے ساتھ ہو رہا تھا۔ سالن جل گیا۔ دودھ ابل گیا۔ اور سلاد بنانے میں اس کی انگلی کٹ گئی۔

انس کو اس وقت شبیر حسین کے سامنے گھر آتے دیکھ کر اس کے جو اوسان خطا ہوئے تھے۔ وہ تو اس نے کمال مہارت سے سنبھال کر، انس کے استفسار پر شبیر حسین کو کسی چندہ کمیٹی کا رکن کہہ کر جان چھڑالی تھی۔ لیکن اب سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کل دوپہر کو جب وہ مصیبت اس سے آنے کا کہہ کر گیا ہے۔ اس کا کیا سدباب ہو گا اور کس طرح۔

اتنا تو اسے یقین تھا کہ ایک بار گھر میں گھس جانے کے بعد شبیر حسین کو گھر سے نکالنا اتنی آسانی سے ممکن نہ ہو گا۔ کئی ایک بار اس کے جی میں آئی کہ کل دوپہر کو دروازے پر تالا ڈال کر وہ خود بھی کہیں چلی جائے۔ پھر خود ہی اس خیال کو مسترد کر دیا۔ کیونکہ کل دوپہر کو اسے گھر سے غائب پا کر وہ بعد میں کسی بھی وقت نازل ہو سکتا تھا۔ اور یقیناً پہلے سے زیادہ ہٹ دھرمی کے ساتھ۔

اس مصیبت کا کوئی مستقل حل کم سے کم اسے تو دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"یا اللہ میں کیا کروں۔"

کئی بار اس کے دل سے آواز نکلی۔ اپنے ہاتھوں کھڑی کی گئی مصیبت کو اپنی ہی جانب بڑھتا دیکھ کر اسے بہت جلدی خدا یاد آ گیا تھا۔

رات کے کھانے پر بھی وہ بے توجہی سے شوربے میں روٹی کے ٹکڑے کر کے ڈالنے لگی۔ حالانکہ وہ کبھی کبھی روٹی کو سالن یا دال میں اس طرح مکس کر کے نہیں کھاتی تھی۔ اور اگر سوہا کو ایسا کھاتے ہوئے دیکھتی تو یوں ناک چڑھاتی جیسے اسے بہت گھن آ رہی ہو۔ حدید اس کی غائب دماغی کو بہت دیر سے نوٹ کر رہا تھا۔ جب ہی اسے سالن اور روٹی کا ملیدہ بناتے دیکھ کر ٹوکے بنا رہ نہیں سکا۔

"یہ کیا کر رہی ہو نائلہ۔ ایسے کھاؤ گی سالن۔"

"وہ بری طرح چونک پڑی۔ پھر اپنی پلیٹ پر نظر ڈالی تو خفیف سی ہو گئی۔

"ہاں وہ بس۔۔۔ آج یونہی دل کر رہا تھا کھانے کو۔"

اس نے حدید کی مشکوک نگاہیں خود پر مرکوز دیکھ کر جلدی جلدی بڑے بڑے نوالے نگلے۔

"تمہیں کوئی مسئلہ ہے نائلہ۔"

رات کو سونے سے پہلے اس نے ایک بار پھر پورے خلوص اور سچائی سے اس سے پوچھا تھا۔ اور جواباً "وہ ایک پھیکی سی ہنسی ہنس کر رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

بے حد مایوسی اور ناقابل یقین سی کیفیت میں اس نے سیل کی بے جان لائن کو دیکھا۔

"کیا حبیب ناراض ہو گئے ہیں مجھ سے۔"

تمام تر شکووں کے باوجود یہ سوچ کافی تھی۔ اور مضطرب کرنے کے لیے۔

اس نے کمرے میں جھانکا۔ دیوار کی سمت چہرہ پھیر کر لیٹی سوہا پتا نہیں جاگ رہی تھی یا سو رہی تھی۔ وہ تمام تر کوشش کے باوجود اس سے اپنی فیلنگز شیئر نہیں کر سکتی تھی۔ سوہا جس اعصابی کشمکش اور بڑے حادثے سے گزر کر دوبارہ زندگی کی طرف لوٹی تھی۔ اس نے اس کی ذہنی حالت ایسی کر دی تھی کہ کسی بھی موضوع پر بات کرنے کو اس کا دل نہیں چاہتا تھا۔ اور انس یا اپنے بچے کے بارے میں ذکر اسے آب دیدہ کر دیتا تھا۔ فی الحال وہ اس قابل نہیں رہی تھی کہ اس سے کسی بھی موضوع پر بات کی جاتی۔

نیچے عفت تھی۔ جس کا ہونا نہ ہونا بسا اوقات پتا ہی نہ چلتا۔ وہ دن بھر گھر کے کام نمٹاتی۔ سب کے لیے کھانا پکاتی، دو طرح کے پرہیزی سالن۔ صفائی۔ اور اس طرح کے دوسرے کام۔ یوں بھی ماضی میں ماہا کی کبھی عفت سے اس قدر بے تکلفی نہیں رہی تھی۔ کہ وہ اس قدر ذاتی نوعیت کی باتیں اس سے کہتی۔

فی الحال اس کے پاس حبیب کے فون کا انتظار کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

فلیٹ میں خاموشی تھی۔ دروازے پر دستک کی آواز آنا بند ہو چکی تھی۔ مگر حبیب دروازہ کھول کر اس کی غیر موجودگی کا یقین کرنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ عین ممکن تھا۔ وہ دروازے کے پاس ہی کہیں موجود ہو۔

وہ.... کون تھی وہ؟ ڈزنی بلیک.... اپنے نام کی ضد بے تحاشا سفید عورت اس کے ذہن پر ماضی کے ہاتھ برسوں پرانے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ جب اس نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔

اسے دیکھ کر کوئی بھی ذی ہوش اپنے ہوش کھو سکتا تھا۔ وہ خوب صورت نہیں، حسین عورت تھی اور اپنے بے پناہ حسن اور اس کی تباہ کاریوں سے اچھی طرح واقف تھی۔

حبیب جتنا کم عمر اور ناتجربے کار تھا۔ اس کے لیے ظاہری حسن رکھنے والی عورت کا ساتھ ہونا ہی اسے مکمل طور پر دیوانہ بنانے کے لیے کافی تھا۔ یہ بات وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ مگر وہ سدا کی دھوکے باز تھی۔ مردوں کو بے وقوف بنا کر ان سے پیسے اینٹھنا اور پھر کام نکل جانے کے بعد راہ چل دینا اس کا محبوب مشغلہ بھی تھا۔ اور ذریعہ معاش بھی۔

حبیب اس سے ملنے والے مردوں میں وہ واحد مرد تھا۔ جس کی طرف وہ بغیر پیسے کے ملتفت ہو گئی تھی۔ حالانکہ وہ کوئی ایسا خوب صورت حسین و جمیل، مردانہ وجاہت کا شاہکار مرد نہیں تھا۔ پھر بھی وہ اس کے پاس اس کے اپارٹمنٹ میں، جو فقط ایک کمرے اور کچن پر مشتمل تھا رہتی رہی تھی۔ حبیب اسے خود سے متاثر اور محبت میں گرفتار سمجھنے لگا۔ اس نے زندگی میں اس جیسی عورتیں کبھی دیکھی ہی نہیں تھیں۔ اس قدر مطلبی، اتنی چلتی پرزہ۔ دن رات مردوں کی سنگت میں گزارنے اور جانے کون کون سے گورکھ دھندوں میں پھنسی۔ جسم فروشی کی غلیظ دلدل میں گردن تک دھنسی عورتیں۔

وہ بھی ان ہی عورتوں میں سے ایک تھی۔ اور اپنے ایک بہت پرانے اور خطرناک قرض خواہ سے چھپتی پھر رہی تھی۔ اس کے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ حبیب کو اپنی محبت کا فریب دے کر چند روز یا چند ہفتے اس کے پاس سب سے چھپ کر گزارے۔ دن رات کا ساتھ اور حدود و قیود سے مبرا قربت وہیں رنگ لائی تھی۔ جب حبیب کو

پتا چلا کہ ڈزنی اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ جس دن اسے یہ خبر ملی اس کی کیفیت عجیب تھی اور احساسات عجیب تر۔

یہ پہلی خوش خبری تھی جو اسے زندگی میں وقت سے بہت پہلے مل گئی تھی۔ ڈزنی کے لیے بھی یہ خبر غیر متوقع تو تھی۔ لیکن خوش کن ہرگز نہیں تھی۔

جس روز حبیب کو یہ خبر ملی۔ اسی رات ان دونوں کے درمیان زبردست جھگڑا ہوا۔ اور حبیب اس سے ناراض ہو گیا۔ پھر وہ تین دن تک ناراض رہا لیکن ڈزنی کے اوپر رتی برابر اثر نہ ہوا۔ ہار مان کر حبیب خود ہی اس کا خیال رکھنے پر آمادہ ہو گیا۔ لیکن اس عورت کے لیے یہ صورت حال کسی طور قابل قبول نہ تھی۔ وہ تو فقط چند روز کے لیے پناہ لینے حبیب کے پاس آئی تھی۔ زندگی بھر کے لیے کسی سے جڑ کر رہنا اس کی فطرت میں ہی نہ تھا۔ کجا کہ کسی مرد کی بیوی بن کر اس کے بچے پالنا۔

حبیب نے اپنا پورا زور لگایا۔ مگر جب وہ کسی طرح اس بات کے لیے راضی نہ ہوئی کہ یہ بچہ اس دنیا میں آئے تو اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ ڈزنی ویسے بھی اس پر پوری طرح ظاہر کر چکی تھی کہ وہ کس قماش کی عورت ہے۔ اس لیے اب نہ تو مزید حبیب کے پاس اس کی رہائش ممکن ہے اور نہ اس بچے کی دنیا میں آمد۔

حبیب کی آنکھوں میں کسی عورت کے حوالے سے سجا پہلا خواب بری طرح چکنا چور ہو گیا۔ وہ اگر اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تھی تو وہ اسے مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ اسے خود پر اپنی عقل پر اپنی نادانی پر حیرت بھی تھی۔ اور افسوس بھی تھا۔

ایک عورت نے کتنے دن کتنے مزے سے اسے بے وقوف بنایا اور وہ فقط اس کی حسین صورت اور خوب صورت جسم کے پیچھے اس کے لیے ایک مہرے کی طرح استعمال ہوتا چلا گیا۔ اس نے بمشکل تمام اسے اس بات کے لیے راضی کیا کہ وہ اس بچے کو دنیا میں آنے دے۔ اس کے بعد اس بچے کو حبیب کے حوالے کر کے وہ جہاں جانا چاہے۔ دنیا کے کسی بھی کونے میں، وہ اسے مجبور نہیں کرے گا کہ وہ حبیب کے ساتھ ہی رہے۔ لیکن وہ حبیب کی اولاد کو یوں ختم نہیں کرے گی۔ کافی بحث مباحثے کے بعد وہ مان گئی۔

حبیب کی مالی پوزیشن اس قدر کمزور تھی کہ ڈزنی کا خیال رکھنے کے لیے اسے وقت پر خوراک اور دواؤں کی فراہمی اور پھر مستقبل میں اپنے بچے کے لیے اس کے اخراجات کے لیے ڈبل جاب کرنی پڑی۔ مگر وہ راضی خوشی تیار ہو گیا۔ اس نے ویک اینڈ اور سنڈے کو بھی کام کرنا شروع کر دیا۔ اپنی ضروریات ختم کر کے وہ ہر طرح سے ڈزنی کا خیال رکھ رہا تھا وہ سمجھ رہا تھا۔ اس طرح سے اپنی محبت نچھاور کر کے وہ اسے اپنا بنا لے گا۔ مگر ایسا ہو نہیں سکا۔

ایک بہت عام سے دن جب وہ اٹھارہ گھنٹے کی ڈیوٹی بھگتا کر گھر واپس آیا تو اس کا اپارٹمنٹ خالی تھا۔ اور وہ کہیں بھی نہیں تھی۔

✡ ✡ ✡
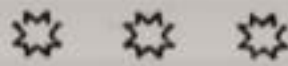
بے انتہا شل ہوتے اعصاب کسی کی پرسکون رفاقت کے متقاضی تھے۔ وہ مہربان ہاتھ جو گزرے وقت کی نامہربان یادوں سے اسے سنبھال کر علیحدہ کر لیتے۔ اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتے اور وہ سکون سے آنکھیں موند کر گہری نیند میں اتر جاتا۔ اس نے ماہا کا تصور کر کے آنکھیں موندیں تو بے تحاشا جلن کے احساس تلے ایک نئی بے چینی نے جنم لیا۔ ماہا نے دوبارہ کال نہیں کی۔ پتا نہیں وہ کیا سمجھی ہو گی۔ یقیناً" اور بھی زیادہ بدگمان ہو گئی ہو گی اور کیا۔

ایک اضطراب اس کی رگ و پے میں دوڑ گیا۔ اس نے وقت دیکھے بغیر تیزی سے ماہا کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری

جانب پہلی بیل کے مکمل ہونے سے پہلے فون ریسیو کرلیا گیا۔
"ہیلو۔ ہیلو ماہا۔ کیسی ہو میری جان۔"
اس کے لہجے میں کتنی بے چینی' بے کلی پنہاں تھی۔ میلوں دور بیٹھی اس کی آواز کا انتظار کرتی ماہا نے پورے دل و جان سے محسوس کی۔
سوہا نے کمرے کی کھڑکی سے جھانک کر ماہا کو دیکھا۔ وہ کسی سے فون پر بات کر رہی تھی۔ اور رات کے اس پہر بھلا کون ہو سکتا تھا حسیب کے سوا۔
اس کی آواز معمولی سی بھنبھناہٹ کی صورت میں اس تک پہنچ رہی تھی۔ اس کی آواز میں کوئی ترنم نہ تھا۔ نہ کوئی لوچ نہ گداز۔ پھر بھی اس وقت وہ دبی دبی محتاط آواز سوہا کو کسی خوب صورت محبت بھرے' پر نم گیت سے کم نہیں لگی۔
جانے کس خیال نے اس کی آنکھیں یک دم گلابی کردیں۔ اس کے دل میں بوندا باندی ہونے لگی۔
"کیا انس کو میری یاد آتی ہوگی۔" ایک سوال آنکھوں میں آنسو لیے اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ اور اس کی ہمت نہ تھی کہ ہاتھ بڑھا کر وہ آنسو صاف کردے۔ اس کے دل نے ایک سسکی بھری۔

☼ ☼ ☼
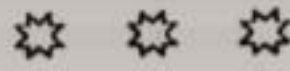
دوسری صبح اس قدر بوجھل نہ تھی۔ جتنی کل رات لگ رہی تھی۔ دل کا بوجھ ماہا سے بات کرکے کافی حد تک کم ہوگیا تھا۔ وہ آنکھ کھلنے کے بعد بھی دیر تک پڑا بستر میں اینڈتا رہا۔ رات کو ہونے والی بات اور ڈزنی کی اچانک آمد کے بارے میں سوچتا رہا۔
اسے حسیب کا ایڈریس کہاں سے ملا اور وہ دبئی کیسے پہنچ گئی۔ ان سوالوں کے جوابات ڈھونڈنا بے کار تھے۔ اب اسے جلد سے جلد اپنا ایڈریس تبدیل کرنا تھا۔ خوش آئند بات یہ تھی۔ کہ کل اس نے بہت عرصے بعد ماہا کی آواز میں اپنے لیے اسی پرانی بے تابی کی جھلک دیکھی۔ اس نے ماہا سے وعدہ لیا تھا کہ وہ کچھ عرصے بعد اسے واپس بلالے گا اور وہ انکار نہیں کرے گی۔ فی الحال وہ خود ہفتے بھر کے لیے اس سے ملنے پاکستان جانے کا فی الفور ارادہ کر بیٹھا تھا۔ ماہا نے البتہ فوراً" ساتھ آنے سے انکار کردیا تھا۔ حسیب کے لیے یہ ہی بہت تھا کہ کم سے کم اس کی ناراضی دھیرے دھیرے اختتام کی طرف سفر کررہی تھی۔ اور اگر وہ حسیب کی پوری بات سن لے گی تو یقیناً" اسے معاف بھی کردے گی۔
اس کے دل میں امیدوں کے نئے چراغ تو پکڑ رہے تھے۔
اس نے گنگناتے ہوئے کافی بنائی اور بہت اچھے موڈ میں آفس کے لیے تیار ہوا۔ ابھی اسے اپنے منیجر کو ہفتے بھر کی بریفنگ بھی دینی تھی۔ کہ اس کی غیر موجودگی میں پورے آفس اور اسٹاف کو اس کا منیجر ہی دیکھتا تھا۔
دروازے پر بیل ہورہی تھی۔ ٹائی کی ناٹ لگاتے ہوئے اس کے ہاتھ تھم گئے۔ بے وقت کی آمد' شاید نہیں یقیناً" پھر اس کی تھی۔
"Not Again -" اس نے کوفت سے ایک گہری سانس لی۔ اور دروازے پر لگی میجک آئی سے احتیاطاً" باہر جھانکا۔ مگر باہر اس کی توقع کے خلاف ڈزنی کے بجائے مسز شرجیل کھڑی تھیں۔ اس کے دل کو ذرا اطمینان ہوا۔ اس نے فوراً" دروازہ کھولا۔ پھر ٹھٹک گیا۔
مسز شرجیل وہاں اکیلی نہیں تھیں۔ وہ اپنے برابر میں اشارہ کرکے معنی خیزی سے کچھ کہہ رہی تھیں۔
"یہ خاتون آپ کا ایڈریس پوچھ رہی تھیں۔"

☼ ☼ ☼
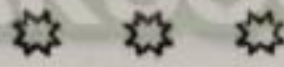
بھری دوپہر کا وقت تھا۔ نائلہ جلے پیر کی بلی کی طرح برآمدے میں یہاں سے وہاں چکر لگا رہی تھی۔ اسے انتظار تھا۔ شبیر حسین کا۔ جسے اس نے خود آج آنے کا بلاوا دیا تھا۔ سمجھ نہیں آتا تھا کہ کس کس وقت کو کوسے اور اپنی کون کون سے حماقتوں کا ماتم کرے۔ اس کی حرکتوں کے لیے لفظ حماقتیں تھا بھی بہت احمقانہ۔

دفعتاً" دروازے پر بیل ہوئی۔ اسے معمول سے زیادہ چیختی ہوئی محسوس ہوئی۔ کانپتے ہوئے پیروں اور کپکپاتے ہاتھوں سے اس نے دروازہ کھولا۔

"آ... آپ۔" اس کا دل حلق میں آن پھنسا۔ سامنے حدید کھڑا تھا۔

کھڑے کھڑے جسم بے جان ہو جاتا۔ ناکارہ ہو جانا کسے کہتے ہیں۔ اسے آج پتا چلا تھا۔ وہ اتنی حواس باختہ ہو گئی کہ کتنی دیر وہیں کھڑی حدید کی شکل ہی دیکھتی رہی یہاں تک کہ اس نے باقاعدہ اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔ ایک طرف ہو کر اسے راستہ دیتے سمے بھی اسے یوں ہی لگ رہا تھا۔ جیسے وہ ابھی پورے قد سے زمین پر جا گرے گی۔

شاید وہ اپنی زندگی میں اتنی خوف زدہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ حدید سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

"آپ... آپ اس وقت کیسے آ گئے۔" وہ جیسے لڑکھڑاتی ہوئی آواز اور ڈگمگاتے قدم لے کر اس کے پیچھے آئی تھی۔

"یار ایک ضروری فائل لے جانی تھی۔ گھر پر بھول گیا۔ خواری اٹھانی پڑی۔"

وہ اب سائیڈ ٹیبل کے پاس کھڑا کسی فائل کے صفحات کو عجلت میں پلٹ رہا تھا اور نائلہ اتنے ہی اضطراب کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی۔ صد شکر تھا کہ وہ اس قدر جلدی میں تھا کہ اس نے نائلہ کے چہرے کو غور سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ ورنہ اسے اس کے منہ پر اڑتی ہوائیاں ضرور نظر آ جاتیں۔

"تو آپ فائل لے کر جا رہے ہیں واپس۔"

"ہاں... دیکھو شاید..."

"ش... شاید مطلب..." ابھی اس کا سوال منہ میں ہی تھا کہ حدید کی کال آ گئی۔ چند منٹ اس نے بات کی، پھر فون بند کر کے سکون کا سانس لیا۔

"میں نہانے جا رہا ہوں، تم کھانا نکال لو۔"

"کیوں... م... میرا مطلب ہے آپ جا نہیں رہے واپس۔"

"جاؤں گا، مگر اب اتنی جلدی نہیں۔"

وہ خود تو سکون سے ہو گیا، لیکن نائلہ کا سکون غارت ہو گیا۔ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر نہانے چلا گیا۔ نائلہ چند لمحے باتھ روم کے بند دروازے کو گھورتی رہی، پھر تیزی سے اچھلی۔ دروازے کی بیل بج رہی تھی۔ چیختی، چلاتی، شور مچاتی۔

اس کے حواس ساتھ چھوڑنے لگے۔ وہ وہیں کھڑی باتھ روم کے دروازے کو گھورے گئی۔ وہ جانتی تھی، اب دروازے پر شبیر حسین کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

بیل پھر بجی۔ نائلہ کا دل کنپٹیوں میں بھاگ آیا۔ ایک ایک رگ دھڑکن کے ساتھ پھڑکنے لگی۔ ایک پل کو خیال آیا کہ یوں ہی کھڑی رہے اور بیل بجانے والا مایوس ہو کر چلا جائے۔ لیکن یہ خیال کتنا بودا اور کچا تھا۔ مسلسل بجتی بیل پر اگر حدید نکل آتا اور اگر نہیں نکلتا تو جھانک کر اسے آواز دینے کا ارادہ کرتا اور اسے یوں بت بنے دیکھ

لیتا تو۔۔۔

اسے ایک جھرجھری سی آئی اور وہ تیز لیکن ٹیڑھے میڑھے قدموں سے دروازے تک آئی۔ جھری سے جھانکنے پر کچھ دکھائی نہیں دیا تو اس نے دھیرے سے دروازہ کھولا۔

دروازہ کھلتے ہی اس کا منحوس چہرا سامنے تھا۔ پان کھاتے دانت ' سیاہ مسکراتے لبوں کے پیچھے خباثت سے جے ہوئے تھے۔

✡ ✡ ✡

وہ بے حد سنجیدہ اور سپاٹ چہرے کے ساتھ اپنی پیکنگ میں مصروف تھا۔ کمرے کے کھلے دروازے سے سامنے صوفے پر وہ اسے بیٹھی ہوئی نظر آرہی تھی۔ سر جھکائے ' نادم و شرمسار سی۔ اسے اس کی یہ حرکت اور یہ تاثر ایک ڈھونگ سے زیادہ کچھ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ کافی دیر خاموشی سے اپنا کام کرنے کے بعد وہ اس کی طرف آیا۔

"میں پاکستان جا رہا ہوں۔" چند لمحے اسے سخت نظروں سے گھورنے کے بعد اس نے کہا "اور تم میری غیر موجودگی میں یہاں نہیں رہ سکتیں۔"

"میں رہ سکتی ہوں۔ میرا مطلب ہے تم جتنے دن کے لیے جا رہے ہو ' صرف اتنے دن مجھے یہاں۔۔۔"

"اور اس کے بعد۔۔۔" حسیب نے بے زاری سے اس کی بات کاٹی۔

"اس کے بعد میں چلی جاؤں گی۔ آئی سوئیر۔۔۔ مجھے صرف چند دن کے لیے یہاں رہنے دو۔" اس کا لہجہ التجائیہ ہو گیا ' لیکن اس کے اوپر کوئی اثر نہیں ہوا۔

"اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں ہے نا۔ سارا مسئلہ تو یہ ہے۔"

"تم میری بات کا یقین کرو حسیب میں۔۔۔ میں کیسے تمہیں یقین دلاؤں۔ میں تمہیں کوئی نقصان پہنچانے نہیں آئی۔ پلیز میرا یقین کرو۔ میں بہت مصیبت میں ہوں ' میری مدد کرو پلیز۔" وہ پھر گڑگڑاتی ہوئی رونے کے لیے پر تولنے لگی۔

"اوہ پلیز یار۔۔۔ بند کرو یہ ناٹک۔۔۔" اس نے کوفت سے اسے ٹوک دیا۔ "ٹھیک ہے۔۔۔ ابھی تو میں چند دن یا شاید صرف تین دن کے لیے جا رہا ہوں۔ لیکن میں پاکستان سیٹل ہونے والا ہوں۔ اس لیے تمہارے دل میں اگر کوئی گمان ہے بھی تو دور کر لو۔ میری شادی ہو چکی ہے اور میں اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا ہوں اور اس کی خاطر میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ اسی لیے اپنا پورا بزنس 'کانٹیکٹس' ختم کر کے پاکستان چلا جاؤں گا۔ تمہارے پاس یہ ہی تین دن ہے۔ اپنا ٹھکانا کرو اور بوریا بستر سمیٹ کر رکھو۔" اس کے لہجے میں حد درجے بے مروتی اور لاتعلقی بھر گئی۔

"ہاں۔۔۔ ہاں میں چلی جاؤں گی ' میرا وعدہ ہے۔"

"ہونہہ۔۔۔ وعدہ۔ ایک وعدہ پہلے بھی کیا تھا تم نے کسی کے حوالے سے ' یاد ہے تمہیں۔" اس کے رونے میں یکدم بریک آیا۔ اس نے ناسمجھی کے سے انداز میں حسیب کو دیکھا۔ پھر بے حد چونک اٹھی۔

✡ ✡ ✡
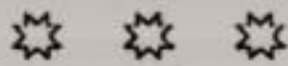
وہ فون پر اسے بے قراری سے خود کو پکارتا اور سسکتا ہوا سن رہا تھا۔ شاید اتنے دنوں کی دوری نے سوہا کے دل پر چھائی تمام بدگمانی کی کثافت کو دھو کر اس کی پوتر محبت کو پھر سے اجاگر کر دیا تھا۔ وہ محبت جو ان دونوں کے درمیان موجود ہوتے ہوئے بھی کہیں گم ہو گئی تھی۔

"تم۔۔۔ رو مت میں آجاؤں گا تمہیں لینے۔"

"کب... کب آئیں گے' جلدی آجائیں' میرا دل گھبرا رہا ہے۔ بہت۔"

"کیوں... کیا تم اکیلی ہو... ماما اور آنٹی کہاں ہیں۔"

"وہ ہیں یہیں گھر میں... مگر مجھے چین نہیں مل رہا' پتا نہیں کیا بات ہے۔" وہ بے قراری سے بول رہی تھی اور انس کا قرار لوٹ رہی تھی۔

"اچھا ابھی تو میں آفس میں ہوں۔ تم امی کے پاس چلی جاؤ۔ میں آج ہی آؤں گا... او کے..."

"آپ ابھی تک کیا کر رہے ہیں آفس میں... اب تو آٹھ بجنے والے ہیں' ابھی تک..." اس کی تشفی ہی نہیں ہو پا رہی تھی۔

"ارے بھئی کام کا لوڈ ہے۔ میں نے کہا نا میں آجاؤں گا' اب فون بند کر کے نماز پڑھو تم۔ سکون ملے گا دل کو اور گھبراہٹ بھی کم ہوگی' جاؤ شاباش..."

اس کی گھبراہٹ کم نہیں ہوئی تھی۔ مگر وہ آفس میں بیٹھ کر زیادہ دیر تک بات بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجبوراً" اسے لائن ڈس کنکٹ کرنی پڑی۔ فون بند کر کے اس نے چہرے پر پھیل جانے والی نمی سمیٹی تو امی کو دروازے میں کھڑا ہوا پایا۔

"کیا ہوا سوہا' کیا ڈر گئی تھیں میری بچی!"

وہ آگے بڑھیں' سوہا ایک دم ان سے لپٹ کر رونے لگی۔ وہ ماں تھیں۔ سمجھ سکتی تھیں' سمجھ سکتی تھیں کہ اب بیٹی کو اپنے ہم سفر کی یاد بے چین کر رہی ہے۔ وہ دھیرے دھیرے اسے پچکارتے ہوئے اس کا سر تھپکنے لگیں۔

"اسی لیے میں نے کہا تھا کہ فون کر کے اسے بلاؤ اور اس کے ساتھ گھر چلی جاؤ۔ اتنے دن کی دوری یوں ہی وسوسے ڈال دیتی ہے دل میں اور اتنے محبت کرنے والے شوہر سے زیادہ کون خیال رکھ سکتا ہے۔ انس اور حدید ماشاء اللہ دونوں ہی بہت نیک' شریف النفس اور محبت کرنے والے بچے ہیں۔"

امی دھیمی آواز میں اسے تسلی دے رہی تھیں۔ جب انس اور حدید کا نام سن کر اندر آتی ہوئی عفت دہلیز پر ہی رک گئی۔

انس اور حدید... محبت کرنے والے بچے... حسیب... جان چھڑکنے والا شوہر... اس کے دل میں جانے کیوں بوندا باندی سی ہونے لگی۔ وہ بنا کچھ کہے وہیں سے واپس پلٹ گئی۔ چپ چاپ' خاموش اور بے نام سی اداسی کے ہمراہ۔

☆ ☆ ☆

"تم... ابھی چلے جاؤ خدا کے لیے میرا شوہر گھر پر ہے۔"

"کیوں شہزادی۔ اب ہم سے بھی آنے بہانے کرو گی تم۔ ہم کوئی غیر ہیں۔"

"اُفوہ خدا کے لیے کیوں ایک بار کی بات نہیں سنتے تم۔"

نائلہ کھڑے کھڑے پگھلتی جا رہی تھی۔ بس نہیں چلتا تھا کہ جادو کے زور سے اس خبیث شیطان کو وہاں سے غائب کر دے۔

"اے لو۔ ابھی کل ہی تو سن کر گیا تھا کہ کل دوپہر میں آنا۔ اور اب آج پھر وہی بات۔"

اس پر نائلہ کی حالت اور اس کی منت سماجت کا خاک اثر نہیں ہوا۔ وہ مصنوعی خفگی سے یوں ٹھنکا جیسے وہ دونوں آپس میں بچپن کی گہری سہیلیاں ہوں۔

"ہاں ہاں کہا تھا میں نے... مگر ابھی وہ آگیا ہے بنا بتائے۔ اب اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ تم بس ابھی چلے

جاؤ۔" نائلہ نے بات کے درمیان میں خوف سے مڑ کر دیکھا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ حدید ابھی نہا کر نہیں نکلا تھا لیکن یقیناً" نکلنے ہی والا تھا۔ اس نے گردن واپس موڑی تو شبیر حسین ہتھیلی پر کوئی بدرنگی چیز رکھے انگوٹھے سے مسل رہا تھا۔

"سنا نہیں تم نے میں نے کیا کہا ہے۔" اس کا اطمینان اور بے نیازی دیکھ کر وہ دبی آواز میں چیخ اٹھی۔

"اوئے۔" شبیر حسین کے تاثرات میں یک لخت سرد مہری در آئی اور آنکھوں سے شرارے نکلنے لگے۔ "چلا کس پر رہی ہے۔"

لمحہ بھی نہیں لگا تھا کہ وہ ایک بے فکرے ریشہ خطمی عاشق سے بدل کر غنڈا موالی لگنے لگا۔ اس کا انداز اس قدر دھمکی آمیز تھا کہ نائلہ کی خوف کے مارے آنکھیں ابل آئیں۔

"تو تم میری بات کیوں نہیں سن رہے۔ آج نہیں کل آجانا مگر خدا کے لیے ابھی جاؤ۔ اگر محلے میں سے بھی کسی نے دیکھ لیا۔"

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر تسلی دی۔

"اوئے بس بس۔ آج تو جا رہا ہوں۔ پر اب کی بار آیا تو...." بات چھوڑ کر اس نے ایک لوفرانہ مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر بائیں آنکھ دبائی۔

"تو اندر آکر بات کروں گا' چائے پانی کے بغیر ٹلوں گا نہیں۔"

وہ پھر کوئی پرانا رازدار لگنے لگا۔ نائلہ کے سینے پر سے کسی نے بھاری سل اٹھائی۔ بائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی کان میں ڈال کر زور زور سے ہلاتے ہوئے وہ مڑ گیا۔ اور اس کے مڑتے ہی دروازہ بند کرتی نائلہ کا لمحے بھر کو جی چاہا اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دے۔

عرق عرق پیشانی' ٹرین کی رفتار سے بھاگتا دل اور گھٹی گھٹی سانسیں لیتے وہ سیدھی کچن میں آکر چولہا جلا کر اس پر توا رکھنے لگی۔ ابھی تو وہ کسی بھی صورت میں حدید کا سامنا نہیں کر سکتی تھی۔ اور اپنے بارے میں اسے صد فیصد یقین تھا کہ اس کے چہرے پر ضرور کوئی نہ کوئی گڑبڑ کی تفصیل دیتا تاثر ہوگا۔ جسے فی الوقت وہ حدید سے چھپانا اور اپنے تاثرات کو نارمل کرنا چاہتی تھی۔ اسے کسی بھی قسم کے شبہے سے دور رکھنے کے لیے یہ احتیاطی تدبیر بہت ضروری تھی۔

روٹیاں جھٹ پٹ پک گئیں مگر آج ان میں وہ گولائی نہیں تھی۔ جو اس کے ہاتھ کی روٹی کا خاصہ تھی۔ کھانا تیار تھا۔ اس نے گرم کرنے کو رکھا۔ اور سینے پر ہاتھ رکھ کر خود کو بالکل پر سکون کر لیا۔ پھر ذرا کی ذرا باہر جھانکا تو حدید نہایا دھویا کمرے سے نکل کر اسی طرف آرہا تھا۔ اس نے تیزی سے رخ پھیر لیا۔ چند ہی پل گزرے اور وہ اس کے پشت پر کچن میں داخل ہوا۔ اس نے ہانڈی میں چلانے کے لیے چمچہ اٹھایا ہی تھا کہ وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر واپس ہنڈیا میں جا گرا۔

حدید نے اس کی پشت پر سے اپنے دونوں بازو ڈال کر اسے اپنے قریب کر لیا۔

"کیوں اتنی ہلکان ہو رہی ہو۔"

نائلہ سن اور ساکت سی اپنی جگہ کھڑی رہ گئی۔ اس سے جنبش کرنا تو دور سانس لینا بھی محال ہو گیا۔ ذرا دیر پہلے ایک نامحرم نے اس کا دم نکالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اور اب یہ محرم مرد اس کی سانسیں روکے کھڑا تھا۔

"کتنی گرمی ہو رہی ہے۔ ہے نا۔"

اس نے ہاف آستین کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کا تر و تازہ اور ٹھنڈا وجود' اگر نائلہ اس کی وفادار بیوی

ہوتی۔ اور یہ ایک دوسرے کے من چاہے ہوتے تو اس کے ٹھنڈے وجود کی ساری ٹھنڈک اور تازگی نائلہ خود میں اتار لیتی۔ لیکن۔ لیکن اس وقت تو اس کے گیلے بازوؤں کی ٹھنڈی نرم ملائم گرفت نے کسی دہکتے لوہے کی طرح اسے جکڑ لیا تھا۔ اس کے جسم میں تپش بھرنے لگی۔ وجود سلگنے لگا۔

"کچھ بولو بھی۔ یا ایسے ہی کھڑی رہو گی۔ اچھا چلو چھوڑو کھانے کو آؤ۔" اس نے خود ہی ہاتھ بڑھا کر چولہا بند کیا۔ اور پھر اس کا رخ اپنی طرف پھیر کر وہ جانے اپنا کونسا حق استعمال کرنا چاہتا تھا۔ جب نائلہ ایک دم تڑپ کر اس کی گرفت سے نکل گئی۔ حدید جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔

"میں کھانا لگا رہی ہوں آپ ہاتھ دھو کر آجائیں۔"

احساس توہین سے اس کے جبڑے بھینچ گئے۔ چہرہ سرخ پڑ گیا۔

کیا نائلہ جانتی نہیں تھی۔ کہ وہ ابھی نہا دھو کر ہی نکلا ہے اسے ہاتھ دھونے کی ضرورت نہیں۔ اور کھانا کھانے سے اس نے خود ہی انکار کر دیا تھا۔ وہ کچھ اور کہہ رہا تھا۔ اسے کھانا نہیں چاہیے تھا۔ اس کی خواہش کچھ اور تھی۔ وہ کیا مانگ رہا تھا۔ نائلہ اچھی طرح جانتی تھی۔ اور وہ اس طرح دور کیوں چلی گئی تھی۔ یہ حدید بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ لیکن کیوں؟

وہ ایسا کیوں کرتی تھی۔ وہ حدید کے نزدیک نہیں آتی تھی۔ نہ اسے قریب آنے دیتی تھی۔ آخر کیوں۔ کیا چل رہا تھا اس کے دماغ میں۔ کیا وجہ تھی اس گریز کی۔ وہ کیوں اپنے اور اس کے بیچ یہ اجنبیت اور بیگانگی قائم رکھنا چاہتی تھی۔ وہ اس سے وہ تعلق کیوں نہیں جوڑنا چاہتی تھی جو ایک مرد اور عورت اپنے محرم سے ہی جوڑتے ہیں کہ اسی میں ان کی بہتری اور بھلائی ہے۔

ہمیشہ کی طرح نائلہ اس سے دور ہٹ گئی تھی۔ اس کے لیے ایک سوالیہ نشان چھوڑ کر۔

اس نے چاہا کہ وہ ابھی فوراً" پلٹ کر جائے اور اپنا حق وصول لے۔ یا کم سے کم اسے جھنجوڑ ہی ڈالے۔ اس احتیاط کی اس دوری اور گریز کی وجہ ہی پوچھ لے۔ چاہے جبراً" زور زبردستی سے ہی سہی۔ لیکن اس پر اچھی طرح ثابت کر دے کہ وہ کیا ہے اور کیا کر سکتا ہے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکا۔ کیونکہ اسے یاد آگیا تھا کہ اس حوالے سے ایک بار پہلے بھی ان کے درمیان تناؤ آچکا تھا۔ جھڑپ نہیں، لیکن بحث تو ہو ہی چکی تھی۔

نائلہ جا چکی تھی۔ اور وہ جانتا تھا کہ بے شک نائلہ کو کھانا نکالنے کے لیے کچن میں آنا ہو گا مگر وہ اس وقت تک نہیں آئے گی۔ جب تک وہ خود وہاں سے باہر نہ چلا جائے۔ اس کی کنپٹی کی رگیں پھڑپھڑانے لگیں۔

نائلہ نے اسے تیزی سے کچن سے نکل کر باہر جاتے دیکھا۔ دوبارہ آفس جانے کے خیال سے اس نے اپنی بائیک اب تک باہر ہی کھڑی کر رکھی تھی۔ نائلہ اس کا ارادہ بھانپ گئی۔

"حدید! میری بات سنیں۔ پلیز رک جائیں۔ دیکھیں۔"

جانے کس خوف کے زیر اثر اس نے غصے میں اندھا دھند باہر نکلتے حدید کو دیکھ کر اسے روکنا چاہا۔ مگر وہ شدید غصے کے عالم میں بائیک اسٹارٹ کر کے یہ جا وہ جا۔

☆ ☆ ☆
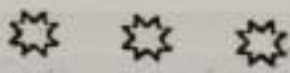
کراچی کا موسم ابر آلود تھا۔ ایئرپورٹ پر چلتی ٹھنڈی ہواؤں نے اس کا استقبال کیا۔ ماہا سے ملنے کی خوشی کے باعث دل ویسے ہی مطمئن اور شاد تھا۔ موسم نے دل کے موسم کو کچھ اور نکھار اور سنوار دیا۔ اس کے باوجود وہ سیدھا ماہا سے ملنے کے بجائے اپنی بہن سے ملنے چلا آیا۔ ماہا کے علاوہ دنیا میں ایک یہی اس کا سگا اور واحد رشتہ بچا تھا۔

"ارے تم حسیب اس قدر اچانک۔" ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔

"بس اپنوں سے ملنے کا دل تو ہر وقت ہی کرتا ہے۔ سوچا مل ہی آؤں جا کے۔" اس کی مسکراہٹ میں، باتوں میں، لہجے میں ایک عجیب سی اداسی تھی۔ اور میٹھی سی خلوص کی چاشنی تھی وہ پورا دن اس نے وہیں گزارا۔ اپنی بہن کے ہاتھ کا بنا کھانا کھایا۔ عرصے بعد گھر کا کھانا ملا جو محبت بھرے ذائقے سے لاجواب ہو گیا تھا۔ فرمائش کر کے بیف بریانی اور شاہی ٹکڑے بنوا کر کھائے۔ پھر بھی ایک بے نام سی الجھن نے اس کا احاطہ کیے رکھا۔

شام تک وہ اسی ادھیڑ بن میں لگا رہا کہ آپی سے ڈسکس کرے یا نہ کرے۔ پھر اس نے ان کو کچھ بھی نہ بتانے کا فیصلہ کیا۔ یوں بھی ان کے انداز سے کچھ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اگر انہیں ماہا اور حسیب کے درمیان کسی تنازعے کا علم تھا بھی۔ تب بھی انہوں نے ظاہر نہیں کیا۔ یا شاید وہ اس کی گہرائی سے واقف نہیں تھیں۔

شام کو اس کے بہنوئی کے آنے کا وقت ہوا تو اس نے واپسی کے لیے پر تولے۔

"اتنے دن بعد آئے ہو۔ تو ایک رات رک ہی جاؤ۔ ماہا کے پاس کل چلے جانا۔"

بہن کے مان بھرے اصرار کے آگے اس سے پس و پیش نہیں کی گئی۔ اور وہ اس رات وہیں رک گیا۔ اسے احساس تو تھا کہ ماہا منتظر ہو گی۔ لیکن پھر اس نے سوچا کہ فون کر کے اسے بتا دے گا۔ ماہا واقعی منتظر تھی حسیب کی۔ لیکن کوئی اور بھی تھا۔ جس کی بے چینی اور بے تابی عروج پر تھی۔ اور وہ ماہا نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼
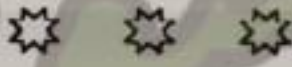
کمرے کے پیچھے کی طرف بنی بالکونی جو باہر گلی میں کھلتی تھی۔ اس وقت اس کے اداس وجود سے آباد تھی۔ مغرب کے بعد اب عشاء ہونے کو آئی۔ لیکن گلی ہنوز سنسان پڑی تھی۔ وہ جانتی تھی۔ انس جتنی بھی جلدی کر لے، مگر محض ایک گھنٹے میں گھر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ پھر بھی اپنے دل کو طفل تسلیوں سے بہلاتی مستقل ہی بالکونی میں کھڑی باہر جھانک رہی تھی۔

تب ہی گلی کے نکڑ سے ایک بائیک نمودار ہوئی اور اس کی رفتار کم ہوتے ہوئے دروازے پر ختم ہو گئی۔ سوہا نے یوں ہی باہر جھانکا اور جیسے زمان و مکان کی گردشیں تھم گئیں۔ وہی تو تھا۔ جس کا اسے اس قدر بے چینی سے انتظار تھا۔

بائیک رکی وہ اترا اور دروازے پر بیل دی۔ سوہا بجائے واپس مڑ کر نیچے جانے کے وہیں کھڑی دروازہ کھلنے کا انتظار کرتی رہی۔ وہ اب دروازے کے اور نزدیک ہو کر بالکونی والے چھجے کے نیچے چلا گیا تھا۔ اس لیے پورا جھک جانے پر بھی سوہا کو نظر نہیں آ رہا تھا۔

پھر آواز آئی۔۔۔ دروازہ کھل چکا تھا۔ عفت نے ہی کھولا تھا۔ پھر اس نے عفت کی آواز سنی۔ وہ سلام کر کے اسے اندر بلا رہی تھی اور بس۔۔۔ سوہا کے ضبط کی حدیں یہیں تک تھیں۔ وہ مڑ کر تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی۔ پھر صحن میں کھلنے والے دروازے سے تیز تیز قدم اٹھاتی۔ سیڑھیوں سے اترتی چلی گئی۔

کمرے میں بیٹھی موبائل میں مصروف ماہا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ پھر خود ہی انس کے آنے کا قیافہ لگا کر مصروف ہو گئی۔ امی نے بھی اسے دیکھا ضرور، لیکن وہ عشاء کے لیے نیت باندھ رہی تھیں۔ سوہا نے دو، دو سیڑھیاں ایک ساتھ پھلانگیں۔ آخری سیڑھی کے اختتام پر عفت کھڑی کسی سے باتیں کر رہی تھی اور۔۔۔ اور کون ہو سکتا تھا۔۔۔ انس کے علاوہ۔۔۔ عفت نے مڑ کر اسے نیچے اترتے دیکھا اور مسکرائی۔

"آؤ۔۔۔ سوہا۔۔۔ حدید بھائی آئے ہیں تم بھی ملو۔"

اس کی آواز تھی یا سم کا جادو۔ سوہا وہیں تھم گئی۔ اس کی ساری بے قراری ابلتے دودھ کی طرح دیگچی سے

باہر آگری۔ سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا' اچھان بیٹھ گیا۔ وہ ساکت ہوئی۔ پھر وہیں سے حدید کو دیکھا۔ جو ذرا آگے ہو کر اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کیا حال ہیں سوہا!"

"نہیں... میں سمجھی کہ شاید... انس آگئے۔"

اس کے لہجے میں ہزار نوری سالوں جیسی تھکن سمٹ آئی۔ متاع سفر لٹا کر بیٹھے مسافر کی جیسی تھکن' مایوسی اور اداسی...

"اچھا انس کو بھی آنا تھا کیا۔" وہ ابھی بھی وہیں کھڑا سوال کر رہا تھا۔ سوہا بددلی سے جواب دیے بغیر پلٹ گئی۔ عفت اور حدید نے اس کی خاموشی بہت محسوس کی۔

"آپ کو اوپر جانا ہے تو چلے جائیں۔" سوہا کے جاتے ہی عفت جیسے اپنے آپ میں پلٹی۔

حدید کی اس قدر اچانک اور اتنی رات میں آمدیوں ہی تو نہیں ہو سکتی تھی' ہر چند کہ وہ کہہ رہا تھا کہ وہ خالہ جان اور خالو کی طبیعت پوچھنے آیا ہے۔ لیکن وہ کیوں آیا تھا یہ اس کی بے تاب نگاہوں سے جھلکتا اضطراب بول رہا تھا۔ اس کے انداز بول رہے تھے اور عفت سن رہی تھی۔

"ابا جلدی سو جاتے ہیں۔ اماں ان کے پیر دباتی ہیں۔ کبھی سر وغیرہ تو اس لیے وہ بھی آج کل..." اس نے بات ادھوری چھوڑ دی' اور ناخن کھرچنے لگی۔

حدید بغور اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا' بنا کچھ کہے' بس خاموشی سے اور پھر... خاموشی بولنے لگی۔ معنی خیز اشارے' رمز و کنائے... ان دونوں کے مابین ایک نئی گفتگو کے سر جڑنے لگے۔ لفظ بننے لگے' جذبے چھلکنے لگے' وقت سرکنے لگا کچھوے کی چال کی مانند' گھسٹ گھسٹ... لمحہ لمحہ... پل پل... گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ۔

دونوں اپنی اپنی سوچ کے دائروں میں مقید ہو کر ایک دوسرے کو پڑھ رہے تھے۔ ایک دوجے کے سامنے پھر مہر بہ لب بول رہے تھے۔ ایک دوجے کو سن رہے تھے۔ وقت کبھی تھمتا نہیں ہے' لیکن تھم گیا تھا۔ سمے کا پہیہ رکتا نہیں ہے۔ لیکن رک گیا ہے اور خاموشی کی زبان نہیں ہوتی' لیکن وہ بولنے لگی تھی۔

"کیوں آئے ہو اب یہاں۔"

"یہاں نہ آؤں تو کہاں جاؤں۔"

"کہیں بھی۔"

"کہیں بھی... کہیں بھی کہاں... کہیں دل بھی تو لگے۔"

"دل لگانے کا کیا فائدہ۔ نرا وقت کا زیاں' زندگی کی بربادی۔"

"اسی بربادی میں تو زندگی کا مزا ہے اور اگر... اگر میں کہوں کہ میری زندگی... تم ہو تو..." شررر... رر... اچانک ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ گھر کی پچھلی طرف لگے نیم کی شاخیں جھوم کر آپس میں ٹکرائیں۔ خوشبو بھری ہوا نے ان کے چہرے چھوئے اور خوابیدہ لمحے بے دار ہو گئے۔

"آ... آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں۔ میں اماں کو جگاتی ہوں' آپ وہیں..." عفت بوکھلا کر بولی۔ لیکن پلٹ نہیں سکی۔ اس کا ہاتھ حدید کے ہاتھ کی گرفت میں تھا۔ وہ رک گئی۔ وہ ٹھہر گئی۔ اس کے سرسراتے لبوں سے ایک بے یقینی سرگوشی نے سر نکالا۔

"حدید..."

"مت بلاؤ کسی کو بھی... میں جا رہا ہوں واپس... شاید میں نے غلطی کی یہاں آکر۔" اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔ سرگوشی سے ذرا بلند۔

"تو غلطی کا مداوا کر لیجیے۔" اس کے منہ سے بدقت تمام نکلا۔

"مداوا تو اس غلطی کا کیا جاتا ہے، جسے کرنے پر کوئی پچھتاوا ہو۔" اس نے نگاہوں میں حد درجہ حیرت سمو کر اسے دیکھا اور اس کی کلائی ایک مضبوط گرفت سے آزاد ہوئی۔

"اور میں... میں یہ غلطی بار بار کرنا چاہتا ہوں۔" انگاروں جیسے سلگتے الفاظ نے عفت کی سماعتیں راکھ کر ڈالیں۔ وہ سر جھکائے پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا۔ یوں جیسے، بہت نادم اور شرمسار ہو۔ لیکن قائل نہ ہو، رام نہ ہو۔

"غلطی کو بار بار دہرانا اور وہ بھی جان بوجھ کے پاگل پن ہوتا ہے۔" اس نے نیم اندھیرے میں اپنی کلائی پر ابھر آنے والی اس کی انگلیوں کے نشان دیکھے۔

"اور محبت... محبت... بھی ایک پاگل پن ہی ہے عفت۔"

سرسراتے لبوں سے ایک اعتراف نکلا اور ہوا کے تیز جھونکے کے ساتھ فضا میں کہیں گم ہو گیا۔ کوئی نام و نشان چھوڑے بغیر... اس کی اپنی محبت کی طرح بے نام و نشان، بنا ثبوت و گواہ... نہ وعدہ، نہ کوئی ارادہ، نہ کوئی پیماں، نہ ہجر، نہ فراق، نہ دوری، نہ کوئی قربت، نہ کوئی قرب کی آرزو... فقط ایک اعتراف اور بس...

وہ پلٹ چکا تھا۔ عفت اسے قدم قدم دور جاتا دیکھتی رہی۔

صحن میں اب سناٹا ناچ رہا تھا اور اس کی ہنسی اڑا رہا تھا۔

یہ دیکھو... اس سودائن کو دیکھو۔ چار لفظوں کی اسیرن کو دیکھو۔ ارے اس کے چہرے کی زردی، اس کی کلائی کی سرخی تو دیکھو کیا تماشا ہے، واہ واہ... کیا تماشا ہے۔ ارے اس کے قدموں میں رلتی خاک کو دیکھو۔ اس کی آنکھوں میں اڑتی دھول کو دیکھو۔ لو دیکھو اس سے پہلے ایسا تماشا نہ دیکھا ہو گا۔ ہاہا... واہ... واہ...

آج کی رات بھی عجیب رات تھی۔

دور اج ہنس تنہا اپنے جوڑی دار کے انتظار میں مایوس ہو بیٹھیں اور ایک سودائن سے ملنے اس کا سودائی آن پہنچا۔ دور افق کی سیاہی پر لٹکا زرد چاند سر نیہوڑائے کسی کو آخری سیڑھی پر بیٹھ کر سسکتے دیکھ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

پوری رات آنکھوں میں انتظار لیے کٹ گئی۔ انس وعدہ کر کے بھی نہیں آیا اور اس کا تکیہ بھیگتا رہا۔

"وہ بھول گئے ہوں گے۔ یقیناً" گھر چلے گئے ہوں گے اور گھر جانے کے بعد نائلہ نے... ہاں حدید بھائی تو یہاں آ گئے تھے۔ نائلہ گھر پر اکیلی ہو گی۔ اسی نے روک لیا ہو گا۔"

وسوسے، خدشے ناگ بن کر اسے ڈستے رہے اور وہ اپنی تنہائی سے لڑتی دل ہی دل میں شکوہ کناں رہی۔ جانے کب اور کتنی دیر بعد کہیں جا کے اس کی آنکھ لگی اور اس وقت کھلی جب کمرے کے دروازے پر کسی نے دھیرے سے دستک دی۔

اس نے مندی مندی آنکھوں سے موبائل ٹٹول کر ٹائم دیکھا۔ صبح کے سات بجے تھے۔ سر بھاری ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا ابھی آنکھیں بند کی تھیں اور ابھی کسی نے جگا دیا۔

دروازے پر پھر دستک ہوئی، بہت دھیمی دستک۔ اس نے چونک کر ماہا کے خالی بستر کو دیکھا۔ پھر ایک خیال کوندے کی طرح ذہن میں لپکا۔

یہ اتنی صبح صبح کون دستک دے رہا ہے، کوئی گھر کا فرد تو نہیں ہو سکتا۔ کہیں حسیب بھائی آ تو نہیں گئے۔ اس نے جلدی سے بال سمیٹ کر کیچر لگایا۔ دوپٹا لپیٹا۔ اتنی دیر میں پھر دروازہ کھٹکھٹایا جا چکا تھا۔ لحہ بھر کو تذبذب سے ماہا

کی غیر موجودگی کے متعلق سوچ کر اس نے دروازہ ذرا سا وا کیا۔

اس کا اندازہ غلط تھا۔

وہاں حسیب نہیں۔ انس کھڑا تھا۔ نکھرا' فریش' تروتازہ۔۔۔

چند لمحے تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ جبکہ وہ نرمی سے مسکراتا ہوا دروازہ پورا کھول کر اندر قدم رکھ چکا تھا۔ سوہا ابھی تک ایک بے حد دھیمی حیرت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ تھوڑا سا منہ کھولے اسے دیکھ رہی تھی۔

اس نے کب سوچا تھا کہ رات گئے تک اسے انتظار کروا کے مایوس کر دینے والا اتنی صبح صبح اس کے انتظار کو خوشی میں بدل دے گا۔

"کیا ہوا۔۔۔ کیا دیکھ رہی ہو۔" انس نے دھیرے سے اس کا گال سہلایا۔

سوہا نے دھیرے سے اس کا ہاتھ تھاما اور اگلے ہی پل وہ بے ساختہ و بے تابانہ اس سے لپٹ گئی۔

"ارے ارے۔۔۔ کیا ہو گیا بھئی۔" وہ اب بری طرح سے رونے لگی تھی۔ کوئی جواب دیے بغیر۔ انس بھی ایک جذباتی لمحے کی گرفت میں آکر اس کے گرد بازو لپیٹ کر اس کا سر سہلانے لگا۔ سوہا کی آواز دھیمی ہو کر سسکیوں میں ڈھلی تو اس نے دھیرے سے اس کا سر سہلایا۔

"بس کرو' کتنا روؤ گی اور کیوں رو رہی ہو' پاگل ہو گیا۔" اس نے دونوں ہتھیلیوں میں بھر کے اس کا رویا رویا چہرہ اوپر کیا' آنسو صاف کیے۔ سوہا کے جلتے سلگتے دل پر ٹھنڈے یخ چھینٹے پڑنے لگے۔ اس کی بے قراری کو قرار آنے لگا۔

"یہاں بیٹھو' ابھی کوئی آگیا نا' تو نری شرمندگی ہو گی۔ ایسے مجھ سے چپک کر کھڑی ہو۔ میری بھی پوزیشن خراب کرواؤ گی۔" انس کے جتانے پر وہ بے انتہا جھینپ کر مسہری پر بیٹھ گئی۔

"اب بتاؤ۔۔۔ رو کیوں رہی تھیں۔"

"آپ آئے کیوں نہیں رات میں۔ میں نے اتنا انتظار کیا کہ بس۔۔۔"

"تو اس میں رونے کی کیا بات تھی۔"

"بس آگیا رونا۔ کتنے دن گزر گئے آپ نے پلٹ کر میری خبر تک نہیں لی۔"

اس کی آواز پھر رندھ گئی۔ انس نے جواب دینے کے بجائے سر جھکا لیا۔ سوہا منتظر رہی کہ وہ کچھ بولے گا۔ مگر پھر۔ اس کی خاموشی دل میں چبھ سی گئی۔

"ناشتا ملے گا یا آج بغیر ناشتے کے ہی گزارا کرنا ہو گا۔"

چند لمحوں بعد وہ لہجے کو ہشاش بشاش بناتا ہوا اٹھ گیا۔ سوہا نے محسوس کیا کہ اس نے جان بوجھ کر اس کی بات کو ٹال کر موضوع پلٹ دیا۔

امی اور ماہا خوشی خوشی ناشتا لگا رہی تھیں۔ بہت صبح کا وقت تھا۔ پھر بھی سورج پوری آب و تاب سے چمکنے لگا تھا۔ موسم میں البتہ ابھی تپش نہیں اتری تھی۔

گرم گرم چائے' خستہ پراٹھوں اور آملیٹ کا ناشتا آج سے پہلے کبھی اتنا مزے دار نہیں لگا تھا۔ سوہا عرصے بعد انس کے ساتھ ناشتا کرنے بیٹھی تھی۔ وہ بھی اتنے اچھے ماحول میں' ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ میں اس نے پوری رغبت سے دل لگا کر ناشتا کیا۔ امی بھی خوش اور مطمئن سی لگ رہی تھیں۔ ورنہ دونوں بیٹیوں کو دہلیز پر واپس آتے دیکھ کر ان کی راتوں کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں۔ سجدے طویل اور وظائف طویل تر ہو گئے تھے۔ ہر وقت ان کے لبوں پر خدا سے التجا جاری رہتی کہ ان کی بیٹیاں ہنسی خوشی اپنے گھروں میں آباد ہو جائیں۔

کتنی منتیں اور کتنے نفل انہوں نے مان رکھے تھے اور کتنے نوافل اور حاجات کی نمازیں وہ ادا کر چکی تھیں۔ آج سوہا اور انس کو یوں ساتھ ساتھ دیکھ کر بے ساختہ ان کی نظر اتارنے لگیں۔ ناشتے کے بعد بھی انس کو آرام سے بیٹھا دیکھ کر سوہا تعجب میں گھر گئی۔

"آفس نہیں جانا کیا۔ اللہ خیر کرے میری وجہ سے کہیں آف تو نہیں کرلیا آج۔" اس کے لہجے میں طنز نہیں شگفتگی تھی۔

"ہمم۔۔۔ م۔۔۔ م۔۔۔ بس یوں ہی سمجھ لوں، جاؤں گا، مگر ذرا دیر سے۔" وہ پوری توجہ سے سوہا کے موبائل میں گھسا ہوا تھا۔

"اب دیر سے کیا جانا۔ آج چھٹی کرلو اور شام تک رکو، پھر سوہا کو لے کر گھر چلے جانا۔"

کمرے میں داخل ہوتی امی نے انس کی بات سن کر رسان سے اپنی دل کی خواہش بیان کی۔

انس انہیں دیکھ کر مسکرایا، پھر سوہا سے بولا۔ "ایک گلاس پانی ملے گا۔" وہ پانی لینے چلی گئی تو انس امی کو دیکھ کر سنجیدہ ہو گیا۔

"میں فی الحال سوہا کو گھر نہیں لے جا رہا آنٹی۔" امی کے مسکراتے لب ایک دم سکڑ گئے۔

"لیکن آپ فکر نہ کریں۔ اس کی وجہ میری کوئی ناراضی نہیں، اصل میں۔۔۔ میں اپنی جاب سے ریزائن دے رہا ہوں۔ آفس میں مجھے نکالنے کی باتیں چل رہی تھیں۔ تو میں سوچا کہ اس سے پہلے کہ وہ کوئی قدم اٹھائیں میں خود ہی۔۔۔"

"تو بیٹا پھر تم کرو گے کیا اور اس سب سے سوہا کو لے جانے کا کیا تعلق۔"

ان کا بے فکری کی طرف بڑھتا دل سہم کر واپس خدشوں کے کچھار میں جا بیٹھا۔

"مجھے حیدر آباد میں کسی نے ایک این جی او کا بتایا ہے۔ فی الحال میں وہاں جا رہا ہوں۔ جاب جیسے ہی کنفرم ہو گی، میں رہائش کا انتظام کر کے سوہا کو وہاں بلا لوں گا۔"

اس نے سوہا کی وجہ سے جلدی جلدی بول کر امی کو مطمئن کرنا چاہتا تھا۔ امی کے چہرے پر تفکر تھا۔ ان کا اطمینان نہیں ہو پا رہا تھا۔

"آپ پلیز سوہا کو اس بارے میں نہ ہی بتائیں تو اچھا ہے۔ وہ پریشان ہو جائے گی۔" سوہا پانی لے آئی تھی۔ انس اس کے ہاتھ سے لے کر گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔ امی ابھی تک کشمکش کے عالم میں اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ پانی پی چکا تو سوہا خالی گلاس لے کر رکھنے چلی گئی۔

"کیا آپ کو میری بات کا یقین نہیں ہے آنٹی۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔ مگر تم سوہا کو یہاں سے لے جاؤ تو ہی بہتر ہے۔ وہ بہت انتظار کر رہی تھی تمہارا اور۔۔۔ میرا نہیں خیال کہ اب وہ کسی قیمت پر یہاں رکے گی۔" امی اس سے اپنے دل کی بات نہیں کہہ سکیں کہ میں اسے کسی قیمت پر یہاں نہیں رکھنا چاہتی۔

"وہاں گھر میں نائلہ ہے آنٹی اور نائلہ اور سوہا کی آپس میں بنتی نہیں۔ اس لیے میں چاہ رہا تھا کہ۔۔۔" اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ سوہا نے کمرے میں آتے ہوئے اس کی بات سن لی تھی۔ وہ ناسمجھی سے انس کو دیکھ رہی تھی۔ انس نے ایک لمحے کا توقف کیا۔

"میرا ٹرانسفر ہو گیا ہے سوہا حیدر آباد۔ میں چاہ رہا تھا جب تک میں رہائش کا انتظام نہ کرلوں، تم یہیں رہ جاؤ۔"

سوہا کے لیے یہ خبر بہت اچانک تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ فوری طور پر کیا جواب دے۔ کمرے میں چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر امی باہر نکل گئیں۔ ان کے چہرے پر ناگواری تھی۔ یقیناً انہیں انس کے فیصلے سے اتفاق

نہیں تھا۔ انس نے بے اختیار ایک گہری سانس لی۔

"پتا نہیں وہاں کب تک انتظام ہو۔ میرا دل اکتا گیا ہے یہاں سے۔ میں آپ کے ساتھ ہی چلوں گی گھر۔ جب اکیلے ہی رہنا ہے تو یہاں کیوں اپنے گھر کیوں نہیں۔"

تھوڑی دیر سوچنے کے بعد سوہا نے انس سے کہا اور امی کو بھی اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ان کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔ ماما البتہ کچھ خاموش سی تھیں۔ حسیب نے آنے کا کہا تو تھا۔ مگر نہ وہ اب تک خود آیا' نہ اس نے رابطہ کیا تھا۔ اب سوہا کو سامان سمیٹتے اور گھر جانے کی تیاری کرتے دیکھ کر اس کا دل ایک بے نام سی اداسی کی لپیٹ میں آتا جا رہا تھا۔ سوہا کے لیے انس کے ساتھ گھر واپسی کا خیال اتنا خوش کن تھا کہ اس نے ماما کی خاموشی کو محسوس ہی نہیں کیا۔

☆ ☆ ☆
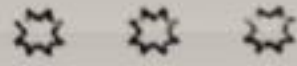
پوری رات دونوں نے ایک بے چینی کے زیر اثر گزاری تھی۔ سو جانے کے باوجود بھی بے داری جیسا احساس رہا اور صبح جب وہ جاگی تو حدید بستر تو کیا پورے گھر میں ہی کہیں نہیں تھا۔ رات کو بھی بہت دیر سے لوٹا تھا اور خالی گھر میں نائلہ کو زندگی میں پہلی بار اک خوف سا محسوس ہوا تھا۔ کل رات انس بھی بہت دیر سے آیا اور وہ خود ایک انجانی الجھی ذہنی کیفیت میں تھی کہ انس سے بلاوجہ الجھنے لگی تھی۔

"تم سوہا کو گھر کیوں نہیں لا رہے انس۔ وہ کب تک اپنی امی کے یہاں رہے گی۔"

اس نے کھانے کی ٹرے پٹخنے کے سے انداز میں انس کے سامنے رکھی تھی۔ انس کو بہت برا محسوس ہوا تھا۔

"لے آؤں گا۔" بدمزگی سے بچنے کے لیے اس نے مختصر ترین جواب دیا تھا۔

"لیکن کب۔۔۔"

"جلد ہی۔۔۔ بس ذرا اس کی طبیعت سنبھل جائے۔"

"کیوں۔۔۔ کیا ہوا اس کی طبیعت کو۔"

نائلہ کو انس کے انداز میں ناگواری کی جھلک محسوس ہو گئی تھی۔ تب ہی تھوڑا دھیمی پڑ گئی۔ انس کو اس کے

جان بوجھ کر انجان بننے پر غصہ سا آگیا۔

"کیوں تمہیں پتا نہیں مس کیرج ہوا ہے اس کا۔"

"تو اب اس میں کون سی انوکھی بات ہو گئی۔ دنیا میں ہزاروں عورتوں کا ہو جاتا ہے' میرا بھی تو..." اس نے زبان دانتوں تلے دبائی... پھر بات بنا کر بولی۔

"میرا بھی تو دل کرتا ہے' گھر میں کوئی دوسری عورت ہو' جس سے میں بات کروں' جو میرا کام ہلکا کر دے۔ سوہا ہوتی تو کم سے کم تمہاری ذمہ داری تو اٹھاتی نا۔"

انس کے چہرے پر پھیلتی ناگواری کی لکیریں گواہ تھیں کہ اسے یہ بات پسند نہیں آئی۔

"تمہیں اگر بوجھ محسوس ہوتا ہے تو مت کیا کرو۔ میں اپنے کام خود کر لوں گا۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ انس رکو تو سہی۔"

وہ بوکھلا کر رہ گئی۔ لیکن انس رکا نہیں۔ اس نے دو نوالے ہی کھائے تھے۔ باقی کھانا یوں ہی رکھا رہ گیا تھا۔ نائلہ کی باتوں نے جہاں انس کے دل میں میل ڈال دیا' وہیں وہ سوہا کی نائلہ کے بارے میں شکایتوں کو نئے سرے سے سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

دوسری طرف نائلہ بھی مطمئن نہیں رہی۔ حدید کو خفا کرنے کے بعد اس نے اپنی لن ترانی سے اب انس کو بھی ناراض کر دیا تھا اور حدید تو اس قدر سخت ناراض تھا کہ رات گئے آیا۔ بنا بات کیے' بنا کھانا کھائے سیدھا بیڈ پر... اور اب صبح اسے جگائے بغیر وہ بھی آفس جا چکا تھا اور انس بھی۔

نائلہ کو اپنا سر بے حد بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ انتہائی کوفت زدہ انداز میں اس نے اپنے لیے ایک کپ چائے بنائی اور لاؤنج میں بیٹھ کر اس صورت حال کو نئے سرے سے سوچتے ہوئے حلق سے اتارنے لگی۔ کچن بالکل صاف ستھرا تھا۔ مطلب انس اور حدید دونوں ہی بنا ناشتے کے گھر سے چلے گئے تھے۔

"حدید نے کل جو پیش رفت کی وہ دوبارہ بھی تو کر سکتا ہے۔ کل تو غصے میں گھر سے نکل گیا۔ اور اگر زبردستی پر اتر آتا تو میں کیا کر لیتی۔" اس کی سوچیں کسی ایک سمت میں ٹک نہیں رہی تھیں۔

"سوہا بھی گھر پر نہیں کہ وہ دن دہاڑے تو اپنی حد میں رہے۔"

یہ اس کی ذہنیت تھی کہ وہ اپنے شوہر کو اس کی حد و دیا دلا رہی تھی۔

"اور یہ سوہا کی بچی۔ یہ اچھی رہی۔ مس کیرج کیا ہوا۔ انس بھی اسی کا دم بھرنے لگا' کہاں تو اتنا لاپروا ہو گیا تھا کہ نہ ڈاکٹر کو پوچھتا تھا' نہ دوا یا درہتی تھی اور اب...

اور... اور یہ شبیر حسین... اف میرے اللہ میری جان کو کوئی ایک مصیبت تو نہیں... اس سے کیسے پیچھا چھڑاؤں میں... کیسے۔"

دفعتاً" ڈور بیل پوری طاقت سے چیخی۔ اپنی سوچوں میں گم نائلہ بری طرح ڈر کر اچھلی اور چائے چھلک کر اس کے کپڑوں پر آگری۔

"اب اس وقت کون آن مرا منحوس..." اس نے بڑبڑاتے ہوئے چپل اڑسی اور جا کے دروازہ بنا پوچھے کھول دیا۔ آنے والا منحوس ہی تھا اور اس نے بنا پوچھے دروازہ کھول کر زندگی کی کون سی ویں بڑی غلطی کی تھی۔ یہ یاد کرنے کے وہ قابل نہیں رہی۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ چکا تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

نظیر فاطمہ
تجدید محبت
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

"لو، میرا یار!" وہ پورے دھیان سے اپنے لیے شرٹس دیکھ رہا تھا جب کسی نے پیچھے سے آکر اسے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ وہ اس اچانک افتاد پر گھوما اور پھر اس کا حال بھی پہلے شخص جیسا ہوا۔

"لو، اے تو کدھر سے ٹپکا ہے؟" وہ بھی اونچی آواز سے جواب دیتے ہوئے اس کے گلے لگ گیا۔ ان دونوں کی آواز اور حرکتوں نے شاپ پر موجود دیگر کسٹمرز کو ان کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ لوگوں کو متوجہ دیکھ کر دونوں خجل سے ہو کر شاپ سے باہر نکل گئے۔ اب کہاں کی شاپنگ۔ دونوں اتنے عرصے بعد ایک دوسرے کے روبرو تھے۔

"یار عباس! انگلینڈ سے کب واپس آئے ہو؟"

"تقریباً دو ہفتے پہلے۔" وہ دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ان کا رخ کافی شاپ کی طرف تھا۔ یہ جدید طرز کا شاپنگ مال تھا جس کے فرسٹ فلور پر کچھ بیکرز اور کافی شاپس تھیں۔

"شاہ زیب یقین کرو تمہیں یوں اچانک سامنے دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔" عباس کی خوشی اس کے چہرے پر نظر آرہی تھی۔

"تم لاہور میں کتنے دن کے لیے ہو؟" شاہ زیب نے پوچھا۔

"ہم نے لاہور میں گھر بنالیا ہے۔ امی، ابو اور بھائی، بھابھی ادھر ہی شفٹ ہو گئے ہیں۔" وہ چلتے چلتے ایک کافی شاپ میں داخل ہو گئے۔

"اور تم سناؤ، تم یہاں کیسے؟" دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

"میری پوسٹنگ آج کل ادھر ہی ہے۔" شاہ زیب نے آرڈر دے کر جواب دیا۔

"پھر میری طرف چکر ضرور لگانا۔ یہ میرا ایڈریس پکڑو۔ بھابھی کو ضرور ساتھ لانا۔ میری ابھی تک ان سے ملاقات ہی نہیں ہو سکی۔" عباس نے رخصت ہونے سے پہلے اپنا کارڈ اسے تھمایا۔

"چل ٹھیک ہے، پھر ملتے ہیں، اللہ حافظ....."

عباس کو رخصت کر کے شاہ زیب نے اپنی شاپنگ مکمل کی اور واپسی کی راہ لی۔

✡ ✡ ✡

عباس اور شاہ زیب دونوں یونیورسٹی میں ایک دوسرے کے دوست بنے تھے۔ ان کی یہ دوستی اتنی گہری ہو گئی تھی کہ یونیورسٹی ختم ہونے کے بعد بھی ان کا ملنا جلنا قائم تھا۔ ایم بی اے کے بعد عباس انگلینڈ چلا گیا تھا اور شاہ زیب سی ایس ایس کے بعد محکمہ انکم ٹیکس میں خدمات انجام دے رہا تھا۔ پچھلے تین سالوں سے دونوں کی ملاقات کہیں ہوئی تھی، صرف فون یا فیس بک پر ہی رابطہ تھا۔ آج یوں سرراہ غیر متوقع ملاقات دونوں کو خوش کر گئی تھی۔ عباس شاہ زیب کی شادی میں بھی شریک نہیں ہو سکا تھا۔

شاہ زیب بڑے خوش گوار موڈ میں گھر واپس آیا۔

"کیا بات ہے؟ جناب بڑے خوش نظر آرہے ہیں۔" عبیرہ نے اس کا چمکتا چہرہ دیکھ کر جملہ کسا۔

"ہاں۔ آج اپنے ایک پرانے دوست سے اچانک ملاقات ہو گئی اس لیے۔" عبیرہ شاہ زیب کی تایا زاد تھی۔ دونوں کی شادی کو تین سال ہو چکے تھے۔ ان میں بہت محبت اور انڈر اسٹینڈنگ تھی اور یہ ایک خوش گوار زندگی گزار رہے تھے۔ اب ان کی ڈیڑھ سال کی بیٹی تھی۔

✡ ✡ ✡

شاہ زیب آج ذرا جلدی فارغ ہو گیا تھا، سو عباس کے بتائے ہوئے ایڈریس پر جا پہنچا۔ عباس اپنی اسٹڈی میں تھا۔ اسے بھی وہیں بلا لیا۔

"شاہ زیب! تم صرف پانچ منٹ کے لیے یہاں بیٹھو میں یہ فائل بھائی کو دے کر ابھی آیا۔ پھر چائے ساتھ پیتے ہیں۔" عباس نے اپنے سامنے کھلی ہوئی فائل بند کی اور اسے اٹھا کر باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد شاہ زیب دائیں جانب والی الماری کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا جہاں عباس کی جمع کی ہوئی بزنس سے متعلق کتابیں تھیں۔ اس نے غیر ارادی طور پر ایک کتاب اٹھا کر کھولی تو اس میں سے

ایک تصویر نکل کر اوندھے منہ اس کے قدموں میں آن گری۔ تصویر کے پیچھے کچھ لکھا ہوا تھا۔ اس نے بے دھیانی میں تصویر اٹھا کر سیدھی کی اور جیسے پتھر کا ہو گیا۔ یہ عبھو کی تصویر تھی۔

"عبھو کی تصویر یہاں؟" اس نے تصویر الٹی تو اس پر یہ شعر درج تھا۔

دوستی اپنی بھی اثر رکھتی ہے فراز
بہت یاد آئیں گے ذرا بھول کر تو دیکھو

شعر کے نیچے عبھو کے سائن تھے۔ یہ عبھو کی کافی پرانی تصویر تھی۔ فرسٹ ایر یا شاید سیکنڈ ایر کی۔ تصویر میں عبھو بوائے کٹ میں تھی اور بہت دبلی پتلی تھی۔ اب اگر کوئی عبھو کو دیکھتا تو اس تصویر والی عبھو کو پہچان بھی نہیں سکتا تھا۔ مگر شاہ زیب اس کا چچازاد تھا۔ وہ بچپن سے عبھو کو دیکھتا آرہا تھا' سو وہ پہلی نظر میں اسے پہچان گیا تھا۔ مزید تصدیق عبھو کی ہینڈ رائٹنگ اور دستخط نے کردی تھی۔ اسے لگا جیسے کسی نے اسے کھولتے ہوئے پانی میں دھکیل دیا ہو۔ اس نے کتاب کا نام ذہن نشین کیا اور اسے واپس اس کی جگہ پر رکھ کر خود کو کنٹرول کرنے لگا۔

"سوری! مجھے تھوڑی دیر ہو گئی۔" عباس اسٹڈی کا دروازہ دھکیلتے ہوئے اندر آیا۔ شاہ زیب کے لیے خود کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

"عباس! مجھے ابھی ابھی کال آئی ہے۔ ایک بہت ضروری کام ہے' آفس جانا ہے۔ میں پھر چکر لگاؤں گا۔" شاہ زیب فوراً یہاں سے نکلنا چاہ رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنا ضبط کھودے۔

"یار! چائے آرہی ہے وہ تو پیتے جاؤ۔" عباس نے اس کے اضطرابی انداز کو بغور دیکھا۔

"نہیں یار! پھر کبھی سہی۔" بات مکمل کر کے وہ وہاں سے نکلتا چلا گیا۔ عباس اس کے انداز پر نا سمجھی سے کندھے اچکا کر رہ گیا۔

☆ ☆ ☆
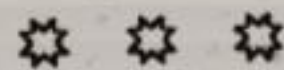
گھر آکر وہ بغیر کوئی بات کیے تن فن کرتا سیدھا کمرے میں چلا گیا۔ عبھو اس کے انداز پر پریشان ہو کر اس کے پیچھے گئی۔

"شاہ زیب! کیا ہوا؟ سب خیریت ہے؟" شاہ زیب نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا' مگر خاموش رہا۔

"پلیز بتائیے کیا بات ہے؟" وہ اس کے انداز پر ہول گئی۔

"تم تھوڑی دیر کے لیے کمرے سے باہر چلی جاؤ۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔" اس کے لہجے میں شعلوں کی لپک تھی۔ عبھو الجھتے ہوئے باہر چلی گئی۔ پھر شاہ زیب نے رات کا کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ رات کو وہ کمرے میں آئی تو اس کی طرف سے کروٹ لے کر لیٹ گیا۔ عبھو عجیب بے چینی کا شکار ہو گئی۔ اس نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر اس کا رخ زبردستی اپنی طرف کیا۔

"شاہ زیب! بتائیے آپ کو کیا پریشانی ہے۔ مجھ سے شیئر کریں پلیز۔" شاہ زیب اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کیا شیئر کروں تم سے بولو؟ یہ شیئر کروں کہ میں تمہارے پرانے یارانے کے بارے میں جان گیا ہوں یا یہ بتاؤں کہ میں تمہاری آوارہ فطرت کا ثبوت دیکھ کر آرہا ہوں۔" وہ دھاڑا۔ عبھو سہم گئی' اسے اس کی بات سمجھ نہیں آرہی تھی۔

"آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ آپ کھل کر بات کریں۔" عبھو کسی انہونی کے خدشے سے لرزنے لگی۔

"اوہ! کھل کر تو سنو عبھو مجھے بتاؤ تم عباس کو کیسے اور کتنا جانتی ہو؟"

"کون عباس؟" عبھو نے اس کی بات کاٹی۔

"وہی عباس جس کے ساتھ تمہارا افیئر رہ چکا ہے اور وہی عباس جس کے پاس تمہاری تصویریں ہیں' وہی عباس جسے تم نے چیلنج کیا تھا کہ وہ تمہیں بھول کر دکھائے۔ بس یا کچھ اور بھی بتاؤں؟" وہ پھنکارا۔

"شاہ زیب! آپ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں۔ آپ مجھے جان سے مار دیتے' مگر یوں گھٹیا الزام تو نہ لگاتے۔" وہ بے دم ہو گئی۔

"کیوں؟ یہ الزام نہیں، حقیقت ہے' اس لیے تمہیں کوڑے کی طرح لگ رہا ہے۔ گناہ کیا ہے تو اقرار کرنے کا حوصلہ بھی پیدا کرو۔" اس نے اس کے بالوں کو پیچھے سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔

"پلیز۔ ایسامت کریں۔ میرا یقین کریں میں کسی عباس کو نہیں جانتی۔" اس کی آنکھیں جل تھل ہو گئیں اور آواز گلے میں گھٹ گئی۔

"نہیں جانتی؟ میں نے خود اپنی آنکھوں سے ثبوت دیکھا ہے۔ نہ صرف تصویر تمہاری تھی' بلکہ اس پر تمہارے ہاتھ سے لکھا شعر اور تمہارے دستخط بھی تھے۔ کس کس چیز کو جھٹلاؤ گی؟ بولو؟ وہ ابھی تک تمہارے غم میں کنوارا پھر رہا ہے اور تم انکار کر رہی ہو کہ اسے نہیں جانتی۔ تم میری آنکھوں میں اس طرح دھول نہیں جھونک سکتی۔" وہ بیڈ سے اترا اور زور سے دروازہ بند کر کے چلا گیا اور وہ سسکتی رہ گئی۔

☆ ☆ ☆
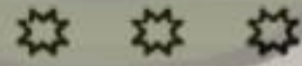
پچھلے دس روز سے وہ دونوں ہی شدید اذیت میں مبتلا تھے' مگر عبیرہ کی اذیت حد سے سوا تھی۔ اس الزام سے اس کی روح پر جو زخم لگے سو لگے' مگر اس بات کی تکلیف چین ہی نہیں لینے دیتی تھی کہ وہ اس کی بات کا یقین نہیں کر رہا۔ وہ اسے یوں اگنور کر رہا تھا جیسے وہ اس گھر میں موجود ہی نہ ہو۔ وہ خود سے اسے مخاطب کرنے کی جرات کرتی تو وہ کوئی طنز اس کی طرف اچھال کر اس کی ہمت ختم کر دیتا۔

"شاہ زیب! پلیز۔ میری بات سنیں۔ مجھے بتائیں میں ایسا کیا کروں کہ آپ کو میری بے گناہی کا یقین آ جائے۔" وہ ناشتا کیے بغیر آفس جانے کے لیے نکل رہا تھا' جب عبیرہ نے اس کا بازو پکڑ کر التجا کی۔ عبیرہ کے ہاتھ لگانے سے اسے جیسے کرنٹ لگا تھا۔ اس نے عبیرہ کے ہاتھ بے دردی سے جھٹک دیے۔

"مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ تم کس مٹی سے بنی ہوئی ہو۔ اتنا بڑا جرم کر کے بھی ڈٹی ہوئی ہو' تم مان کیوں نہیں لیتی کہ عباس کے ساتھ تمہارے تعلقات تھے؟" اس نے ایک ایک لفظ چبا کر ادا کیا۔

"کیسے مان لوں؟ جب میں نے کچھ کیا ہی نہیں تو کیسے آپ کا یہ جھوٹا الزام قبول کروں؟" وہ جیسے پھٹ پڑی۔

"تمہارے سامنے دو راستے ہیں یا تو تم مجھے اپنے اور عباس کے تعلقات کے بارے میں سچ سچ بتا کر معافی مانگ لو یا ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلی جاؤ۔ میں تم جیسی بے حیا عورت کا وجود اپنے گھر میں برداشت نہیں کر سکتا اور نہ ہی میں یہ چاہتا ہوں کہ میری بیٹی تم جیسی عورت کی گود میں پلے۔" شاہ زیب کے لہجے میں بہت نفرت تھی۔ وہ ذلت کے احساس سے زرد پڑ گئی۔ اس سے کچھ بولا ہی نہ گیا۔ وہ نفی میں سر ہلانے لگی اور پلٹ کر بیڈ روم میں بند ہو گئی۔ وہ سر جھٹک کر دفتر چلا گیا۔ دوپہر دو بجے کے قریب شاہ زیب کے موبائل پر میسج موصول ہوا۔ اس نے موبائل چیک کیا تو عبیرہ کا میسج دیکھ کر بغیر پڑھے موبائل سائیڈ پر رکھ دیا۔

☆ ☆ ☆
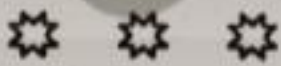
عبیرہ اپنا بیگ اور ماہ نور کو سنبھالے ڈائیوو ٹرمینل پر بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ رونے کی صاف چغلی کھا رہا تھا۔ اب بھی اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ اس نے بڑی مشکل سے خود کو رونے سے باز رکھا ہوا تھا۔ وہ ملتان جانے والی بس کے انتظار میں تھی جس کی روانگی میں آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس نے اپنا گھر چھوڑ کر اچھا کیا ہے یا نہیں۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ اپنے ماں باپ کو کیا کہہ کر مطمئن کرے گی۔ بس اس وقت اسے یہ ہی مناسب لگا کہ وہ اپنی عزت کی خاطر یہاں سے چلی جائے۔

شام کو شاہ زیب گھر آیا تو گیٹ پر تالا لگا ہوا تھا۔ ڈپلی کیٹ چابی اس کے پاس موجود تھی' مگر وہ یہ سوچ رہا تھا کہ عبیرہ اس وقت کہاں گئی ہے۔ اس کے ذہن میں شک کا ناگ پھن اٹھانے لگا۔ اچانک اسے دوپہر کو ملنے والا میسج یاد آیا۔ اس نے فوراً" موبائل نکال کر میسج کھولا۔

"شاہ زیب! آپ نے میرے سامنے دو راستے رکھے تھے تو میں نے دوسرے راستے کا انتخاب کرلیا ہے۔ دوسرا راستہ چننا میرے لیے بہت دشوار تھا' کیونکہ میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں۔ مگر میں نے یہ مشکل راستہ چنا' جانتے ہیں کیوں؟ اس لیے کہ مجھے اپنی عزت' محبت سے زیادہ عزیز ہے۔ میں اپنی ہر کوشش کے باوجود آپ کو اپنی بے گناہی کا یقین نہیں دلاسکی تو میں نے سوچا آپ کو تکلیف سے بچانے کے لیے آپ سے دور چلی جاؤں۔ میں جانتی ہوں' آپ اپنی بیٹی کو "مجھ جیسی" عورت کے سائے سے بھی بچانا چاہتے ہیں' لیکن ابھی وہ بہت چھوٹی ہے اور میں اسے فیڈ بھی کراتی ہوں' سوفی الحال اسے اپنے ساتھ لے کر جارہی ہوں۔ آپ جو فیصلہ کرنا چاہتے ہیں کرلیں' مگر میں پھر بھی یہ ہی کہوں گی کہ میں کسی عباس کو نہیں جانتی۔" شاہ زیب نے میسج پڑھ کر اپنی پیشانی کے بال دائیں ہاتھ کی مٹھی میں جکڑ لیے۔

وہ خود بھی بہت اذیت میں تھا۔ جب سے اس نے عباس کی کتاب میں عبہر کی تصویر دیکھی تھی اس کا چین سکون سب کچھ لٹ گیا تھا۔ عبہر اور عباس کو اکٹھے سوچ کر اس کا دم گھٹنے لگتا تھا۔ اس نے عبہر سے پوچھ گچھ کی تو وہ سرے سے انکاری ہوگئی۔ وہ پیار سے غصے سے ہر طرح سے پوچھ پوچھ کر تھک گیا' لیکن اس کا جواب نہیں ہی رہا۔ آج صبح وہ غصے میں نہ جانے کیا کچھ کہہ گیا کہ وہ گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ کوئی بھی عورت اتنی آسانی سے اپنا گھر نہیں چھوڑتی۔ یقیناً" کوئی ایسی بات تھی جو اس کی نظروں سے اوجھل تھی۔

"اف! میں کیا کروں؟ اس مسئلے کو کیسے سلجھاؤں؟" وہ صوفے پر گر گیا۔ عبہر اور ماہ نور کے بغیر گھر سائیں سائیں کررہا تھا۔ "کیا میں ان دونوں کے بغیر رہ سکتا ہوں؟" اس نے خود سے سوال کیا۔

"مجھے کچھ تو کرنا ہوگا۔ اس مشکل سے نکلنا ہوگا۔ مجھے عباس سے پوچھنا چاہیے۔ مگر نہیں' وہ نہ جانے کیسے ری ایکٹ کرے۔ عباس' عبہر نہیں ہے جو میری بکواس آرام سے سن لے گا۔" وہ ارادے بناتا توڑتا رہا' جب کچھ سمجھ نہ آیا تو اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

"عبہر بیٹا! اکیلی کیوں آئی ہو؟" امی کو اس کا رویا رویا سا چہرہ ہولا رہا تھا۔ وہ جب سے آئی تھی امی کم و بیش دس مرتبہ گھما پھرا کر یہ سوال پوچھ چکی تھیں۔ وہ مسلسل خاموش تھی' مگر اب کی بار اس کی چپ ٹوٹی۔

"امی! پلیز۔ ابھی مجھ سے کچھ مت پوچھیے۔ میں کچھ روز آپ کے پاس رہنے آئی ہوں۔ ایک بات اور آپ یا ابو کوئی بھی شاہ زیب کو فون کرکے کچھ نہیں پوچھے گا۔" امی اور پریشان ہوگئیں۔

"مجھے لگتا ہے عبہر' شاہ زیب سے جھگڑ کر آئی ہے۔" رات کو امی نے ابو کے سامنے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ ان کے لہجے میں وسوسوں کی سرسراہٹ تھی۔

"عبہر سے پوچھو کیا مسئلہ ہے؟" ابو کا انداز سرسری تھا۔

"پوچھا تھا' لیکن اس نے کچھ نہیں بتایا اور شاہ زیب سے پوچھنے سے بھی منع کردیا ہے۔" امی روہانسی ہوگئیں۔ اب کے ابو بھی فکر مند ہوگئے۔

"میرا خیال ہے' دو چار روز تک اس سے کچھ مت پوچھو۔ اس کے ساتھ اپنا رویہ نارمل رکھو۔ پھر اگر وہ مناسب سمجھے گی تو بتادے۔ ہوسکتا ہے کوئی خاص بات نہ ہو' ہم ایسے ہی پریشان ہورہی ہو۔" انہوں نے امی کو تو تسلی دے دی' مگر دل میں سوچنے لگے۔

"میری بیٹی چھوٹی چھوٹی باتوں پر گھر چھوڑ کر آنے والوں میں سے نہیں ہے' اللہ خیر کرے۔" وہ گہری سوچ میں گم ہوگئے۔

☼ ☼ ☼

رات جل تھل مری آنکھوں میں اتر آیا تھا
صورت ابر کوئی ٹوٹ کے برسا ہوگا

لاہور میں شاہ زیب نے اور ملتان میں عبہر نے ساری رات آنکھوں میں نمی لیے کروٹیں بدلتے

ہوئے گزاری۔ شاہ زیب صبح اٹھا تو طبیعت مضمحل سی تھی۔ سو وہ آفس جانے کا ارادہ ترک کر کے بستر پر پڑا رہا۔ دوپہر کے بعد نہا دھو کر فریش ہوا اور چائے کا ایک کپ پی کر گاڑی میں جا بیٹھا۔ وہ بلا مقصد گاڑی ادھر ادھر دوڑاتا رہا۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر وہ عباس کی طرف چلا آیا۔ عباس نے اس کا استقبال بہت گرم جوشی سے کیا۔ وہ اسے ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ وہ شاہ زیب کا سنجیدہ سا انداز نوٹ کر رہا تھا، مگر اس نے کچھ بھی پوچھنے سے گریز کیا۔

"کیا بات ہے شاہ زیب؟ سب ٹھیک ہے نا؟" چائے پینے کے بعد بھی اس کے انداز میں تبدیلی نہ آئی تو عباس کو پوچھنا ہی پڑا۔ "ہاں! سب ٹھیک ہے۔ بس ایسے ہی بور ہو رہا تھا تو تمہاری طرف چلا آیا۔" اس نے بڑی دقت سے اپنے لہجے کو نارمل رکھا۔

"بھابھی کہاں ہیں؟"

"ابھی تو بھابھی کہہ رہا تھا، اگر جو یہ عبیرہ سے مل لے تو...؟" شاہ زیب دل ہی دل میں تلملایا، مگر جواب تو دینا ہی تھا۔

"وہ ملتان گئی ہوئی ہے۔" وہ قصداً مسکرایا۔

"اوہ! اسی لیے میاں مجنوں بنے پھر رہے ہو؟" عباس کا انداز شرارتی ہو گیا۔

"بس یار! تو خود تو ابھی تک اکیلا پھر رہا ہے۔" شاہ زیب اسے مطلب کی بات کی طرف لانے لگا۔

"ہاں بس! ابھی اس طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا اور ویسے بھی مجھے قید ہونے کا کوئی شوق نہیں ہے۔" عباس ہنسنے لگا۔

"دھیان نہیں گیا یا کسی کی طرف ایسا دھیان گیا کہ پھر پلٹا ہی نہیں۔" شاہ زیب نے بظاہر شائستگی سے کہا۔

"کیا مطلب؟" عباس نے خالی کپ ٹرے میں رکھا۔

"مطلب کسی عشق وشق کا چکر؟" شاہ زیب نے کندھے اچکائے۔ وہ خود کو بڑی مشکل سے کنٹرول کر رہا تھا، ورنہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس سے سیدھے سیدھے عبیرہ کے بارے میں پوچھ لے۔

"توبہ کر یار! میں ایسی خرافات میں نہیں پڑتا۔" عباس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"اچھا جی! تو پھر وہ تصویر والی محترمہ کون ہیں؟" شاہ زیب نے آر یا پار کا فیصلہ کر لیا۔

"کون سی تصویر؟" عباس حیران ہوا۔

"وہی جو تم نے اپنی کتاب میں رکھی ہوئی ہے۔" شاہ زیب کا ضبط جواب دینے لگا تھا۔

"میں کچھ نہیں پا رہا کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" عباس الجھ گیا۔

"اچھا... اب ہم سے استادی کرو گے؟" شاہ زیب سنجیدہ ہو گیا۔

"شاہ زیب میں واقعی کچھ نہیں سمجھا۔" عباس کے لہجے میں بے بسی تھی۔

"اچھا... تم میرے ساتھ اپنی اسٹڈی میں چلو۔" شاہ زیب کھڑا ہو گیا۔

"چلو..." عباس اسے لیے اسٹڈی میں آیا۔ شاہ زیب دائیں جانب والی الماری کی طرف بڑھا۔ عباس خاموشی سے اس کی کارروائی دیکھنے لگا۔ شاہ زیب نے متعلقہ کتاب اٹھائی۔ کتاب ابھی تک اسی طرح رکھی ہوئی جیسے وہ اسے دس، بارہ روز پہلے چھوڑ کر گیا تھا۔

"یہ تصویر..." شاہ زیب نے کتاب سے عبیرہ کی تصویر نکال کر اس کے سامنے کی۔ عباس چند لمحوں تک تصویر کو بونقوں کی طرح تکتا رہا۔ پھر تصویر اس کے ہاتھ سے لے کر پلٹی تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

"یہ تصویر یہاں کیسے آئی؟" اس کا لہجہ بھی متبسم تھا۔ شاہ زیب کا دل چاہا کہ چھپٹ کر اس کا منہ بگاڑ دے۔

"ظاہر ہے تم نے رکھی ہے اور کون رکھے گا؟" شاہ زیب کو غصہ آنے لگا۔ اس کے انداز پر عباس نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"بالفرض یہ تصویر میں نے ہی رکھی ہے، پر تمہیں کیوں اتنا غصہ آ رہا ہے؟" عباس نے ابرو اچکائی۔

"اس لیے کہ..."

مگر عزت یا محبت میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوا تو مجھے اپنی عزت زیادہ پیاری ہوگی۔" شاہ زیب کے کانوں میں عبیر کی آواز گونجی۔

"میں بے گناہ ہوں۔ میں کسی عباس کو نہیں جانتی۔" عبیر کی آواز بڑھتی جارہی تھی اور شاہ زیب کا ضمیر اسے کچوکے لگانے لگا۔

"اچھا۔ آپ لوگ باتیں کریں، میں ذرا اشعر کو دیکھ لوں۔" وہ تصویر لے کر چلی گئی۔

"اب بتاؤ۔ اصل مسئلہ کیا ہے اور اس تصویر والی سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟" عباس، شاہ زیب کے سامنے بیٹھ گیا۔ جس طرح شاہ زیب نے تصویر کے حوالے سے بے چینی اور غصے کا اظہار کیا تھا وہ عباس کو بہت کچھ سمجھا رہا تھا، مگر وہ اس کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔ مگر وہ مارے شرمندگی کے کچھ بول ہی نہ سکا۔

"اب بول بھی کہ ہانیہ کی دوست عبیر۔ عی۔ ب۔" عباس یک دم رکا۔ "تم نے بھابھی کا کیا نام بتایا تھا؟" عباس نے شاہ زیب سے پوچھا۔

"عبیر۔" یک لفظی جواب کے بعد پھر خاموشی چھا گئی اور عباس ساری صورت حال سمجھ آنے پر جیسے اچھل پڑا۔

"تم۔ تم کہیں اس تصویر کو لے کر مجھ پر اور بھابھی پر۔" عباس نے بے چین ہو کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور شاہ زیب نے شرمندگی سے ہونٹ بھینچ کر سر جھکا لیا۔

"تف ہے تم پر شاہ زیب، تم نے بھابھی سے کچھ الٹا سیدھا تو نہیں کہہ دیا؟" عباس کو پریشانی لاحق ہونے لگی۔

"وہ اسی وجہ سے ملتان گئی ہے۔" شاہ زیب کا لہجہ بہت پست تھا۔ عباس کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لے۔

"مانا کہ تصویر کی وجہ سے تمہیں غلط فہمی ہو گئی ہوگی، مگر تم پہلے مجھ سے تو بات کرتے۔ بے چاری بھابھی پر نہ جانے کیا گزری ہو گی یہ الزام سن کر۔" عباس کو خود سے زیادہ عبیر کی فکر ہو رہی تھی۔

"شاہ زیب وہ بچپن سے تمہارے سامنے رہی ہیں۔ تمہیں ان پر اعتبار اور اعتماد ہونا چاہیے تھا۔ تم نے تو ان سے ان کا مان ہی چھین لیا اور میں تمہیں کیا ایسا ہلکے کردار کا لگتا ہوں۔ کمال ہے یار۔ میرا خیال ہے کہ یہ بہت مناسب وقت ہے کہ ہم دونوں اپنی دوستی ختم کردیں۔ جس دوستی میں اعتماد نہ ہو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔" عباس تلخ ہو گیا۔

"پلیز عباس! ایسا مت کرو۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔" شاہ زیب کا چہرہ اور لہجہ دونوں شرمندہ تھے۔ عباس کو اس پر ترس آیا۔

"تمہاری سزا یہ ہے کہ تم جاؤ اور جیسے بھی ہو بھابھی کو منا کر واپس لاؤ۔ پھر ہم سب کو کھانے پر بلاؤ اور دو بچھڑی ہوئی سہیلیوں کو ملاؤ۔" عباس نے شاہ زیب کی شرمندگی کو دیکھ کر خود پر کنٹرول کیا تھا، ورنہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اسے کھری کھری سنا کر گھر سے نکال دے۔ مگر وہ حقیقت میں اس کا دوست تھا اور سچا دوست کبھی اپنے دوست کو مشکل میں اکیلا نہیں چھوڑتا۔

"اور ایک بات ذہن میں بٹھالو کہ عبیر بھابھی تمہارے حوالے سے پہلے بھی میرے لیے محترم تھیں، اب بھی ہیں اور ہمیشہ رہیں گی، سمجھے۔" عباس نے رعب سے کہا تو شاہ زیب نے سعادت مندی سے سر ہلا دیا۔

"چلو جاؤ۔ پھر ملتان جانے والی بس پکڑو۔" عباس نے اسے باہر کا راستہ دکھایا۔

☼ ☼ ☼
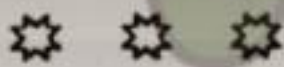
اگلے روز شاہ زیب دوپہر ایک ڈیڑھ بجے کے قریب ملتان پہنچا اور اگلے آدھے گھنٹے میں وہ اپنے چچا، چچی کے سامنے بیٹھا تھا۔ عبیر، ماہ نور کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گئی ہوئی تھی۔

"شاہ زیب! تم دونوں میں کوئی بات ہوئی ہے کیا؟" چچی نے پوچھا تو شاہ زیب اندازہ لگانے لگا "آیا عبیر نے انہیں کچھ بتایا ہے یا نہیں۔" وہ خاموشی سے چچا، چچی کو دیکھ رہا تھا کہ اس بات کا کیا جواب دے۔

"ایک تو تم دونوں میری سمجھ سے باہر ہو۔ پچھلے دو

روزے عبیو نے چپ کا روزہ رکھا ہوا ہے اور اب تم گونگے کا گڑ کھا کر بیٹھ گئے ہو۔" شاہ زیب کی خاموشی طول پکڑ گئی تو چچی بول اٹھیں۔ وہ بظاہر غصے میں بات کر رہی تھیں مگر ان کے اندر سکون سا اتر گیا تھا کہ ان دونوں میں جو بھی مسئلہ تھا وہ اب ختم ہو جائے گا کہ شاہ زیب کا یوں عبیو کے پیچھے دوڑے آنا بے سبب نہیں تھا۔

"اچھا بھئی بس کرو اب' چلو شاہ زیب جا کر فریش ہو جاؤ۔" چچا نے جان بخشی کروائی۔

"آپ عبیو کو میرے آنے کے متعلق کچھ نہ بتایئے گا۔" وہ عبیو کے کمرے کی طرف جاتے جاتے پلٹا۔ "چچا' چچی نے اس کی بات پر زیر لب مسکرا کر سر ہلا دیا۔

✿ ✿ ✿

"چلو جی۔۔۔ اب ہم نینی کریں گے۔" عبیو' ملا نور کو بیڈ پر لٹا کر پلٹی تو شاہ زیب کو واش روم کے دروازے سے کمرے میں آتا دیکھ کر بت بن گئی۔

"تم تو دعا سلام سے بھی گئی بیوی۔" وہ اس کے قریب آیا تو اسے ہوش آیا۔ وہ پلٹ کر باہر جانے لگی تو شاہ زیب نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ عبیو نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"بس تم پہلے ہی بہت رو چکی ہو۔ اب اور نہیں۔" شاہ زیب کے لہجے میں پہلی سی محبت تھی۔

"پلیز میرا ہاتھ چھوڑ دیں۔"

"میں نے یہ ہاتھ چھوڑنے کے لیے نہیں پکڑا۔" شاہ زیب نے ہاتھ چھوڑ کر اسے کندھوں سے تھام لیا۔

"جھوٹ۔۔۔ بالکل غلط۔۔۔ آپ نے تو یہ ہاتھ چھوڑنے میں ایک لمحہ نہیں لگایا تھا۔" آنسو اس کے گالوں پر پھسلنے لگے۔

"یار! اب تجدید محبت کے لیے آ بھی تو گیا ہوں نا۔" شاہ زیب نے عبیو کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ فوراً دور جا کھڑی ہوئی۔

"مجھے ایسی خالی خولی محبت نہیں چاہیے جس میں اعتبار نام کی کوئی شے نہ ہو۔ میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ محبت اور عزت میں سے میرا انتخاب عزت ہوگی۔"

عبیو نے اپنے گال بے دردی سے رگڑے۔

"یار! ایک موقع تو دو۔ اب کے میں جو محبت کروں گا' اس میں پہلے اعتبار اور عزت ہوگی۔" شاہ زیب نے آگے بڑھ کر پھر سے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ عبیو اس کے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگا کر رونے لگی۔ وہ شاہ زیب کی دوری نہیں سہہ سکتی تھی۔ ان دونوں میں اس پر کیا بیتی تھی۔ یہ وہی جانتی تھی۔

"چلو عبیو بس کرو۔ مجھے مزید شرمندہ مت کرو۔" شاہ زیب نے اس کا سر اٹھایا۔

ملا نور دونوں کو ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی۔ اس سے اتنی دیر اگنور ہونا برداشت نہ ہوا تو وہ زور' زور سے رونے لگی۔ دونوں اس کے رونے کی آواز سن کر چونکے اور بیک وقت ہنستے ہوئے اس کی طرف بڑھے۔ دونوں دل ہی دل میں اللہ کے شکر گزار تھے' جس نے ان تینوں کو جدا ہونے سے بچا لیا تھا۔

✿ ✿

نبیلہ ابر راجہ

مکمل ناول

میں گماں نہیں یقیں ہوں

چوتھی قسط

سارا منظر ہی دھندلا رہا تھا۔ اس کے واپسی کے لیے باہر کی طرف پلٹتے قدم جیسے یکایک ہی لڑکھڑانے لگے۔ آوازیں اس کے کانوں میں چیخ رہی تھیں۔ وہ ان پہ غور نہیں کرنا چاہتی تھی پر وہ اسے اپنی طرف بلا رہی تھیں۔ پلٹنے پہ مجبور کر رہی تھیں۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی غور سے سنا۔ یہ تو اس کے گھر کی تعمیر میں لگی ایک ایک اینٹ کی آواز تھی اس نے بمشکل تمام آوازوں سے پیچھا چھڑاتے ہوئے آگے کی طرف قدم بڑھائے۔ یہاں بھی آوازیں اس کا دامن تھام کے فریاد کرنے لگیں۔

درخت، گھاس، لان کی دیوار، براؤن آہنی گیٹ سب ہی اسے التجا کر رہے تھے کہ خدارا اپنے بڑھتے قدم پیچھے ہٹالو۔ چھوٹا ساسوٹ کیس ہاتھ میں تھامے وہ تیز تیز قدموں سے گیٹ کی طرف جارہی تھی۔

اس نے ہزار جتن کرکے آوازوں کی طرف سے دھیان ہٹایا۔ اب وہ گیٹ سے باہر تھی۔ سب آوازیں پیچھے رہ گئی تھیں۔ اس نے پیچھے مڑ کر براؤن گیٹ اور سبزے سے ڈھکی دیوار کو دیکھا دونوں خاموش تھے مایوس تھے انہیں یقیناً" پتا چل گیا تھا کہ وہ اب واپس پلٹنے والی نہیں ہے۔

وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر کومل کے پاس اس کے گھر پہنچی تھی۔ اتفاق سے گھر میں کومل اور ملازموں کے سوا اور کوئی نہیں تھا کیوں کہ اس کے مما پاپا ایک فیملی فنکشن میں گئے ہوئے تھے۔ کومل کا جانے کا موڈ نہیں تھا اس لیے وہ گھر رک گئی تھی۔ ایک لحاظ سے رنم کے حق میں یہ اچھا ہی ہوا کیوں کہ کومل کے گھر پہ نہ ملنے سے اسے پریشانی لاحق ہوسکتی تھی۔

کومل اسے دیکھ کر فوراً" کھٹک گئی کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔ کیوں کہ رنم کے پاس ہینڈ بیگ کے علاوہ ایک چھوٹا ساسوٹ کیس بھی تھا۔ اس کے چہرے پہ حد درجہ پریشانی چھائی ہوئی تھی۔ دروازہ جیسے ہی کھلا وہ کومل کو ہاتھ سے ہٹاتی جھپاک سے اندر داخل ہوئی جیسے کسی کے دیکھ لیے جانے کا خطرہ ہو۔ بیٹھتے ہی اس نے رونا شروع کردیا۔ کومل کے تو ہاتھ پیر پھول گئے۔

"ارے کیا ہوا ہے کچھ بتاؤ تو۔ میرا دل ہول رہا ہے۔" اس نے چھٹی بار بڑے صبر سے اپنا سوال دہرایا۔ پر رنم اسی رفتار سے روتی رہی۔ دسویں بار اس نے جھنجلائے ہوئے انداز میں پوچھا تب رنم نے منہ کھولا۔

"میں گھر چھوڑ آئی ہوں۔" کہیں دھماکا ہوتا تو شاید کومل کی ایسی حالت نہ ہوتی جو اب ہورہی تھی اسے تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ شاید اسے سننے میں غلطی ہوئی تھی۔ بڑی مشکل سے اس کے منہ سے آواز نکلی۔

"کک۔۔۔ کیا کہہ رہی ہو تم مذاق تو نہیں کر رہی نا۔" کومل کے منہ سے بے یقین سا جملہ برآمد ہوا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں ہاں میں ہمیشہ کے لیے اپنا گھر چھوڑ آئی ہوں۔"

"کیوں چھوڑا تم نے گھر؟" کومل نے اپنے منتشر حواس یکجا کرتے ہوئے خود کو سنبھالا۔

"پاپا میری بات جو نہیں مان رہے تھے۔" اس نے پریشانی سے جواب دیا۔

"تم اب کیا کرو گی؟"

"میں گھر چھوڑ آئی ہوں واپس نہیں جاؤں گی۔ یہ لو میرا بیگ اس میں کپڑے ہیں اور یہ میرا ہینڈ بیگ بھی حفاظت سے رکھ دو اس میں جیولری اور کیش ہے۔"

رنم نے آنکھیں مسلتے ہوئے دونوں چیزیں اس کی طرف بڑھائیں۔ کومل یوں پیچھے ہوئی جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

"نہیں رنم تم گھر واپس لوٹ جاؤ میرے مما پاپا فنکشن میں گئے ہیں انہیں پتا چل گیا تو میری شامت آجائے گی۔" کومل سخت خوف زدہ لگ رہی تھی۔ اس نے رنم کے ہاتھوں کی طرف مطلق توجہ نہ دی جن میں سامان دبا تھا۔

"نہیں میں واپس نہیں جاؤں گی مجھے تم اپنے پاس رکھ لو۔" رنم ایسے بولی جیسے کومل انکار نہیں کرے گی۔

"پلیز کومل تم میری دوست ہو۔" وہ روہانسی ہو رہی

تھی۔

"تمہارے پاپا کی اپروچ سے سب واقف ہیں اگر انہیں تمہاری یہاں موجودگی کی خبر ہو گئی تو میری فیملی کی شامت آجائے گی۔ ویسے تم رکنا چاہو تو موسٹ ویلکم، مگر دوسری صورت میں یہ ممکن نہیں ہے۔ میری دوست بن کر تم سو بار آؤ، مگر گھر چھوڑ کر آنے کی صورت میں، میں تم سے معذرت خواہ ہوں۔" اس کا لہجہ بااعتماد اور مضبوط تھا۔

کومل سمجھ دار اور باشعور تھی۔ احمد سیال کے بارے میں ان کی طاقت اور اثر و رسوخ کے بارے میں بھی سب کچھ جانتی تھی۔ اگر انہیں رنم کی یہاں موجودگی کا علم ہو جاتا تو اس کی ذات لازمی شک کی لپیٹ میں آتی۔ وہ مما پاپا کے گھر واپس آنے سے پہلے پہلے رنم کو یہاں سے چلتا کرنا چاہ رہی تھی۔ دوستی اپنی جگہ پر اسے پاپا کی عزت اور سلامتی بھی عزیز تھی۔

رنم پہ پہلے اسے ہمیشہ رشک آتا تھا پر ابھی ترس آرہا تھا۔ اچھی خاصی سیر لائف انجوائے کرتے کرتے وہ جانے کیوں یہ حماقت کرنے پہ تل گئی تھی اور گھر چھوڑ کر یہاں پہنچ چکی تھی۔

"دوسری صورت میرے پاس نہیں ہے۔" رنم کا لہجہ تلخ ہو رہا تھا۔ کومل نے فوراً" اپنے اندرونی احساسات پہ قابو پایا اور زبردستی کی مسکراہٹ لبوں پہ سجائی۔

"تم ابھی غصے میں ہو کل تک تمہارا غصہ دور ہو جائے گا۔ آج کی رات تم میرے گھر مہمان ہو۔ کل میں اور پاپا تمہارے ساتھ تمہارے گھر جائیں گے اور احمد انکل کو سمجھا کر راضی کرنے کی کوشش کریں گے۔" کومل جیسے اسے لالی پوپ دے کر بہلا رہی تھی۔

"مجھے تمہاری کسی بھی قسم کی ہیلپ کی ضرورت نہیں ہے۔" رنم کا لہجہ یکسر ہی سرد ہوا۔ کومل کی باتوں کے پیچھے چھپے معانی نے اسے ازحد تکلیف پہنچائی تھی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" کومل روہانسی ہونے لگی۔

"مطلب یہ کہ میں جا رہی ہوں یہاں سے۔" رنم نے ہینڈ بیگ اٹھایا اور چھوٹا سا سوٹ کیس اپنی طرف کھسکایا جو اس کے پاؤں کے پاس پڑا تھا۔ کومل کے چہرے پہ خوشی سی آگئی وہ جانے رنم کے جملے سے کیا سمجھی تھی۔

"شکر ہے تمہیں عقل آگئی ہے۔ اپنے گھر سے کوئی ایسے تھوڑی نکلتا ہے۔ پاپا کو راضی کرو جا کر۔ کب تک ناراض رہو گی۔ میری مانو تو واپس جا کر سب سے پہلے سوری کرنا۔" اس نے سکون کا سانس لیا۔ رنم دروازے کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گئی اور پلٹی۔

"تمہاری ایڈوائس کا بہت بہت شکریہ۔ مجھے تمہاری فرینڈ شپ پہ بہت ٹرسٹ تھا' لیکن اب No further more۔" یہ طنزیہ فقرہ اس کی دل گرفتی کا مظہر تھا۔ رنم دروازے سے باہر نکلی تو کومل اس کے پیچھے لپکی۔

"رنم تم تو ناراض ہو کر جا رہی ہو۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا جو تم سمجھی ہو۔" وہ شرمندہ سی تھی۔

"میں اب سمجھ گئی ہوں۔" رنم رکے بغیر بولی۔

"دیکھو میں نے تم سے جو کچھ بھی کہا تمہاری بھلائی کے حوالے سے کہا تم گھر سے ایک رات بھی غائب رہتی تو اسکینڈل بن جاتا۔ میں اس لیے چاہ رہی ہوں کہ تم گھر واپس چلی جاؤ۔ گھر میں اختلافات ہو ہی جاتے ہیں' لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ گھر ہی چھوڑ دیا جائے۔ تم لڑکی ہو گھر سے نکلے ہوئے تمہیں زیادہ دیر بھی نہیں ہوئی ہے انکل کو ابھی پتا بھی نہیں چلا ہو گا۔ مما پاپا گھر نہیں ہیں ورنہ میں تمہیں خود ڈراپ کر آتی۔" کومل ہر ممکن طریقے سے اس کا غصہ اور ناراضی ختم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تو تھینکس میں خود چلی جاؤں گی۔" رنم سرد مہری سے بولتی بیرونی گیٹ بھی عبور کر گئی۔ کچھ دیر کومل وہیں کھڑی رہی پھر وہ بھی پلٹ کر گھر کے اندرونی حصے میں آگئی۔ دل میں وہ شکر ادا کر رہی تھی کہ رنم بخیر و خوبی واپس چلی گئی ہے۔ مما پاپا کو پتا چلتا تو اس کی کلاس

لیتے کیوں کہ احمد سیال کے اثرورسوخ کا انہیں بھی اچھی طرح علم تھا۔

☆ ☆ ☆
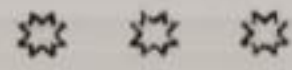
رنم، کومل کے گھر سے نکل آئی تھی اور بیگ تھامے روڈ پر چلی جارہی تھی۔ رفتہ رفتہ شام ہورہی تھی۔ اس نے پاس سے گزرتی ایک ٹیکسی کو روکا۔ ڈرائیور کو فراز کے گھر کا پتا سمجھا کر وہ پچھلی سیٹ پہ ڈھیر ہوگئی۔ کومل کے رویے نے اسے سخت صدمے سے دوچار کیا تھا۔

اس نے تو دوستی کا بھی لحاظ نہیں کیا تھا، جھٹ آنکھیں ماتھے پہ رکھ لی تھیں۔ اب ایک دم کیسے بدل گئی تھی۔ رنم کو بہت شدید طریقے سے رونا آرہا تھا پر وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر رونا نہیں چاہتی تھی۔ ڈرائیور شوقین مزاج لگتا تھا۔ رنم کے بیٹھتے ہی اس نے میوزک سسٹم آن کردیا تھا۔ رنم اپنی ٹینشن میں تھی ورنہ اسے ٹوکتی ضرور۔

میں ڈھونڈنے کو زمانے میں جب وفا نکلا
پتا چلا کہ میں لے کے غلط پتا نکلا......

گلوکار سریلے انداز میں دنیا کی ایک اہم حقیقت بیان کررہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی رنم نے سنا اور پھر اس کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ آگئی۔ وہ بھی کومل کے پاس کتنی امیدیں لے کر پہنچی تھی۔

فراز اس کا بیسٹ فرینڈ تھا رنم کو اس پہ بے پناہ مان تھا۔ اس لیے اس نے فراز کی طرف جانے کا فیصلہ کیا تھا کیوں کہ فی الحال اس کی آخری امید فراز ہی تھا۔ فراز کے گھر کے سامنے ٹیکسی والے کو اس نے ہزار کا نوٹ دے کر فارغ کیا۔ وہ کبھی اسے دیکھ رہا تھا اور کبھی ہزار کے نیلے نوٹ کو۔

رنم پیسے دے کر آگے بڑھ گئی تھی اس نے نہ کرایہ پوچھا اور نہ باقی پیسے طلب کیے۔ ٹیکسی ڈرائیور اس کی عقل پہ ماتم کرتا اور دریا دلی پہ خوش ہوتا واپس جاچکا تھا۔ رنم کو فراز کا چوکیدار بہت اچھی طرح پہچانتا تھا سو اس نے رنم کو زوردار سلام جھاڑا اور گیٹ کھول دیا۔

اندر ایک اور ملازم نے ڈرائنگ روم تک اس کی رہنمائی کی۔ فراز یہاں اکیلا اپنے ملازمین کے ساتھ رہتا تھا۔ اندرون پنجاب اس کا آبائی گھر اور سینکڑوں ایکڑ زمین تھیں یہاں وہ پڑھائی کے ارادے سے رہ رہا تھا۔ اس کے والد کھاتے پیتے خوشحال زمیندار تھے اس لیے وہ یہاں ٹھاٹھ سے رہ رہا تھا دیکھنے والے اس کی قسمت پہ رشک کرتے تھے۔

فراز کو جیسے ہی ملازم نے رنم کے آنے کی اطلاع دی وہ فوراً" ڈرائنگ روم میں آگیا۔ نظر رنم کے پاس رکھے سوٹ کیس پہ پڑی۔ ہینڈ بیگ اس کی گود میں دھرا تھا۔ ذہین تھا فوراً" تاڑ گیا کہ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔

"کیا یہاں رہنے کے ارادہ ہے، جو سوٹ کیس بھی ساتھ لائی ہو۔" اس نے قصداً" ہلکا پھلکا انداز اختیار کیا۔ ادھر فراز کے پوچھنے کی دیر تھی رنم کی آنکھیں برس پڑیں۔ اس نے نئے سرے سے سب کچھ دہرایا۔ کومل کی بے حسی، خود غرضی، طوطا چشمی پہ وہ بے پناہ رنجیدہ تھی۔ فراز اس کی رگ رگ سے واقف تھا اس لیے اس نے کوئی اظہار خیال کرنے کی حماقت نہیں کی۔

"تم کتنی دیر پہلے گھر سے نکلی تھیں۔" فراز کی نگاہیں دیوار گیر کلاک پر مرکوز تھیں۔

"کافی گھنٹے ہوگئے ہیں۔" رنم بڑبڑائی۔

"ابھی تک تمہارے پاپا کو تمہاری گمشدگی کا علم نہیں ہوا ہوگا وہ یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ تم فرینڈز کے ساتھ ہو اور تمہارا سیل فون کہاں ہے؟" اسے اچانک خیال آیا۔

"میں آف کرکے گھر رکھ آئی ہوں۔" اس نے فراز سے نظر چراتے ہوئے کہا۔

"اچھا تب ہی ایک گھنٹہ پہلے میں نے تمہیں کال کی تو آف مل رہا تھا۔" فراز نے جیسے خود کلامی کی۔

"فراز میں اب ادھر ہی رہوں گی جب تک پاپا میری بات نہیں مان جاتے تمہیں کومل کی طرح کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟" رنم کی آنکھوں میں بے پناہ

اندیشے نظر آرہے تھے۔

"تم جب تک چاہو یہاں رہو۔" اس نے دوستانہ آفر کی تو رنم پہلی بار پرسکون ہو کر مسکرائی۔

"تم سیریس ہو؟" اسے جیسے یقین نہیں آرہا تھا۔

"ہاں میں سچ کہہ رہا ہوں۔ تم اپنا سامان رکھو۔ ملازم کمرا تیار کردے گا۔ میں کہتا ہوں اسے اور جاؤ تھوڑا فریش ہو جاؤ۔" فراز اسے تسلی دے کر اٹھا تھا۔

"سنو مجھے بھوک لگی ہے۔" رنم کو تھوڑا اطمینان ہوا تو بھوک ستانے لگی ویسے بھی اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔

"تم ایزی ہو جاؤ میں کھانے کا بول کر آتا ہوں۔"

فراز باہر جا چکا تھا۔ رنم صوفے سے ٹیک لگائے ٹانگیں اوپر کیے نیم دراز تھی اسے نیند آرہی تھی۔ صبح کی جاگی تھی دن بھر کی بے آرام تھی اب پریشانی کچھ کم ہوئی تو جسم آرام طلب کرنے لگا۔ ساتھ بھوک بھی لگ رہی تھی۔ فراز کو گئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ رنم اسے دیکھنے کے لیے باہر آئی۔

ٹی وی لاؤنج سے کسی کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ اور یہ سو فیصد فراز ہی تھا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی فراز بہت آہستہ آواز میں بات کر رہا تھا۔

"انکل وہ یہاں میرے گھر میں ہے۔ میں نے کافی تسلی دی ہے اسے آپ جلدی آئیں۔ میں فون بند کر رہا ہوں ایسا نہ ہو اسے شک ہو جائے۔" وہ اگرچہ آہستہ آواز میں بول رہا تھا پر بغور کان لگا کر سننے سے حرف حرف رنم کی سماعتوں میں اتر گیا تھا۔ فراز فون بند کر چکا تھا۔

رنم کچھ ثانیے کے لیے جیسے ادھر ہی سن ہو گئی قدموں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ فراز نے بھی کومل کی طرح اسے دھوکا دیا تھا۔ کتنی بری طرح فراز نے اس کے اعتبار کو توڑا تھا۔ اس کا سب سے بیسٹ فرینڈ اس کی پیٹھ پر چھرا گھونپ چکا تھا۔ یہ وقت افسوس کرنے کا نہیں تھا اسے یہاں سے نکلنا تھا۔ فراز پاپا کو کال کر کے انفارم کر چکا تھا۔ وہ جہاں کہیں بھی تھے انہوں نے فراز کے گھر پہنچ جانا تھا۔ وہ ایک اور نمبر ملا کر بات کر رہا تھا۔ رنم الٹے قدموں چلتی ڈرائنگ روم میں پہنچی۔ وہاں سے سوٹ کیس اور ہینڈ بیگ اٹھایا۔ اس کا کل اثاثہ یہ ہی دو چیزیں تھیں۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتی گیٹ تک آئی ورنہ باہر موجود چوکیدار کو شک ہو سکتا تھا۔

پر خیریت رہی۔ گیٹ کے ساتھ رکھی اس کی کرسی خالی تھی۔ وہ شاید کسی ضرورت سے کہیں گیا ہوا تھا۔ وہ تیز تیز چلتی ہوئی روڈ تک آئی۔ اب آہستہ چلنے کا مطلب ناکافی تھا۔ خوش قسمتی سے فوراً" ٹیکسی بھی مل گئی۔ وہ پھرتی سے دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔

"کسی اچھے سے ہوٹل لے چلو مجھے۔" اس نے سوچے سمجھے بغیر کہا۔ اس کے ذہن میں کچھ بھی نہیں تھا۔ کومل اور فراز کو اس نے آزما لیا تھا اب اشعر کو آزمانے کی کوشش فضول تھی وہ اگر راعنہ کے پاس جاتی تو اس نے بھی نصیحتوں کے انبار لگا دینے تھے اور فوراً" سے بھی بیشتر اس کے پاپا کو انفارم کرنا تھا۔ اس لیے رنم نے تھک ہار کر ہوٹل کا سوچا تھا۔ اس کے ذہن میں کوئی بھی لائحہ عمل نہیں تھا حماقت در حماقت کرتی جا رہی تھی۔

ٹیکسی ڈرائیور نے بیک مرر سے اس کا جائزہ لیا۔ رنم کوشش کر رہی تھی اس کی کسی حرکت سے پریشانی یا اضطراب کا اظہار نہ ہو۔ ٹیکسی والے نے بہت غور سے اسے سہ بارہ دیکھا۔ لڑکی شکل و صورت و لب و لہجہ اور لباس سے امیر گھر کی لگ رہی تھی اور جس جگہ سے وہ ٹیکسی رکوا کر بیٹھی تھی وہ علاقہ بھی پوش تھا۔ سو ایسے لوگ کس قسم کے ہوٹلز میں قیام کرتے ہیں ٹیکسی ڈرائیور کو اچھی طرح علم تھا۔ اس نے اپنی ٹیکسی ایک عمدہ مہنگے قسم کے ہوٹل کے سامنے لا کھڑی کی۔

☼ ☼ ☼

ڈرائنگ روم میں کمال اور اس کی والدہ عفت خانم آئی ہوئی تھیں۔ بوا نے شاندار طریقے سے خاطر مدارات کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

اتوار کا دن تھا۔ عفت خانم بغیر کسی اطلاع کے

اچانک اپنے سپوت کے ساتھ آن وارد ہوئی تھیں۔ زرینہ بیگم کو پتا ہوتا کہ آج انہوں نے آنا ہے تو وہ انہیں منع کر دیتیں۔ کیوں کہ اتوار کے دن وہاب لازمی ان کے گھر آتا تھا اور اچھا خاصا ٹائم گزار کے جاتا۔ وہ ذیان کے دیدار کے لیے آتا تھا اور گھنٹوں بیٹھتا تھا۔ کیوں کہ اسے چھٹی کا ایک ہی دن ملتا تھا ویسے بھی وہ درمیان میں گاہے بگاہے چکر لگاتا تھا ہر اتوار کے دن اس کی آمد لازمی ہوتی۔

بوا نے جلدی جلدی میں اچھا خاصا کھانا تیار کر لیا تھا جسے مہمان ڈکار کے ہضم بھی کر چکے تھے۔ اب زرینہ بیگم ان کے ساتھ باتوں میں لگی ہوئی تھیں۔ عفت خانم جواب لینے آئی تھیں کیوں کہ زرینہ بیگم نے امیر علی کی عدم دلچسپی کی وجہ سے ابھی تک انہیں کچھ نہیں کہا تھا اسی لیے آج وہ خود آئی تھیں کچھ کمال کا دباؤ بھی تھا۔

ذیان کی خوب صورتی، کم عمری، معصوم موہنی صورت نے اسے بے صبرا کر دیا تھا اسی کے نتیجے میں وہ اس وقت عفت خانم کے ساتھ امیر علی کے گھر میں بیٹھا ہوا تھا۔ جبکہ زرینہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھیں کہ وہاب آج یہاں کا رخ کرنا بھول جائے۔ پر ہونی ہو کر رہتی ہے وہاب آج خاصا لیٹ آیا جب تک خاص الخاص مہمان پر تکلف لنچ کر کے گپیں ہانک رہے تھے۔

وہاب نے ڈرائنگ روم کے باہر سے ہی جھانکا اندر نہیں گیا اور سیدھا بوا رحمت کے پاس آگیا۔

”بوا کوئی مہمان آئے ہیں کیا؟“ اس نے استفسار کیا۔

”ہاں وہاب میاں مہمان آئے ہوئے ہیں۔“ بوا نے وہاب کا چہرا غور سے دیکھا۔

”کون سے مہمان ہیں؟“ وہ تیزی سے بولا۔

”آپ خود اندر چل کر دیکھ لیں۔ چھوٹی دلہن کے کوئی جاننے والے ہیں۔“ بوا نے مصلحت سے کام لیا۔ کیوں کہ اڑتی اڑتی کچھ باتیں ان کے کانوں تک بھی پہنچی تھیں۔ اس لیے انہوں نے وہاب کو زیادہ تفصیل نہیں بتائی۔ پر نہ جانے کیوں اس کا چہرا اندرونی اضطراب کی شدت سے لال ہو رہا تھا۔ بوا مہمانوں کے لیے چائے کے ساتھ دیگر لوازمات رکھ رہی تھیں۔ ذیان کے کمرے کا دروازہ حسب معمول حسب توقع بند تھا۔ امیر علی اپنے کمرے میں تھے۔ بوا نے چائے کا کپ اس کے آگے رکھا اس نے چھوا بھی نہیں۔

اندر ڈرائنگ روم سے اونچی آواز میں باتیں کرنے کی آواز آرہی تھی۔ ہنسی مذاق اور قہقہے بتا رہے تھے جیسے کسی دلچسپ موضوع پہ بات ہو رہی ہو۔ وہاب ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ کر زرینہ خالہ کا انتظار کرنے لگا۔ نہ جانے کیوں رہ رہ کر اسے احساس ہو رہا تھا ان مہمانوں کا آنا بے سبب نہیں ہے اور جو سبب اس کی سوچ میں آیا تھا اس نے وہاب کے ذہن میں ہلچل مچادی تھی۔

کچھ دنوں سے وہ نوٹ کر رہا تھا کہ امی اور زرینہ خالہ میں فون پہ لمبی لمبی باتیں ہونے لگی ہیں حالانکہ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا بہت ہوا تو روبینہ نے فون کر کے زرینہ سے دعا سلام کر لی، خیر خیریت پوچھ لی اور بس، لیکن اب جب وہ آفس سے کبھی امی کی سیل نمبر پہ فون کرتا تو نمبر ہمیشہ مصروف ملتا۔ گھر میں ہوتا تب بھی زرینہ خالہ کی کال وقفے وقفے سے آتی اور روبینہ اپنا فون لے کر ادھر ادھر ہو جاتیں۔ وہاب نے ایک دوبار بے دھیانی میں ان کی یک طرفہ گفتگو سنی تو خدشوں کے ناگ سر سرانے لگے۔ آج وہ اپنے خدشات کی تصدیق کے لیے ہی یہاں آیا تھا اور اسے محسوس ہو رہا تھا اس کے بے نام خدشات بہت جلد حقیقت بن کر اس کے سامنے آنے والے ہیں۔

وہ صبر سے خالہ کا انتظار کر رہا تھا۔ مہمان چائے پینے کے ساتھ ساتھ خوش گپیوں میں بھی مصروف تھے۔ اسے اونچی آوازوں سے کوفت سی ہونے لگی۔ زرینہ خالہ خاصی دیر بعد مہمانوں سے فارغ ہوئیں تب انہوں نے وہاب کو دیکھا۔

”تم کب آئے؟“ وہ خاصی پریشان نظر آرہی تھیں حالانکہ وہاب کو دیکھنے سے پہلے ان کا موڈ بالکل نارمل تھا اب چہرے پہ تفکر نے ڈیرے ڈال لیے تھے۔

کوشش کے باوجود وہ اپنی پریشانی چھپانے میں کامیاب نہیں ہو سکیں۔ وہاب یک ٹک انہیں دیکھ رہا تھا جیسے ان کے تاثرات میں آنکھوں میں کوئی راز چھپا ہو۔

"تم کب آئے وہاب مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔" وہ گڑبڑا گئیں۔

"مجھے تو آئے ہوئے تین گھنٹے سے اوپر ہو گئے ہیں۔" وہاب کا لہجہ عجیب سا تھا۔

"کوئی چائے وائے پی تم نے؟" زرینہ بیگم اس کی طرف دیکھنے سے احتراز برت رہی تھیں۔

"خالہ یہ کون سے مہمان تھے، میں نے پہلے نہیں دیکھا کبھی۔"

"میرے ملنے والے تھے۔"

"آپ کے سب ملنے والوں کو میں جانتا ہوں۔" وہ سخت لہجہ میں ایک ایک لفظ کو چبا کر بولا تو زرینہ کے تاثرات بھی یکسر بدل گئے۔ اسے کیا ضرورت تھی وہاب سے ڈرنے یا دبنے کی۔

"یہ مہمان ذیان کے رشتے کے لیے آئے تھے۔" زرینہ کے انداز میں فطری اعتماد لوٹ آیا تھا۔

"تو گویا آپ اور امی اتنے دن سے مل کر یہی کھچڑی پکا رہی تھیں۔" وہ زہر خند ہو کر بولا۔

"خالہ آئندہ مجھے یہ مہمان یہاں نظر نہ آئیں۔" وہ انگلی اٹھا کر وارننگ دینے والے انداز میں بولا تو زرینہ کے تلووں میں آگ لگی اور سر پہ بجھی گویا۔ ان کا چہرا غصے سے لال انار ہو گیا۔

"تم مجھے یہ حکم دینے والے کون ہوتے ہو۔ میرے گھر کس کو آنا ہے، کس کو نہیں آنا اس کا فیصلہ میں کروں گی نہ کہ تم۔ میں تمہاری مرضی یا حکم کی پابند نہیں۔"

"خالہ یہ لوگ ذیان کے رشتے کے لیے آئے ہیں اس لیے میں نے کہا ہے کہ آئندہ مجھے یہاں نظر نہ آئیں۔"

"ذیان ہماری اولاد ہے۔ یہ ہمارا گھر ہے اور ذیان کی شادی کس کے ساتھ کرنی ہے یا ہونی ہے اس کا فیصلہ بھی ہم نے کرنا ہے تم نے نہیں۔" زرینہ چیخ ہی تو پڑیں، وہاب تھوڑا خائف سا ہو گیا۔ کچھ بھی سہی وہ اس وقت خالہ کے گھر میں تھا اور کچھ کہنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا۔ اس اچانک صورت حال نے اس کے حواس سلب کر لیے تھے اوپر سے خالہ شیرنی کی مانند اس پہ چڑھ دوڑی تھیں۔

"خالہ آپ کو شاید پتا نہیں ہے میں ذیان کو پسند کرتا ہوں شادی کرنا چاہتا ہوں۔" اس کا انداز اب دفاعی ہو گیا تھا۔

"مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا ورنہ کچھ نہ کچھ کرتی۔" زرینہ نے بھی ایک دم پینترا بدلا۔

"کیا مطلب خالہ میں سمجھا نہیں۔"

"مطلب یہ کہ امیر علی کبھی نہیں مانیں گے تمہارے اور ذیان کے رشتے کے لیے۔"

"کیوں خالہ آخر کیوں نہیں مانیں گی وہ؟"

"کیوں کہ وہ میرے خاندان میں اپنی بیٹی کی شادی نہیں کرنا چاہتے۔" زرینہ وہاب کی نرمی اور پسپائی محسوس کر کے شیر ہو گئی تھیں۔

"خالہ آپ امیر خالو سے بات تو کریں بلکہ میں امی کو بھیجوں گا رشتے کے لیے فوراً" پہلے میرا ارادہ کچھ اور تھا پر اب دیر نہیں کروں گا ایسا نہ ہو "ٹور شور" بنانے کے چکر میں سب کچھ ہی میرے ہاتھ سے نکل جائے۔"

"ٹور شور سے تمہارا کیا مطلب ہے؟" وہ وہاب کی بات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"میں کچھ سیونگ کے چکر میں تھا اتنا ہو جائے کہ میں گولڈ کا ایک سیٹ منگنی کے لیے اور شاندار سا سوٹ لے سکوں۔ کسی اچھے ہوٹل میں اپنی منگنی کا فنکشن دھوم دھام سے کروں۔ ذیان کے شایان شان۔" اس نے ٹور شور کی طویل وضاحت کی۔

"میں امی کو جلدی بھیجوں گا آپ کے پاس۔"

"آپا کو میرے پاس رشتے کی نیت سے بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے ہم عفت خانم کو ہاں کر چکے ہیں۔" زرینہ نے جھوٹ فراٹے سے بولتے ہوئے اس کے اعتماد کی مضبوط دیوار میں پہلا سوراخ کیا۔ تب زرینہ کو وہاب کے چہرے پہ چٹانوں کا سا عزم نظر آیا۔

"آپ نے صرف رشتے کے لیے ہاں کی ہے نا۔ نکاح تو نہیں ہوا نا۔" وہ عجیب سے انداز میں بولا۔

"شریف خاندانوں میں زبانی رضامندی نکاح سے کم نہیں ہوتی۔" جولیا" وہ ٹھنڈے ٹھار لہجہ میں بولیں۔

"خالہ میں اس وقت جارہا ہوں بعد میں پوری تیاری کے ساتھ آؤں گا۔" وہاب دروازے کو پاؤں سے ٹھوکر مار کر کھولتے ہوئے عبور کر گیا۔ بوا حیرانی اور ناسمجھی کے عالم میں وہاب کو دیکھ رہی تھیں۔

زرینہ نے اسی وقت زیان کے کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑایا۔ اس نے لاک کیا ہوا تھا اور سر منہ لپیٹ کے لیٹی تھی۔ وہ مہمانوں کی آمد پہ ایک بار بھی باہر نہیں نکلی تھی۔ حالانکہ عفت خانم نے کتنی بار اس کا پوچھا تھا۔ زرینہ نے جھوٹ بول کر انہیں مطمئن کیا تھا۔ زرینہ کو پتا تھا زیان اس کے کہنے کے باوجود بھی کمرے سے نکل کر عفت خانم سے نہیں ملے گی اس لیے انہوں نے ایسی کوشش کی ہی نہیں تھی۔

زیان نے بولٹ گرا کر لاک ہٹا دیا تھا۔ زرینہ تیز قدموں سے آگے اس کی طرف آئی تھیں۔

"تم مہمانوں کے آنے پہ کمرے سے باہر کیوں نہیں نکلیں؟" انہیں زیان پہ شدید غصہ آرہا تھا کیوں کہ وہی تو اس سارے فساد کی جڑ تھی۔

"وہ آپ کے مہمان ہیں اس لیے آپ خود ہی ڈیل کریں۔"

"خیر میں تمہیں یہ بتانے آئی تھی کہ کمال کی والدہ رشتے کی رضامندی کا جواب لینے آئی تھیں۔ تمہارے ابو کو کمال بہت پسند آیا ہے اس لیے تم خود کو ذہنی طور پر کمال سے شادی کے لیے تیار کرلو۔"

"مجھے نہیں کرنی کسی بھی کمال یا جمال سے شادی۔" وہ سرد لہجہ میں بولی۔

"تمہارے ابو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ان کے حال پہ رحم کرو۔" زرینہ کا لہجہ کاٹ دار تھا۔

"آپ میرے حال پہ رحم کریں نہیں کرنی مجھے شادی۔" اس بار زیان نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے۔

"تمہاری ماں خود عیش کررہی ہے تمہیں میرے سینے پہ مونگ دلنے کے لیے یہاں چھوڑ گئی ہے۔"

زرینہ نے آواز دبا کر ایک ایک لفظ پہ زور دیا۔ یہ زیان کی کمزوری اور دکھتی رگ تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ یک دم متغیر ہوا۔ زرینہ دل ہی دل میں خوش ہوئیں۔

"کمال نہیں پسند تو نہ سہی وہاب بھی تمہارے امیدواروں میں شامل ہے۔" انہوں نے تاک کر ایک اور وار کیا۔

"میں لعنت بھیجتی ہوں وہاب پر اور آپ سے وابستہ ہر چیز پہ۔" زیان زہر میں بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ پہلی بار زرینہ نے اس کے اندر سرکشی کو سر اٹھاتے دیکھا۔

"ایسی صورت میں کمال بیسٹ چوائس ہے۔" غصے میں بھی زرینہ نے عقل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

"آپ کو کمال اتنا ہی پسند ہے تو رابیل یا مناہل میں سے کسی ایک کی شادی اس کے ساتھ کردیں۔" زیان نے یہ مشورہ دے کر گویا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔

"رابیل یا مناہل کا نام لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ان کی ماں ابھی زندہ ہوں میری بیٹیاں لاوارث نہیں ہیں۔ زبان کاٹ ڈالوں گی جو آئندہ ان کا نام لیا۔ تمہاری ماں کی طرح نہیں ہوں اپنی بچیوں کی بھلائی عزیز ہے مجھے۔"

زیان کا چہرا دھواں دھواں سا ہوگیا۔ زرینہ کا وار نشانے پہ لگا تھا۔ زیان صوفے پہ گرنے والے انداز میں بیٹھ گئی۔ زرینہ کو اس کا شکست خوردہ چہرا دیکھ کر دلی خوشی ہوئی اپنی ماں کا نام لیے جانے پہ اس کی یہی حالت ہوتی تھی۔ زیان کی آنکھوں میں آنسو ڈول رہے تھے۔ زرینہ اسے چھوڑ کر باہر آگئی۔ اب جو طوفان پیچھے آتا ان کی بلا سے۔ انہیں سروکار نہیں تھا۔

زیان نے وحشیانہ انداز میں تکیے پہ مکے برسائے۔ دیواروں پہ لاتیں ماریں اپنے بال نوچے، لیکن گھٹن

بڑھتی جارہی تھی۔ تھک ہار کر اب وہ گھٹنوں میں سر دیے سسک سسک کر رو رہی تھی۔ اس کی چند ثانیے پہلے والی ساری اکڑ اور تیزی رخصت ہوگئی تھی۔ طوفان آنے کے بعد سناٹے اور خاموشی والی کیفیت تھی۔

☆ ☆ ☆
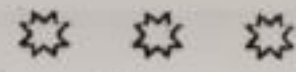
رنم کو گئے کافی دیر ہوچکی تھی۔ کومل اس کے جانے کے بعد کافی دیر بلاوجہ لان کے چکر کاٹتی رہی۔ وہ اسی کے بارے میں مسلسل سوچ رہی تھی۔ جانے گھر پہنچی ہوگی کہ نہیں۔ یہاں سے نکلے ہوئے اسے دو گھنٹے سے اوپر ہوچکے تھے۔ وہ ناراض ہوکر اس سے رخصت ہوئی تھی اسے منانا دشوار امر تھا' لیکن یہ کام تو کرنا ہی تھا۔ کومل نے اسے فون کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے سیل فون اٹھاکر رنم کا نمبر ڈائل کیا۔ پر اس کا نمبر آف جارہا تھا۔ اس نے تین چار بار ٹرائی کیا' لیکن ہر بار ایک ہی جواب ملا۔

اس نے فراز کا نمبر ڈائل کیا۔ اس وقت کومل کے دل پہ بے پناہ بوجھ تھا وہ فراز سے شیئر کرنا چاہ رہی تھی۔ فراز رنم کا کلوز فرینڈ تھا اسے سمجھا بجھا کر کومل کی طرف سے اس کا دل صاف کرسکتا تھا۔

فراز نے فوراً" فون ریسیو کیا۔ کومل کے بولتے ہی وہ جان گیا کہ وہ اس وقت بہت پریشان ہے۔

"کومل آر یو او کے؟"

"نو ناٹ ایٹ آل۔ فراز رنم اپنا گھر چھوڑ کر میرے پاس آئی تھی' لیکن میں نے سمجھا کر اسے گھر واپس بھیج دیا تھا وہ ناراض ہو کر گئی ہے مجھ سے۔ میں اس کے نمبر پہ کال کررہی ہوں' لیکن وہ پاور آف ہے۔ تم اس کی ناراضی دور کرنے کی کوشش کرنا ہوسکتا ہے میں کل یونیورسٹی نہ آسکوں۔ بہت ڈسٹرب ہوں۔" جواب میں فراز نے اسے جو کچھ بتایا وہ کومل کے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھا۔

وہ گھر نہیں گئی تھی سیدھی فراز کے پاس آئی تھی اور اب وہاں سے بھی غائب تھی۔ یعنی کومل کے سمجھانے کا اس پہ کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

"میں اپ سیٹ ہوں بہت۔ میرا خیال ہے اس نے فون پہ میری باتیں سن لی تھیں جو میں احمد انکل کے ساتھ کررہا تھا۔ گیٹ پہ چوکیدار بھی نہیں تھا جو اسے روکتا یا مجھے انفارم کرتا۔" فراز کی آواز سے اس کی دلی پریشانی کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔

"فراز وہ کہاں گئی ہے۔ تم نے اس کے گھر سے معلوم کیا؟" کومل کا سوال بہت سے اندیشے سمیٹے ہوئے تھا۔

"ہاں میں نے ابھی ابھی کال کی ہے کسی ملازم نے اٹینڈ کی ہے کال اور بتایا ہے کہ رنم بی بی گھر پہ نہیں ہیں۔"

"اس کا سیل فون بھی آف ہے۔" کومل نے بتایا۔

"سیل فون آف کرکے وہ اپنے گھر ہی چھوڑ آئی ہے۔ اس لیے آف مل رہا ہے۔"

"فراز تم نے احمد انکل کو بتایا اس کے بارے میں؟" کومل نے محتاط ہو کر پوچھا۔

"نہیں میں نے کچھ نہیں بتایا ہے۔ جب وہ مجھ سے پوچھیں گے۔ تو بتاؤں گا ورنہ نہیں۔"

"فراز وہ مجھ سے بھی تو پوچھیں گے نا۔"

"ڈونٹ وری کومل۔" فراز نے اسے تسلی دی۔

"وہ کہاں ہوگی اب؟"

"مجھے جیسے ہی پتا چلا کہ وہ ڈرائنگ روم میں نہیں ہے تو اسی وقت میں نے اسے پورے گھر میں تلاش کیا۔ ناکامی پہ میں نے اسے ادھر ادھر قریب کے علاقے میں ڈھونڈا۔ ابھی تمہاری کال آنے سے پانچ منٹ پہلے ہی گاڑی پورچ میں کھڑی کرکے آیا ہوں۔" فراز خود بہت پریشان تھا۔

"میں راعنہ سے کال کرکے پوچھتی ہوں اور اشعر سے بھی۔ ہوسکتا ہے وہ ان کی طرف ہو۔" کومل پرامید تھی۔

"اشعر کو میں نے کال کی تھی اس نے لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔ باقی میرا نہیں خیال کہ وہ راعنہ کی طرف جاسکتی ہے۔ پھر بھی تم پوچھ لو۔"

فراز کے ساتھ رابطہ منقطع کر کے کومل نے فوراً راعنہ کو کال ملائی۔ فراز کا اندیشہ سچ ثابت ہوا۔ رنم اس کی طرف بھی نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆
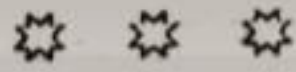
امیر علی کا کمرا ڈرائنگ روم کی مشرقی سمت میں واقع تھا اس لیے گھر کے دیگر حصوں میں ہونے والی سر گرمیوں کی سن گن بہت کم ان تک پہنچ پاتی تھی۔ جب تک کوئی بات مکمل طور پہ ان کے علم میں نہ لائی جاتی وہ آگاہی سے محروم رہتے۔ پروہاب اور زرینہ کے جھگڑے کی آواز ان کی سماعتوں تک بھی پہنچی تھی اسی لیے انہوں نے زرینہ سے استفسار کیا۔

"یہ وہاب اتنا تیز تیز کیوں چلا رہا تھا؟" دوائی کھاتے کھاتے انہوں نے اچانک سوال کیا۔

"اس کا دماغ خراب ہو رہا ہے اور بس۔" زرینہ نے ٹالنے کی کوشش کی۔

"وہ زیان کا نام بھی لے رہا تھا کیوں؟" اس بار سوالیہ بے بسی ان کے لہجے سے واضح تھی۔

"اصل میں وہاب کی مرضی ہے زیان سے اس کا رشتہ ہو جائے پر آپا روبینہ ایسا نہیں چاہتیں انہوں نے خاندان کی ہی ایک لڑکی وہاب کے لیے پسند کر رکھی ہے۔ وہ میرے پاس آیا تھا کہ اس کی ماں کو سمجھاؤں۔" زرینہ نے اعتماد سے جھوٹ بولا۔

"یہ میرا گھر ہے کوئی مچھلی بازار نہیں ہے۔ جو وہ اتنا شور شرابا کر کے گیا ہے۔" امیر علی کا انداز بتا رہا تھا کہ انہوں نے بہت کچھ سن لیا ہے۔

"منعفت خانم کو آپ کوئی صاف جواب دے ہی نہیں رہے ہیں زیان کی کشتی جب تک کسی کنارے نہیں لگتی تب تک یہی ہو گا۔ آپ کو کتنی بار کہا کہ کمال کے رشتے کے لیے ہاں کر دیں ورنہ زیان کی ماں کی شہرت کی وجہ سے اس کے ساتھ یہی ہو گا۔"

زرینہ نے ان کے زخموں پہ نمک چھڑکنے میں انتہا کر دی تھی۔ جواباً" وہ بے بسی سے انہیں دیکھ کر رہ گئے۔ بہت سال پہلے انہوں نے ذرا سے شک کے پیچھے اپنا گھر اجاڑ کر زرینہ سے شادی رچائی تھی اور اسے ایک ایک کمزوری سے آگاہ کیا۔ زرینہ بیگم تب سے اب تک ان کی کمزوریوں سے کھیلتی آ رہی تھی۔ زیان کی صورت میں ایک جیتا جاگتا کھلونا بھی ان کے پاس تھا۔

"بس کر جاؤ زرینہ بیگم۔ میں نے بہت بڑی غلطی کی تھی۔" امیر علی نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا تھا۔ وہ دور بیٹھی تمسخرانہ نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

عنیزہ سونے کے لیے لیٹ چکی تھیں۔ ارسلان مطالعے میں مصروف تھے۔ عنیزہ بستر پہ نیم دراز ہوئیں تو انہوں نے بھی کتاب رکھ دی۔

"کل کے لیے تیاری کر لی ہے نا؟" وہ انہیں سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

"جی ہاں سب تیاری مکمل ہے۔" وہ آنکھیں موندے موندے بولیں۔ ان کے چہرے پہ تھکن تھی۔ شاید دن بھر کی مصروفیت کا نتیجہ تھا۔ صبح انہیں اپنے کام کے سلسلے میں دوسرے شہر جانا تھا اور قیام ہوٹل میں تھا۔

ارسلان ادبی ذوق کے مالک تھے وقتاً "فوقتاً" وہ شہر میں ہونے والی ادبی سرگرمیوں میں شرکت کرتے رہتے تھے۔ تقاریب کے دعوت نامے آئے دن ملتے۔ ان دونوں یعنی ملک ارسلان اور عنیزہ نے کچھ روز کے لیے گاؤں سے باہر جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ عنیزہ ویسے بھی ادبی سرگرمیوں اور دلچسپیوں میں ان کے ساتھ ہی ہوتی تھیں۔

ملک ایبک کو ان دونوں کے ہوٹل میں قیام پہ اعتراض تھا کیوں کہ شہر میں ان کا عالیشان گھر موجود تھا۔ پر ہوٹل میں قیام کرنا ان کی مجبوری تھی۔ کیوں کہ وہ جس ادبی تقریب میں شرکت کرنے جا رہے تھے وہ اسی ہوٹل میں منعقد ہونی تھی اس لیے ملک ارسلان نے وہاں قیام کو اولیت دی تھی کیوں کہ تقریب میں ان

کے پسندیدہ شعرا بھی مدعو تھے۔ ایک سے انہوں نے معذرت کرلی تھی۔

اولاد سے محرومی کے دکھ کو ان دونوں میاں بیوی نے اپنی اپنی مصروفیات میں بھلانے کی کوشش کی تھی اور اس میں کافی کامیاب بھی تھے۔ اس بار شہر آنے کا فیصلہ انہوں نے عنیزہ کی ذہنی صحت کے پیش نظر کیا تھا کیوں کہ انہیں بار بار ڈپریشن کے دورے پڑنے لگے تھے۔

وہ ماضی کی بھول بھلیوں میں گم ہو رہی تھیں۔ ماضی جو ہمیشہ سے ان دونوں کے لیے اذیت ناک رہا تھا۔ ملک ایبک اسے ماضی کے عمیق غاروں سے نکالنا چاہ رہے تھے اور اس میں کافی کامیاب بھی رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ عنیزہ کل شہر جانے کے تصور سے خوش تھیں۔

☼ ☼ ☼
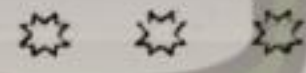
احمد سیال پاگلوں کی طرح رنم کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔

رات گئے انہوں نے باری باری رنم کے سب دوستوں کو کال کر کے اس کے بارے میں پوچھا۔ فراز نے سچائی سے سب حالات ان کے گوش گزار کردیے تھے۔ وہ خود چل کر فراز کے پاس آئے تھے۔ کومل کی زبانی رنم کی بابت سن کر وہ ڈھے سے گئے۔

فراز کو ساتھ لے کر انہوں نے رنم کی سب سہیلیوں، دوستوں سے اس کے بارے میں پوچھا۔ بدنامی کے ڈر سے وہ اس بات کو پھیلانے سے ڈر رہے تھے ان کے دوست احباب رنم کی گمشدگی سے واقف ہو جاتے تو کتنی باتیں بنتیں انہیں اپنی عزت اور خود داری عزیز تھی۔ اس لیے خاموشی سے انہوں نے رنم کی تلاش کے لیے ممکنہ جگہیں دیکھ ڈالیں۔ وہ کہیں بھی نہیں تھی اور کوئی ایسا ثبوت بھی نہیں تھا جس کی بنا پر وہ اسے اغوا شدہ گردانتے۔ وہ خود اپنی مرضی سے گھر چھوڑ کر گئی تھی جو گم ہو جاتے ہیں انہیں تلاش کیا جا سکتا ہے پر وہ جو اپنی مرضی سے گئی تھی احمد سیال اسے کہاں تلاش کرتے اس نے کوئی سراغ نہیں چھوڑا تھا۔ فراز کے مشورے پہ انہوں نے احتیاطاً رنم کی گمشدگی کی رپورٹ پولیس میں درج کروا دی تھی۔

فراز نے ان کی بہت مدد کی تھی ہر جگہ رنم کو تلاش کرنے کی مہم میں وہ احمد سیال کے ساتھ ساتھ رہا تھا۔ رنم کی پراسرار گمشدگی احمد سیال کے ساتھ ساتھ باقی ان سب دوستوں کے لیے بھی معمہ بنی ہوئی تھی۔

طویل سیاہ رات گزر چکی تھی۔ سپیدہ سحر اندھیری رات کا سینہ چیرتے ہوئے نمودار ہونے کی فکر میں تھا۔ احمد سیال پوری رات میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سو پائے تھے۔ انہیں ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ شدید کرب کے حصار میں ہیں ان کی یہ جاں کنی کی کیفیت ختم ہونے والی نہیں تھی۔ ان کی رنم گھر پہ نہیں تھی۔ وہ اپنے گھر تھے پر ان کی لاڈلی بیٹی نے کہاں اور کیسے رات گزاری تھی وہ اس سے لاعلم تھے۔

محض ایک رات میں ہی وہ برسوں کے بیمار نظر آ رہے تھے۔ چوڑے کندھے جھک گئے تھے چہرے پہ زردی کھنڈی تھی۔ انہوں نے پولیس میں رپورٹ درج کروادی تھی۔ ان کا دوست ایس پی گوندل خود رنم کی گمشدگی سے متعلق معاملات کو دیکھ رہا تھا پر ابھی تک اس کی طرف سے بھی کوئی حوصلہ کن خبر نہیں ملی تھی۔

رنم کو اگر خبر ہو جاتی کہ احمد سیال کس کرب اور اذیت سے گزر رہے ہیں تو ایسے گھر چھوڑ کر جانے سے پہلے یقیناً" وہ بہت بار سوچتی۔ رات سے انہوں نے کھانے کے نام پہ پانی کے چند گھونٹ ہی پیے تھے۔

☼ ☼ ☼

رنم کو ہوٹل میں کمرا لینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ ہوٹل بہت اچھا تھا۔ کمرا بھی اس کی پسند کے مطابق تھا پر اندر اندر ہی کوئی چیز رہ کر پریشان کر رہی تھی۔ ہوٹل میں رنم کا تیسرا دن تھا۔ اس دوران وہ ایک بار بھی اپنے کمرے سے باہر نہیں

نکلی۔ تینوں وقت ناشتا چائے پانی کھانا کمرے میں ہی منگواتی۔ ہوٹل کے کچھ ملازم اور بیرے اس کی طرف سے نامعلوم تجسس کا شکار ہو رہے تھے۔ نہ وہ کہیں گئی تھی نہ اسے کوئی ملنے آیا تھا۔ اس شاندار سہولیات سے مزین ہوٹل میں اس نے پورے ایک ماہ کے لیے کمرا بک کروایا تھا۔

سامان کے نام پہ اس کے پاس صرف چھوٹا سا ایک سوٹ کیس اور ہینڈ بیگ تھا اور سب سے حیرت انگیز بات اس کے پاس سیل فون بھی نہیں تھا۔ صفائی کرنے والے لڑکے نے نظر بچا کر اس کے سامان اور کمرے کی سرسری سی تلاشی لی تھی۔

ہوٹل میں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں کسی کا قیام مختصر اور کسی کا طویل ہوتا ہے پر رنم کی طرف سے ہوٹل اسٹاف کے کچھ لوگ تجسس کا شکار ہو رہے تھے۔ لڑکی خوب صورت اور اونچے گھرانے کی لگ رہی تھی صاحب حیثیت بھی تھی تب ہی تو اس مہنگے ہوٹل میں آکر ٹھہری تھی۔ ورنہ عام انسان تو یہاں کی ایک چائے کی پیالی بھی افورڈ نہ کر سکتا تھا۔

رنم کے پاس پیسے تیزی سے کم ہو رہے تھے۔ وہ ہینڈ بیگ میں موجود سب چیزیں باہر نکال نکال کے دیکھ رہی تھی۔ بظاہر سب چیزیں پوری تھیں پھر بھی کہیں نہ کہیں کسی کمی کا احساس ہو رہا تھا۔ رنم ہینڈ بیگ میں موجود چیزیں اندر ڈال کر نقد پیسے گن رہی تھی جب دروازے پہ ہلکی آواز میں دستک ہوئی۔

"یس کم ان۔" اس نے مصروف انداز میں کہا خود وہ اپنے کام میں لگی رہی۔ اسے کھانا پہنچانے والا بیرا دبے قدموں اندر داخل ہوا۔ وہ رنم کی پشت پہ کھڑا تھا۔ آہٹ پہ وہ چونک کر سیدھی ہوئی اور بیرے کو دیکھ کر بڑبڑاتے ہوئے پیسے اور دیگر چیزیں سب تکیے کے نیچے کر دیں۔ پر اس کے چھپانے سے پہلے ہی وہ سب کچھ دیکھ چکا تھا۔

بیرے کے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھی۔ اس نے اپنے تاثرات سے ذرا بھی ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ سب دیکھ چکا ہے۔ اس نے کھانے کی ٹرے ٹیبل پہ رکھی اور ادب سے سلام کر کے باہر آگیا۔ بیرے نے اسے پیسے گنتے دیکھا تھا پر ساتھ ہی اس نے ہینڈ بیگ سے باہر رہ جانے والے سونے کی زیورات بھی رنم کی لاپروائی کی وجہ سے دیکھ لیے تھے۔ اسے پوری امید تھی کہ لڑکی کے پاس اور بھی بہت کچھ ہو گا کیوں کہ وہ موٹی آسامی لگ رہی تھی۔

اس کی نیت میں فتور آچکا تھا۔ لڑکی جوان اور خوب صورت تھی سونے پہ سہاگا اکیلی تھی ابھی تک تو اس نے لڑکی کے ساتھ کسی کو بھی نہیں دیکھا تھا نہ اس نے کسی سے رابطہ کیا تھا۔ یعنی دوسرے الفاظ میں وہ اس کے لیے آسان ترین شکار ثابت ہو سکتی تھی۔ اس لیے رنم کو کھانا پہنچا کر واپس جاتے ہوئے اسے اپنے منصوبے کے بارے میں سوچتے ہوئے سرور آرہا تھا۔

☼ ☼ ☼
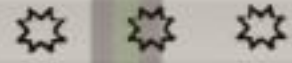
کمرے میں بند رہ رہ کر رنم اکتا گئی تھی۔ ڈرتے ڈرتے اس نے پہلی بار کمرے سے باہر قدم رکھا۔ اس نے بیرے کو پہلے ہی کھانا لانے سے منع کر دیا تھا۔ وہ آزاد فضا میں تھوڑی دیر بیٹھ کر اپنے مسائل کا حل سوچنا چاہ رہی تھی سب سے بڑا مسئلہ تو تیزی سے ختم ہوتی ہوئی رقم کا تھا۔

اس نے گھر سے نکلنے سے پہلے گنے بغیر پیسے بیگ میں ڈالے تھے اچھی خاصی رقم تھی' لیکن اسے گننے کے بعد کم لگ رہی تھی۔ اس کی فکر اپنی جگہ تھی' لیکن ابھی اس کے پاس اچھی خاصی مالیت کے زیورات بھی تھے جو اس کی ذاتی ملکیت تھی۔ کریڈٹ کارڈ اور اے ٹی ایم کارڈ اس کے علاوہ تھے۔ اس کے باوجود بھی وہ پریشان تھی۔ شاید اسے پیش آنے والی تلخ حقیقتوں کا کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا ایک ثانیے کے لیے اس کے جی میں آئی کہ گھر واپس چلی جائے' لیکن فوراً ہی اس نے اپنے اس خیال کا گلا مضبوطی سے گھونٹ دیا۔ وہ احمد سیال سے بہت شدید ناراض تھی۔

کھانا ویٹر نے سرو کر دیا تھا پر اس نے کھانے کو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

اسی ڈائننگ ہال میں اور بہت سے لوگوں کے ساتھ عنبزہ بھی تھیں۔ عنبزہ کی نظر کھانے کے دوران اچانک رنم پہ پڑی۔ سب ہی کھانا کھا رہے تھے پر شکل سے اداس اور پریشان نظر آنے والی لڑکی کھانے کی طرف بالکل بھی متوجہ نہیں تھی۔ کھانے کو سامنے رکھے وہ غیر مرئی نکتے کو دیکھ رہی تھی۔ عنبزہ کو اپنے بائیں پسلو میں شدید چبھن کا احساس ہوا۔ کرب کی ایک لہر پورے وجود میں ایک ثانیئے کے لیے بے دار ہوئی۔ دل اس اجنبی لڑکی کی طرف کسی معصوم بچے کی مانند ہمک رہا تھا۔ اپنی اس کیفیت سے وہ خود بھی حیران تھیں۔ لڑکی کے چہرے کی اداسی دیکھ کر اس کا اپنا دل گہری اداسی میں ڈوب گیا تھا۔ بہت ضبط کے باوجود جب عنبزہ سے رہا نہیں گیا تو وہ اٹھ کر اس کی ٹیبل کی طرف آ گئیں۔ جواب بھی خوف زدہ ہرنی کی مانند ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کسی خوف کے گہرے سائے صاف دکھائی دے رہے تھے۔

"کیا میں یہاں آپ کے پاس بیٹھ سکتی ہوں؟" عنبزہ کی نرم شائستہ آواز پہ وہ چونک کر ان کی طرف متوجہ ہوئی۔ اب اس کے چہرے پہ خوف کے سایوں کی جگہ ایک رسمی مسکراہٹ نظر آ رہی تھی پر اس میں بھی ہزاروں سوال اور خدشے تھے۔ جانے یہ کون تھیں اور کیوں اس کے پاس آئی تھیں۔

"پلیز بیٹھیے۔" عنبزہ کا لہجہ لباس اور شکل و صورت ہرگز بھی نظر انداز کیے جانے کے قابل نہ تھی تب ہی رنم نے انہیں بیٹھنے کی آفر کی۔ وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ شکریہ ادا کرتے ہوئے بیٹھ گئیں۔

اگلے دس منٹ میں رنم ان کے ساتھ کافی اطمینان سے باتیں کر رہی تھی۔ ملک ارسلان اپنے ایک شاعر دوست کے ساتھ کسی ادیب سے ملنے گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے عنبزہ کو بھی ساتھ چلنے کی آفر کی تھی پر انہوں نے نرمی سے منع کر دیا۔ تب ہی تو وہ یہاں اکیلے کھانا کھا رہی تھیں۔

ملک ارسلان کی ساتھ نہ جانے کی صورت میں ہی تو ان کی ملاقات نمناں نامی اپنی اپنی سی لگنے والی لڑکی سے ہوئی تھی۔ ایک لحاظ سے اچھا ہی ہوا تھا ورنہ وہ اسے کیسے ملتیں۔ دل کی اس بے اختیار کیفیت پہ وہ خود بھی حیران تھیں۔

نمناں اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ عنبزہ نے اسے اپنا کانٹیکٹ نمبر دیا تھا اور ہوٹل کے روم کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ رنم نے انہیں اپنا نام نمناں بتایا تھا۔ عنبزہ نے اسے کافی ساری باتیں کی تھیں۔ سوال پوچھے تھے پر وہ صفائی سے ٹال گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ملک ارسلان رات کو کافی لیٹ ہوٹل واپس آئے۔ عنبزہ بے تابی سے ان کا انتظار کر رہی تھیں۔ محبوب بیوی کے چہرے پر دبا دبا جوش انہیں ایک نظر ڈالتے ہی محسوس ہو گیا تھا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔ وہ نمناں کے بارے میں بات کر رہی تھیں۔ ملک ارسلان ان کی اس قدر دلچسپی محسوس کر کے خود بھی پوری توجہ سے سن رہے تھے۔

"جانے کیا بات ہے پہلی ہی نظر میں وہ مجھے اپنی اپنی سی لگی ہے۔ کچھ پریشان اور کھوئی کھوئی سی تھی میں نے بہت پوچھا پر اس نے بتایا نہیں۔"

"تو کل پوچھ لینا۔" ارسلان نے مسکراتے ہوئے مشورہ دیا۔

"ہاں میں نے اسے اپنا سیل نمبر بھی نوٹ کروایا ہے اور روم نمبر بھی بتایا ہے۔" عنبزہ فوراً بولیں۔

"تو ہماری بیگم کو وہ لڑکی بہت پسند آ گئی ہے۔" ملک ارسلان محبت بھری نگاہوں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

"اسے دیکھ کر مجھے بہت کچھ یاد آ گیا ہے۔ یہاں پہلو میں چبھن ہو رہی ہے۔" عنبزہ اچانک سنجیدہ ہو گئیں۔ ان کا مسکراہٹ سے مزین روشن چہرا اور جوت دیتی نگاہیں بجھ سی گئی ہیں۔ ملک ارسلان اچھی طرح جانتے تھے اب کیا ہو گا کیونکہ عنبزہ ان کی طرف سے کروٹ بدل کر لیٹ گئی تھیں۔ بظاہر آنکھیں بند

کیسے سو رہی تھیں مگر حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔

آج کی شب ان پہ بہت بھاری تھی۔ انہوں نے خیالوں ہی خیالوں میں ماضی کا تکلیف دہ سفر طے کرنا تھا۔ اس کے اختتام پہ ان کا درد اور بھی بڑھ جاتا تھا۔ یہ برسوں سے ہو رہا تھا لیکن ابھی تک اس اذیت ناک سفر کا پہلا پڑاؤ ہی ختم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ ملک ارسلان ان کی اذیت اور درد سے واقف ہونے کے باوجود انجان بنے ہوئے تھے وہ نہیں چاہتے تھے عنیزہ کا بھرم ٹوٹے۔

☼ ☼ ☼
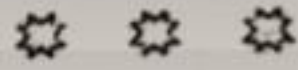
بدحواسی میں رنم نے پورا بیگ چھان مارا تھا۔ ایک ایک چیز باہر نکال کر دیکھی۔ نہ جیولری تھی نہ ہی کریڈٹ کارڈز۔ صرف اے ٹی ایم کارڈز پڑے اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ اس نے موہوم سی امید کے سہارے دوسرا بیگ کھولا کہ شاید اس نے سب چیزیں بے دھیانی میں وہاں رکھ دی ہوں پر وہاں تو صرف استعمال کے کپڑے اور دیگر اشیاء تھیں۔

اس کا جی چاہ رہا تھا دھاڑیں مار مار کے روئے۔ اب اس کے پاس پھوٹی کوڑی تک نہ تھی۔ وہ صرف ایک بار رات کو کھانے کھانے دوسرے الفاظ میں اندرونی گھٹن اور خلفشار سے پیچھا چھڑانے کے لیے کمرے سے باہر گئی تھی۔ اس دوران سب کچھ صفائی سے پار کیا گیا تھا۔ اس بات کا اسے سو فی صد یقین تھا۔

یہ حادثہ اس کے ساتھ رات کو ہوا تھا۔ اب دوپہر ہو چلی تھی۔ وہ صدمے کی حالت میں بیٹھی تھی۔ دوپہر سے شام ہو گئی۔ وہ باہر نہیں نکلی۔ روم سروس کی طرف سے کھانا آیا اس نے دروازہ ہی نہیں کھولا۔ اس کی حالت ابتر ہو رہی تھی۔

رات سر پہ تھی۔ ایک بار پھر دروازے پہ دستک ہوئی۔ اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے دروازہ کھولا۔ بیرا کھانا لایا تھا۔ رنم نے پیچھے ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ خود وہ دروازے کے پاس کھڑی تھی کہ بیرا جائے تو وہ دروازہ اندر سے لاک کرے۔ پر وہ کھانے کی ٹرے رکھ کر اسی طرح کھڑا رنم کو دیکھ رہا تھا۔

"آپ پریشان لگ رہی ہیں۔ کوئی پرابلم ہے بتائیں۔" ہوٹل کا معمولی سا ملازم بڑے معنی خیز انداز میں پوچھ رہا تھا جیسے رنم کا وہ بڑا ہمدرد رہا ہو۔

"تم سے مطلب جاؤ یہاں سے۔" رنم کا فطری غصہ عود کر آیا۔

"میں آپ کے بہت کام آسکتا ہوں۔ صرف ایک موقع دیں مجھے۔ مجھے سب معلوم ہے آپ اکیلی ہیں، پریشان ہیں۔ آپ کے پاس کچھ نہیں ہے۔ میں آپ کے سب مسئلے حل کر سکتا ہوں۔ اگر آپ...." رنم کے غصے کے باوجود اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ اس کے ادھورے فقرے کا مفہوم وہ اچھی طرح جان گئی تھی۔

"یہاں سے فوراً" نکل جاؤ" میں مینجر سے تمہاری شکایت کروں گی۔" وہ اسے کھلے لہجے میں دھمکی دے رہی تھی۔ ہوٹل کے اس ملازم کو اس کی مجبوری اور کمزوری کا احساس تھا' تب ہی تو ڈھٹائی سے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"میں رات کام ختم کر کے آؤں گا۔ میری بات مانو گی تو فائدے میں رہو گی۔ ویسے مجھے تم گھر سے بھاگی ہوئی لگتی ہو۔ تمہارا عاشق عیش کرنے کے بعد تمہیں چھوڑ گیا ہے اور تم اب مشکل میں ہو۔ اکیلی لڑکی ہو سب ہوٹل اسٹاف کی نگاہوں میں آگئی ہو۔ چند دن کی بات ہے' سب نے تمہیں بہتی گنگا سمجھ کر ہاتھ دھونے ہیں۔ اس لیے بہتری اسی میں ہے کہ مجھ سے سیٹنگ کر لو۔ فائدے میں بھی رہو گی اور سب سے بچ بھی جاؤ گی۔ اچھی طرح سوچ لو۔ ورنہ تم جیسی اکیلی لڑکی کو مار کر غائب کر دینا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔"

وہ انسانی نفسیات کا ماہر لگ رہا تھا۔ رنم کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے بہت کچھ بھانپ گیا تھا۔ رنم بالکل سن ہو گئی تھی۔ وہ مسکراتا ہوا چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد رنم نے دروازہ بند کیا اور بیگ میں ہاتھ مار کر اپنا سیل فون ڈھونڈا۔ وہ ہوتا تو ملتا۔ اسے یاد آیا وہ اپنا سیل فون تو آف کر کے اپنے بیڈ روم میں ہی چھوڑ آئی تھی۔

وہ اس وقت کو پچھتا رہی تھی، جب سیل فون گھر چھوڑ کر نکلی تھی۔

اس کے دل میں اچانک ہی خیال آیا تھا کہ وہ اپنے گھر فون کرے۔ پاپا کو سب کچھ بتادے اور پھر دیکھے کہ وہ کیسے ان ہوٹل والوں کی ایسی کی تیسی کرتے ہیں۔ مگر اس کے پاس فون نہیں تھا پیسے بھی نہیں تھے، پر وہ ہوٹل کے ریسپشن سے تو فون کر سکتی ہے۔ اس خیال نے اس کے قدموں میں تیزی بھر دی۔ اگلے پانچ منٹ میں وہ ہوٹل کے ریسپشن پہ موجود تھی۔ وہاں پہ اس وقت ہوٹل اسٹاف کے تین نوجوان کھڑے تھے۔ تینوں نے اسے معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔

اس نے بے ربط ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں مدعا بیان کیا تو ایک آدمی کی مسکراہٹ گہری ہوگی۔ گویا اس کے کمرے میں کھانا سرو کرنے والے بیرے نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ وہ اس کے سب ساتھیوں کی نظروں میں آگئی ہے۔ ایک نے جیسے اس کی غیر ہوتی حالت پہ ترس کھاتے فون اس کی طرف کھسکایا۔ وہ ریسیور اٹھائے خالی الذہنی کے عالم میں پاپا کا نمبر یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن اسے نمبر یاد نہیں آرہا تھا۔ حالانکہ پاپا کا نمبر اسے ازبر تھا۔ اس نے تین چار پاپا کا نمبر یاد کرکے ڈائل کرنے کی کوشش کی، پر اسے ناکامی ہوئی۔ اس ناکامی پہ اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اچانک اسے یاد آیا وہ فکسڈ لائن نمبر پہ بھی تو کال کر سکتی ہے۔ اسے نمبر یاد تھا۔ اس نے تیزی سے نمبر پش کیے۔

بیل جا رہی تھی۔ بہت دیر بعد کال ریسیو ہوئی۔ کسی نے زور سے ہیلو کہا۔ بس منظر سے رونے، پیٹنے، آہ و بکا کی دلدوز آوازیں آرہی تھیں۔ اس کے دل نے ایک بیٹ مس کردی۔ نہیں... نہیں... اس کے پاپا کو کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس کی زبان جیسے ہلنے سے انکاری تھی۔ اس کی متغیر ہوتی رنگت اور لرزتا کانپتا جسم دیکھ کر ایک نوجوان نے فون کا ریسیور اس سے لے لیا۔

وہ خود بات کر رہا تھا۔ شاید اسے رنم کی حالت پہ ترس آگیا تھا۔ ایک منٹ بعد اس نے فون بند کیا تو اس کی آنکھوں اور لہجہ میں ہمدردی تھی۔ دوسرے دو نوجوانوں کی نسبت اس نے مہذب رویے کا مظاہرہ کیا۔

"آپ نے جس نمبر پہ کال کی ہے، اس گھر کے مالک کا آج انتقال ہو گیا ہے۔" اس نے پگھلا سیسہ رنم کے کانوں میں انڈیلا۔

وہ بہت مشکل سے خود کو کمرے تک واپس لائی اور بستر پہ گر سی گئی۔ صدمات کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا، اس کا برا وقت آگیا تھا۔ جیولری، نقدی سب کچھ پراسرار طور پہ غائب ہو چکا تھا۔ وہ ہوٹل اسٹاف کی نگاہوں میں تھی۔ سب رال ٹپکانے کو تیار بیٹھے تھے اور اب پاپا بھی اسے چھوڑ کر جا چکے تھے۔ وہ تو گھر واپس آنے کے لیے انہیں کال کرنے گئی تھی۔ واپسی پہ دل پہ بھاری صدمے کا بوجھ اٹھائے لوٹی۔ اب اس کی عزت اور جان خطرے میں تھی۔ اسے اپنے بچاؤ کا راستہ تلاش کرنا تھا۔

اچانک اسے عنیزہ ملک کا خیال آیا۔ انہوں نے اسے اپنا فون نمبر دیا تھا اور روم نمبر بھی بتایا تھا۔ وہ سیکنڈ فلور روم نمبر 26 میں ٹھہری ہوئی تھیں۔ پاپا تو رہے نہیں تھے۔ اب وہ گھر کس منہ سے جاتی۔ کاش وہ گھر نہ چھوڑتی، کاش وہ ان کی بات مان لیتی۔ منہ پہ پانی کے چھپاکے مارتی وہ زار و قطار روتی جا رہی تھی۔ وہ عنیزہ ملک کے پاس جانے کے لیے تیار تھی۔ اس وقت اس کے پاس اور کوئی بھی راستہ نہیں بچا تھا۔

اپنے اس گھر میں کیسے جاتی، جہاں اب پاپا نہیں رہے تھے۔ سب نے اسے پاپا کا قاتل ٹھہرانا تھا۔ اس کی ضد تھی کہ وہ ان سے کچھ نہیں لے گی، تو یہ دربدری و محرومی کی سزا اس کے لیے بالکل جائز تھی۔ روم نمبر 26 کے سامنے کھڑے دروازہ ناک کرتے وہ اپنے پاپا کے بارے میں ہی سوچے جا رہی تھی۔

تیسری دستک پہ دروازہ کھل گیا۔ اندر عنیزہ کے ساتھ ملک ارسلان بھی تھے۔ وہ بجلی کی تیزی سے اندر آئی۔

"پلیز... ہیلپ می...." وہ عنیزہ ملک کے ہاتھ پکڑ

کر بکھرے ہوئے لہجہ میں بولی۔ آنسوؤں کی برسات اس کی آنکھوں سے جاری تھی۔ وہ دونوں پریشانی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ نہ جانے یہ ستم رسیدہ حرماں نصیب کون تھی۔ کون سا دکھ پہنچا تھا اسے جو اس کی آنکھیں ساون بھادوں کا منظر پیش کر رہی تھی۔ روتے روتے وہ بول رہی تھی اور بار بار اس کی آواز ڈوب رہی تھی جیسے بولنے کی طاقت ختم ہو گئی ہو۔

اس کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ کا لب لباب کچھ یوں تھا کہ ہینڈ بیگ میں سے اس کی سب چیزیں غائب ہو گئی ہیں۔ والدین حیات نہیں ہیں۔ وہ اکیلی ہے۔ وہ اتفاقی طور پہ ایک حادثے کا شکار ہو کر اس ہوٹل میں پہنچی ہے۔ اس کی جمع پونجی پہ کسی نے ہاتھ صاف کر دیا ہے اور اب اسے اپنی جان اور عزت کی طرف سے شدید خطرہ ہے۔

وہ جس طرح رو رہی تھی جس ابتر حالت میں تھی۔ اس پہ کسی طور بھی یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اس کی من موہنی معصوم صورت دھوکا دینے والی نہیں لگ رہی تھی۔ ملک ارسلان نے عنیزہ کو اشارہ کیا کہ رنم کو بٹھائے، تسلی دے، خود بخود ہی ان کے دل میں نرم گوشہ پیدا ہو۔ عنیزہ نے گلاس میں پانی ڈال کر زبردستی اسے پلایا۔

"میں مینجر سے خود بات کرتا ہوں۔" ملک ارسلان نے اسے تسلی دی۔

"نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں سب کچھ گنوا چکی ہوں۔ اب عزت نہیں گنوانا چاہتی۔" اس بار ہچکیوں سے اس کا سارا جسم لرز رہا تھا۔ عنیزہ کی اپنی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ اس اجنبی لڑکی کے لیے وہ اپنے دل میں بے پناہ محبت محسوس کر رہی تھیں۔ اس کا دکھ انہیں اپنا دکھ لگ رہا تھا۔ "اب تم کیا کرو گی؟" عنیزہ نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

"میں بے سہارا ہوں، بے آسرا ہوں، اتنی طاقت نہیں ہے کہ کچھ کر سکوں۔" آنسو مسلسل اس کی آنکھوں سے بہے جا رہے تھے۔ عنیزہ نے ارسلان کو اشارہ کیا۔ دونوں رنم کو کمرے میں چھوڑ کر باہر آ گئے۔

جانے کیا بات تھی کہ رنم کا دل چاہ رہا تھا ان پہ اعتبار کر لے۔ یہ ہی وجہ تھی کہ جب وہ دونوں اسے کمرے میں اکیلا چھوڑ کر باہر نکلے تو اسے ان کی نیت پہ کوئی شک نہ ہوا۔

عنیزہ ملک ارسلان سے رنم کے بارے میں بات کرنا چاہ رہی تھیں۔ اسی لیے دونوں ہوٹل کے ایک الگ تھلگ گوشے میں آ گئے، جہاں چہل پہل کافی کم تھی۔ "یہ لڑکی بہت دکھی اور ستم رسیدہ لگتی ہے، ہے بھی اکیلی، اب کیا کرنا ہے اس کا، ہم سے کتنی امیدیں لے کر مدد مانگنے آئی ہے۔" عنیزہ نے بات کا آغاز کیا۔

"میں اپنے ایک دوست کو کال کرتا ہوں۔ پولیس ڈپارٹمنٹ میں اعلا عہدے پہ ہے۔ اس لڑکی کو بحفاظت دارالامان پہنچا دے گا یا بے سہارا عورتوں کے محفوظ مرکز میں۔"

"اس کی شکل و صورت دیکھی ہے آپ نے۔ میں نے بے سہارا عورتوں کے مرکز کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔ میں اس حق میں نہیں ہوں کہ یہ دکھی لڑکی وہاں جائے۔"

"تو پھر تم ہی بتاؤ کیا، کیا جائے؟" وہ سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے۔

"نہ جانے کیا بات ہے، یہ لڑکی چند گھنٹوں میں ہی مجھے اپنی اپنی محسوس ہونے لگی ہے۔ ایک بات کہوں، اگر آپ برا نہ مانیں تو......" وہ ہزاروں امیدیں لیے ملک ارسلان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"ہاں بولو تو سہی۔ پہلے تم نے کبھی ایسے اجازت لینے کا تکلف نہیں کیا بات کرنے کے لیے تو پھر اب یہ غیروں والی باتیں کر رہی ہو۔"

"ملک صاحب بات ایسی ہے کہ کرنے سے پہلے سو مرتبہ سوچنا پڑتا ہے۔"

"ہاں بولو تو اب......"

ملک صاحب اگر ہم اس لڑکی کو ساتھ لے جائیں تو؟" عنیزہ نے ڈرتے ڈرتے کہا تو وہ سوچ میں ڈوب گئے۔

"میں لینے کو تو ساتھ لے جاؤں پر سوچ لو۔" کچھ

توقف کے بعد وہ گویا ہوئے۔ "جوان ہے۔ خوب صورت ہے کسی اچھے خاندان کی لگتی ہے۔ ہماری حویلی میں بہت جگہ ہے رہ لے گی۔ ساتھ اسے حویلی میں ہی کسی کام پہ لگادیں گے۔" عنیزہ نے ملک ارسلان کو اور سوچنے کا موقع نہیں دیا۔

"بھائی جان کو اعتراض نہ ہو اس پہ۔" ملک ارسلان نے اس طرف توجہ دلائی تو چند لمحوں کے لیے وہ بھی سوچ میں پڑ گئیں۔

"میں ان سے خود بات کروں گی۔ ویسے بھی یہ ہماری طرف رہے گی۔ بے چاری سی لڑکی ہی تو ہے کوئی نہیں ہے اس کا۔ ثواب ہوگا ہمیں اگر تحفظ دیا اس کو تو اور اللہ بھی خوش ہوگا۔" عنیزہ نے انہیں خاموش دیکھ کر جذبہ ہمدردی ابھارنے کی کوشش کی۔

"میں صرف اسے اس لیے اپنے ساتھ لے کر جارہا ہوں کہ تم اس عمل سے خوش ہوگی۔" ملک ارسلان محبت سے بولے تو حد درجہ انڈر اسٹینڈنگ کے اس مظاہرے پہ عنیزہ کی آنکھیں بھر سی آئیں۔ وہ تو اپنی طرف سے انہیں کونیس کرنے کی کوشش کر رہی تھیں، جبکہ وہ ان کے دل کی بات جان گئے تھے۔ "بعد میں جو ہوا میں دیکھ لوں گا۔" "تم ابھی سے پریشان مت ہو۔ انہوں نے اسے تسلی دی تو عنیزہ کھل کے مسکرائیں۔ یہ جگہ اظہار ممنونیت کے لیے موزوں نہیں تھی، ورنہ وہ شاید فرط جذبات سے رو ہی تو پڑتیں۔

☼ ☼ ☼
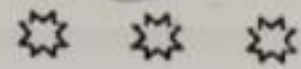
قیامت در قیامت تھی۔ ملک جہانگیر' احمد سیال کے پاس آئے ہوئے تھے۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ جہانگیر اپنے دوست احمد سیال کو کچھ اپ سیٹ سا دیکھ رہے تھے۔ چائے پینے کے بعد وہ فارغ ہوئے تو ملک جہانگیر نے اپنی آمد کی غرض و غائیت بیان کی۔

"میں نے تم سے اپنے بڑے بیٹے کے رشتے کی بات کی تھی۔ اتنے دن گزر گئے ہیں تم نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ میں نے سوچا تم سے مل بھی لوں اور اس تاخیر کا سبب بھی دریافت کروں۔" ملک جہانگیر ہلکے پھلکے انداز میں بولے۔ احمد سیال معذرت خواہانہ انداز میں مسکرائے۔

"میں کچھ دیر میں خود گاؤں تمہاری طرف آنے والا تھا۔" اتنا بول کر وہ خاموش ہوگئے۔ ملک جہانگیر ان کے مزید بولنے کے منتظر تھے۔

میری بیٹی رنم اعلا تعلیم کے حصول کے لیے کینیڈا چلی گئی ہے۔ وہ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی' اس لیے میں تم سے معذرت خواہ ہوں۔" وہ بہت دیر بعد آہستہ آہستہ گویا ہوئے۔ جہانگیر کے سینے سے ایک ٹھنڈی سانس خارج ہوئی۔ تو احمد سیال کی پریشانی کی وجہ یہ تھی' اس لیے وہ شرمندہ نظر آرہا تھا۔

"اس میں معذرت والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ نہ تمہیں اس پہ کوئی شرمندگی ہونی چاہیے۔" جہانگیر نے احمد سیال کے کندھے پہ دوستانہ انداز میں ہاتھ رکھتے ہوئے گویا انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔ لیکن خود اندر سے وہ بددل ہوچکے تھے۔ وہ جلد از جلد ملک ایبک کی شادی کے چکر میں تھے اور احمد سیال سے دوستی کے رشتے داری میں بدلنے کے خواہاں تھے۔ یہ امید تو ختم ہی تھی۔ احمد سیال کی لاڈلی اکلوتی بیٹی اعلا تعلیم کے حصول کی خاطر کینیڈا جاچکی تھی اور بے چارا احمد سیال شرمندہ نادم ان کے سامنے بیٹھا تھا۔

"ہم دوست ہیں اور ہمیشہ رہیں گے کیا ہوا جو ہماری دوستی رشتہ داری میں نہ بدل سکی۔" ملک جہانگیر سے احمد سیال کی مسلسل خاموشی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

"ہاں ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لیکن یقین جانو میں بہت شرمندہ ہوں۔ اس لیے اتنے دن گزرنے کے باوجود میری ہمت نہیں ہوئی کہ تم سے بات کروں۔" لیکن میں تمہارا شکر گزار ہوں جو تم نے میری مجبوری کو سمجھا۔

"یار اب بس بھی کرو۔ میں شرمندہ ہو رہا ہوں اب۔" جہانگیر نے قصداً" مزاحیہ انداز اختیار کیا اور واقعی کچھ دیر بعد احمد سیال بظاہر نارمل ہو کر ان سے

بات کر رہے تھے۔

ملک جہانگیر جا چکے تھے، پر احمد سیال اور بھی پریشان تھے۔ رنم کی پراسرار گمشدگی نے ان کی ذہنی و نفسیاتی کیفیت کو بھی متاثر کیا تھا۔ وہ اپنے مالی معاملات دفتری امور کسی پہ بھی توجہ نہیں دے پا رہے تھے۔ ان کا ذہنی دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ انہیں لاڈلی بیٹی کی ناراضی کا سبب معلوم تھا۔

وہ ان لڑکیوں میں سے نہیں تھی جو ایک شخص کی محبت کی خاطر والدین کی محبتوں سے منہ موڑ کر گھر کی دہلیز پار کر جاتی ہیں۔ بلکہ رنم نے ایک احمقانہ ضد کی خاطر غصے میں آ کر یہ انتہائی قدم اٹھایا تھا۔ اگر وہ کسی کو پسند کرتی محبت کرتی تو احمد سیال کو اس کی بات ماننے میں تامل نہ ہوتا، وہ تو ان کی ہستی کی بنیادیں تک ہلا گئی تھی۔ اب وہ پچھتا رہے تھے کہ پہلی بار ہی اس کی بات تسلیم کر لی ہوتی بہلا دیا ہوتا بیٹی کو۔

وہ رنم کے سب دوستوں خاص طور پہ فراز اور کومل کو روز ہی فون کرتے کہ شاید اس نے ان سے رابطہ کیا ہو یا اس کی کوئی خیر خبر مل جائے۔ فراز نے اپنے طور پہ بہت کوشش کی تھی۔ اس کا سراغ لگانے کی۔ پولیس نے الگ اپنی کارکردگی دکھانے کی کوشش کی تھی۔ یہ سب کام رازداری سے ہوئے تھے، کیونکہ احمد سیال کی شرط ہی یہ ہی تھی کہ رنم کی گمشدگی کا پتا نہیں چلنا چاہیے۔ غالباً" اسی رازدارانہ شرط کے سبب رنم کی گمشدگی معمہ بنی ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ملک ارسلان اور عنیزہ ہوٹل سے چیک آؤٹ کر رہے تھے۔ رنم سخت خوف زدہ تھی۔ ان حالات میں جب ان دونوں نے اسے اپنے ساتھ چلنے کی پیش کش کی تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے یہ امداد غیبی ہو۔ اس نے ان کی یہ پیش کش فوراً" قبول کرلی۔

عنیزہ اس کے پہنے گئے کپڑوں کو تنقیدی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی حویلی کے حساب سے یہ قطعی ناموزوں تھے۔ اس لیے ہوٹل چھوڑنے سے پہلے انہوں نے اس کے لیے کچھ ضروری خریداری کی۔ ہوٹل کے پاس ہی شاپنگ مال تھا انہوں نے رنم کو بھی ساتھ چلنے کی پیش کش کی، پر اس نے انکار کر دیا۔

عنیزہ اس کے لیے کپڑے، جوتے اور استعمال کی کچھ اور چیزوں کی خریداری مکمل کر کے واپس آئیں تو ملک ارسلان گاؤں روانگی کے لیے تیار تھے۔ عنیزہ نے خریدے گئے کپڑوں میں سے ایک سوٹ رنم کی طرف بڑھایا۔

"نہناں تم یہ پہن کر جلدی سے تیار ہو جاؤ اور بال بھی باندھ لو۔" عنیزہ نے تنقیدی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

رنم خاموشی سے کپڑے لے کر چلی گئی۔ یہ امبرائیڈری والی قمیص ٹراؤزر اور ساتھ ہم رنگ دوپٹا تھا۔ اسٹیپس میں کٹے بالوں کو اس نے بمشکل تمام پنیں لگا کر سمیٹا اور پھر پونی باندھی۔ اب اس کی ظاہری شکل و صورت اور حلیہ کافی تبدیل ہو چکا تھا۔ عنیزہ نے دیکھا تو مطمئن ہو گئیں۔

رات کو انہوں نے رنم سے کافی باتیں کی تھیں۔ اپنے خاندان گاؤں اور حویلی کے بارے میں معلومات دی تھیں۔ رنم کو انہوں نے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ حویلی میں کیسے رہنا ہے اور کسی کے پوچھنے پہ کیا جواب دینا ہے۔ رنم نے ان کو اپنا فرضی نام نہناں بتایا تھا۔ اس لیے جب وہ دونوں اسے نہناں کہہ کر مخاطب کرتے تو وہ ایک ثانیے کے لیے چونک سی جاتی۔ شکر ہے انہوں نے اس پہ توجہ نہیں دی تھی۔

رنم نے دوپٹا اچھی طرح اپنے سر پہ جمایا، وہ دوپٹا سر پہ لینے کی عادی نہیں تھی۔ چونکہ جیسی ڈریسنگ وہ کرتی تھی اس میں دوپٹا لینے کی گنجائش نہیں تھی۔ اس لیے دوپٹا سر پہ لینے میں اسے ازحد مشکل پیش آ رہی تھی۔

عنیزہ نے دوپٹا اس کے سر پہ اوڑھا کر ایک سائیڈ پہ پن لگا دی تھی۔ ان کی اس حکمت عملی سے رنم بار بار دوپٹا سنبھالنے کی زحمت سے بچ گئی تھی۔

وہ ملک ارسلان اور عنیزہ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ

گئی تھی۔ ایک نئی منزل کی طرف اس کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ گاڑی شہر سے نکل کر گاؤں والے راستے پہ رواں دواں تھی۔ رنم شیشے کی طرف چہرہ کیے باہر دیکھ رہی تھی۔ سڑک کے دونوں اطراف سرسبز کھیت اور بلند و بالا درخت ایستادہ تھے۔ کہیں کہیں کچے مکانات بھی نظر آ رہے تھے۔ تیز دھوپ' سبز چراگاہوں میں مویشی چرتے نظر آ رہے تھے۔ عورتیں کھیتوں میں کام کر رہی تھیں۔

یہ سب مناظر رنم کے لیے بالکل نئے اور انوکھے تھے۔ شیشے سے باہر کا نظارہ کرتے ہوئے وہ کچھ دیر کے لیے وقتی طور پہ اپنے سب دکھ بھول گئی تھی۔ یہاں کا ماحول اور فضا شہر سے بالکل ہی اچھوتا اور مختلف نظر آ رہا تھا۔

☆☆☆
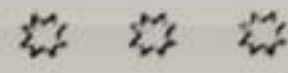
وہاب' روبینہ پہ گرج برس رہا تھا۔ "آپ دونوں مل کر کون کون سے منصوبے تیار کرتی رہی ہیں' سب پتا چل گیا ہے مجھے۔"

"کیا پتا چل گیا ہے تمہیں؟" روبینہ نے پریشانی سے اس کی شکل دیکھی۔

"سنا ہے زرینہ خالہ نے زیان کا رشتہ طے کر دیا ہے؟" ان کے چہرے پہ نظر جمائے وہ لفظ چبا چبا کے بول رہا تھا۔

"ہاں اگر اس نے طے کر دیا ہے تو زیان اس کی بیٹی ہے۔" انہوں نے لہجہ کو سرسری رکھنے کی پوری کوشش کی تھی۔

"امی میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ میں زیان سے شادی کرنا چاہتا ہوں' آپ خالہ سے بات کریں۔"

"میں نے اسے ایک بار نہیں' بہت بار بات کی۔ امیر بھائی نہیں مانتے۔" انہوں نے بیٹے سے نظر چرائی۔

"سب جھوٹ ہے' بکواس ہے۔ زرینہ خالہ نے تمام عمر زیان سے نفرت کی ہے۔ وہ کبھی نہیں چاہیں گی کہ میری شادی اس کے ساتھ ہو۔" روبینہ نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ گویا وہ اتنا بھی انجان نہیں تھا جتنا وہ تصور کرتی تھیں۔

"میں نے بہت بار زرینہ سے بات کی ہے' پر وہ نہیں مانتی۔" وہاب کی محبت میں انہوں نے ایک اہم راز سے پردہ اٹھایا تھا۔ اس کا شک وہاب کو پہلے سے ہی تھا' پر اب یہ شک یقین میں بدل چکا تھا کہ خالہ اس کی اور زیان کی شادی ہونے کے حق میں نہیں ہیں۔

"زرینہ خالہ خود کو بہت ہوشیار سمجھتی ہیں نا۔ ان کی ہوشیاری میں ان ہی کے اوپر آزماؤں گا اب۔" وہاب کے ہونٹوں پہ پراسرار مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"کیا کرنا چاہتے ہو تم؟" روبینہ متوحش ہوئیں۔

"میں نے نہیں کرنا' آپ نے کرنا ہے۔" وہ اسی مسکراہٹ سمیت بولا۔

"کیا کرنا ہے مجھے بتاؤ تو سہی وہاب کیا پہیلیاں بھجوا رہے ہو۔"

"امی آپ نے میرے اور زیان کے رشتے کی بات امیر خالو سے کرنی ہے اور بس۔" وہ دوٹوک لہجہ میں بولا۔

"اور جو کمال کا رشتہ آیا ہے زیان کے لیے وہ۔"

"اس کی آپ فکر مت کریں۔ میں نے کمال کا حل بھی سوچ لیا ہے۔"

"میں نے زرینہ کو کتنا سمجھایا کہ زیان کا رشتہ میرے وہاب کے لیے دے دو' پر اس کی ایک ہی ضد تھی۔ سچ پوچھو تو مجھے کبھی کبھی زیان پہ بہت ترس آتا ہے۔ مجھے تم دونوں کی شادی پہ کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

بیٹے کی محبت میں وہ اس وقت زرینہ کی دی ہوئی سب ہدایات بھول گئی تھیں۔ یہ اولاد کی محبت ایسی ہی ہوتی ہے کہ باقی سب رشتوں کو پس پشت ڈال دیتی ہے۔

"امی آپ مجھے پہلے بتا دیتی نا تو اب تک میری شادی زیان کے ساتھ ہو چکی ہوتی۔ میں زرینہ خالہ کو ان کے

منصوبے میں کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔" رفتہ رفتہ اس کے چہرے پہ غصہ جگہ لے رہا تھا۔

"تم فکر مت کرو، میں بہت جلد امیر بھائی سے تمہارے رشتے کی بات کرنے جاؤں گی۔ زرینہ کو برا لگتا ہے تو لگے، میں بیٹے کی خوشی کو قربان نہیں کر سکتی۔"

ان حالات میں وہ ایک روایتی ماں نظر آ رہی تھیں۔ جو اولاد کی خوشی کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہے۔

☆ ☆ ☆
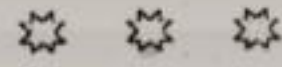
امیر علی کی طبیعت اچانک بگڑی تھی۔ ان کے ناک، منہ سے خون آنا شروع ہو گیا تھا۔ زرینہ کے دل کو خون دیکھ کر کچھ ہوا۔ اس نے پوری قوت سے چیخ ماری اور دروازہ کھول کر اندھا دھند ڈرائیور کے کوارٹر کی طرف بھاگی۔ زیان، بوا، آفاق، منابل، رابیل تینوں امیر علی کے کمرے میں تھے۔ ان کی حالت لحظہ بہ لحظہ بگڑتی جا رہی تھی۔

زیان بے اختیار ان کی طرف بڑھی۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ شروع میں وہ بے چین تھے۔ ہاتھ پٹخ رہے تھے۔ گردن کو ہلا رہے تھے۔ پر اب ان کی حرکات ست تھیں۔ ڈرائیور انہیں ہسپتال لے جانے کے لیے تیار تھا۔ زیان ان سے بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھی، پر ان کی حالت ایسی نہیں تھی۔

وہ ان کے ساتھ اسپتال جانا چاہ رہی تھی، اس لیے بھاگ کر پہلے گاڑی میں بیٹھی۔ زرینہ اور اس کا دکھ مشترک ہو گیا تھا۔ اس لیے انہوں نے زیان کے ساتھ اسپتال جانے پہ کوئی اعتراض نہیں کیا۔

☆ ☆ ☆
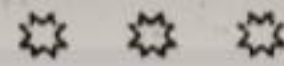
روبینہ نے امیر علی کے پاس جانے کی تمام تر تیاری مکمل کر لی تھی۔ وہاب انواع واقسام کے ڈرائی فروٹس اور پھلوں کے ٹوکرے لایا تھا۔ آخر کو وہ اکلوتے بیٹے کی ماں تھیں۔ وہاب نے کہا تھا کہ کسی بھی قسم کی کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے۔ وہاب کی خوشی پہ وہ زرینہ کی ناراضی بھی قربان کرنے کے لیے تیار تھیں۔ انہیں اندازہ تھا کہ زرینہ ان کے اس اقدام سے بہت ناراض ہو گی۔ ان کی بلا سے ناراض ہوتی ہے، تو ہو۔

زیان میں کوئی کمی تو نہیں ہے، خوب صورت ہے، تعلیم یافتہ ہے، آج کل کی لڑکیوں والی چھل بھل اس میں نہیں ہے، کم گو ہے اور سب سے بڑھ کر وہاب کی پسند ہے۔ زرینہ نے برسوں کی نفرت ابھی تک دل میں دبا کر رکھی ہے۔ وہ اسے سمجھانے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ زرینہ مان جاتی ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ انہیں زیان اور وہاب کی شادی سے مطلب ہے۔ وہ جاتے ہوئے تمام راستہ اسی بارے میں سوچتی رہیں۔

زرینہ کے گھر کے گیٹ سے وہ اندر داخل ہوئیں تو کسی غیر معمولی تبدیلی کا احساس ہوا۔ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ورنہ جب بھی وہ آتیں۔ ایک چہل پہل کا احساس ہوتا تھا مگر ابھی سب پریشان بیٹھے تھے، بوا رحمت تسبیح تھامے مسلسل کچھ پڑھ رہی تھیں منابل، رابیل اور آفاق تینوں اداس اور خاموش تھے۔

زرینہ اور زیان دونوں کہیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ انہیں درست طور پہ صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوا۔

"بوا کیا ہوا ہے گھر میں اتنی خاموشی کیوں ہے۔ زرینہ اور زیان کہاں ہیں؟" انہوں نے ایک ہی سانس میں پوچھ ڈالا۔

"امیر میاں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے ناک منہ سے مسلسل خون آ رہا تھا۔ پہلے گھر پہ ڈاکٹر کو بلوایا اس نے کہا دیر مت کرو ان کو فوراً" اسپتال لے جاؤ۔ زیان اور چھوٹی دلہن ادھر ہی گئی ہیں۔"

بوا نے تسبیح سائیڈ پر رکھتے ہوئے ان کے سوالوں کے جواب دیے تو ان کے خدشات میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ بوا کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ وہ کافی دیر روتی رہی تھیں۔ ان کے اس گھر اور مکینوں کے ساتھ پرانی وابستگی تھی یہی وجہ تھی کہ وہ ہر دکھ سکھ میں برابر کی شریک ہوتیں۔

روبینہ نے وضو کر کے بوا سے قرآن مانگا۔ انہوں نے حکم کی تعمیل کی۔ روبینہ دوپٹا سر پہ جمائے قرآن

پڑھنے میں مصروف ہو گئیں۔ دل کسی انہونی کے خدشے سے لرز رہا تھا۔ آخر کو زرینہ ان کی ماں جائی تھی۔ اور امیر علی اس کے سر کے سائیں۔ "اللہ میری بہن کا سہاگ سلامت رکھنا" قرآن پڑھ کر انہوں نے دل سے دعا کی۔

بوا نے دوبارہ ہاسپٹل زیان کو کال کر کے امیر علی کی خیر خبر لی تھی۔ زیان کے لہجہ میں مایوسی تھی آواز بھی روئی روئی لگ رہی تھی۔

روبینہ قرآن پڑھنے کے بعد وہیں اس جگہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ بوا بھی ان کے پاس تھیں وہ امیر علی کی طبیعت اور موجودہ حالت کے بارے میں ہی بات کر رہی تھیں جب گیٹ پر باہر ایمبولینس سائرن بجاتی رکی تھی۔ روبینہ کو ایسے محسوس ہوا جیسے وقت رک گیا ہو۔ زرینہ کے اونچی آواز میں رونے بین کرنے کی آواز یہاں تک آرہی تھی۔ باہر بہت سے اور لوگوں کی بھی آوازیں تھیں لیکن ان سب پہ زرینہ کی آواز حاوی تھی۔ روتی کرلاتی، بین کرتی صدمے سے چور چور آواز۔ جیسے اس کا سب کچھ لٹ گیا ہو۔ واقعی اس کا تو سب کچھ لٹ گیا تھا۔ وہ امیر علی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گنوا بیٹھی تھیں۔ بیوی سے بیوہ بن کر ہسپتال سے گھر لوٹی تھیں۔

روبینہ نے سینے پہ دو ہتھڑ مارے اور باہر صحن کی طرف بھاگی۔ امیر علی کو ایمبولینس سے اتار کر گھر کے اندر لایا جا رہا تھا۔

زرینہ کے رونے پیٹنے بین کرنے نے سب کو اس کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ پر زیان کی ناگفتہ بہ حالت کی طرف کسی کی بھی توجہ نہیں تھی۔ وہ خاموشی سے خالی الذہنی کے عالم میں سب کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ جیسے اسے کچھ سمجھ ہی نہ آرہا ہو۔ اس کے سب آنسو دل پہ اندر ہی اندر گر رہے تھے اور ان آنسوؤں نے بہت دور تک آگ لگا دی تھی۔

امیر علی سفید کفن اوڑھے اس سے بہت دور جا چکے تھے۔ وہ ان سے اپنے دل کی بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھی۔ جو وہ اسے پہلے اپنی ناراضی میں ان سے کر نہیں پائی تھی۔ وہ انہیں زرینہ آنٹی کی زیادتیوں کے متعلق آگاہ کرنا چاہتی تھی وہ انہیں رابیل مناہل اور آفاق کی بیگانگی سے مطلع کرنا چاہتی تھی وہ انہیں یہ سب کھول کھول کے بتانا چاہ رہی تھی کہ زرینہ آنٹی ان کی چہیتی بیوی نے بچپن سے ہی اس کے ساتھ زیادتیاں روا رکھی ہیں وہ اسے ذہنی طور پر بے پناہ اذیت سے دوچار کرتی رہی ہیں۔ انہوں نے اس کے بچپن کو مسخ کر دیا ہے۔ وہ اس کی ماں کے حوالے سے گندی و گری ہوئی گھٹیا باتیں کرتی رہی ہیں۔ حالانکہ اس نے اپنی ماں کو نہیں دیکھا تھا نہ وہ ان کے لمس سے واقف تھی۔

زرینہ آنٹی نے اس کے اور ابو کے درمیان دوری پیدا کر دی ہے۔ حالانکہ اس کا دل چاہتا ہے وہ ان کے پاس بیٹھے ان سے لاڈ کرے ان سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرے۔ اس کے سینے میں دبی چھوٹی چھوٹی سی خواہشیں حسرت بن گئی ہے۔ وہ چاہ کر بھی ان کے قریب نہ آسکی۔ اور وہ ان کے سینے سے لگ کر ان کے ہاتھوں کو پکڑ کر یہ شکایت کرنا چاہتی ہے کہ آپ بھی تو مجھ سے دور ہو گئے آپ بھی تو مجھ سے لاپروا ہو گئے آپ کو پتا ہی نہیں کہ یہاں اس گھر میں آپ کی بیٹی زیان بھی رہتی ہے۔ اسے بھی آپ کی محبت کی شفقت پدری کی ضرورت ہے۔ وہ آپ کی لاپروائی کی وجہ سے آپ سے دور ہوئی ہے۔ حالانکہ وہ آپ کے پاس آنے کے لیے ترستی ہے۔ اس کی سب ناراضی آپ سے ختم ہو گئی ہے۔ وہ اب دل سے آپ سے راضی ہے۔ آپ ایک بار آنکھیں کھول کر اسے دیکھیں تو سہی۔ آپ دیکھیں ناں آپ کی بیماری کی وجہ سے وہ کتنی خوفزدہ رہتی ہے وہ تحفظ چاہتی ہے کیونکہ وہاب کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ وہاں یہاں گھر آتا ہے تو اسے ڈر لگتا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ آپ اس کا ماتھا چومیں اور کہیں کہ میں تمہارے ساتھ ہوں کسی گندی نگاہ کو تمہاری طرف اٹھنے سے پہلے ہی پھوڑ ڈالوں گا۔

پر امیر علی تو اس کی کوئی خاموش فریاد نہیں سن رہے تھے۔ وہ ان کی زندگی میں بھی ان سے کچھ نہیں کہہ پائی اور کٹی کٹی رہی اور اب موت جیسی اٹل حقیقت نے

رشتوں کی ڈوری ہی کاٹ دی تھی۔

☼ ☼ ☼

سفید حویلی جس میں نہناں یعنی رنم' ملک ارسلان اور عنیزہ کے ہمراہ آئی تھی بہت شاندار تھی۔ اپنی پریشانی کے باوجود وہ حویلی کی خوب صورتی' سجاوٹ اور وقار دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔ حویلی کے ساتھ خوب صورت باغ بھی تھا۔ جس میں نایاب اقسام کے پودے اور درخت اپنی بہار دکھا رہے تھے۔

عنیزہ نے رنم کو نوکرانیوں والے حصے میں نہیں ٹھہرایا تھا بلکہ حویلی کے رہائشی حصے میں بنے کمروں میں سے ایک اس کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ یہ فرق صاف ظاہر کر رہا تھا کہ رنم کو اس نے خاص اہمیت اور حیثیت دی ہے۔ رنم کی رہائش کا انتظام ہو گیا تھا اس کے بعد عنیزہ نے حویلی کے تمام ملازمین سے متعارف کروایا اور سب سے آخر میں وہ اسے افشاں بیگم سے ملوانے لائیں۔

افشاں بیگم کو نہناں یعنی رنم کی بے چارگی و درماندگی کا سن کر بہت دکھ ہوا۔ وہ اس کے لیے دل میں ہمدردی محسوس کر رہی تھیں۔

عنیزہ اسے پوری حویلی دکھا کر سب کا تعارف کرواچکی تھیں۔ شروع میں رنم بہت خوفزدہ اور سہمی ہوئی تھی اب اس کا خوف آہستہ آہستہ تحلیل ہو رہا تھا۔ حویلی میں ملک ارسلان اور عنیزہ بیگم ہی تھے اور باقی ڈھیر سارے ملازمین۔

ملک ارسلان صبح ناشتے کے بعد ڈیرے کی طرف نکل جاتے گھر میں عنیزہ ہوتیں ملازموں کے ہمراہ۔ رنم کے ذمے کوئی خاص کام نہیں تھا اور فارغ بیٹھ بیٹھ کر وہ حقیقی معنوں میں اکتا گئی تھی اس کی اسی اکتاہٹ کے سبب عنیزہ نے حویلی کے ملازمین کی سپرویژن کا کام اسے سونپ دیا۔ یعنی ایک لحاظ سے وہ سب کی انچارج تھی۔ رنم نے یہ کام یا اس نوعیت کے دیگر امور کبھی بھی سرانجام نہیں دیئے تھے اس لیے یہ مصروفیت اس کے لیے غنیمت تھی۔

عنیزہ فارغ اوقات میں حویلی کے دوسرے حصے میں مقیم ملک جہانگیر اور افشاں بیگم کی طرف چلی جاتیں رنم فارغ ہوتی تو وہ اسے بھی ساتھ لے لیتیں۔ لیکن اکثر اوقات وہ ان کے ساتھ جانے سے معذرت کر لیتی۔ عنیزہ اس سے بہت خوش تھیں۔ انہیں ایسے محسوس ہوتا تھا نہناں نے آکر ان کی ایک عرصے کی تنہائی کا مداوا کر دیا ہے۔ وہ نہناں سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرتیں شام کی چائے اکثر اس کے ساتھ پیتیں۔ یعنی وہ ان کے لیے خاص تھی۔

حویلی کے دیگر ملازمین بھی عنیزہ کی اس کے لیے خصوصی توجہ محسوس کر رہے تھے اس لیے سب اس سے ادب سے پیش آتے۔ ملک ارسلان نہناں کو حویلی لانے کے فیصلے سے مطمئن تھے کیونکہ اس کی آمد کے بعد عنیزہ خوش رہنے لگی تھیں۔ ایک مخصوص اداسی اور یاسیت جو عرصہ دراز سے ملک ارسلان کی تمام تر توجہ اور محبت کے باوجود عنیزہ کی شخصیت کا حصہ بنی ہوئی تھی وہ اب کم ہونے لگی تھی۔ وہ زندگی کے معاملات میں پھر سے سرگرم ہو گئی تھیں۔ یہ تبدیلی خوش آئند تھی۔ نہناں بہت مختصر عرصے میں حویلی کا حصہ بن گئی تھی۔

☼ ☼ ☼
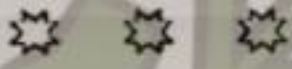
زیان پہلے سے زیادہ گم صم رہنے لگی تھی۔ اپنی تنہائی' بے چارگی اور کسمپرسی کا احساس کچھ اور بھی بڑھ گیا تھا۔ پہلے امیر علی کی زندگی میں کسی اپنے کے ہونے کا فرحت بخش اطمینان ہمراہ تھا۔ ان کے بعد یہ مان اور اطمینان بھی چھین چکا تھا۔

امیر علی کے انتقال کو ایک ماہ سے زائد ہو چکا تھا۔ روبینہ مستقل طور پر زرینہ کے پاس ہی تھیں وہاب صبح و شام چکر لگاتا۔ امیر علی زندہ تھے تو اس کی آمدورفت کو زیادہ پسند نہیں کرتے تھے وہ بھی وقفے وقفے سے آتا پر اب کوئی آڑ کوئی دیوار نہیں رہی تھی۔

زرینہ عدت میں تھیں۔ عفت خانم نے دبے دبے الفاظ میں کمال اور زیان کی شادی کی بات چھیڑی۔

زرینہ نے انہیں اطمینان دلایا کہ عدت ختم ہوتے ہی وہ یہ معاملہ بھی نمٹالیں گی۔ ادھر روبینہ نے امیر علی کی ناگہانی موت اور اس کے بعد بہن کی بیوگی و عدت کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک بار بھی وہاب کے رشتے کی بات نہیں چھیڑی تھی۔ پر عفت خانم کی آمد اور شادی کے تقاضے نے ان کے کان کھڑے کردیے۔ پھر وہاب کے صبح و شام کے چکر اس بات کو کہاں تک چھپا سکتے تھے۔ وہ غصے سے آگ بگولہ ہو رہا تھا۔ امیر علی کی موت نے اسے نڈر کردیا تھا۔ پھر زرینہ خالہ کا دم خم ختم ہوچکا تھا وہ اب شوہر سے محروم عام سی عورت تھیں۔ وہاب نے عفت خانم کو ذلیل کرکے وہاں سے چلتا کیا۔ اچھا خاصا تماشا بن رہا تھا۔ اب وہاب جیسے منہ زور کو قابو کرنا مشکل تھا۔

زرینہ کو اب اور خوف ستانے لگے تھے۔ وہ اکیلی اور بے سہارا تھیں۔ میکے میں رشتے داروں کے نام پہ روبینہ اور وہاب کے سوا ان کا کوئی بھی نہیں تھا ادھر امیر علی بھی اکیلے تھے ان کے چند دور پار کے ہی رشتے دار تھے۔ وہ مشکل میں آجاتیں تو کوئی بھی ایسا نہیں تھا وہ جس پہ بھروسا کرتیں۔ خود تو وہ عدت میں تھیں۔

وہاب اور روبینہ آپا ہی گھر کے کرتا دھرتا بنے ہوئے تھے۔ ہر چیز پہ ان کا کنٹرول تھا۔ ان دونوں کی بدلی بدلی کیفیت زرینہ محسوس کررہی تھیں۔ سب سے پہلے تو وہاب نے عفت خانم کو بدتمیزی کرکے گھر سے نکالا پھر روبینہ آپا نے انہیں طویل لیکچر دیا کہ عفت خانم کو اب یہاں کسی صورت بھی قدم نہ رکھنے دیا جائے۔ ویسے بھی وہاب نے جس طرح عفت خانم کو ذلیل اور رسوا کرکے گھر سے نکالا تھا۔ اس کے بعد ان کا یہاں آنا محال ہی تھی۔ زیان، زرینہ کے گلے کی ہڈی بن گئی تھی نہ نگل سکتی تھیں نہ اگل سکتی تھیں۔

زیان، بوا کے ساتھ اپنے کمرے میں بیٹھی تھی۔ عفت خانم اور وہاب کا ہنگامہ شروع ہوتے ہی زیان وہاں سے ہٹ گئی تھی۔ اس کے خوف اور بے چارگی کو محسوس کرکے بوا بھی اس کے پیچھے آگئیں۔

"بوا یہ سب کیا ہو رہا ہے کیوں ہو رہا ہے۔ ہم اپنے ہی گھر میں اجنبی بن گئے ہیں۔ میرے دن رات خوف میں بسر ہو رہے ہیں۔ میں کالج سے آتے ہی اپنے کمرے میں گھس جاتی ہوں۔ ایسے لگتا ہے اس گھر کے در و دیوار میرے لیے پرائے ہوگئے ہیں۔" وہ بے حد شاکی اور ہراساں تھی۔

بوا اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ وہ خود امیر علی کے بعد زیان کو دیکھ دیکھ کر جی میں کڑھتیں۔ کچھ کر بھی نہیں سکتی تھیں۔ آنے والے حالات کا اندازہ انہیں کچھ کچھ ابھی سے ہو رہا تھا۔

"اللہ پہ بھروسا رکھو فکر مت کرو سب اچھا ہوجائے گا۔" انہوں نے بھیگے انداز میں اسے تسلی دی۔ یہ الگ بات کہ یہ تسلی یقین سے خالی تھی۔

☆ ☆ ☆

رنم کام کرتی نوکرانیوں کو ہدایات دے رہی تھی۔ عنیزہ دور بیٹھی ادھر ہی دیکھ رہی تھیں۔ اس کی نظر رنم پہ ہی تھی۔ رات سے ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ جانے کیا بات تھی رہ رہ کر دل و دماغ میں عجیب سے خیال آرہے تھے۔ اب رنم کو دیکھتے ہوئے یہ خیال اور بھی طاقتور ہوتے جارہے تھے۔ وہ پیچھے بہت پیچھے ماضی میں جارہی تھیں۔ ماضی میں جانے کا یہ سفر اتنا آسان نہیں تھا انہیں کرب و اذیت کی کئی منزلوں سے گزرنا پڑتا تھا۔

وہ سب کے سامنے سے اٹھ آئیں۔ اس وقت صرف تنہائی اور اندھیرا درکار تھا۔ اندھیرا ہی تو ان کی ٹوٹی پھوٹی روح کو اپنی پناہ میں تحفظ دے سکتا تھا۔ اتنے برس گزر چکے تھے وہ بے خبر تھیں انہیں کچھ خبر نہ تھی جو وہ پیچھے چھوڑ آئی ہیں "وہ متاع جان" کس حال میں ہے۔ کوئی مددگار کوئی سہارا نہ تھا۔

ملک ارسلان ان کی کیفیت دیکھتے ہوئے انہیں صرف تسلی دے سکتے تھے۔ اور اتنے برس سے وہ یہی کررہے تھے۔ لیکن تسلی دلاسوں سے عنیزہ کے زخم کہاں بھرنے والے تھے۔

☆ ☆ ☆

رات لمحہ بہ لمحہ تاریکی کا سفر طے کرتی اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔ بوا بہت دیر سے اپنے بستر پہ لیٹی کروٹ بدل رہی تھیں۔ عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد وہ معمول کے ذکرو اذکار میں کافی دیر مشغول رہیں۔ اصولاً" اب انہیں نیند آجانی چاہیے تھی۔ نیند نہ آنے کی وجہ سے ان کی ذہنی چبھن تھی۔ اس چبھن کو عفت خانم کے ساتھ وہاب کی منہ ماری نے اور بھی بڑھادیا تھا۔

وہ برسوں سے اس گھر کے مکینوں کی خدمت کرتی چلی آرہی تھیں امیر علی انہیں گھر کا فرد کا درجہ دیتے تھے ان کی ادب و احترام میں امیر علی نے کبھی کوتاہی یا کمی نہیں کی تھی اول دن سے زرینہ بیگم بھی بوا کی اہمیت کو سمجھ گئی تھیں اس لیے ان کے تعلقات بوا کے ساتھ خوشگوار ہی رہے۔ اس میں بوا کی مصلحت آمیز فطرت اور سمجھداری کا بھی دخل تھا۔ وہ سب کی مزاج آشنا تھیں اور اس کے مطابق ہی برتاؤ کرتیں۔

زرینہ کا ذیان کے ساتھ جو رویہ تھا وہ انہیں پسند نہیں تھا ڈھکے چھپے لفظوں میں انہوں نے زرینہ کو اس کا احساس دلانا چاہا پر وہاں سے مطلوبہ ردعمل ظاہر نہ ہونے پر انہوں نے اپنے ہونٹ سی لیے۔

امیر علی کی بیماری سے پہلے سب ٹھیک چل رہا تھا۔ وہ گھر کے سربراہ اور تمام اختیارات کے مالک تھے۔ اختیارات میں طاقت میں تبدیلی آئی تو بہت کچھ بدل گیا۔ زرینہ شوہر پرست عورت تھیں اس کے ساتھ ساتھ وہ ذیان سے سخت عناد بھی رکھتی تھیں۔

وہاب کی ذیان کے ساتھ پسندیدگی اور ذیان کے حصول کی خواہش انہیں ذرہ بھر نہیں بھائی تب ہی تو انہوں نے کمال کے رشتے کے لیے راہ ہموار کی۔ جو وہاب کے غیض و غضب کو اور بھی ہوا دینے کا باعث بنی۔ بوا نے بہت قریب سے وہاب کی فطرت اور عادات کا مشاہدہ کیا تھا۔ وہ کینہ پرور، ضدی اور اپنی مقصد کے حصول کے لیے حد سے گزر جانے والوں میں سے تھا۔

وہاب جنونی تھا اور ذیان کو حاصل کرنے کے لیے

کچھ بھی کر سکتا تھا اب امیر علی نہیں رہے تھے وہ کرتا دھرتا بنا ہوا تھا۔ بلکہ روبینہ نے وہاب کو اور بھی آگے کی رلو دکھائی دی تھی۔ زیان سے وہاب نے ہر حال میں شادی کرنی ہی تھی لیکن زیان کے ساتھ ساتھ اب وہ اس کی جائیداد کا بھی حقدار بننا چاہ رہا تھا۔ روبینہ اور وہ دونوں مل کر اس مقصد پہ کام کر رہے تھے۔

بوا اپنی آنکھیں اور کان کھلی رکھتی تھیں۔ زرینہ بھی کچھ کچھ بھانپ گئی تھیں کیونکہ، روبینہ آپا اور وہاب نے امیر علی کی وراثت کے بارے میں انہیں ہر طرح سے کریدا تھا کہ امیر علی کی کتنی دولت ہے کتنی جائیداد ہے اور ان کے بینک اکاؤنٹس میں اس وقت کتنا پیسہ موجود ہے۔ زیان کو شادی کے موقعے پر کیا کچھ دیا جائے گا۔

روبینہ پہلے وہاب کی پسند کی وجہ سے زیان کو بہو بنانا چاہ رہی تھی لیکن اب اس میں لالچ کا عنصر بھی شامل ہو گیا تھا۔ روبینہ نے بوا سے بھی بہانے بہانے سے امیر علی کی وراثت کے بارے میں سوال کیے تھے۔ اور اس میں وہاب کی پوری پلاننگ تھی۔ آنے والا وقت انہونیوں کی نوید دے رہا تھا اس لیے بوا بے حد پریشان تھیں۔

رات گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ گزرتی جا رہی تھی۔ بوا اپنے بستر سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ وہ دروازے کے قریب اپنی تسلی کرنے کے لیے گئیں حالانکہ دروازہ اندر سے لاک تھا پھر بھی انہوں نے اپنی تسلی ضروری سمجھی تھی۔

کمرے میں زیرو پاور کا بلب جل رہا تھا۔ انہوں نے دوسری لائٹ جلائی۔ اب کمرے میں بھرپور روشنی تھی سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ بوا کونے میں رکھے اپنے جستی ٹرنک کی طرف بڑھیں۔ جستی ٹرنک کے ساتھ ہی ایک طرف کپڑوں کی الماری تھی انہوں نے الماری کھول کر چابیوں کا گچھا برآمد کیا۔ جستی ٹرنک پہ موٹا تالا جھول رہا تھا۔ چابیوں کے گچھے میں سے ایک چابی منتخب کر کے انہوں نے تالے پہ آزمائی تو وہ فوراً" کھل گیا۔ انہوں نے آگے جا کر ٹرنک میں رکھی اشیاء باہر نکالنی شروع کر دیں۔

ٹرنک میں رکھی سب چیزیں اب باہر بچھے بستر پر پڑی تھیں۔ ٹرنک کے سب سے نچلے حصے میں ایک پوٹلی پڑی تھی۔ بوا نے کپکپاتے ہاتھوں سے وہ پوٹلی باہر نکالی اور اس کی گرہیں کھولنی شروع کیں۔ ان کا انداز چوکنا اور رازدارانہ تھا۔ رات کے سناٹے میں اس طرح ٹرنک کھول کر کچھ ڈھونڈنا ظاہر کر رہا تھا کہ پوٹلی کے ساتھ یقیناً" کوئی اہم راز وابستہ ہے۔ ورنہ وہ دن کے کسی بھی حصے میں آ کر ٹرنک کھول کر کچھ بھی نکال اور رکھ سکتی تھیں۔

بوا پوٹلی کھول چکی تھیں۔ اس میں رکھی چیزیں بوا کے ہاتھوں میں تھیں۔ اس میں دو سونے کی انگوٹھیاں اور کانوں کی بھاری بالیاں پڑی تھیں۔ بوا نے ان پہ مطلق توجہ نہ دی بلکہ انہوں نے وہ چیزیں ایک طرف رکھ کر پوٹلی میں پڑے ایک شاپر کو باہر نکالا۔ شاپر مضبوط اور گہرے رنگ کا تھا۔ بوا نے شاپر کھول کر اندر موجود لفافے کو باہر نکالا۔ لفافہ مٹیالے رنگ کا تھا۔ اس کے اندر پڑا کاغذ گردش زمانہ سے پیلا اور بوسیدہ ہو رہا تھا۔ بوا نے کانپتے ہاتھوں سے کاغذ کی تہیں کھولنا شروع کیں۔ یہ ایک خط تھا جو برسوں پہلے انہیں تحریر کیا گیا تھا۔ برسوں پہلے جب یہ خط بوا کو بھیجا گیا تھا تب وہ اس کا جواب چاہنے کے باوجود بھی نہ دے پائی تھیں۔ اس ناکامی نے انہیں عجیب سے احساس جرم کا شکار بنا دیا تھا۔ اسی وجہ سے وہ زیان کا بہت خیال رکھتی تھیں، اسے ایک لمحہ کے لیے بھی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیتیں۔

زیان ان کے ہاتھوں میں پلی بڑھی تھی انہوں نے ایک ماں کی طرح اس کی ذمہ داریاں نبھائی تھیں۔ راتوں کو اس کے لیے جاگی تھیں اس کے کھانے پینے سے لے کر صفائی ستھرائی و تربیت ہر چیز کا خیال رکھا تھا۔ زرینہ سے امیر علی کی شادی کا ایک سبب زیان بھی تھی۔ پر بوا نے زرینہ بیگم کو زیان کی طرف سے بالکل

بے فکر اور پر سکون کر دیا تھا۔ وہ امیر علی کے باقی تینوں بچوں کی ماں اور محض بیوی تھیں۔ بوا نے بس زیان کو پیدا کرنے کا کرب برداشت نہیں کیا تھا باقی ہر لحاظ سے وہ اس کے لیے ماں جیسی تھیں۔

بوا خط کھول چکی تھیں۔ خط کے مندرجات پہ ان کی نگاہ تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ انہیں پتا ہی نہیں چلا کہ کب اور کیسے ان کی آنکھیں بھیگنا شروع ہوئیں۔

اس خط کے جواب دینے کا ٹائم آگیا تھا۔ بوا نے خط پہلے کی طرح پوٹلی میں رکھا اور ٹرنک کی سب چیزیں پھر سے اس میں رکھیں۔ اب سب کچھ پہلے کی طرح تھا۔

رات کا آخری پہر شروع تھا۔ بوا کی تہجد کی نماز کا ٹائم ہو گیا تھا۔ وہ وضو کر کے اپنے اللہ کے حضور جھک گئیں۔

☼ ☼ ☼
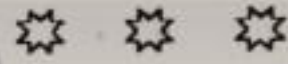
وہاب اپنے گھر کا چکر لگا کر دوپہر میں ادھر زرینہ بیگم کی طرف آگیا تھا۔ زیان کھانا کھا رہی تھی۔ اس کی آواز سنتے ہی کھانا چھوڑ کر کمرے میں چلی گئی۔ ابو کی موت کے بعد سے وہاب اور روبینہ ادھر ہی تھے۔ زیان کو وہاب کی معنی خیز نگاہوں سے عجیب سے گھبراہٹ اور الجھن ہوتی اس لیے اس کی پوری کوشش ہوتی کہ وہ منظر سے غائب رہے۔ اب تو زرینہ کو بھی وہاب کے وجود سے بے زاری ہونے لگی تھی۔ پر وہ عدت میں تھیں اس لیے خون کے گھونٹ پینے پہ مجبور تھیں۔

بوا نے دروازہ بجا کر اسے رات کے کھانے کے لیے باہر بلایا پر اس نے باہر آنے سے انکار کر دیا۔ تب وہ اس کے لیے کھانے کی ٹرے لائیں۔ زیان نے کمرے میں ہی کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد اس نے بلاوجہ ہی کمرے کے چکر کاٹنے شروع کر دیے۔ اس مشغلے سے دل اکتایا تو اس نے ایک کتاب اٹھالی۔ کتاب کا موضوع اتنا دلچسپ تھا کہ اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ باہر اب مکمل طور پر سناٹا اور خاموشی طاری تھی۔

اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ کافی وقت گزر چکا تھا۔ سناٹا بتا رہا تھا کہ سب خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ وہ کتاب رکھ کر سونے کے لیے۔ جونہی بستر پر لیٹی اور بیڈ لیمپ آف کرنے کے لیے بٹن کی طرف ہاتھ بڑھایا اچانک لائٹ چلی گئی۔ کمرا تاریکی میں ڈوب گیا۔ اسے یکدم ہی اندھیرے سے ڈر لگنے لگا۔ کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے بھی خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اے سی اور پنکھا بند ہوا تو تھوڑی دیر میں ہی بند کمرے کی وجہ سے گھٹن بڑھنے لگی۔ اس کی قمیص بھیگ کر جسم سے چپک گئی تھی۔

زیان سے مزید گرمی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر آہستگی سے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور ادھر ادھر دیکھا۔ باہر ہنوز خاموشی اور سناٹا طاری تھا۔ اس نے کمرے سے باہر قدم رکھا۔

اندھیرا ہونے کے باوجود وہ بہت تیزی تیزی سے سیڑھیاں طے کر کے اوپر چھت پر آئی تھی۔ چھت پر آتے ہی اسے احساس ہوا کہ یہاں اس کے علاوہ کوئی اور ذی نفس پہلے سے موجود ہے۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ اس کی چھٹی حس نے اسے خبردار کیا۔ اور اس کی چھٹی حس کبھی غلط نہیں کہتی تھی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

☼ ☼

آسیہ عارف

محبت کی اک سادہ سی کہانی

پیاری شاوو!

سلام عرض! میں خریت (خیریت) سے شہر پہنچ گیا ہوں، لیکن میں جانتا ہوں تم خریت سے نہیں ہوگی، ہمیشہ کی طرح میرے آنے پر تم نے رو، رو کے اپنے جھیل ورگے (جیسے) نین سجالیے ہوں گے اور سویرے خالہ کے پوچھنے پر سردرد کا بہانہ کردیا ہوگا، لیکن میں تمہیں کیا کہوں، میری تو اپنی حالت بڑی خراب ہے۔ آنا تو شہر میں پہلے بھی ہوں، لیکن اس بار دل بڑا اداس ہے۔ خورے (شاید) آتے وقت تم سے ملاقات نہیں ہوسکی اس لیے۔ میں نے بہنو کو بھیجا تھا تمہارے گھر تم اپنی اماں کے ساتھ ٹیوب ویل پہ کپڑے دھونے گئی ہوئی تھیں۔ سارے رستے تمہیں ہی سوچتا رہا ہوں، رکشہ جب اڈے پہ رکا تو مجھے پتا ہی نہیں چلا رکشے والے پائیے (بھائی) کے ہلانے پر میں تمہارے خیالوں سے نکلا فیر (پھر) میں شرمندہ بھی بوہت (بہت) ہوا۔ پر میں کیا کروں، میری سوچوں پہ میرا اختیار نہیں، نہ مجھے بھوک لگتی ہے نہ نیند آتی ہے۔ میرے یار بیلی کہتے ہیں اسے کوئی بیماری لگ گئی ہے اسے ڈاکٹر کو دکھاؤ انہیں کیا پتا اس بیماری کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں، یہ مرض لاعلاج ہے اور یہ بیماری اب تھوڑی لگی ہے یہ تو چار سال پرانی ہے۔ اب تو یہ دن بدن گوڑی ہوتی جارہی ہے۔ اب تو میں دن رات تمہارا ہاتھ پکڑے گاؤں کی گلیوں، کھیتوں میں چلنے پھرنے کے سپنے دیکھتا ہوں۔ اج (آج) ہفتہ ہے ماسٹر صاحب کی بیٹی (تمہاری سہیلی) آئی ہوگی۔ اس سے خط پڑھا لینا اور جواب بھی لکھوا لینا۔ تمہیں کتنی بار کہا ہے، میں تمہیں موبیل (موبائل) لے دیتا ہوں، لیکن تم بھی بڑی ضدی ہو۔ تمہارے لیے میں نے سوہے (سرخ) رنگ کی چوڑیاں اور ساوا (سبز) پرانده بھیج رہا ہوں بہنو تمہیں دے جائے گی، انہیں پہننا ضرور اور شیشے میں خود کو میری نظر سے بھی دیکھنا، چل جھلی شرما کیوں رہی ہے۔ اب گاؤں آیا تو اماں سے ضرور بات کروں گا، بس اب گزارہ نہیں ہوتا۔ اپنا بوہت سارا کھیال (خیال) رکھنا۔

ندی کے کنارے بلبل بیٹھی پا کے سوہا جوڑا
زندگی رہی تو تے فیر ملاں گے دل نا کرنا تھوڑا

☼ ☼ ☼

پیارے جیرے!

سوہنے رب سے امید کرتی ہوں کہ تم ٹھیک ہوگے۔ میں بھی بس جی رہی ہوں۔ تمہاری یاد میں ساری رات تارے دیکھتی ہوں اور ان کی مختلف شکلیں بناتی رہتی ہوں۔ جس دن تمہارا خط ملا اس دن ہی رانی بھی آگئی۔ اماں، ابا مجھے بھی تمہاری طرح دو جماعتیں پڑھا دیتے تو یہ محتاجی تو نہ ہوتی۔ موبیل کی بھی تم نے اچھی کہی، تمہارے باقی تحفوں کو تو میں اماں کے سامنے تو بہنو کا نام دے دیتی ہوں، موبیل کا کیا کہوں، بہنو کے پاس تو اپنا بھی نہیں۔ اج وی (ویسے بھی) جو مزا خط میں ہے وہ موبیل میں کہاں یہ تو میں پڑھانے کے بعد سنبھال لیتی ہوں۔ روزانہ صبح اٹھ کے دیکھتی ہوں۔ ان میں سے تمہاری خشبو (خوشبو) آتی ہے اور کبھی کبھار تو صورت بھی نظر آجاتی ہے۔ تم ہنس رہے ہونا، چلو جاؤ میرا مذاکھ (مذاق) نہ اڑاؤ۔ تمہاری بھیجی ہوئی چوڑیاں اور پرانده مجھے مل گئے ہیں،

کتنی بار کہا ہے ایسی گلاں (باتیں) نہ لکھا کر رانیہ سے پڑھا نا ہوتا ہے تو وہ ہستی (ہنستی) ہے۔ میں نے دونوں چیزیں پہن کے دیکھیں اور اتار کے پیٹی میں سنبھال کے رکھ لیں۔ تن (تین) ہفتے بعد چاچا کرمو کی کینز کی شادی ہے۔ پھر اپنے عید والے کھٹے (مالٹا) رنگ کے سوٹ ساتھ پہنوں گی۔ تم آؤ گے نا شادی پہ 'آنا ضرور' تمہارے بغیر دل بڑا اداس ہے 'کل بھا کریم کے ٹریکٹر پہ لگا گانا مجھے اپنے سوچوں کی زبان لگا۔

دکھاں دیاں دے کے او سوغاتاں
تے سکھ ماہی نال لے گیا
کل تندوری پہ روٹیاں لگانے لگی تو تیری یاد آگئی'

کتنی پسند ہیں، تمہیں تندور والی روٹیاں پتا نہیں شہر وچ (میں) تجھے تندور والی روٹی ملتی بھی ہوگی یا نہیں۔ خیالوں میں گم پتا ہی نہیں چلا۔ دونوں روٹیاں جو لگائی

ہوئی تھیں، گر کے سڑ (جل) گئیں۔ وہ تو اماں دھواں اٹھنے پہ آئیں تو انہوں نے زور سے مجھے دھمو کا جڑا۔ ان کے مکے پہ میں خود بھی تندوری میں گرتے گرتے بچی۔ اپنا بھوں (بہت) سارا خیال رکھنا' روٹی' ٹکر ٹائم پہ کھالینا اور چا (چائے) زیادہ نہ پینا شاہو کے آجاتے ہو اور شہری کڑیوں سے بچ کے رہنا' خط ملتے ہی جواب دینا۔

عطر کی شیشی پتھر پہ مار کر توڑ دوں گی
خط کا جواب نہ دیا تو خط لکھنا ہی چھوڑ دوں گی

رب راکھا
صرف اور صرف تمہاری
شادو

پیاری شادو!
سلام محبت! میں بالکل ٹھیک ہوں اور امید کرتا ہوں کہ تم بھی خیریت سے ہوگی۔ سیانے سچ کہتے ہیں اندر کا موسم ہی سب موسموں پہ حاوی ہوتا ہے۔ اس بار تو شہر کا منظر ہی بدلا ہوا ہے' ہر چیز خوش ہے اور گنگنا رہی ہے اور یہ شاید میری اندر کی خوشی ہے' جو مجھے ہر جگہ رقص کرتی ہوئی نظر آرہی ہے۔ جب بھی آنکھیں بند کرتا ہوں تو تمہارا پریاں ورگا (جیسا) روپ سامنے آجاتا ہے۔ کھٹے سوٹ میں تمہارا رنگ اس طرح چمک رہا تھا جیسے سورج کی روشنی میں کنک (گندم) چمکتی ہے اور وہ سوہی چوڑیاں اور پراندہ خریدتے وقت مجھے اندازہ تو تھا کہ تمہیں پیارے لگیں گے' لیکن وہ تو تم پہ ایسے سجے جیسے تمہارے لیے ہی بنے ہیں اور نیلی جتی (جوتی) میں سجے تمہارے دودھ ورگے پاؤں تو مجھے بھول ہی نہیں رہے۔

لو جو بات تمہیں بتانی تھی۔ وہ تو میں بھول ہی گیا' میں نے اماں سے گل (بات) کرلی۔ پہلے تو انہوں نے صاف انکار کردیا' پھر بہنو اور میں نے منتیں کرکے منالیا۔ وہ کہتی ہیں شادو ہی کیوں کوئی ہور (اور) کڑی کیوں نہیں' میں نے کہا۔

نیلی پیلی روشنی کمرے میں بند ہے
میں کیا کروں مجھے پینو پسند ہے

اماں آئیں گی تمہارے گھر' دعا کرو چاچا' چاچی ہاں کردیں۔ جب تک کوئی اچھی خبر نہیں ملے گی دل بہت بے چین رہے گا۔ اپنا بوہت سارا کھیال رکھنا۔

فقط تمہارا
جیرا

✡ ✡ ✡

میرے سوہنے نذیر!
سلام عرض! اتنے دنوں سے تمہارا خط آیا ہوا ہے' ماسٹر صاحب کے گھر جانے کا ٹائم ہی نہیں ملتا' آج بھی رانی کو ادھر ہی بلایا ہے۔ کیا کروں اتنے کام اور میں اکیلی جان' صبح بانگ (اذان) کے ساتھ ماسی اٹھا دیتی ہے' نماز پڑھ کے مجوں (بھینسوں) کا باڑہ صاف کرتی ہوں۔ انہیں کھرلی پہ باندھ کے چارہ ڈالتی ہوں' دودھ دوہتی ہوں۔ اتنے میں دن نکل آتا ہے' ناشتا بناتی ہوں' پھر سارا دن گھر کے کاموں میں مصروف گزر جاتا ہے۔ دن میں وقفے وقفے سے تمہاری یاد بھی آتی رہتی ہے' کچھ دنوں سے تو زیادہ ہی آرہی ہے' تم تھوڑے سے ناراض ہو کے جو گئے تھے کہ میں ہر وقت کام میں مصروف رہتی ہوں اور تم آتے ہو تو تمہیں ٹائم نہیں دیتی' یہ ہی تو فرق ہوتا ہے شادی سے پہلے اور بعد والی زندگی میں' شادی سے پہلے تو بندہ ہر طرح سے آزاد ہوتا ہے' بعد میں اس پہ بہت سی ذمہ داریاں عائد ہوجاتی ہیں جنہیں خوش اسلوبی سے پورا نہ کرنے کی صورت میں کئی بگاڑ پیدا ہوسکتے ہیں اور بگاڑ تو کہیں اچھا نہیں ہوتا' نہ رویوں میں' نہ گھروں میں اور نہ معاشرے میں۔ تم راضی ہوجاؤ نا اگلے ہفتے جب تم آؤ گے تو صرف تمہیں ٹائم دوں گی اور کوئی کام نہیں کروں گی۔ جب میری موجودگی میں ماسی کام کرتی ہیں تو مجھے اچھا نہیں لگتا' اس لیے میں ان کے کرنے سے پہلے خود ہی کردیتی ہوں اور مجھے ان کا اعتماد بھی تو حاصل کرنا ہے' جو کہ بہت مشکل ہے' کیونکہ میرے اوپر پسند کی شادی کا لیبل جو لگ چکا ہے۔ اچھا چلو اب راضی ہوجاؤ اور اگلے ہفتے ضرور آنا' میں تمہاری ساری شکایتیں دور کرنے کی کوشش کروں گی اور آتے ہوئے میرے لیے موبائل بھی لے آنا۔ اپنا بہت سارا خیال رکھنا۔

اللہ حافظ
تمہاری بیوی
شمشاد نذیر

✡ ✡

فاخرہ گل
آٹھویں قسط

"دیکھا۔ چینا کے آئیڈیے سے کتنا فائدہ ہوا۔ آج اتنے سارے لوگوں نے رجسٹریشن کی فیس دی' تم خوش ہو نا ضمیر؟" کلائنٹس کے جانے کے بعد چینا نے ضمیر پر ہنس دیا۔

"سچ کہہ رہی ہو۔۔۔ میں تو اتنا خوش ہوں کہ ڈرتا ہوں' پاگل ہی نہ ہو جاؤں۔" وہ بھی مسکرائے۔

"اسی لیے تو کہتی ہوں کہ بیوی ہزار نعمت ہے۔"

"ہزار ہوں تو نا۔ اور وہ بھی اس لیے کہ کمپٹیشن رہتا ہے۔" انہوں نے نئی منطق نکالی تھی۔

"شوہر کو بھی تو چاہیے نا کہ وہ بھی سب سے زیادہ پیار کرے۔"

"ہاں تو نوے فیصد شوہر بیوی کے علاوہ سب سے زیادہ پیار کرتے ہیں اور باقی دس فیصد کی بیویاں انہیں سب سے زیادہ پیار کرتی ہیں۔"

"چھوڑو بھی ضمیر' چینا کا تو خیال ہے کہ شوہر کو چاہیے بیوی کی ہر پسند ناپسند کو ہنسی خوشی اپنالے۔ اس کا موڈ دیکھ کر بات کرے۔ جیسا کھانا وہ پکا کر دے ہنسی خوشی کھالے۔ خوامخواہ کی روک ٹوک نہ کرے اور مختصر یہ کہ بیوی کی ہر بات پر بس چپ چاپ اوکے کی مہر لگاتا جائے۔" شادی دفتر میں کی گئی تمام سجاوٹ کو دیکھتے ہوئے کریڈٹ لینے کے انداز میں چینا نے اسے اپنے مطابق ایک اچھے شوہر کی تمام خوبیاں بتائیں تو وہ حسب معمول چڑ گیا۔

"میں تمہارا شوہر ہوں' لفافہ نہیں ہوں' جس پر تم اپنی مرضی کا ایڈریس لکھنا چاہ رہی ہو۔"

"اچھا چلو چھوڑو' چینا کی مانو تو یہ چڑچڑاہٹ ختم کرنے کے لیے ہم دونوں کو ہوٹلنگ کرنی چاہیے۔ چینا کا مطلب ہے Sunday کو تم اور Monday کو چینا ہوٹلنگ کرنے جائے گی۔" خوش ہوتے ہوئے ضمیر کو ایک دم اس کی بات کا مطلب سمجھ آیا تو چپ ہی لگ گئی۔

☼ ☼ ☼
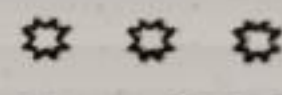
چینا نے علی کو فون کر کے بلایا تھا' تاکہ وہ فوراً سے شادی دفتر میں آکے رشتے کے لیے آئی لڑکی کے سامنے خود کو پیش کرے اور اس سے پہلے کہ وہ پرفیوم کا آخری اسپرے کر کے کمرے سے نکلتا۔ ایک بار پھر فون بجنے لگا۔

"ہیلو آپی کمانا آرہا ہوں۔۔۔" دوسری طرف غیر متوقع طور پر چینا کے علاوہ کوئی اور تھا۔

"جی ہاں میں علی ہی بات کر رہا ہوں اور یہ ہی ایڈریس ہے۔"

"کیا میری لاٹری نکلی ہے؟ خوشی اور حیرت کے مارے علی کی آواز چنگچی کے ٹائر کی طرح پھٹ گئی تھی۔" "لیکن میں نے تو کوئی الیکشن نہیں جیتا تو لاٹری کیسے نکلی؟"

"لیکن یار یہ سروس چارجز کچھ زیادہ نہیں ہیں؟" چلتے چلتے اس کے پاؤں کو بریک لگا۔

"نن نن نہیں نہیں۔۔۔ میں دے دوں گا سروس چارجز تم بس میری رقم کو امانت سمجھ کر اپنے پاس رکھنا۔"

"فون تو کھٹاک سے بند ہو گیا تھا' لیکن علی کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ آخر سروس چارجز کے لیے اسے پیسے دے گا کون؟ ضمیر بھائی' آپی' خالہ' چندا۔۔۔ ابا؟"

دھیرے دھیرے علی نے انہیں اپنی لاٹری نکلنے' کمپنی کی طرف سے فون آنے' سروس چارجز مانگنے اور اس کے پاس پیسے نہ ہونے کے بارے میں بتایا تو خالہ کا جوش بھی قابل دید تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ فوراً سے جا کر لاٹری کی رقم لے آئیں۔ "یہ بتا دو علی کہ میں نے کیا کرنا ہے؟"

"وہ جو آپ نے پہلے کبھی نہیں کیا؟" علی نے ان کے کان کے پاس جا کر کہا۔

"آرام۔۔۔؟"

"نہیں خالہ کام!"

"کام؟ میں تمہیں کام والی لگتی ہوں۔ دماغ ٹھیک ہے تمہارا؟" وہ بدک ہی گئی تھیں۔

اسی دوران اندھا دھند ویگن کی رفتار سے چینا اندرونی دروازے سے برآمد ہوئی۔

"علی' چینا نے کتنی دیر ہو گئی تمہیں فون کیا تھا کہ آجاؤ' لیکن تم نہیں آئے' آخر مسئلہ کیا ہے؟"

"آپی یہ خالہ۔۔۔ انہوں نے سب اگلوا لیا مجھ سے' انہوں نے موقع سے میرا فائدہ اٹھایا ہے آپی۔" اس نے ننھے سے معصوم بچے کی طرح شکایت کی' ورنہ دل تو چاہ رہا تھا دیوار پر سر ٹکراتا۔ اپنا نہیں خالہ کا۔

"ارے قسم لے لو چینا' میں نے کوئی دھوکے سے اس کا فائدہ نہیں اٹھایا۔ الزام لگا رہا ہے مجھ پر۔" چینا سخت جھنجلاہٹ کا شکار تھی۔

پہلے اس نے علی کا ہاتھ پکڑا اور تقریباً گھسیٹتے ہوئے شادی

دفتر کی طرف چلی گئی۔ لڑکی والوں کو اتنی دیر سے، جو جتن کرکے اس نے روکا ہوا تھا یہ وہی جانتی تھی۔

☼ ☼ ☼
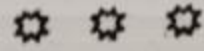
"ہیلو۔ اگر میں غلط نہیں تو آپ یقیناً "لڑکی ہیں۔" چینا نے اسے کمرے میں بھیج کر خود باہر اس لڑکی کے والدین کو بہلانے میں لگ گئی تھی اور اب علی سامنے بیٹھی لڑکی کو دیکھ کر خود کو یقین دلا رہا تھا کہ یہ ہی لڑکی ہے۔

"جی ہاں آپ غلط ہی ہیں 'کیونکہ میں تو بچی ہوں۔" ٹائٹ جینز پہنے اس لڑکی نے ٹانگ پر ٹانگ چڑھاتے ہوئے غرور سے جواب دیا تو علی کو دلچسپی محسوس ہوئی۔

"اوہ اچھا اچھا تو آپ بلکہ تم وہ بچی ہو جس کے بارے میں لڑکوں کے درمیان بات ہو رہی ہوتی ہے کہ یار بچی بڑی زبردست ہے۔ بچی کا نمبر ملے گا یا یونی ورسٹی میں نئی بچی آئی ہے دیکھی؟ سچ بتاؤ تم وہی بچی ہو یا پھر بچی کچی ہو؟"

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہے؟ یعنی ہم ایک دوسرے سے رشتے کی غرض سے مل رہے ہیں اور تم ہو کہ اس طرح کی فضول باتیں کرکے وقت برباد کر رہے ہو۔" وہ یقیناً "تکرار ہاؤس میں گفتگو کے طول و عرض سے واقف نہیں یعنی جب ہی آغاز میں گھبرا گئی تھی۔

"مجھے تو اسی طرح کی باتیں کرنا آتی ہیں۔ بلکہ مجھے کیا ہمارے گھر میں تو فیشن ہے 'اس طرح کی بات چیت کرنے کا' علی نے خطرہ 440 والٹ سے آگاہ کیا۔ مقصد صرف اور صرف اسے ٹالنا اور بھگانا تھا' ورنہ لڑکیوں سے بات کرنے میں تو وہ کافی ماہر تھا۔

"تمہارا گھر ہے یا چڑیا گھر؟" وہ چڑ کر کھڑی ہو گئی تو علی نے گہرا سانس لیا۔

"بس کردو' بس کردو' بس۔۔۔" دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے وہ زور سے چیخی تھی۔ اتنی زور سے کہ باہر بیٹھے ضمیر بھائی' چینا اور اس کی لڑکی کے ممی ڈیڈی جن کے چہرے کے تاثرات سے صاف لگتا تھا کہ وہ شادی دفتر میں نہیں' بلکہ کسی میٹرنٹی ہوم میں خبر کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ اب جو ایک دم اندر سے آوازیں آنا شروع ہوئیں تو آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ سے اٹھ کر اس کمرے کا دروازہ کھولا جس سے آوازیں آرہی تھیں۔ چینا نے تو اچھا ہی کرنا چاہا تھا' لیکن دروازہ پوری قوت سے کھولنے کے بعد جب سب اندر داخل ہوئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اندر صرف علی ہی موجود تھا جو بوکھلاہٹ کے عالم میں دروازے کے پیچھے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ معمہ کھلا تب جب ایک بار پھر اسی لڑکی کی ہائے ہائے کرنے کی آوازیں آنے لگیں یعنی کہ وہ عین اس وقت دروازہ کھولنے لگی تھی' جب چینا نے پوری قوت سے باہر کی طرف سے دروازہ اندر مارا جو اس کی پیشانی پر لگ کر پریشانی میں مبتلا کر گیا۔

"اوہ مائی گاڈ۔۔۔ یہ میری بچی کا کیا حشر کر دیا تم لوگوں نے ظالمو۔" ماڈرن ماں نے لپک کر چھوٹی سی کرتی پہنے اپنی بڑی سی بیٹی کو اٹھایا اور سینے سے لگا لیا۔

"میں پریس کانفرنس کروں گی' میڈیا بلاؤں گی' پولیس بھیجوں گی' اوہ مائی گاڈ۔"

"علی' چینا کو کچھ بتاؤ کہ آخر یہ سب چکر کیا ہے۔ تم نے اندر کیا کہا اسے؟ اور یہ۔۔۔ یہ کیا کہہ رہی تھی' کیوں چلا رہی تھی؟" چینا اور ضمیر بھائی کو شادی دفتر کا مستقبل تاریک معلوم ہو رہا تھا۔

"ارے یہ کیا بتائے گا بدھو۔۔۔ اب تو میں بتاؤں گی ساری دنیا کو۔۔۔" زخم خوردہ آواز ابھری۔

"اب میں دیکھتی ہوں کہ تم لوگ یہ میرج بیورو کیسے کھولتے ہو' چلو پنکی۔" ممی ڈیڈی کے ساتھ پنکی تو چلی گئی' لیکن ضمیر بھائی اور چینا آپی کا غصہ نہ گیا۔ ضمیر بھائی پاؤں پٹختے ہوئے گھور کر باہر چلے گئے تو علی بولا۔

"آپی گولی ماریں ان سب کو' پلیز مسکرائیں' تاکہ میں آپ کو ایک خوش خبری سناؤں۔"

"تم اور خوش خبری؟" حیران ہوتے ہوئے بھی خوش خبری کے لیے وہ مسکرائی۔

"آپی شادی دفتر کا خیال ذہن سے نکال کر میری بات سنیں۔۔۔ کہ میں دراصل زندگی میں اونچا مقام حاصل کرنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے مجھے آپ کی مدد چاہیے۔"

"اونچا مقام چاہیے تو کھجور کے درخت پر چڑھ جاؤ نا۔ مقام بھی اونچا' قیام بھی اور طعام بھی اعلا۔"

"اوہو آپی! آپ سمجھ نہیں رہیں نا۔" اسے چینا کی ذہنی حالت پر ترس آیا۔

علی نے مکمل تفصیل سے لاٹری کے متعلق بتایا۔

"واؤ۔۔۔ واؤ یعنی واؤ۔۔۔ یہ تو بہت خوشی کی بات ہے' لیکن۔۔۔ چینا تو خود ضمیر کی مقروض ہے۔"

"ارے آپی۔۔۔ ضمیر کے مقروض تو ہم سب ہی ہیں۔" علی نے زبردستی سنجیدہ ہونا چاہا' لیکن اس وقت چینا کا

ایموشنل ہونے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ اسی لیے فوراً" وضاحت کی۔

"کچھ کریں آپی' پلیز کچھ کریں۔" علی اس قدر دکھی موسمی طور پر ہی ہوتا تھا سوچینا کا چونکنا لازم تھا۔

☆ ☆ ☆
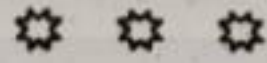
"پتری کدرے جارہی ہو؟" ابا نے کچن کا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد چندا کے کمرے میں یوں قدم رکھا جیسے اعلا حکمران سیلابی علاقوں میں رکھتے ہیں۔ سونے پہ سہاگہ سامنے ہی چندا ادھر ادھر کچھ ڈھونڈتی ہوئی پائی گئی۔

"نہیں ابا... میں تو نہیں جارہی کہیں۔"

"لگتا ہے کش ڈھونڈ رہی ہو۔" انہوں نے اندازہ لگا کر منہ کینیا کے نقشے جیسا بنا لیا تھا۔

"جی ابا! وہ میں نے رکھی تھی یہاں کریم... آپ نے تو نہیں دیکھی کہیں؟"

"کریم تے میں نے دیکھی ہے' پر گھر وچ کریم لگانے کی وجہ پوچھ سکتا ہوں میں؟"

"جی جی ابا... پوچھیں۔" وہ مطمئن ہو گئی تھی کہ کریم مل گئی ہے' لیکن پوچھنے کی اجازت ملنے پر بھی ابا نے صرف گھورنے سے کام چلا کر ڈریسنگ ٹیبل کے سب سے نچلے دراز سے کریم برآمد کرلی۔

پتری کہ میں تیرا باپ ہوں اور تیرے بارے وچ سوچنا تے میرا فرض ہے نا... ایس لئی میں نے سوچیا ہے کہ پڑھائی شڑھائی اپنی جگہ تے پر اب تیری زندگی نوں کسی ساتھی دی ضرورت ہے' جو دن رات تیرے ساتھ رہے اک دوست بن کے... تیرا ایس بارے وچ کیا خیال ہے۔"

"ابا... جو آپ کی مرضی ہے نا' وہی ہے میری مرضی' نہ پہلے کبھی آپ کے کسی فیصلے کے آگے کیا ہے انکار اور نہ ہی کروں گی آئندہ۔" ابا کی اتنی کھلی رائے مانگنے پر تو شرمانا بنتا تھا' اس لیے وہ کھلی آنکھیں جھکا کر شرمائی۔

"تے بس پھر ٹھیک ہے پتری' تو اپنی طرف سے تیاری رکھیں' ویسے تے دونے گھر اوپر نیچے ہی ہیں۔ پر فیر وی ذرا رسم ورواج تے کرنے ہی پڑتے ہیں نا اور فیر یہ بات تے تو جانتی ہے نا کہ یہ لوگ مجھے پسند شسند نئیں' پر دیکھ لے تیری خاطر تیرا ابا ایہہ قربانی وی دے کے [illegible] کوئی گل نیئں۔"

"ابا... آپ ہیں واقعی ایک عظیم انسان' مجھے آپ کی بیٹی ہونے پر ہو رہا ہے فخر۔"

"او چل کوئی گل نئیں... خیر ہے کدی کدار ہو جاتا ہے فخر وی' تو نا پریشان ہو۔" ابا نے تہبند سنبھالا اور مستقبل کے منصوبے بناتے کمرے سے نکلتے نکلتے پھر ایک دفعہ مڑے اور چندا کو دیکھا جو اس وقت اتنی خوش تھی جیسے کپڑوں کی دکان پر ساٹھ فیصد سیل دیکھ آئی ہو۔ ابا کو یہ تو پتا تھا کہ وہ ان کے فیصلے سے خوش ہوگی۔ لیکن اس کے اس قدر خوش ہونے کی امید ابا کو ہرگز نہیں تھی۔ جب ہی اس کی خوشی اور حیرت کو مزید دگنا کرنے کا سوچتے ہوئے ایک اور فراخدلانہ آفر کرکے یقیناً" اسے بے ہوش کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

"اچھا... ایسا کر جا کے اس شتومبڑے کو وی بتا دے میرے اس فیصلے کا۔"

"شتومبڑے؟" چندا کو سمجھ نہیں آیا تھا کہ لقب کسے عطا کیا گیا ہے۔

"اوئے آہو... علی دی بات کر رہا ہوں میں' تو بے شک اوس شتومبڑے کو بتا دیں' تاکہ کام وچ دیری نہ ہو... تے وہ سب دی اس کام وچ راضی ہوں۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔"

ابا تو بات ختم کرکے چلے گئے تھے' لیکن چندا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کس طرح اچھل کود کرے' ناچے گائے' شور مچائے اور سب کو بتائے کہ واقعی جگہ بدلنے سے انسان کے ذہن پر کتنے مختلف اثرات پڑتے ہیں۔

"تے ہاں اک ہور گل..." ابا آتی جاتی لائٹ کی طرح بار بار آجا رہے تھے۔ چندا پھر چونکی۔ "کوئی چیز شیز منگائی ہوئی نا تے مجھے بتائیں' فیر عین ٹیم پر مشکل دی ہو جاتی ہے اور ایویں ای خاہ مخواہ کسی کا سان (احسان) وی لینا پڑتا ہے۔ میں آپ جو ہوں سارے کم ختم کرنے کے لیے۔"

"ابا... کیا میں دیکھ رہی ہوں کوئی خواب؟"

"او نئیں پتری... وہ دراصل شادی کوئی روز روز تو نیئں نا ہوتی' بس ایسے لئی۔" بات کرکے وہ پھر غائب ہو گئے تھے اور چندا نہ صرف یہ کہ علی کو ساری صورت حال بتانے کے لیے بے چین ہو گئی تھی' بلکہ ساتھ ساتھ یہ بھی سوچنے لگی تھی کہ اس خاص موقع سے پہلے ابا سے کروایا جانے والا کام کون کون سا ہے۔

☆ ☆ ☆

علی اور چینا سروس چارجز دینے کے لیے روپوں کی تلاش میں عین اس وقت بیڈ روم کے باہر کھڑے تھے جب ضمیر بھائی "دل کے ارماں آنسوؤں میں بہ گئے۔" دل ہی دل میں گنگناتے ہوئے اب اکیلے ہی شادی دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے۔

ادھر چینا نے دبے پاؤں اپنے ہی بیڈ روم میں جاکر ضمیر کے موجود نہ ہونے کی تیقین دہانی کی اور پھر علی کو بھی بلانے کے بعد بولی۔

"آجاؤ آجاؤ' شکر ہے کہ ضمیر نہیں ہے۔

بات کرنے کے ساتھ ساتھ وہ بڑی تیزی سے ضمیر کا والٹ بھی ڈھونڈ رہی تھی اور ایک دم اس کے ہینگر میں موجود کوٹ کی جیب سے والٹ نکل بھی آیا جبھی اس نے خوشی سے یاہو کا نعرہ بھی لگا دیا۔

"والٹ تو مل گیا ہے آپی' لیکن اب اس کے اندر سے بھی تو کچھ ملے ناں' یہ تو دور سے دیکھنے میں ہی ضمیر بھائی کے منہ کی طرح پتلا اور دماغ کی طرح خالی لگ رہا ہے۔"

"علی تم بھی ناں... کم از کم کام نہیں تو چینا کی طرح باتیں ہی اچھی کرلیا کرو۔"

ابھی چینا کے جذباتی ہونے کی باری آئی تھی کہ غیر متوقعہ طور پر ضمیر بھائی کمرے میں آگئے اور جیسے ہی آئے وہ تو کلینک کے مقابلے میں یہاں بجلی ہونے اور کمرہ ٹھنڈا ہونے سے پرسکون ہوئے تھے لیکن وہ دونوں بوکھلا گئے تھے اور اتنا بوکھلائے کہ علی نے تو باقاعدہ سلام بھی کر ڈالا۔

"وہ... ضمیر بھائی... السلام و علیکم ورحمتہ اللہ۔"

"لاحول ولا..." علی کے قریب سے گزر کر صوفے پر جاتے جاتے وہ درمیان میں ہی رکے اور بولے "تمہیں کسی نے پانی سے پرہیز بتایا ہے کیا؟" "ارے یار بندہ کم از کم ہفتے بعد ہاتھ منہ ہی دھولیتا ہے۔"

"جب منہ روز دھونے سے بھی ویسا ہی رہنا ہو تو پھر بھلا فائدہ روز دھونے کا؟" علی نے مائنڈ کیا۔ "اور ویسے بھی بندہ باہر جائے تو صاف ستھرا ہو بھی جائے اب گھر میں ہی رہنا ہو تو بھلا کیا فائدہ۔"

"چینا... فضول باتیں چھوڑو' یہ اس وقت ہمارے کمرے میں کیا کر رہا ہے؟"

"ابھی تو خاموش کھڑا ہے آدھا منٹ پہلے تم سے باتیں کررہا تھا۔"

"میں پوچھ رہا ہوں کہ مجھ سے پہلے تم دونوں کیا کر رہے تھے؟" دانت پیستے ہوئے علی کو دیکھا۔

"اسی دوران ضمیر بھائی کی نظر اپنے نیچے گرے ہوئے ادھ کھلے والٹ پر پڑی تو فوراً" جاکر اٹھایا۔

"یہ... یہ میرا والٹ... نیچے...؟"

"وہ... وہ دراصل ضمیر بھائی آپ کو تو پتا ہے ناں کہ پیسے آپی کے ہاتھ کی میل ہوتے ہیں... تو... تو وہ آپی کو ناں اپنے ہاتھ بہت میلے لگ رہے تھے اور یہ آپ کے پیسوں سے ہاتھ دھونا چاہتی تھیں۔"

"ہاں ضمیر... تمہیں پتا ہے ناں چینا کتنی صفائی پسند ہے۔" وہ بات کور ہو جانے پر مسکرائی۔

"پتا ہے' پتا ہے... اسی لیے صفایا کرنے کے لیے ملازم بھی رکھا ہوا ہے۔" ضمیر بھائی نے علی کی طرف دیکھتے ہوئے اشارتاً" اسے ملازم کہا۔

"واہ ضمیر... شوہر ہو تو تمہارے جیسا... یعنی خود کو چینا کا ملازم کہتے ہوئے بھی تمہیں شرم نہیں آتی کاش چینا تمہیں ویری بولڈ کہہ سکتی۔"

"ضمیر بھائی... ملازم نہیں کے۔" چینا کے بات ختم کرتے ہی علی نے بھی بے عزتی فنڈ میں حصہ ڈالا۔

"اب جاؤ گے بھی یا کیدو کی طرح چوکیداری ہی کرتے رہو گے ہماری؟"

"ضمیر... کیا کہہ رہے ہو؟ یہ چینا کا بھائی ہے۔"

"اسی لیے تو کیدو نہیں کہا ناں' کیدو کی طرح کہا ہے۔" ضمیر بھائی کی وضاحت پر چینا مسکرانے لگی۔

"کاش چینا تمہیں آئی لو یو کہہ سکتی۔" چینا کے یوں پیار سے دیکھنے پر ضمیر بھائی اس کی طرف پیش قدمی کرتے کرتے علی کو دیکھ کر پھر رک گئے جو ابھی تک کھمبا بنا وہیں کھڑا ہوا تھا اور ایسے کھڑا ہوا تھا کہ لگتا کھڑا ہوا نہیں بلکہ جما ہوا ہے۔ وہیں سے اشارہ کرکے اس نے چینا کو یاد دلایا کہ موقع اچھا ہے۔ پیسے مانگ لیں۔

"وہ ضمیر... دراصل علی کو کچھ تھوڑے سے پیسے چاہئیں۔" سونف مسلنے کے انداز میں چینا نے ہاتھ مسلے تو ضمیر بھائی کو مزید غصہ آگیا۔

"علی کو؟ حرام کے پیسے نہیں ہیں میرے پاس۔" بات کرکے ان کا خیال تو یہی تھا کہ وہ غصے میں کمرے سے نکل جائیں لیکن نہیں جانتے تھے کہ ایک آفت خالہ کے روپ باہر بھی کھڑی ہے اور جیسے ہی انہوں نے دروازہ کھولنے کے لیے ہینڈل پر ہاتھ رکھا وہ باہر سے دروازہ کھولنے کم اور

مارنے کے انداز میں زیادہ اندر داخل ہوئیں۔ ضمیر بھائی نے بمشکل لڑکھڑاتے ہوئے اپنا ماتھا تھاما۔ مگر یہ پوچھنے کا وقت بھلا کس کے پاس تھا کہ انہیں چوٹ لگی یا نہیں۔

"ضمیر دے دو ناپلیز....."

"نہیں دوں گا' نہیں دوں گا' نہیں دوں گا.... آخر میری اپنی کمائی کے ہیں۔ کیسے دے دوں؟"

"ہائیں.... یہ تمہاری تائی کب رکھوا کر گئی ہے؟" خالہ نے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر یوں چھینک ماری کہ سامنے کھڑی چینا کا فری میں منہ کھل گیا۔

"تائی کے نہیں ہیں خالہ کمائی کے ہیں۔" ماتھا سہلاتے ہوئے وہ بلبلائے۔

"کبھی تائی کبھی نائی.... سیدھی طرح بتاتے کیوں نہیں ہو کس کے پیسے ہیں؟" خالہ کو غصہ بس تقریباً" آہی گیا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی مزید کاری وار کرتیں چینا بولی۔

"چینا کا تو مشورہ ہے کہ ضمیر بس اب پیسے دے بھی دو' ورنہ خالہ کہاں چھوڑیں گی۔"

"اوہ میرے خدا۔" ضمیر بھائی کو اپنا دماغ موت کے کنویں میں گھومتا محسوس ہوا تو فوراً" ہی والٹ سے سو کا نوٹ نکال کر علی کی طرف بڑھایا۔ جو علی نے تو فوراً" ہی پکڑ لیا مگر چینا بولی۔

"ضمیر.... تم نے سو کا نوٹ علی کو ہاتھ صاف کرنے کے لیے دیا ہے؟"

"ہاں تو اور کیا آپی' دیکھ لیں یہ ہے آپ کی اوقات۔"

"علی جو چیز ہے ہی نہیں اس کے بارے میں بات کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" چینا کے بولنے سے پہلے ہی ضمیر بھائی بول اٹھے تھے۔

"ہاں ضرورت تو بس اب اوپر جانے کی ہی ہے.... اور میں اوپر جا رہا ہوں۔"

"نہیں علی نہیں.... ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے اوپر جانے کی.... اتنا جذباتی نہ بنو چینا کے بھائی کاش کہ چینا تمہارے ساتھ ہوتی نا انصافی روک سکتی...." چینا دل جمعی سے رونا شروع کرنے ہی والی تھی کہ علی نے معاملہ کلیئر کیا۔

"اوہو آپی میں اوپر والے پورشن میں جا رہا ہوں۔"

"کیوں؟" ان کی ٹوٹیاں ٹھیک کرنی ہیں؟" ضمیر بھائی نے طنز کیا۔

"رکو رکو میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی کیونکہ مجھے سب پتا ہے کہ تم وہاں بھی پیسے مانگنے جاؤ گے.... اور اگر خدانخواستہ انہوں نے تمہیں پیسے دے ہی دیے تو اتنی بڑی رقم لے کر اکیلے نیچے آنا بھی تو ٹھیک نہیں ہے ناں۔"

خالہ ان لوگوں میں سے تھیں جو بیمار پرسی کرنے کے بہانے کئی لوگوں کی موت کا احوال سنا آتے ہیں۔

"پیسے پیسے پیسے.... مجھے بھی تو سمجھ آئے ناں کہ آخر ان پیسوں کا کرنا کیا ہے تم نے؟" ضمیر بھائی نے آخر پوچھ ہی لیا تھا کیونکہ جس پیمانے پر پیسوں اور پیسے ادھار دینے والے بندے کی تلاش جاری تھی اور شادی دفتر بند ہونے کے نقصان سے آنکھ چرائی گئی تھی اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ کچھ نہ کچھ ہے۔ جس کی پردہ داری ہے۔

"کوئی بتائے گا کہ ان پیسوں سے کیا کیا جائے گا؟"

"جی ہاں میں بتاؤں گا۔" علی نے نوکیلے کیل کے سرے جیسا منہ بنایا۔

"ان پیسوں سے آپ کو زکواۃ دی جائے گی۔" بات ختم کر کے علی فوراً" ہی کمرے سے نکل کر اوپر والے پورشن کی طرف بڑھا۔ آٹومیٹک دروازے کی طرح خالہ بھی اس کے پیچھے ہی تھیں۔ ادھر ضمیر بھائی کی بے چینی بھی عروج پر تھی لہٰذا چینا نے انہیں تفصیل سے آگاہ کرنا اپنا فرض سمجھا۔

✿ ✿ ✿

ایک زمانہ تھا جب لوگ پیار میں اندھے ہوا کرتے تھے لیکن اب تو تلے ہوتے ہیں اور اس کی تازہ ترین مثال علی تھا جو چندا کو سامنے پاکر عجیب سا ہو گیا تھا۔

"ہیلو میلی پالی شی چندا...." اور اس سے پہلے کہ چندا ابھی کچھ شرماہٹوں اور گھبراہٹوں کے ساتھ علی کو ساری بات بتاتی۔ علی کے پیچھے سے خالہ کا نمودار ہونا تھا کہ منہ کا ذائقہ ہی بگاڑ گیا۔

"تمہارے ابا ہیں....؟" علی نے اگربتی کی تیز خوشبو کی طرح زبردستی محبت بکھیرنے کی کوشش کی تھی' جواب میں چندا نے برا سا منہ بنا کر نفی میں سر ہلا دیا کہ وہ تو آج علی سے بالکل اکیلے میں بات کرنا چاہتی تھی مگر ساتھ ہی خالہ کو دیکھا تو ماحول بگڑتا ہوا لگا اور یہ جان کر کہ وہ اس وقت گھر میں اکیلی ہے علی شدید خوشی سے کچھ بولنے ہی والا تھا کہ خالہ نے غم سے کہا۔

"اناللہ وانا علیہ راجعون.... وہ کب چلے گئے ایسے چپ چاپ بنا بتائے۔"

"خالہ وہ اس گھر سے گئے ہیں دنیا سے نہیں گئے۔" علی نے دانت پیسے۔

"خالہ آپ یہاں سے جاتی ہیں یا ہم چلے جائیں؟" علی نے ان کا ہاتھ پکڑا اور زبردستی دروازے کے سامنے کھڑا کر دیا۔

"بس۔۔۔ اب آپ تھوڑی دیر یہیں رہیں خالہ کیوں بنا بنایا کام بگاڑنا چاہتی ہیں؟" اور خالہ کو افسردہ چھوڑ کر علی دوبارہ چندا کے کمرے میں جا کر دروازہ بند کرتے ہوئے اس کی طرف بڑھا جو اب تک ایسا منہ بنا کر کھڑی تھی جیسا عام طور پر زیادہ تعداد والی کلاس کی ٹیچر کا چھٹی کے وقت ہوتا ہے۔

"میں خالہ کو باہر چھوڑ آیا ہوں چندا۔۔۔ کیونکہ میں یہ بات خالہ تو کیا کسی بھی اور کے سامنے نہیں کر سکتا تھا۔" علی کے انداز نے چندا کو چونکا دیا اور باوجود اس کے کہ وہ خود اسے ابا والی بات بتانے کو بے چین تھی لیکن اب تو دل چاہتا تھا کہ بس علی ہی بولے۔

"کیا بات ہے ایسی علی؟"

"چندا وہ ناں دراصل مجھے۔۔۔" علی نے ایک بار مڑ کر بند دروازے کو دیکھا۔

"چندا وہ۔۔۔ دراصل۔۔۔ مجھے تم سے۔۔۔ ادھار چاہیے تھا۔"

"کیا۔۔۔؟" اپنی توقعات کے بالکل ہی برعکس بات سننے پر اب وہ بھرپور طریقے سے غصے میں تھی۔ دوسری طرف خالہ جو دروازے سے کان لگائے کھڑی تھیں ہمیشہ کی طرح دھڑام سے دروازہ کھول کر گرنے کے انداز میں اندر داخل ہوئیں اور آتے ہی سب سے پہلے تو دونوں ہاتھ کمر پر رکھے اور بولیں۔

"واہ واہ واہ یعنی تمہیں چندا سے پیار چاہیے تھا۔"

"ارے نہیں خالہ میں نے تو۔۔۔" علی نے بے چارگی سے دیکھا۔

"مجھے تو تم کچھ اور کہہ کر لائے تھے ناں اب یہاں آ کر پیار مانگ رہے ہو؟"

"ہونہہ۔۔۔ میں بھی کوئی اس کے پیار کے لیے نہیں جا رہی مری۔" چندا نے غصے سے علی اور خالہ کو دیکھا اور کمرے سے نکل گئی۔ خالہ نے بھی سر کھجایا اور بولیں۔

"ضرورت بھی کیا ہے مری جانے کی۔۔۔ جب ہمیں کراچی میں ہی تھوک کے حساب سے پیار مل رہا ہے۔

اور اب تو مجھے بھی مل گیا ہے۔" خالہ نے اپنے ہی حساب سے بات کی جبکہ علی یوں ایک دم بات بگڑ جانے پر بے حد پریشان تھا۔

☼ ☼ ☼

ضمیر بھائی اور چینا بڑی ہی بے چینی سے لاؤنج میں علی کی طرف سے آنے والی خبر کا ایسے انتظار کر رہے تھے گویا وہ ہاسپٹل کے لیڈیز وارڈ میں کھڑے ہوں۔ اسی دوران علی کے بجائے چندا کو سیڑھیوں سے اترتا دیکھا تو بڑے جوش سے اس کی طرف بڑھے۔

"ہاں چندا، بتاؤ کیا ہوا؟ بچ چینا بہت ہی بے چین ہے۔"

"آپی میں گھر سے آ رہی ہوں، نہیں آ رہی کسی آپریشن تھیٹر سے۔"

"چینا کا مطلب ہے علی کا کچھ ہوا؟ وہ اسی امید سے تو تمہارے پاس گیا تھا ناں۔"

"جی نہیں میرے پاس تو وہ گیا تھا ادھار مانگنے۔" ضمیر بھائی کے سمجھانے کی کوشش پر وہ بولی۔

"ہاں تو میں کب کہہ رہا ہوں کہ وہ تمہارے پاس کپڑے استری کرنے گیا تھا۔ تم بس یہ بتا دو کہ تم نے اسے رقم دی کہ نہیں؟"

"رقم؟ میرے پاس نہیں ہے اس کے لیے ایک پیسہ بھی۔" وہ آگے بڑھی۔

"ارے ناراض نہ ہو چندا اس کے لیے نہیں ہے تو چینا کو ہی دے دو" اس بے چارے کی لاٹری تو نکل آئی لیکن شاید وہ لاٹری کی رقم نہ لے سکے۔" چندا باہر جاتے جاتے مڑ کر پھر واپس آئی۔

"علی کی پورے دو لاکھ روپے کی لاٹری نکلی ہے، لیکن پہلے سروس چارجز کے پچیس ہزار بھی دینے ہیں اور خود مجھے جب سے پتا چلا ہے ناں میں نے تو پندرہ ہزار چینا کو دے بھی دیے اب باقی کچھ تم دے دو اور یقین رکھو کہ جتنے دو گی اس کے ڈبل واپس ملیں گے۔"

شاید تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا جب ضمیر بھائی علی کی حمایت میں بول رہے تھے اور بے دریغ بول رہے تھے۔ چینا نے بھی سائیڈ پوز پر یقین کرنے کے بجائے سامنے سے آ کر دیکھا تب مانی۔

چندا نے فوراً ہی پرس میں ہاتھ ڈالا اور پھر باہر بھی نکال

لیا۔ ضمیر اور چینا کو ان ہاتھوں میں پیسے دیکھ کر یقیناً "بے حد عجیب لگ رہا تھا کیونکہ ان کے نزدیک چندا کے ابا کے ہوتے ہوئے چندا کے ہاتھوں میں پیسے نظر آنا ایسا ہی تھا جیسے چڑیا کا تیرنا...!

"یہ لیں 'بل کے پیسے تھے جو میں جا رہی تھی جمع کروانے۔ لیکن لے لیں آپ۔"

"کیا تم سچ کہہ رہی ہو چندا؟" چینا نے لمحہ بھر بھی ضائع کیے بغیر اس کے ہاتھ سے پیسے جھپٹ لینے کے بعد پوچھا تو چندا شرما شرما کر بھی ویسی ہی رہی۔

"یہ سچ ہی ہے آپی' کیونکہ بل سے کہیں زیادہ اہم ہوتا ہے یہ دل۔"

"ہاں بالکل... کم از کم اپنا جو ہوتا ہے۔" ضمیر بھائی نے بھی عاشقانہ نظروں سے چندا کو دیکھنے کا ارادہ ترک کر کے اسی موڈ اور انداز کے ساتھ چینا کو دیکھا کیونکہ بہرحال اس وقت اس کے ہی پاس پیسے تھے اس لیے عزت اور محبت کی بھی صرف وہی حق دار تھی۔ اسی دوران باہر بیل ہوئی اور اس کے ساتھ ہی خالہ اور علی گرتے پڑتے سیڑھیوں سے نیچے اترتے دکھائی دیے۔

"اور ہاں میں کروں گی کوشش' اگر ابا سے بھی کچھ پیسے مل گئے تو دے دوں گی وہ بھی۔"

"ہائے اللہ چندا تم کتنی اچھی ہو... کاش چینا تمہیں بھابھی کہہ سکتی۔"

چینا کے والہانہ انداز پر چینا منہ میں انگلی دبائے سیڑھیوں سے اپنے پورشن کی طرف لپکی۔

"ہاں تو کہہ دیں آپی' آپ کو روکا کس نے ہے؟" علی خالہ کے سائے سے نکل کر آیا۔

☆ ☆ ☆
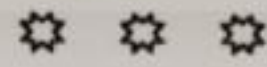
ابا کو بچپن سے ہی مشہور ہونے کا بہت شوق تھا۔ چاہتے تھے کہ لوگ ان کو موضوع بحث لایا کریں اور ان کے بارے میں بات کیا کریں۔

ابھی وہ اپنے بیڈ روم میں داخل ہوئے ہی تھے کہ چندا بھی ان کے پیچھے پیچھے چلی گئی۔

"ابا... وہ مجھے چاہیے تھے کچھ پیسے؟"

"کس؟ پتری سارا کش ای تیرا ہے۔" وہ مسکرائے۔

"وہ تو معلوم ہے مجھے' لیکن ابا مجھے ابھی چاہیے ناں' ضرورت ہے ابھی۔"

"او پتری' ضرورت ہے تے منگ لے' شرماتی گھبراتی کیوں ہے۔" انہوں نے تکیے کے نیچے رکھا موبائل دیکھ کر کسی کال کے آنے نہ آنے کی تصدیق کی باوجود اس کے کہ بیٹری کی بچت کے لیے فون پاور آف تھا۔

"مانگ تو رہی ہوں ناں ابا... دے دیں ناں۔"

"پتری' پیسے نہ منگ' پیسے ملنے کی دعا منگ دعا۔ ہاتھ اٹھا کے بول یا اللہ مجھے پیسے دے۔"

"ابا' آپ بھی لگوا لیا کریں ناں کبھی پیسوں کو ہوا۔" اسے غصہ آگیا تھا۔

شاوا شے... اتنی گرمی وچ خود ہمیں ہوا نئیں لگ رہی' تیرا دل ہے جو تھوڑی بہت ہوا ہے وہ بھی پیسوں کو لگوا دوں؟ تے خود سک سڑ جاؤں؟"

"ٹھیک ہے ابا' جب دے گا ناں علی مجھے پیسے تو میں بھی نہیں دوں گی ایک روپیہ بھی۔"

"علی دے گا؟ کیوں اور مزاروں کے باہر بیٹھنے لگ گیا ہے کیا؟" ابا نے ہنسی اڑائی۔

اس کی نکلی ہے لاٹری اور لاٹری بھی نکلی ہے فون سے اور جب اسے ملیں گے ناں پیسے تو نہیں دے گا وہ آپ کو بھی۔"

"اچھا تیرا مطلب ہے کہ فون سے لاٹری وی نکل سکتی ہے؟"

"جی ابا... یہ دنیا ہے یہاں بہت کچھ ہو سکتا ہے۔" بات ختم کر کے چندا تو غصے سے کمرے سے نکل گئی۔ لیکن ابا کو ایک نئی سوچ میں ڈال گئی تھی انہوں نے بڑی محبت بھری نظروں سے سامنے رکھے شاپر میں رکھے اپنے موبائل فون کو دیکھا اور پھر گردن موڑ کر الماری کو لگے موٹے تالے کو' اب تک انہیں یہ اطمینان تھا کہ چندا نے وہ انگوٹھی نہیں دیکھی' جو وہ اسے سرپرائز دینے کے لیے خصوصاً "منگنی کی رسم کی وجہ سے لائے تھے۔ مگر کچھ دیر بعد حیران پریشان نیچے چلے آئے' جہاں سب بیٹھے باتوں میں مصروف تھے۔

"ابا... کیا آپ آئے تھے کوئی بات کرنے؟" چندا نے ابا سے اچانک پوچھا۔

"نئیں نئیں پتری میں تے ذرا بور ہو رہا تھا ناں تے سوچیا کہ نیچے جا کے گپ شپ ہی کروا آؤں۔" انہوں نے گہرا طنز کیا تھا لیکن بھلا چندا کو یہ گہری باتیں کب سمجھ آتی تھیں۔

"ارے تو آپ نے چندا سمیت سب کو اوپر ہی بلا لینا تھا

ناں' خوامخواہ تکلیف کی۔"

"تکلیف کا تو کوئی مجھ سے پوچھے تے فیر میں بتاؤں ناں۔" پریشانی میں ان کا منہ انیس سو ستر کی فلموں میں موجود ایکسٹراز جیسا ہو گیا تھا۔

"تو آپ کا کیا خیال ہے کہ اب تک ہم محلے والوں سے بات کر رہے تھے۔" علی نے موبائل پر ٹائم دیکھا۔

"توں تے چپ کر جا چوٹھیا (جھوٹے) ہمیں کہتے ہو کہ لاٹری فون سے نکلی ہے۔ ہونہہ۔"

"تو آپ کا کیا خیال ہے کسی دراز سے نکلی ہے؟"

"چل من لیا کہ تیری لاٹری فون سے نکلی ہے پر فیر میری کیوں نئیں نکلی۔۔۔ میں وی تے اپنا سارا فون کھول کے رکھ دتا اے پر اس نکی جی ٹکی (سم) دے علاوہ کش وی نئیں نکلیا۔" ابا نے موبائل کی باقیات ٹیبل پر یوں رکھیں جیسے پولیس والے پریس کانفرنس کے وقت اسلحہ سجا کے رکھتے ہیں۔ علی نے ضمیر بھائی کو اور ضمیر بھائی نے علی کو ترحم آمیز نظروں سے دیکھا۔

"ہاں علی۔۔۔ چندا کے ابا کہتے تو ٹھیک ہیں۔۔۔ ان کی لاٹری کیوں نہیں نکلی۔" خالہ نے اپنی طرف داری ظاہر کرنے کے لیے ابا کی طرف سے سوال کیا۔

"او خالہ کمپنی کمپنی کا فرق ہوتا ہے ناں۔۔۔ اب اس میں میرا کیا قصور؟"

"ہاں فتور تو تم نے کوئی نہیں ڈالا اس بات کی تو میں بھی گواہ ہوں۔ سنیں' اس میں علی کی کوئی غلطی نہیں ہے۔" خالہ نے ابا کو دلاسہ دیا اور خالہ کی میٹھی سی آواز نے تو گویا ابا پر ایسا اثر کیا کہ فوراً" ہی اپنی غلطی مان لی۔

"آہو غلطی تے میری ہے' اس فون کو دکان تے ہی کھول کر دیکھ لیتا ناں کہ لاٹری ہے کہ نہیں۔"

"جو کچھ بھی ہے لیکن اس وقت نہیں ہے ان باتوں کا وقت بلکہ اب تو وقت ہے عمل کا۔" چندا نے سب کو جلدی سے چلنے پر اکسایا۔

☆ ☆ ☆
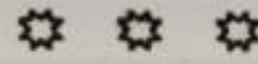
منی ٹیکسی میں سوار ہو کر تکرار ہاؤس کا یہ قافلہ اب ایک بنگلے کے بیرونی گیٹ کے سامنے کھڑا تھا۔ بیل دینے پر اندر سے ایک انسان نما چیز باہر آئی تو ضمیر بھائی نے فوراً" ہی خیر سگالی کے جذبات کے طور پر سلام لینے کے انداز میں ہاتھ آگے بڑھایا۔

"السلام و علیکم' میرا نام ضمیر ہے۔"

"چل بے کچھ نہیں چاہیے پھوٹ یہاں سے۔" اس نے دھم سے گیٹ بند کیا تو وہ سب ایک دوسرے کو دیکھنے لگے سو آگے بڑھ کر علی نے بیل دی۔

"دیکھیں آپ ہمیں اندر تو آنے دیں۔"

"ہاں اب بتا کیا تکلیف ہے؟ کیا لینے آئے ہو یہاں؟"

"تکلیف؟ ارے میں تو خود ڈاکٹر ہوں' ہم تو یہاں اپنے دو لاکھ روپے لینے آئے ہیں جو ہمارے لاٹری کے ہیں۔" ضمیر بھائی نے عینک اتار کر پہلے ہاتھ میں پکڑے' پھر دوبارہ لگالی۔

"اوہ اچھا اچھا تو یہ ساری دو لاکھ والی پارٹی ہے' بڑا دلیر ہے تو ڈاکٹر۔"

"باتیں چھوڑو اور پہلے ہماری رقم نکالو۔" ضمیر بھائی بھولپن میں مارے جانے والے تھے کہ چینا کو کسی خطرے کا احساس ہوا اور اس نے ضمیر کا ہاتھ بڑی مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"بڑا کون ہے بے تم سب میں سے؟"

"وہ۔ چینا تو سب سے چھوٹی ہے ویسے ہی ذرا قد بڑھ گیا ہے اور۔ اور ابا سب سے بڑے ہیں لیکن پتا نہیں کیوں ان کا قد رک گیا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ مرضی تیرے ابا کی ہی چلے گی۔" چینا ضمیر کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے پیچھے سرکنے لگی تھی۔

"او جی کیا مطلبل ہے جی آپ کا۔" ابا سینہ تان کر آگے بڑھے تو انہوں نے بندوق تان لی۔

"ابے ایک تو بندے اغوا کرتا ہے اور سے تاوان لینے گھر آجاتا ہے بڈھے۔ بول' بتا اب رقم نکلوائے گا کہ بھر کس۔۔ یا کروں پولیس کو فون؟"

ابا نے دائیں بائیں دیکھا تو خود کو تنہا ہوتے پایا باقی سب آہستہ آہستہ پیچھے کی طرف چل رہے تھے۔

وہ سب بھول کر گاڑی میں بیٹھ گئے' فور سیٹر کے انداز کی منی ٹیکسی میں وہ خالہ' علی اور چندا اور ضمیر بھائی اور چینا آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ خالہ نے سب کو خاموش اور بجھا بجھا محسوس کیا تو بولیں۔

"میری تو یہ سمجھ نہیں آتا کہ ہم جب بھی پیسے کمانے نکلتے ہیں ہمیشہ ذلت کما کر ہی آتے ہیں۔"

"اس لیے کہ ہم پیسے نہیں کماتے بلکہ شارٹ کٹ ڈھونڈتے ہیں' شارٹ کٹ۔" ضمیر بھائی نے ٹیکسی کو گلے

جھٹکے سے گرے اپنا چشمہ چینا کے پاؤں پر سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ارے ضمیر یہ کیا' گلے تو پڑ ہی گئے ہو' اب پاؤں کیوں پڑ رہے ہو اس کے۔" خالہ سمجھیں تھیں کہ ضمیر بھائی چینا کے پاؤں پڑے ہوئے ہیں۔

"خالہ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" چینا کو اپنے سوا کسی اور کے منہ سے ضمیر بھائی کی بے عزتی سن کر برا لگا "آپ کو بھلا کیا پتا کہ ضمیر کو تو چینا اپنے سر کا تاج سمجھتی ہے۔"

"انسان ہو انسان رہو مور کی نسل میں شامل ہونے کی کوشش نہ کرو۔" اس سے پہلے کہ خالہ کچھ اور کہتیں ان کا دھیان چندا اور علی کی طرف گیا جو یقیناً" خاموشی سے باتیں کرتے ہی جا رہے تھے۔ "علی' ہم سب ادھر Burried ہو رہے ہیں اور تم ہو کہ۔"

خالہ توبہ کریں جو منہ میں آتا ہے بول دیتی ہیں "Burried نہیں Worried"

"ارے واہ جو منہ میں آئے گا وہی تو بولوں گی ناں' تم کیا کان میں آیا ہوا بولتے ہو۔" اور عین وہی وقت تھا جب اچانک سے ٹیکسی کو جھٹکا لگا اور خالہ اور ابا کا سر ٹکرا گیا۔ ابا جو صدمے کے وجہ سے جاگتی آنکھوں کے ساتھ نیم بے ہوش سے بیٹھے تھے۔ اس ٹکڑ سے ایک دم ہوش میں آگئے اور تب دونوں دیر تک ایک دوسرے کو یوں دیکھتے رہے کہ جیسے سر نہیں بلکہ ان کے دل ٹکرا گئے ہوں۔

☼ ☼ ☼

ٹکرا ہاؤس میں اتنی پریشانی تھی کہ لگتا دنبہ ذبح ہونے سے پہلے ہی مر گیا ہو۔ لیکن اب سب ہی اپنے اپنے طور پر کوشش کرنا چاہتے تھے کہ ماحول پہلے جیسا ٹکراری ہو جائے اور پھر اب تو چندا نے بھی خود علی کو آبیل مجھے مار پر عمل کرتے ہوئے گرین سگنل دکھا کر رشتہ بھیجنے کا کہا تھا۔ اور اب ڈائننگ ٹیبل کی طرف جاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ آج تو یہ نالہ پار کر ہی لے گا۔

خالہ اور چینا کھانے کی ٹیبل پر کھانا رکھ رہی تھیں۔ جب خالہ نے مسکراتے ہوئے کم اور علی کو لگا جیسے کہ چڑاتے ہوئے زیادہ کہا۔ "آج کھانا ہم دونوں نے مل کر تیار کیا ہے۔"

"کھانا تیار کیا ہے خالہ یا دلہن؟ اصلی شکل تو سمجھ ہی نہیں آ رہی۔" ضمیر بھائی کے چہرے پر مسکینی طاری تھی اور آواز میں بھی۔

"ارے تو پہلے چکھو تاں' پھر دیکھنا۔"

"پتا ہے ضمیر۔ لذیذ کھانا بنانے میں عورتوں کا کوئی کمال نہیں ہوتا اور نہ ہی بد مزا کھانا بنانے میں ان کا کوئی قصور' کیونکہ چینا کا دعوا ہے کہ لذیذ اور مزے دار کھانا صرف اس لڑکی کے ہاتھوں سے بن سکتا ہے۔ جس کا شوہر اس سے بے پناہ پیار کرتا ہو۔ اب خود سوچو ناں کہ اگر کھانا اچھا نہ بنے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ شوہر اس سے پیار ہی نہیں کرتا' بے چاری لڑکی کی اس میں کیا غلطی؟"

چینا نے اب تو بات ہی ایسی کر دی تھی کہ ضمیر چاہنے کے باوجود بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ کھانا آج بہت ہی بد مزا بنا ہے۔ سو مجبور چہرے کے تاثرات سے ایسے ظاہر کرنے لگا جیسا کہ کھانا تو بے حد لذیذ ہے حالانکہ وہ خود نہ تو یہ سمجھ پا رہا تھا کہ آج آخر اس کے سامنے موجود چیزیں کہاں سے دریافت ہوئی ہیں اور کیا ہیں اور نہ ہی دماغ اس حد تک جا رہا تھا کہ وہ عظیم مسالاجات بھی آخر ہیں کون سے جنہیں ساتھ ملا کر اس کے خلاف یہ کارروائی کی گئی۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہ شوہر تھے اور انہیں بہرحال گھر کا سکون عزیز تھا تب ہی اداکاری کے برج الخلیفہ کو چھوتے ہوئے بولے۔

"واہ بھئی واہ۔ آج تو چینا مزا آگیا کھانے میں۔"

"واقعی ضمیر۔۔۔؟" خالہ اور چینا نے حیرت کے مارے بوکھلاتے ہوئے جبکہ علی نے پریشانی سے سر کھجاتے ہوئے ان کی ذہنی حالت کے مکمل ٹھیک ہونے کی یقین دہانی کی۔

"ہاں تو اور کیا۔ آج تو دل چاہ رہا ہے کہ اپنی انگلیاں بھی چاٹتا رہوں' بھئی کیا ذائقہ تھا' "واہ خالہ مبارک ہو بہت بہت۔" چینا نے سامنے کھڑی خالہ کو پیچھے سے گلے لگا لیا تھا۔ وہ بھی خوشی میں اپنے بنیادی رنگ سے کہیں بڑھ کر گہری ہوتی دکھائی دیں۔

"ارے واہ آپی' آج تو بڑا لاڈ ہو رہا ہے خالہ سے' آخر چکر کیا ہے؟" علی نے خالہ اور چینا کے تعلقات دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

"ہاں ناں چینا لاڈ کیوں نہ کرے خالہ کے۔ آخر اتنا اچھا کھانا بنایا ہے تو اس کا تو پھر یہ ہی مطلب ہوا ناں کہ خالہ کے ہونے والے "وہ" ان سے بہت پیار کریں گے۔"

اس بات پر ضمیر بھائی نے چونک کر چینا کو اور پھر خالہ کو دیکھا جو شرما شرما کر بے حال ہو گئی تھیں۔

"تو کیا یہ کھانا تم نے نہیں بنایا تھا؟" انہوں نے پوچھا۔
"نہیں تو۔ چینا نے تو یہ والا بنایا ہے۔" اس نے ایک اور ڈونگہ ضمیر بھائی کے آگے رکھا جس میں موجود تمام اشیاء یقینی طور پر کسی زمانے میں اپنا نام اور مقام ضرور رکھتی ہوں گی لیکن اب تو سب ہی اپنی شناخت کھو چکی تھیں۔ ضمیر بھائی کا دل چاہ رہا تھا کہ اپنا سر دیوار میں نہ ماریں بلکہ دیوار ہی سر پر دے ماریں۔

"تو یعنی اب یہ بھی چکھنا پڑے گا؟" انہوں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"ہاں تو اور کیا' چینا نے بنایا ہے' چکھنا تو پڑے گا۔" وہ اٹھلائی۔

"چکھنے کا اس لیے کہہ رہی ہیں کہ کھانے کی ہمت تو پتا نہیں پھر ہوگی بھی کہ نہیں۔" علی مسکرایا۔

"ویسے آپی میرے لیے کوئی آپشن اور نہیں ہے کیا؟"

"ہے ناں۔ کھاؤ یا ناں کھاؤ' بلکہ یہ کھاؤ نا چینا نے بنایا ہے۔"

"مجھے معاف کریں کیونکہ نہ تو میری ابھی شادی ہوئی ہے اور نہ ہی میں نے کسی کو اپنی محبت کا یقین دلانا ہے۔"

"ویسے ایک بات تو پکی ہے کہ اگر کھانا چولہے کے بجائے عقل سے پکتا تو کتنے ہی لوگ بے چارے بھوکے ہی رہ جاتے۔" ضمیر بھائی کے آگے کھانا پیچھے چینا تھی تب ہی بڑے ہی محتاط انداز میں بولے اور جانے کونسی نیکی کام آئی کہ علی نے چینا کی توجہ اپنی طرف کھینچی۔

"شادی تو میری اب تک ہو بھی چکی ہوتی اگر آپ میں سے کوئی سیریز ہوتا۔" ضمیر بھائی بولے۔

"ارے تو تم کو رشتہ دیتا ہی کون ہے ورنہ ہم تو ابھی اپنے پیروں پر اٹھ کر چلے جاتے۔"

"دور کیوں جائیں بھلا' میرا رشتہ لینے آپ کو کہیں نہیں جانا پڑے گا کیونکہ رشتہ گھر میں ہی موجود ہے" علی نے مسکرا کر سب کو حیران کر دیا تھا۔

"آپ جائیں اور اوپر سے رشتہ لے آئیں۔"

"یہ تم ہمیں رشتہ لینے بھیج رہے ہو کہ دہی لینے؟" ضمیر بھائی کو بیٹھے بٹھائے پتا نہیں کیوں ایک دم ہی علی سے حسد محسوس ہونے لگا تھا۔

"واہ واہ علی۔ تم نے ثابت کر دیا کہ تم چینا کے ہی بھائی ہو۔ یعنی اتنی کفایت شعاری' اتنی بچت کاش چینا تمہیں کسی کنجوس کا داماد کہہ سکتی۔"

"تو کہہ دیں ناں آپی کہہ دیں' کوئی گھڑی قبولیت کی بھی ہوتی ہے۔ ڈریں نا۔"

"ڈر تو مجھے اس وقت سے لگ رہا ہے جب یہ شادی ہوگی۔" ضمیر بھائی زبردستی کے دانشور بننا چاہ رہے تھے۔ علی بھی غصے میں آگیا۔

"آپ لوگ رشتہ لینے جاتے ہیں یا میں۔۔۔"

"پیک کروا لاؤں۔" ضمیر بھائی نے شرارت سے اس کی بات کاٹی لیکن شرارت مہنگی پڑ گئی۔

"ضمیر کاش چینا تمہیں کوئی نچلے درجے کا جگت باز کہہ سکتی۔ علی چینا خود لے کر جائے گی تمہارا رشتہ' خالہ' ضمیر اور علی تم بھی آنا ہے تو آجاؤ نہیں آنا تو پھر بھی آجاؤ۔" چینا نے ہونہہ کے انداز میں گردن کو جھٹکا دیا تو ان تینوں کو اس کے پیچھے آنا ہی پڑا۔ یہ الگ بات ہے کہ علی کے علاوہ باقی دونوں کا سر دیکھ کر لگتا تھا جیسے ان کا منہ بنا ہوا ہے۔

☼ ☼ ☼

میں تو ہر روز پڑوں عشق میں مجنوں کی طرح
اور تڑپتی ہو میرے پیار میں لیلیٰ میری
اس کے ابا کو تو دنیا سے اٹھا لے یارب
لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری

چندا کے پورشن میں جانے سے پہلے اس قدر دل کا دھڑکنا تو خود علی کی سمجھ سے باہر تھا۔ پتا نہیں ابا کی طرف سے نہ ہو جانے کا خوف تھا یا پھر مذاق میں ہی ہاں ہو جانے کا ڈر اسے کچھ بھی تو سمجھ نہیں آرہا تھا۔

"کیا شادی کی صرف کارروائی شروع ہو جانے پر ہی اس قدر حواس گم ہو جاتے ہیں؟" اس نے خود سے پوچھا اور اسی پوچھ پچھ میں سیڑھیاں ختم ہوگئیں سامنے ہی ابا اپنے روایتی لباس یعنی تہبند کے ساتھ سفید کرتا پہنے ایسے بیٹھے تھے گویا کسی کے انتظار میں ہوں۔ ان سب کو باجماعت اپنے گھر آتا دیکھ کر تو جیسے انہیں بوکھلاہٹ سی ہوگئی تھی۔ ایک دم کھڑے ہو کر یوں خوشی خوشی ان کا استقبال کرنے لگے جیسے جانتے نہ ہوں پہچانتے نہ ہوں۔ خود چینا وغیرہ ان کی اس رد عمل پر بے حد حیران تھے۔

"او شاواشے۔ میں تے خود کتنے ہی دنوں سے سوچ رہا تھا کہ ذرا آپ کے گھر جا کے کوئی چکر شکر لگا کے آوں۔"

"ارے واہ' اس کا تو مطلب ہوا نا کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے بلکہ یہاں تو دل کو دل سے موٹر وے ہو چکی ہے

ناں۔" چینا نے حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ابا کو دیکھا۔

"بس جی' آج کل تے دلوں کے ملنے کا موسم آگیا ہے ناں۔" آج تو ابا کے چہرہ سنہرا ہو رہا تھا ابا اور اتنی محبت اور دھیمے انداز میں بات کریں یہ ممکن ہوتا اگر شیر کا درخت پر چڑھنا' اگر پانی مچھلیوں سے ملتا یا اگر گری آگ سے ختم ہوتی۔ ایسا تو کچھ بھی نہیں ہوا تھا لیکن پھر بھی وہ اس لہجے میں بات کرکے مسلسل حیران کررہے تھے۔

"اچھا چلیں یہ سب باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی' چینا کا خیال ہے کہ اتنے بہت سارے دن تو بس ایسے ہی گزر گئے تو کیوں ناں آج ذرا آپ اپنے بارے میں کچھ بتائیں۔"

"آہو جی کیوں نئیں ضرور پچھو کیا پچھنا ہے؟" ابا تو خبردار قسم کے تیار ہو کر بیٹھنے لگے تھے جبکہ علی یہاں وہاں رویت ہلال کمیٹی کے بزرگ ارکان کی طرح چاند کو یعنی اپنی چندا کو ڈھونڈ رہا تھا کیونکہ علی کا ماننا تھا کہ وہ کوئی واقعی انوکھا سا ہی لاڈلا ہوگا جو کہ کھیلنے کے لیے چاند مانگے۔ کیونکہ ایک مذکر کا دوسری مذکر چیز کے لیے اس قدر شدت سے چاہت کا اظہار کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے البتہ وہ اپنے معاملے میں اس لیے بھی قدرے مطمئن تھا کہ وہ چاند نہیں بلکہ چندا کے لیے اپنا چین داؤ پر لگانے والا ہے اور اب اس کے ابا کو لائن پر لایا جارہا تھا تاکہ ان کی طرف سے انکار ہونے کی کوئی بھی گنجائش نہ رہے۔

"ہم نے آپ کے اور چندا کے علاوہ کبھی کسی کو دیکھا نہیں آپ کے گھر میں۔ کیا صرف۔ میرا مطلب ہے کہ آپ کے کل کتنے بال بچے ہیں۔" خالہ نے بڑی ہی جھجک سے پوچھا تو ابا نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انہیں دیکھا۔

"آج تک میں نے گنے تے نئیں ہیں پر یہی کش بچے ہیں جتنے نظر آرہے ہیں۔" خالہ نے بال بچوں کا پوچھا تھا لیکن ابا نے سر پر بچے ہوئے بالوں میں لپیٹ کر جواب دیا اور پھر خود ہی جھیپے بولے۔

"تے جہاں تک بات ہے کاکے کاکیوں کی' تے فی الحال تے صرف چندا ای ہے اب آگے فیر رب جانے تے اس کے کام' بندا وچارا کش نئیں کر سکتا۔" ابا نے ایک ایک لفظ سے امید ٹپک رہی تھی جس نے سب کو ٹھٹکنے پر مجبور کردیا۔

"بس کیا تے کش بتاؤں کہ آج کل کس کا خیال میریاں نینداں چرا کے لے گیا ہے۔" اسی دوران چندا ابا کی بول

اور گلاس ٹرے میں رکھ کر لائی تو چندا اور علی ایک دوسرے کی طرف جبکہ خالہ اور ابا ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر بڑے ہی گہرے انداز میں مسکرائے۔ چینا نے بھی یہ سب دیکھا اور بولی۔

"ہاں جی' چینا اچھی طرح سمجھتی ہے کہ گھر میں جوان بٹی ہو تو بڑوں بڑوں کی نیندیں اڑ جاتی ہیں۔" چینا کی بات پر چندا مزید شرمائی اور علی نے بھی اسے پہلے سے زیادہ گہری نظروں سے دیکھا۔

"ناں جی ناں' بس بہت ہوگیا' اب میں نے اپنی پیاری سی بٹی کو کیلا نئیں رہنے دینا' کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اب اس کو ایک اچھے ساتھی دی ضرورت ہے' جو دن رات ایس دا خیال رکھے' ایس دا دوست وی ہووے تے محرم وی.... تے اسی لیے میں نے بڑے دنوں دی سوچ وچار کے بعد ہی یہ فیصلہ کیا۔"

"بس جی' تے فیر علی پتر آگے کیا ارادہ ہے کرنے کا؟"

"میں کرنٹ افیرز میں ایم ایس سی کرنے کا سوچ رہا ہوں' کیونکہ سنا ہے کہ ہماری یونیورسٹی کے ایم ایس سی ڈیپارٹمنٹ میں ایسے ایسے افیرز چل رہے ہیں کہ دیکھتے ہی کرنٹ لگ جاتا ہے۔"

"آپس کی بات ہے کہ چینا نے تو اسے بہت کہا کہ ایم ایس سی کی بھلا کیا حیثیت ہے' تم نے کرنا ہی ہے تو فارن افیرز میں ایم بی اے کرلو' ایم ان اے کرلو.... لیکن بس اپنی اپنی مرضی۔"

"یہ تم لوگوں نے باتیں کی ہیں کہ میرا میاق کیا ہے؟" ابا کو مجال ہے جو ایک بھی لفظ پلے پڑا ہو اور یہی وہ لوگ چاہتے تھے کیونکہ اگر علی کے متعلق انہیں ایک بھی لفظ پلے پڑ جاتا تو وہ یقینی طور پر چندا کا رشتہ دینے سے انکار کر دیتے۔

"وہ تو سب ٹھیک ہے.... لیکن دراصل چینا اور سب چاہ رہے تھے کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو ہم اب صرف پڑوسی نہ رہیں.... بلکہ...."

"چینا یہ تم رشتہ مانگ رہی ہو کہ زکوۃ۔" ضمیر بھائی نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"او جی' مناسب کیا' میں تے کہتا ہوں کہ اس سے بہترین اور کیا بات ہوگی کہ اگر ہمارا تعلق کسی نویں رشتے داری وچ بدل جائے' کیونکہ میں وی جانتا ہوں کہ بےشک گھر تم لوگوں کا چھوٹا ہے پر دل بہت بڑا ہے۔"

"ہاں ہاں بالکل، وہ چینا کا خیال تھا کہ کیوں نہ ہم سب پڑوسی کی بجائے ایک دوسرے کے رشتے دار ہی بن جائیں۔"

"واہ جی واہ... آپ نے تے میرے منہ دی بات ہی چھین لی ہے۔"

"جی آپی آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے اور بھلا ابا کو ہو سکتا ہے کیا اعتراض، کیونکہ انہوں نے تو سوچا ہی میری خوشی کے لیے ہے، ہے ناں ابا؟" چندا نے بڑے غرور سے ابا کو کہا۔

"آہو کو پتری کیوں نہیں... اوو دراصل میں نے کوشت (کوشش) تے بڑی کی تھی کہ ایس دے نال دوستوں کی طرح رہو پر یہ ہے کہ ہروقت بٹی بن جاتی ہے... حالانکہ مجھے وی پتا ہے کہ الاد کے ساتھ دوستی ہونی چاہیے پر فیروی یہ خود کو بڑا اکیلا مسوس کرنے لگ گئی ہے تے ایس لئی میں اب چاہتا ہوں کہ گھنٹے دو گھنٹے نہیں بلکہ اپنی بٹی کو کسی دا ایسا ساتھ ملے جو ہروقت ایس دے ساتھ رہے... کیوں جی؟" ابا نے اپنی بات کی تائید حاصل کرنے کے لیے سب کی طرف باری باری دیکھا۔

"ہاں جی، ہاں جی کیوں نہیں، چندا کی طرف سے آپ بالکل فکر نہ کریں بس آج سے چندا کی ذمہ داری صرف ہماری۔" خالہ نے بڑے ہی پرجوش انداز میں کہا۔

ضمیر بھائی، چینا اور علی نے بھی بخوشی ان کی بات پر گردن ہلائی۔ خوشی اس بات کی بھی تھی کہ گھر میں تو خالہ جیسے بھی ری ایکٹ کر رہی تھیں لیکن یہاں آکر انہوں نے اس بات کو بالکل محسوس نہیں ہونے دیا تھا۔

"واہ جی واہ، خوش کردتا ہے آپ نے۔" مارے خوشی کے ابا کی گردن ہاتھی کے کانوں کی طرح ہلنے لگی تھی کبھی جوش سے خالہ کو دیکھتے اور کبھی ہوش سے باقی ماندہ افراد کو۔

"تے ویسے وی، جیسے آپ لوگ سمجھو، تے اب چندا واقعی آپ دی ہی ذمہ داری بنتی ہے۔"

"تو پھر کیا خیال ہے یہیں رسم کرلیں۔" چینا نے جلدی سے کہا۔

"جو وی آپ سب دی مرضی، ورنہ میں تے خود یچے آ کر رشتے دی بات کرنا چاہتا تھا پر آپ سب نے تے میری مشکل آسان کردی۔"

"چلیں اب چھوڑیں بھی۔ چینا کو شرمندہ نہ کریں۔" چینا، ضمیر، خالہ، علی اور چندا سب کے چہروں پر کمال کی خوشی تھی... ایک دوسرے کو دیکھنے کا انداز بھی ایسا سراہنے والا تھا جیسے خربوزہ بہت ہی میٹھا نکل آیا ہو یا سخت بھوک میں اچانک محلے سے بریانی کی پلیٹ آگئی ہو۔

"اب فارمیلٹیز وغیرہ کو چھوڑیں اور چندا تم ادھر آؤ ناں، یہاں آکر علی کے ساتھ بیٹھو۔" چینا نے جگہ خالی کرتے ہوئے چندا کو فون کے نقطے کی طرح ایڈجسٹ کردیا اور اب سب کے بیٹھنے کی ترتیب کچھ اس طرح سے تھی کہ درمیان میں علی اور چندا جبکہ دونوں اطراف میں خالہ اور ابا بیٹھے تھے۔ چینا اور ضمیر بھائی سامنے والے صوفوں پر موجود تھے اور چونکہ انگوٹھی تو وہ لوگ لائے ہی نہیں تھے اس لیے ضمیر بھائی نے مکمل طور پر اداکاری کرتے ہوئے جیبوں کو ٹٹولا اور پھر اس انداز میں بولے کہ گویا انجانے میں بھول آئے ہوں۔

"میرا خیال ہے کہ انگوٹھی تو لائے نہیں، جانے کہاں رکھ دی میں نے... کیوں ناں آج صرف مٹھائی سے کام چلا کر منہ میٹھا کرلیا جائے؟"

"مٹھائی دی کیا ضرورت ہے ادی ادی چجی چینی سے منہ میٹھا کرلیتے ہیں، تے باقی رہ گئی بات انگوٹھی دی، تے اس دی فکر نہ کرو، کیونکہ انگوٹھی تے میں ہروقت ہی آج کل اپنی جیب وچ رکھتا ہوں کہ کیا پتا، کب، کسے، کہاں دینی پڑجائے۔"

"کیا ہی بات ہے بھئی واہ..." ضمیر بھائی نے ان کی دور اندیشی کو سراہا۔

"باپ ہو تو ایسا، یعنی اس قدر مکمل منصوبہ بنائے بیٹھے تھے چندا کی خوشیوں کے لیے اور چینا تو بس خوامخواہ ہی ڈرتی رہی آنے سے کہ کہیں آپ کو برا نہ لگ جائے... کیوں علی؟" چینا خوشی کے مارے بھی ابا کو دیکھتی تو کبھی علی کو اور علی کو چونکہ آج موقع کے حساب سے بولنے کی پہلے کی طرح آزادی نہ تھی، اس لیے مختصراً "تائید کرکے ابا کی طرف ہی متوجہ رہا جو اب جیب سے انگوٹھی نکال رہے تھے۔ چندا اور چندا کے بالکل ساتھ بیٹھی خالہ بھی انگوٹھی دیکھنے کی منتظر تھیں کہ ابا چندا کی طرف انگوٹھی بڑھاتے ہوئے بولے۔

"میری پتری چندا دی تنہائی دور کرنے کے لیے اور ایس میری پتری دے سارے دکھ سکھ بانٹ کے، ہروقت ایس نوں خوش رکھنے کے لیے مینوں بڑی سخت امید ہے کہ ساری حیاتی۔"

انگوٹھی کیونکہ ابا نے بنوائی تھی اس لیے چندا کا خیال تھا کہ وہ علی کو پہنائے گی اور پھر وہی انگوٹھی علی اپنی انگلی سے اتار کر چندا کو پہنا دے گا' اسی امید میں چندا ابا کے ہاتھ سے انگوٹھی لینے کی ہی منتظر تھی کہ ابا انگوٹھی اس کے قریب لا کر دینے کے بجائے پھر وہاں سے اٹھے اور بالکل سامنے جا کر گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے بڑے ہی شرمیلے انداز میں ساتھ بیٹھی خالہ کا ہاتھ پکڑ کر انگوٹھی انہیں پہناتے ہوئے اپنی بات مکمل کرنے لگے۔

"میں تے آپ کرکٹ تے نئے' سیاستدان تے کرپشن' عوام تے مسیل (مسائل) دی طرح اک دوجے لئی لازم تے ملزوم رہیں گے۔"

ابا کا عمل اتنا غیر متوقع تھا کہ اب تک سبھی حیران پریشان تھے اور کسی کو بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس موقع پر کس طرح کا ردعمل ظاہر کیا جائے... البتہ ابا کی منگیتر یعنی خالہ سب سے پہلے ہوش میں آ کر اب مسکرانے لگی تھیں۔ خوشی کا یہ عالم تھا کہ ان کا بس چلتا تو ابا کو بھنگڑے میں مصروف کر کے خود لڈیا ڈالنے لگتیں۔ چندا حیرت سے کبھی ابا اور کبھی بہت جلد بننے والی اماں کو دیکھتی' باقی افراد شاید شرمندگی میں مبتلا تھے اس لیے بولا نہیں جا رہا تھا۔ سو ابا دوبارہ سے بولے۔

"میری پتری مجھے بڑی مید (امید) ہے کہ تیری زندگی میں' میں نے جس ساتھی کا اضافہ کیا ہے وہ تیری ہر کمی کو پورا کر دے گی۔ جیسے وٹامنوں کی ٹکیاں کرتی ہیں۔" پھر خالہ کی طرف متوجہ ہوئے۔

"کیوں جی' میری پتری کی ماں' دوست' بہن' دکھ سکھ دی ساتھی بن کے ایس نوں ضرور خوش رکھنا... تے جے کدی ٹیم مل جائے تے میری طرف دی کوئی دھیان شیان مار لینا۔" بات کا آخری حصہ ابا نے قدرے شرماتے ہوئے آہستگی سے خالہ کی طرف جھکتے ہوئے کہا تو وہ بھی دونوں کندھے سکیڑتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر شرم سے دوہری ہو گئیں۔

چینا اور ضمیر ایک دوسرے کو بڑی ہی بے بسی سے دیکھتے ہوئے اس عظیم و عجیب کایا پلٹ پر اس قدر پریشان تھے کہ لگتا الفاظ کسی برتنوں کے ڈھیر میں چائے کے چمچے کی طرح گم ہو گئے ہوں۔ ادھر خالہ اور ابا کی اشارے بازیاں آنکھوں ہی آنکھوں میں جاری تھیں رومانٹک ہوتے ہوئے ابا علی کو اس دلہن کی طرح لگ رہے تھے جو کسی طریقے ہیروئن کو حاصل کر لینے کے بعد اپنی جلا دینے والی مسکراہٹ سے اس کے ارد گرد چکر لگا رہا ہو۔

میری ہم درس میری بات ذرا غور سے سن
قبل اس کے کہ تیری ماں میری ماں تک پہنچے
میں کسی طور اب شادی کا نہیں ہوں قائل
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے!!!

علی نے کچھ بھی کہنے سننے کی زحمت سے بچنے کے لیے موبائل پر ہی یہ پیغام ٹائپ کر کے ساتھ بیٹھی چندا کے سامنے کر دیا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی' فوراً کھڑا ہو کر بولا۔

"آپ کیا خیال ہے چلیں یا شادی بھی ابھی ہی کرنی ہے؟"

"نہیں نہیں' وہ چینا تو خود بس اب جانے ہی والی تھی' کیوں ضمیر؟"

"اب بیٹھنے کے لیے رہا ہی کیا ہے' میرا بھی یہی خیال ہے کہ بس اب چلتے ہیں۔" ضمیر بھائی کے کھڑے ہونے کا انداز ایسا تھا جیسا کوئی مڈل کلاس شخص الیکشن میں کھڑا ہو رہا ہو۔

"خالہ چلیں..." علی نے چندا کو جاتے جاتے ایسے دیکھا جیسے نہانے کے دوران شیمپو لگانے کے بعد پانی ختم ہو جانے والے نل کو دیکھا ہو۔ خود چندا کا بھی حال کچھ مختلف نہ تھا' افسوس اس قدر تھا کہ لگتا خاص مہمانوں کی آمد پر سالن کا اکلوتا ڈونگا ہی ہاتھ سے سلپ ہو کر نیچے جا گرا ہو۔

"او جی... آپ موس نہ کرو تے ان کو کش دیر کے لیے ایس دی ہونے والی بیٹی چندا دے پاس چھوڑ جاؤ' پوری زندگی اکٹھی گزارنی ہے ناں' تے چلو کش ناں کش اک دوجے دے بارے وچ جان پچھان کر لیں... ویسے وی کیا پتا چندا دا کتنا دل کر رہا ہو گا' اس بندے نال باتیں کرنے کا جو کش ای دنوں دے اندر اندر اس دی ماں بننے والی ہو۔" ابا نے مونچھیں مروڑنے کے انداز میں موٹر سائیکل کی اسپیڈ بڑھانے کے طریقے کو اپنا لیا اور خالہ پر نظریں جماتے ہوئے بایاں ابرو اٹھا کر دائیں آنکھ کا کونا ہلکا سا بند کرنے ہی والے تھے کہ انہیں ہوش آ گیا اور لگا کہ یہ انداز ضرورت سے اور حقیقت سے بڑھ کر انہیں گھٹیا ظاہر کرے گا لہٰذا بند ہوتی آنکھ ہی مسل دی۔

"ہمیں تو کوئی اعتراض نہیں ہے' ہاں البتہ خالہ کو یقیناً اچھا نہیں لگے گا' اس لیے میرا خیال ہے ابھی تو چلتے

ہیں۔ چندا پھر کسی وقت خالہ سے مل لے گی... تفصیلاً۔"

ضمیر بھائی نے چینا کی حمایت اور تائیدی نظروں کے زیرِ سائے اپنی بات مکمل کی... تو خالہ نے ایک نظر نہیں دیکھا اور پھر ابا کی طرف دیکھ کر دوبارہ انہیں سے مخاطب ہوئیں۔

"میرا خیال ہے کہ تم لوگ جاؤ' میں تھوڑی دیر تک آجاؤں گی... وہ دراصل موقع ایسا ہے ناں کہ وہ... شاید چندا کا دل چاہ رہا ہو مجھ سے اکیلے میں کچھ باتیں کرنے کا... پھر چندا کے ابا مجھے گھر تک چھوڑ جائیں گے... کیوں جی' آپ مجھے چھوڑ دیں گے؟" خالہ کی بات پر ضمیر بھائی اور چینا آپی نے ایک دوسرے کو دیکھا جبکہ ابا خالہ کی بات کو تو دل پر ہی لے گئے تھے۔ فوراً" بولے۔

"توا (توبہ) کرو جی توا' میں نے آپ کو انگوٹھی چھوڑنی دے واسطے تے نئیں پہنائی' ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنے کے لیے پہنائی ہے۔" خالہ سر جھکا کر شرمائیں۔

"تے جس وقت نیچے جانا ہوناں' تے یہ انگوٹھی اتار کر مجھے دے جانا' میں کدرے سنبھال شنبھال کے رکھ دوں گا ناں۔"

علی سے ان دونوں کی یہ نازک مزاجیاں برداشت نہیں ہو رہی تھیں۔ سو بغیر کچھ کہے سیڑھیاں اتر کر نیچے چلا گیا۔ چینا اور ضمیر بھائی نے بھی کباب میں ہڈی بننے کے بجائے وہاں سے چلے جانا ہی مناسب سمجھا تو چندا بھی اپنے کمرے میں نظر بند ہونے کی نیت سے بند ہو گئی۔ اسے ابا سے ہرگز بھی یہ امید نہیں تھی کہ وہ اسے شادی کا جھانسہ دے کر خود اپنی منگنی کر کے بیٹھ جائیں گے اور پھر جب کافی دیر تک چندا اسی متعلق سوچتی رہی تو خیال آیا کہ ابا نے تو آج تک یہ کہا ہی نہیں تھا کہ وہ اس کی اور علی کی شادی کر رہے ہیں یہ سب تو وہ سمجھی تھی' لیکن خیر جو بھی ہوا اب اسے ہر حال میں اپنے لیے خود ہی کچھ کرنا ہو گا' لیکن کیا؟ اس بارے میں سوچتے سوچتے ایک دم ہی اس کے ذہن میں ایسا زوردار جھماکا ہوا کہ لگا چلتے چلتے رکشے کا ٹائر پھٹ گیا ہو... مگر ہاں فرق تھا تو بس اتنا کہ ذہن میں ہونے والے اس جھماکے پر وہ خوش بے حد تھی کہ اب نہ تو علی کو منانا مشکل ہو گا نہ اسے اپنانا!

☼ ☼ ☼

"اوجی... ویسے آپ خوش تے ہوناں؟" ابا نے خالہ کو انگلی میں انگوٹھی گھماتے دیکھ کر پوچھا تو انہوں نے بس مسکراتے ہوئے سر ہلا دیا۔

"مجھے تے پہلے ای پتا تھا کہ آپ کو انگوٹھی ملنے کی بڑی خوشی ہو گی۔" وہ بھی ہاتھ مسلتے ہوئے خالہ کے قریب بیٹھ کر مسکراتے ہوئے بولے۔

"جی بالکل... جیسے آپ خوش ہوں۔" خالہ نے بڑی ہی ادا سے نظر اٹھا کر ابا کو دیکھا تو وہ اپنا ذہنی توازن برقرار نہ رکھ پائے اور بولے۔

"ہائے اوئے' قسمے ایسیاں نظراں نال تے نہ دیکھیا کرو' ورنہ میں آپ دے بغیر اک منٹ وی نئیں رہ سکوں گا۔"

"ہاں تو اب آپ کو ایک بھی منٹ مجھ سے دور رہنے بھی نہیں دیا جائے گا۔" خالہ اٹھلا کر بولیں۔

"پھر شادی دے بعد کش دن تے آپ نوں میرے بغیر رہنا اے پڑے گا ناں۔"

"کچھ دن' لیکن کیوں؟"

"دراصل' پتا ہے ناں کہ آج کل منگیائی (مہنگائی) کتنی زیادہ ہے' دو بندیاں دا تے بہت خرچہ وی ہو جاتا ہے' تے ایس لیے میں نے سوچیا ہے کہ شادی دے بعد کیلا (اکیلا) ہی جا کے ہنی مون منا آوں گا۔"

"کیا...؟" خالہ نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"آہو جی' نیا زمانہ ہے ناں تے ہنی مون آج کل بڑا ضروری ہو گیا ہے... تے فیر جا کے پتا ہے میں نے آپ دے لیے کونسا گانا گانا ہے؟" خالہ نے عالم حیرت میں کچھ بولنے کے بجائے صرف آنکھوں سے یہی سوال کیا کہ کونسا گانا گانا ہے؟ تو ابا دھیرے دھیرے ان کی طرف سرکتے اور اپنا تہبند سنبھالتے ہوئے انتہائی رومانٹک انداز اپنا کر ناک کے رستے آواز فضا میں بکھیرتے ہوئے گنگنانے لگے۔

میں تے میرا دلبر جانی
بلیاں تے پیار کہانی
ساواں وچ آیا ہے طوفان
موسم ہوا اے بے. ایمان

(آخری قسط آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

☼ ☼

حیا بخاری

صبح سے لے کر اب تک وہ نہ جانے کتنی بار اپنی الماری چیک کر چکی تھی، مگر ہر بار بڑبڑاتے ہوئے زور سے الماری کا دروازہ بند کرتی اور دوبارہ بیڈ پہ جا بیٹھتی۔ باہر برآمدے میں بیٹھیں، مسلسل تسبیح پڑھتی دادی عینک کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے اس کی یہ ساری کارگزاری دیکھتیں اور تاسف سے سر ہلا کر دوبارہ تسبیح میں مصروف ہو جاتیں۔

وہ شاید منتظر تھیں کہ کب ان کی پوتی باہر آئے اس سب سے تھک کر اور وہ اسے کچھ کہیں، مگر وہ باہر آتی تب نا۔ وہ تو بار بار ایک ہی کام سرانجام دیتی اور دوبارہ اپنے بیڈ پر گر جاتی۔ دادی کو ہی اپنی قسم توڑنا پڑی ساتھ پڑی بید کی چھڑی اٹھائی اور اندر چلی آئیں۔ حیا نے ان کو اندر آتے دیکھا تو جھٹ سے سرہانہ منہ پر رکھ دیا۔

"میں اچھی طرح جانتی ہوں تم جاگ رہی ہو۔" بید کی چھڑی نے سرہانے کو کافی دور اچھال دیا تھا۔

"توبہ ہے دادی۔ طاقت کے مظاہرے میں تو آفریدی کو پیچھے چھوڑ دیتی ہیں آپ۔" حیا نے کان پکڑے۔

"اے لو۔ آفریدی میں کون سی طاقت ہے بھلا؟ ایک چھکا مارنے کے بعد اس میں اتنی طاقت نہیں رہتی کہ چوکا مارے، سیدھا بال فیلڈر کو پکڑا دیتا ہے اور خود باہر۔" کرکٹ کی دلدادہ دادی ورلڈ کپ کے آغاز میں پاک ٹیم کی کارکردگی سے قطعی ناخوش تھیں۔ تب ہی فوراً "برا مان گئیں۔

"اسی لیے کہتی ہوں کہ نہ دیکھا کریں یہ میچ وچ۔ ٹوٹل سیاپا۔" حیا نے ہاتھ جھاڑے۔

"ہاں تو میں بھی اسی لیے کہتی ہوں کہ دوستی اپنے ہم پلہ لوگوں سے ہی اچھی لگتی ہے، نہ دیکھا کر ان کے کپڑے شپڑے، رہن سہن، ٹوٹل جلاپا۔" دادی کے اسی کے انداز میں لوٹائے گئے جملے پہ حیا نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

"اللہ اللہ۔ دادی آپ کتنا جینئس ہیں۔ اگر آج کے دور میں آپ میری عمر کی ہوتیں تو سائنس دان ہوتیں۔" وہ واقعی ان کی ذہانت کی متعرف تھی۔ دادی نے ایک مشکوک سی نگاہ اس کے کسی اجلی صبح کے جیسے اجلے چہرے پہ ڈالی تھی اور وہاں رقم سچائی پڑھ کر پورے فخر سے گردن اوپر کی تھی۔

"تو اب کیا میں کسی سے کم ہوں، اپنے دور میں آٹھویں جماعت سے ہی سوچ لیا تھا میں نے کہ آئن سٹائن (آئن شائن) اور اس کے تمام دوسرے بیلی (ساتھی) سائنس دانوں کے کلیے غلط ثابت کروں گی، مگر اللہ رکھے تیرے دادا کو۔" بات کرتے کرتے وہ دوپٹے کا پلو منہ میں پکڑ کر ذرا سا شرمائیں۔ غور سے سنتی حیا کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

"اللہ کا نام لیں دادی۔ اٹھارہ برس ہو گئے ہیں دادا کو اللہ کے پاس پہنچے اور آپ اب بھی ان کو زندہ رہنے کی دعا دے رہی ہیں؟" اس نے جیسے بہت کچھ یاد دلانا چاہا۔

"تو تب ہی تو کہہ رہی ہوں کہ بس اللہ اپنے پاس ہی رکھے۔" بات بتاتے بتاتے دادی کو خود بھی ہنسی آگئی۔ حیا کا تو اور برا حال تھا۔

"اللہ دادی۔ آپ کتنی سویٹ ہیں۔" وہ ان سے

لپٹ گئی۔ دادی مسکرا دیں۔

"مگر کیا فائدہ سویٹ ہونے کا۔ جب میری اکلوتی پوتی ہی مجھ سے خوش نہ ہو۔" انہوں نے محبت سے چور لہجے میں ہلکا سا گلہ کیا۔

"خوش ہوں دادی، مگر کبھی کبھی ثنا کو دیکھتی ہوں یا ٹی وی ڈراموں اور ڈائجسٹ کی ہیروئنوں کے بارے میں سوچتی ہوں تو میرا بھی دل کرتا ہے کہ میرے پاس بھی یہ سب ہو۔ صاف ستھرے چمکتے فرش اور کسی محل کے چھت کی جیسی چھتوں والا گھر، صرف ایک دن کے لیے پہننے کے لیے کئی ہزار کے مہنگے سوٹ اور سب کے ساتھ میچنگ جیولری اور شوز مہنگے پرس اور۔ اور۔ اور۔۔۔"

وہ اپنے خواب بتاتے بتاتے ہلکان ہونے لگی۔ دادی کی آنکھوں میں فکر جاگ اٹھی۔

حیا ان کی اکلوتی پوتی ان کے اکلوتے مرحوم بیٹے کی نشانی، جس کو ہمیشہ انہوں نے اپنی جان سے بڑھ کر عزیز

رکھا تھا۔ انہوں نے بہت محبت اور توجہ سے اپنی پوتی کی پرورش کی تھی۔ حیا ان کی امیدوں کا محور تھی۔ ان کے تمام خواب تمام خواہشیں حیا کے گرد گھومتے تھے۔ حیا کی تمام عادتیں ان پر گئیں تھیں۔ وہ بالکل اپنی دادی کا پرتو تھی، مگر نہ جانے کب کیسے اس کی آنکھیں اپنی حد پرواز سے اوپر کے خوابوں تک پرواز کرنے لگیں۔ ثنا اس کی کالج فیلو تھی اور یہیں اس کی دوستی ثنا سے ہوئی تھی، ثنا بھی بہت اچھی لڑکی تھی، مگر تھی بے حد امیر اور اس کا بہترین لائف اسٹائل نہ جانے کب حیا کا بھی خواب بن گیا۔

تب سے اس میں ایک احساس سا جاگ اٹھا کہ وہ کمتر ہے۔ اسے اپنا رہن سہن، اپنی استعمال کی ہر چیز کم تر لگنے لگی تھی اور یہی چیز دادی کو پریشان کر رہی تھی۔ ہمیشہ والا صبر شکر حیا کی طبیعت سے ختم ہو رہا تھا۔ وہ خواہشوں میں جکڑی جا رہی تھی۔ اسے جو ملتا اس پر شکر کی بجائے اداس ہو جاتی۔ اسے کوستی اور اس سے بہتر کی خواہش کرتی۔ دادی جانتی تھیں کہ اس کی ناشکری خود اس کی ذات کو ہی نقصان پہنچاتی، مگر یہ بات وہ حیا کو کیسے سمجھائیں یہ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ تب ہی وہ پریشان تھیں۔

"وقت آنے پر سب کو مل جاتا ہے حیا، مگر یاد رکھو بیٹا۔ شکر مصیبتوں کے خلاف ڈھال ہے اور جو انسان اپنے نصیب پہ شاکر ہوتا ہے، نعمتیں اس کی طرف خود چل کر آتی ہیں۔" حیا کے لمبے گھنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے انہوں نے محبت سے اسے سمجھایا۔

"ابھی تو مجھے صرف کل کے فنکشن کے لیے ایک بھی اچھی چیز نہیں مل رہی۔" اس کی سوئی اسی جگہ اٹکی تھی۔

"شام کو تیار رہنا میں ساتھ والی زبیدہ خالہ کو تمہارے ساتھ بھیج دوں گی جا کر اپنی پسند کا سب کچھ لے لینا بس۔" ہار ہمیشہ کی طرح دادی کو ہی ماننا پڑی تھی۔

حالانکہ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ حیا نے ہمیشہ کی طرح شاہ خرچی کرنی تھی اور آگے سارا مہینہ خرچے میں تکلیف انہوں نے اٹھانی تھی، مگر پوتی سے بڑھ کر کچھ بھی اہم نہیں تھا۔ حیا ان کی بات سنتے ہی حسب معمول چہک چہک کر ان کو اپنی ضروریات سنانے لگی تھی اور وہ بھی خوشی خوشی سنے جا رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼
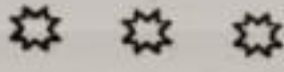
"تم آ رہی ہو نا۔" کل مارکیٹ میں چل چل کر اس کا حشر ہو گیا تھا۔ پھر آدھی رات تک خریدی گئی سب ہی چیزوں کو کبھی تنقیدی کبھی تعریفی نظروں سے اچھی طرح جانچنے کے بعد وہ سوئی تو صبح دادی کے نماز کے لیے اٹھانے پہ بھی نہ اٹھی۔ دس بجے کے قریب موبائل ٹون کی تیز آواز نے اسے جاگنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ اس نے بڑبڑاتے ہوئے کال پک کی تھی، مگر ثنا کی چہکتی آواز پہ وہ فوراً" مکمل بے دار ہو کے اٹھ بیٹھی تھی۔

"حیا۔ پلیز کوئی بہانہ نہیں۔ تمہیں پتا ہے تمہارے سوا میری اور کوئی سہیلی نہیں ہے۔ تم نہیں آؤ گی تو مجھے بہت دکھ ہو گا۔" ثنا اس کی خاموشی پہ اداس ہوئی۔

"نہیں نہیں یار میں ضرور آؤں گی۔ بس کل تمہاری شادی کی تیاریوں میں ہی مصروف رہی تو رات ذرا دیر سے آنکھ لگی۔" اس نے لمبی سی جماہی لیتے ہوئے کہا۔ دادی نے اندر آ کر ایک نظر اس پہ ڈالی۔ ہاتھ کے اشارے سے ناشتے کا بتایا اور باہر چلی گئیں۔

"تم بالکل بھی پریشان مت ہونا یار۔ میں نے مہندی اور رخصتی کے فنکشنز کے لیے تمہارے لیے بہت ہی خوب صورت سوٹ تیار کروا لیے ہیں۔ تم بس آ جاؤ۔" وہ ایسی ہی تھی اس کی بے حد پروا کرنے والی۔ حیا مسکرا دی۔

"نہیں۔ میں نے سب تیاری مکمل کر لی ہے۔ تم پریشان نہ ہو۔" وہ بیڈ سے اترتے ہوئے بولی۔

"او کے۔ تو میں ڈرائیور کو بھیج رہی ہوں۔ تم اور دادی دونوں آ جاؤ نا۔ اور ولیمے تک تم میرے ہی گھر

رہو گی۔ یاد ہے نا؟" ثنا نے اپنی تسلی کی۔

"ہاں ہاں سب یاد ہے۔ ڈونٹ وری۔ اب مجھے تیاری تو کرنے دو۔" وہ باتھ روم کے دروازے کے قریب تھی۔ فون ابھی تک کان سے لگا تھا۔

"اوہ ہاں۔ شیور۔ اوکے دین سی یو۔" ثنا نے فوراً کال ختم کرلی۔

وہ منہ ہاتھ دھو کے باہر نکلی تو دادی ناشتا لیے اس کی منتظر تھیں۔

"آرام سے ناشتا کرو۔ صبح زبیدہ آئی تھی، ساری صفائی کر گئی ہے اور تمہارا سارا سامان بھی میں نے پیک کروالیا ہے۔ بس تھوڑے سے برتن ہیں تم ان سے فارغ ہو لو تو نکلتے ہیں۔" دادی نے اس کی فکر دور کی، وہ مسکرا کر مطمئن ہو کر ناشتا کرنے لگی۔

✩ ✩ ✩

سب ہی فنکشنز میں ثنا نے اسے اپنے ساتھ رکھا تھا۔ دادی ساتھ تھیں تو اسے بھی کوئی مسئلہ نہیں ہوا تھا۔ اس بار کچھ اس نے دریادلی سے اپنا سامان خریدا تھا کچھ ثنا نے بھی اس کے لیے بہترین چن رکھا تھا۔ تب ہی دادی نے ہر فنکشن میں اس کے مطمئن انداز میں شریک ہونے پہ بار بار دل میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا تھا۔ آج رخصتی تھی اور ثنا اسے ساتھ لے جانے پہ مصر۔

"پلیز حیا۔ میرے ساتھ چلو میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہیں ذرا بھی تکلیف نہیں ہوگی۔" ثنا مچلی۔

"مگر وہاں انجان لوگوں میں....." حیا ہچکچائی۔

"تو میں ہوں اور تمہارے دولہا بھائی بھی تو ہوں گے وہاں۔" وہ شرماتے ہوئے بولی۔ سرخ کلدار لہنگے میں اس کا حسن دو آتشہ ہو رہا تھا۔

"ہاں ہاں حیا۔ چلی جاؤ بیٹا۔ ویسے بھی گھر میں بور ہوتی رہتی ہو۔ نیا شہر دیکھ لوگی، نئے لوگوں سے مل کر اچھا لگے گا تمہیں۔" دادی نے بھی اسے پچکارا۔

"اوہم۔ چلو ٹھیک ہے مگر میرا خیال رکھنا پھر تم۔" اس نے معصومیت سے کہا۔ ثنا کھلکھلا دی۔

"توبہ ہے۔" اس نے پیار سے حیا کو چٹکی کاٹی۔ وہ سی کر کے رہ گئی۔

✩ ✩ ✩

کوہاٹ سے پشاور تک مختصر سفر بھی اس نے خوب انجوائے کیا تھا۔ وہ ثنا اور دولہے بھائی کی کار میں ان کے ساتھ بیٹھی تھی اور سارا راستہ اس نے ان دونوں کو خوب تنگ کیا تھا۔

ثنا کی سسرال کافی بڑی فیملی تھی۔ ایک ایک فیملی میں چار چار مزید خاندان تھے۔ سب ہی ہنس مکھ اور کھاتے پیتے لگ رہے تھے۔ حیا کو اس کی قسمت پہ رشک آتا رہا۔ سب نے اسے ثنا کی بہن اور حیات کی سالی کے طور پر ہی عزت دی۔ وہ گردن اکڑائے بے فکری سے ادھر سے ادھر اچھلتی پھرتی۔ پھر یہاں بات بات پہ ٹوکنے والی دادی جان بھی نہیں تھیں۔ سو اس نے ہر موقع پوری طرح انجوائے کیا تھا۔

دوسرے دن ولیمہ کے فنکشن کے لیے وہ خوب دل سے تیار ہوئی۔ ثنا اپنے ساتھ ہی اسے بیوٹی پارلر لے گئی۔ آئینے میں اپنا سجا سنورا روپ دیکھ کر وہ خود بھی حیران رہ گئی تھی۔ پہلی بار اس قدر تیار ہوئی تھی بہت نروس تھی۔ ہوٹل پہنچتے پہنچتے ثنا اس کا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہوئی تھی۔

آج مہمان بھی زیادہ تھے۔ اوپر سے بھاری بھر کم لہنگے نے اس کی جان عذاب بنادی تھی۔ وہ صحیح طریقے سے چل بھی نہیں پارہی تھی۔

"دیکھو تو سارے لوگ مجھے دیکھ رہے ہیں جیسے دلہن میں ہوں۔ تم نے میرا مذاق بنا کے رکھ دیا ہے۔" اس نے چل کر ساتھ چلتی ثنا کے کان میں سرگوشی کی تھی۔ ثنا کا ڈریس اس کے ڈریس سے کہیں زیادہ کلدار اور تھا۔ مگر وہ بلا کے اعتماد سے چل رہی تھی۔

"اتنے نارمل سے ڈریس میں لوگ تمہیں دلہن نہیں سمجھیں گے۔ ڈونٹ وری۔" وہ حسب عادت مسکراتے ہوئے بولی۔

"تو ایسے دیدے پھاڑ پھاڑ کے مجھے کیوں دیکھ رہے

ہیں۔" وہ مزید چڑ گئی۔

"کیوں کہ انہوں نے اس سے پہلے اتنی پیاری لڑکی نہیں دیکھی نا۔" ثنا کی رشتہ دار خواتین آگے بڑھیں اور ثنا کو نرغے میں لے کر اسٹیج کی طرف بڑھ گئیں۔ خود بخود ہی اس کے قدم رک گئے۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔ وہ وہیں کھڑی رہ گئی۔

وہاں سب ثنا اور حیات کے ساتھ شرارتوں میں مشغول ہو گئے۔ قہقہوں اور سیٹیوں سے سارا ہال گونجنے لگا تھا۔ حیا بغور ثنا کو دیکھے گئی۔ ڈارک میرون کلر کے خوب صورت لباس میں اس کا اجلا اجلا روپ بے حد دلکش تھا۔ سونے اور ہیرے جڑے نفیس زیورات اس کے روپ کو عجیب سی روشنی دے رہے تھے۔

"ثنا کتنی خوش قسمت ہے۔ بچپن سے لے کر آج تک ایک شہزادی جیسی زندگی اس کا مقدر ہے۔ کاش کہ یہ زندگی میری مقدر ہوتی۔" تنہائی پاتے ہی مایوسی نے اس کی ذات کو گھیرنا شروع کر دیا تھا اور اس بھی بنا کوئی مزاحمت کیے خود کو مایوسی کے حصار میں دے دیا تھا۔

پل میں ہی منظر بدل گئے تھے اور گرد ٹمٹماتی روشنیاں اندھیروں میں تبدیل ہونے لگیں۔ احساس سرد پڑنے لگے تھے۔ دل میں عجیب سی کسک بے دار ہوئی تو جیسے منظر کا ہر رنگ پھیکا پڑنے لگا۔ اب نہ تو اسٹیج پہ بنی سنوری بیٹھی نازک اندام سی ثنا اسے اچھی لگ رہی تھی۔ نہ ہی چاروں طرف گونجتے قہقہوں اور میوزک کا شور۔ اسے ایک دم اپنا آپ بے حد اکیلا اور خالی محسوس ہونے لگا تھا۔ بنا کسی وجہ کے کھڑے کھڑے ہی اس کی خوب صورت براؤن آنکھیں نمکین پانیوں سے بھرنے لگیں۔ وہ شاید کتنی ہی دیر اور وہاں کڑھتی رہتی کہ کسی نے بڑے زور سے اسے دھکا مارا تھا۔

دھکا اس قدر زبردست تھا کہ اس نے بمشکل خود کو گرنے سے بچایا تھا' لیکن، دائیں کندھے میں درد کی شدید لہر جاگی۔ وہ غصے سے مڑی۔ خجل سا چہرہ لیے وہ

ستائیس اٹھائیس سالہ نوجوان بھی سیدھا اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ صورت حال شاید اس کے لیے بھی کچھ اتنی اچانک تھی کہ شرمندگی سے وہ کچھ بول ہی نہیں پا رہا تھا۔

"آئم رئیلی سوری..." بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے جیسے لفظوں کو پہلے ترتیب دیا پھر اٹکتے ہوئے بولا کہ حیا نے ہاتھ کھڑا کر کے اسے مزید بولنے سے منع کر دیا۔ حلیے سے وہ پڑھا لکھا اور اچھے خاندان کا لڑکا لگ رہا تھا۔ اوپر سے اس کے چہرے پہ چھائی بدحواسی اور شرمندگی اس کی شرافت کی گواہی دے رہے تھے۔ تب ہی حیا نے دل میں آئے سارے سخت الفاظ اسے سنانے کا ارادہ قطعی ملتوی کر دیا تھا اور اسٹیج کی طرف بڑھ گئی جہاں ثنا مسلسل ہاتھ کے اشارے سے اسے اوپر بلا رہی تھی۔

"مجاہد بھائی نے تمہیں کچھ کہا تو نہیں۔ کوئی بات ہوئی؟" وہ جیسے ہی ثنا کے قریب پہنچی۔ ثنا کے تیز مگر مدہم لہجے نے اسے حیرت زدہ کر دیا۔

"کیا مطلب؟ کون مجاہد۔" وہ قطعی ناسمجھی سے بولی۔

"وہی یار جن کے ساتھ تم ابھی نیچے کھڑی تھیں۔" اس نے تیزی سے حیا کو بتایا۔

"نہیں... غلطی سے ٹکرا گئے تھے' مگر کچھ کہتے کیوں۔ سارا قصور ہی ان ہی کا تھا۔" اس نے بجھے بجھے لہجے میں جواب دیا' نگاہ دور کہیں جمی تھی۔

"قصور ہو نہ ہو۔ اگلے پہ چڑھ دوڑتے ہیں۔ بڑے تنک چڑھے ہیں مجاہد بھائی۔ حیات کے چچا زاد ہیں۔ اکلوتے ہیں تب ہی ناک پہ مکھی تک نہیں بیٹھنے دیتے۔ یہ ہی چڑچڑا مزاج ہے اور مغرور شخصیت کہ خیر سے 35 سال کراس کرنے والے ہیں' مگر ابھی تک شادی نہیں ہوئی۔" وہ اسے مکمل بایو ڈیٹا بتاتے ہوئے بولی۔

"اوہ۔ میں تو سمجھی یہی کوئی پچیس چھبیس سال کے ہوں گے۔" اسے واقعی حیرت ہوئی تھی۔

"ہاں شخصیت ہی ایسی ہے ان کی۔ چلو شکر کہ

تمہیں کچھ نہیں کہا انہوں نے۔" اس کی بات پہ حیا کا بنا منہ مزید بگڑ گیا۔

"اچھا ایسے فلاسفر کی طرح گم سم کیوں بیٹھی ہو۔" ثنا نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے دھیرے لہجے میں کہا۔

"ایسے ہی۔ بس اچانک ہی دل میں عجیب سے خیال آرہے ہیں۔" ثنا اس کی واحد دوست تھی اور وہ ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں چھپاتی تھیں۔

"مثلاً" ثنا نے مختصراً کہا۔ تب ہی اس کی نگاہ اپنی طرف آتے مجاہد پہ پڑی تھی۔ وہ فوراً سیدھی ہو بیٹھی، لیکن اس سے غلطی یہ ہوئی کہ وہ حیا کو خبردار نہیں کرپائی تھی اور اسے اس کے سوال کا جواب لازمی دینا تھا۔ مجاہد قریب آچکا تھا۔

"یہی کہ کاش تمہاری طرح میری شادی بھی کسی اونچے گھرانے میں ہو۔ اور میرا ولیمہ بھی ایسا ہی شاندار ہو۔ بالکل تمہاری شادی کی طرح میری شادی ہو۔ رسمیں ہوں۔" وہ بولنے پہ آئی تو بولتی گئی۔ ثنا اس کا ہاتھ دلوچتی رہ گئی، مگر وہ بات مکمل کرکے ہی رکی تھی۔ بالکل نزدیک ٹھہرے مجاہد مصطفیٰ کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

"السلام علیکم مجاہد بھائی۔" حیا کی رفتار روکنے کے لیے اسے نئی نویلی دلہن والے سارے لحاظ ایک طرف رکھنا پڑے تھے۔ حیا چونکی۔

"وعلیکم السلام بھابھی۔ یہ میری طرف سے آپ کے لیے شادی کا چھوٹا سا گفٹ اور ساتھ میں بہت سی دعائیں۔ معذرت کے شادی میں شرکت نہ کرسکا جس کا مجھے اب سخت افسوس بھی ہے۔" اپنی بات کا آخری جملہ اس نے حیا کو نظروں میں لیتے ہوئے کہا۔ وہ بالکل بھی اس کی طرف متوجہ نہ تھی۔

"بہت شکریہ۔" ثنا نے چھوٹا سا گفٹ پیک لیتے ہوئے خوش دلی سے کہا تب ہی حیات بھی وہاں آئے تھے۔

"اوئے۔ جا کہاں رہا ہے۔ ہماری تصویر تو بناتا جا۔" وہ مڑنے لگا تو حیات نے کیمرہ اسے تھماتے ہوئے کہا۔

"توبہ ہے۔ ایک تو تمہارا یہ فوٹو گرافی کا کریز۔" مجاہد نے مسکراتے ہوئے کیمرہ تھاما۔

"چلو مسکرادیں آپ سب۔" اس نے آپ سب پہ زور دیتے ہوئے کہا۔

"حیا سامنے دیکھو۔" ثنا نے ایک مرتبہ پھر اس کا ہاتھ تھاما۔ بھیگی بھیگی آنکھوں والی حیا نے چونک کر سامنے دیکھا اور کیمرے کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمے سے مسکرادی۔ اداس سی مسکراہٹ کیمرے کے ساتھ ساتھ کسی کے دل کے آئینے میں بھی محفوظ ہوئی تھی، شاید ہمیشہ کے لیے۔

☆ ☆ ☆
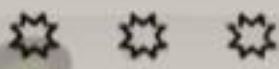
دو ہفتے ہوگئے تھے ثنا کی شادی کو، مگر حیا کے منہ پر اس کی شادی اس کے سسرال کے ہی تذکرے تھے۔ دادی پوری کوشش کرتیں کہ وہ مصروف رہے تاکہ ان سب چیزوں سے اس کا دھیان ہٹا رہے، مگر شام ڈھلتے ہی جب وہ سونے کے لیے کھلے آسمان کے نیچے چارپائی پر لیٹتیں تو حیا کا وہی ٹاپک زور و شور سے شروع ہوجاتا۔ زری جیسے جگمگاتے ستاروں سے سجے آسمان کے کشادہ آنچل کو تکتے تکتے وہ یوں حسرت سے دادی کو ثنا اور اس کی شادی کا احوال سناتی سناتی خود تو نیند کی گہری وادیوں میں اتر جاتی، مگر دادی کا ضعیف وجود ساری رات پھر اس کی فکر میں گھلتا، اس کے لیے دعائیں کرتا سونے سے قاصر رہ جاتا۔ ابھی بھی بار بار وہ اسے سونے کی تلقین کررہی تھیں، مگر وہ کہاں باز آنے والی تھی۔

"حیا سوجاؤ گڑیا۔ تم تو بعد میں سوجاتی ہو۔ میں مگر بوڑھی ہوں رات کے اس پہلے پہر نیند نہ لے لوں تو پچھلے پہر تو نیند آتی ہی نہیں مجھے۔ سو جاؤ اور مجھے بھی سونے دو۔" دادی نے اس کے کھلے بالوں میں محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"دادی سنیں تو۔" انہوں نے آنکھیں بند کرتی دادی کو پھر سے جھنجھوڑ دیا۔

"میں آپ کو ثنا کے بارے میں بتانا چاہتی ہوں اور آپ ہیں کہ سنتی ہی نہیں۔" وہ خفا ہوگئی۔ دادی کو

مجبوراً" اس کی طرف پلٹنا پڑا۔

"حیا پورے چودہ پندرہ دن ہو گئے مجھے یہ سب سنتے ہوئے اور اب سب کچھ مجھے زبانی یاد ہے۔" دادی نے اس کا رخ اپنی طرف پھیرتے ہوئے کہا تھا۔

"اچھا۔ ذرا بتائیں مجھے اس کا گھر کیسا ہے؟" وہ دادی کا منانا محسوس کرکے فوراً" اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"مطلب تم ایسے نہیں مانو گی۔" وہ تھکن زدہ لہجے میں بولیں۔ حیا زور زور سے انکار میں سر ہلانے لگی۔

"اچھا۔ تو ثنا کا گھر بہت بڑا ہے۔ وہ چونکہ گھر کی بڑی بہو ہے تو گھر کا پچھلا پورشن جو کہ گھر سے قدرے الگ بھی ہے اور بڑا بھی وہ ثنا کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ گھر کا چمن بہت بڑا ہے اور بہت ہی خوب صورت پودے لگائے گئے ہیں اور گھر میں ایک بہت ہی شاندار صاف ستھرے پانی والا سوئمنگ پول بھی ہے۔ بس۔" انہوں نے کسی بچے کی طرح رٹا رٹایا سبق دہرایا۔

"بس کہاں دادی۔ جھولا ہے اتنا بڑا ایک لان میں اور ایک لاؤنج میں اور پھر گیراج' تین تین گاڑیاں یہ سب تو آپ بھول ہی گئیں۔" وہ واقعی کبھی بھی راضی نہ ہوتی تھی۔ دادی کو دکھ سا محسوس ہوا۔

"حیا اب مجھے نیند آنے لگی ہے۔ سو جاؤ۔ بس باقی کل صبح سن لوں گی۔" اس بار انہوں نے کروٹ بدلی تھی۔

"وعدہ کہ کل ضرور سنیں گی۔" حیا نے دھیرے سے ان کے کمزور کندھے کو پکڑ کر ہلایا۔

"ہاں۔ پکا وعدہ۔" نیند میں ڈوبی آواز پہ حیا بھی ان سے لپٹ کر لیٹ گئی۔ نظریں ستاروں بھرے آسمان پہ جمی تھیں۔ جہاں اسے ستارے نہیں بلکہ ثنا کا خوب صورت گھر نظر آرہا تھا۔ تب ہی اسے ثنا کی یاد آئی تھی۔ اس نے دھیرے سے اٹھ کر سرہانے کے نیچے رکھا موبائل نکالا اور تیزی سے پیغام لکھ کر ثنا کے نمبر پر بھیج دیا جو کہ ثنا اور حیات کے مشترکہ استعمال میں رہتا تھا۔ دوست سے ایک اور وش شیئر کرکے وہ سکون سے سونے لیٹ گئی۔

ادھر تیزی سے پیغامات کے جوابات دیتے حیات نے ایک پیغام عجلت میں مجاہد مصطفیٰ کو بھیجا تھا۔ جو پیغام کی عبارت دیکھ کر کچھ لمحوں کے لیے تو حیران بیٹھا رہ گیا تھا۔

"کاش کہ میرا گھر بھی بالکل تمہارے گھر جیسا بڑا اور خوب صورت ہو۔" جملہ مکمل ہوتے ہی کسی کا بھیگا بھیگا اداس سا چہرہ آنکھوں میں آسمایا تھا اور سب کچھ کلیئر ہو گیا تھا۔ مسکراتے ہوئے اس پیغام کو محفوظ کرتے ہوئے مجاہد مصطفیٰ نے ایک فیصلہ بھی لیا تھا اور کافی دیر تک مطمئن ہو کر مسکراتا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼
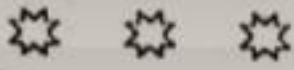
اللہ بے نیاز ہے۔ وہ ہمیشہ انسان کو نوازتا رہتا ہے' مگر کم انسان ہی ہوتے ہیں جو اپنے نصیب پہ شاکر ہوتے ہیں۔ اکثر ہمیشہ شکوہ ہی کرتے رہتے ہیں حتیٰ کہ کسی نعمت کے ملنے پہ بھی یہ شکوہ ان کے لبوں پہ رہتا ہے یا خوشی کو کمتر جان کر یا پھر جو مل جائے اس سے بھی مزید بہتر کی خواہش اور تڑپ جبکہ یہ خود انسان کو ہی خسارہ بخشتی ہے۔

یہی حیا کے ساتھ ہوا تھا وہ جو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔ بس ہر وقت نصیب کو کوستے ہوئے ثنا سے اپنی خواہشات کا اظہار کرتی تھی۔ وہ حیا کہ جسے رب کی نعمتیں مانگنا یاد تھا' مگر رب کی رضا اور خوشنودی تو کیا رب ہی یاد نہ رہتا تھا۔ اللہ نے اس کی خواہش پوری کردی تھی' وہ بھی یوں اچانک ثنا اور حیات بھائی مجاہد مصطفیٰ کی فیملی کے ساتھ اس کا ہاتھ مانگنے آئے تھے دادی کے پاس۔ ثنا نے دادی کو ہر طرح سے مطمئن کردیا تھا۔

عمر میں فرق تھا' مگر دادی پرانے وقتوں کی جہاں دیدہ خاتون تھیں' ان کے مطابق مرد کا پختہ عمر کا ہونا کامیاب ازدواجی زندگی کی دلیل مانا جاتا تھا۔ پھر حیا کا ان کے علاوہ اور کوئی تھا بھی نہیں۔ ایسے میں اتنا اچھا رشتہ انہیں اللہ کی خاص مدد لگا تھا۔ ثنا نے بھی ان کو مکمل امید دلائی تھی' تب ہی وہ لوگ منگنی کا سامان ساتھ لے کر آئے تھے۔ مجاہد مصطفیٰ کی امی نے دعائیں دیتے

ہوئے حیا کو انگوٹھی پہنائی۔ دادی کے اندر تک
اطمینان اتر گیا۔ ان کے جاتے ہی انہوں نے شکرانے
کے نوافل ادا کیے۔

وہ کمرے میں آئیں تو حیا منگنی کا سارا سامان بیڈ پر
پھیلائے اداس بیٹھی تھی۔ دادی اس کی اداسی محسوس
کر کے مسکرادیں۔

"ہر وقت تو شہزادے کے لیے دعائیں کیا کرتی تھی
اور اب اداس بیٹھی ہو۔ جب وہ آکر تمہیں اپنے نام کی
انگوٹھی پہنا گیا ہے۔" دادی اس کے ساتھ بیڈ پر بیٹھتے
ہوئے بولیں اور ان لوگوں کی طرف سے لائے گئے
سامان کو دیکھنے لگیں۔ سادہ سی تقریب کے باوجود وہ
لوگ حیا کے لیے بیش قیمت تحفے لائے تھے۔ دو قیمتی
شیفون کے سوٹ کے ہمراہ ان کے ہم رنگ جیولری
بھی تھی۔ دو نفیس سی سینڈل تھیں۔ بالکل ویسی جو
ہمیشہ حیا کی کمزوری رہی تھیں۔

"میں اداس اس لیے بیٹھی ہوں دادی کہ انہوں
نے ایک تو منگنی کی تقریب اتنی سادگی سے کردی۔ اوپر
سے سامان دیکھیں۔ اس سے اچھا سامان تو زویا کا تھا۔"
اس نے ہمیشہ کی طرح اپنی کسی دوست کی مثال دے کر
شکوہ کیا۔ دادی تو حیران رہ گئیں۔ انہیں کم از کم آج حیا
سے اس بے وقوفی کی امید نہیں تھی۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو حیا۔ ایک سے ایک بڑھ کر چیز
لائے ہیں وہ تمہارے لیے۔ پھر زویا کی تو بری تھی۔
تمہاری تو صرف منگنی پہ انہوں نے اس قدر تحائف
دیے ہیں۔" انہوں نے خفگی سے اسے گھورا۔

"یہ بیش قیمت ہیں دادی۔ اس سے اچھے کپڑے تو
میں نے ثنا کی شادی پر پہنے تھے۔ جو اس نے بنوائے
تھے میرے لیے۔" اس نے بددلی سے کپڑوں کو پرے
کھسکایا۔

"آپ نے ثنا کی بری دیکھی ہوتی نہ تو اس طرح نہ
کہتیں۔ میں نے کتنے خواب سجائے تھے کہ جب
میری منگنی ہو گی تو۔۔۔"

"حیا۔" دادی نے اسے ٹوک دیا۔

"شکر کرو تمہیں تمہاری حیثیت سے بڑھ کر ہی ملا
ہے گڑیا۔ ورنہ جس طرح کے حالات ہیں ہمارے اور
جو حیثیت ہے نا تو کوئی ڈھنگ کا رشتہ ملنا بھی مشکل
تھا۔ تم پہ تو اللہ کا خاص کرم ہوا ہے کہ مجاہد جیسے اچھے
لڑکے سے تمہارا نصیب جوڑ دیا ہے۔ اس پاک ذات
نے تمہیں تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔" انہوں
نے پیار سے اسے سمجھایا۔

"پتا نہیں دادی۔ مگر شکر تو تب ادا کروں نا جب دل
خوش ہو مطمئن ہو۔ میرا تو دل کبھی خوش ہی نہیں ہوا۔
کچھ ایسا ملا بھی تو نہیں مجھے۔" اس کی بات سن کر دادی
کا دل سر پیٹنے کو چاہا۔

"حیا یہ مال و دولت عیش پرستی نعمت نہیں ہوتی۔
بلکہ عزت اور محبت بڑی نعمت ہے۔ اور مجاہد کی
آنکھوں میں، میں نے عزت دیکھی ہے۔ شرم و حیا
دیکھی ہے۔ ایسے لوگ بہترین جیون ساتھی ثابت
ہوتے ہیں۔" انہوں نے حسب عادت دلائل دینا
شروع کردیے۔ جبکہ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ حیا
پہ ان کا کوئی اثر نہیں ہونے والا۔

"یہ سب آپ کو کیسے پتا؟" بے وقوفانہ سوال۔

"یہ بال میں نے دھوپ میں سفید نہیں کیے بیٹا
جی۔" انہوں نے اپنے تجربے پہ حیا کے سوال پہ
ٹھنڈی آہ بھری۔

"میں کیسے مان لوں؟" اسے ثبوت چاہیے تھا۔

"تم نے آج ثنا کو دیکھا۔ تمہیں اس کے رویے
میں کچھ بدلاؤ محسوس ہوا؟" انہوں نے الٹا اس سے
سوال کیا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"اس کی شادی کو کچھ ہی دن بمشکل ہوئے ہیں۔ مگر
میں نے دیکھا ہے۔ کہ اس میں کچھ جھجک سی آگئی
ہے۔ جس طرح کا اعتماد کا اس کی شخصیت کا خاصہ تھا وہ
اس بار مفقود تھا۔ پھر نہ جانے کیوں وہ مجھے مرجھائی
مرجھائی سی لگی۔" انہوں نے اپنا تجزیہ بیان کیا۔

"دلہن۔ ظاہری بات ہے۔ نئی نئی شادی کے اتنے
جھنجھٹ" کہہ رہی تھی کہ اتنا بڑا سسرال ہے کہ ابھی
تک وہ اور حیات ایک دوسرے کو صحیح طرح جاننے کے
بھی قابل نہیں ہو سکے۔ اور سارا دن اور آدمی آدمی

رات تک وہ دعوتوں پہ رہتے ہیں۔ تو تھکن سے بندہ مرجھا ہی جاتا ہے۔" حیا نے منہ بناتے ہوئے ان کے سارے خدشات کی گردن ہی مروڑ دی۔ وہ جو اسے سمجھا رہی تھیں خود اثبات میں سر ہلانے لگی۔

"اچھا چلو جو بھی ہے۔ اگر تمہیں یہ سب نہیں پسند تو میں کل ہی ثنا کو فون کرکے منع کردیتی ہوں؟" لبوں پہ آئی مسکراہٹ چھپا کر انہوں نے خود اس بار حیا کی چھیڑنے سے پہلے بحث چھیڑ دی۔

"یہ میں نے کب کہا؟" بے اختیار ہی اس کے منہ سے نکلا۔ دادی ہنسنے لگیں۔ وہ شرمائی سی ان سے لپٹ گئی۔ دادی کے کمزور بازوؤں نے اسے اپنے اندر سمو لیا۔

☼ ☼ ☼
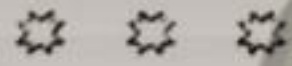
اپنی شادی کے حوالے سے اس نے جو جو خواب اپنی آنکھوں میں سجا رکھے تھے۔ مجاہد مصطفیٰ نے یوں اس کا ہر خواب پورا کرنے کی کوشش کی تھی۔ جیسے وہ شروع سے اسے ہر خواب بتاتی آئی ہو۔ اس کی دو تین خواہشوں نے ہی اسے مجاہد مصطفیٰ کے سامنے کھول کے رکھ دیا تھا۔

سنا ہوگا تم آپ نے کہ محبت جب کسی کے لیے ایک کے دل میں گھر بناتی ہے۔ تو اس شخص کی اچھائیاں ہوں یا برائیاں ہر چیز چاہنے والوں کے لیے اہم ہوجاتی ہے۔ خواب محبوب دیکھتا ہے۔ اور ان کی تعبیر چاہنے والے ڈھونڈتے ہیں۔

یہی حیا کے ساتھ ہوا تھا۔ اس نے بالکل انجانے میں کچھ خواب مجاہد کے سپرد کیے تھے' اور وہ جو پہلے اتفاق میں ہی دل سپرد کرچکا تھا۔ اس کے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنے لگا تھا۔ اور پھر حقیقت میں بھی اس نے حیا کے سب خواب پورے کیے تھے۔ شادی کی انتظام کی تیاری میں ہر چیز کو اس نے ثنا کے ذریعے حیا کی خواہشات کے مطابق رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ خوشی سے حیا کے پاؤں زمین پہ نہیں ٹک رہے تھے۔

اور پھر آسمان پہ لکھا جانے والا بندھن اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بزرگی اور برتری کا اقرار کرتے ہوئے اس زمین پہ بھی قبولیت پا گیا تو جیسے تمام تر رشتے ثانوی ہوگئے۔ سارے حقوق کسی انجان کے نام ہوئے تو سب سے بہترین رشتہ جڑ گیا۔

رخصتی کے وقت حیا دادی کے کمزور وجود سے لپٹ لپٹ کر خوب روئی۔ دادی اسے ساتھ لگائے کتنی ہی دیر تک اس کی مہک اپنے اندر اتارتی رہیں۔ دعائیں دیتی رہیں۔ ان کے چھاؤں جیسے نرم و مہرباں وجود سے لپٹ کر وہ ساری خواہشیں سارے خواب بھول گئی۔ یاد رہا تو اب اتنا کہ اس کے بغیر دادی اکیلے کیسے رہیں گی۔

"زبیدہ ہے نا میرے پاس؟" دادی اسے ساتھ لگائے دروازے کی طرف لائیں۔ وہ سسکتی رہی۔

"ہاں حیا بچے تم بالکل بھی فکر مت کرنا۔ میں اماں کے ساتھ ہی رہوں گی۔" خالہ زبیدہ سے ان کے برادرانہ تعلقات تھے۔ اور وہ ان کی فیملی کا ہی حصہ تھیں۔ مگر حیا دل کا کیا کرتی۔ جو اب دادی کی فکر میں مطمئن ہی نہیں ہورہا تھا۔ بڑی مشکل سے ثنا اور دادی اسے باہر لے کر آئی تھیں۔

بارات کی باقی گاڑیاں پہلے ہی نکل چکی تھیں۔ صرف وہی گاڑی ٹھہری تھی۔ جس میں ثنا اور مجاہد مصطفیٰ کے ساتھ اس نے زندگی کے ایک نئے سفر کا آغاز کرنا تھا۔ وہ عام دولہوں کی طرح ڈریسڈ نہیں تھا۔ اس نے بلیو جینز پہ سفید شرٹ پہن رکھی تھی۔ گاڑی کے فرنٹ ڈور سے ٹیک لگائے سینے پہ ہاتھ باندھے' پیروں کی قینچی بنائے کھڑا وہ سیدھا دروازے کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ ان دونوں کو باہر آتا دیکھ کر اس نے تیزی سے پیچھے والا دروازہ کھولا۔

ثنا نے احتیاط سے حیا کو بیٹھنے میں مدد دی۔ اور پھر آرام سے دروازہ بند کرتے ہوئے فرنٹ سیٹ پر حیات کے ساتھ بیٹھ گئی۔

مجاہد ساری شرارت سمجھ گیا۔ اور یوں آرام سے جا کر پیچھے بیٹھ گیا۔ جیسے وہ اسی بات کا منتظر تھا۔ ثنا نے برا منہ بنایا جبکہ حیات نے ہنستے ہوئے گاڑی اسٹارٹ

کردی۔

"توبہ ہے مجاہد بھائی۔ آپ تو بہانے کی تلاش میں تھے۔ میرا تو پورا ارادہ ہی آپ نے ملیا میٹ کردیا۔ خوب تنگ کرنے کا آپ کو۔" ثنا نے خفا لہجے میں مجاہد سے شکوہ کیا تھا۔

"یہ تو میری اچھائی تھی بھابھی کہ اپنی اس قدر خوب صورت بیوی کے ساتھ آپ کو بیٹھنے کا موقع دے رہا تھا۔ ورنہ اتنا وقت آپ لوگوں نے رونے دھونے میں ضائع کیا کہ میں خود اگر آپ دونوں کو پکڑ کر گاڑی میں بٹھانے کا ارادہ کرچکا تھا۔" شریر سی نظر سمٹی سکڑی حیا پہ ڈالتے ہوئے وہ بولا تو وہ مزید خود میں سمٹ گئی۔

"اللہ اللہ۔ اس قدر بے قراری۔ اور بنتے تو کتنے تیس مار خان تھے، جیسے سینے میں دل نہ ہو پتھر ہو۔" ثنا نے اسے چڑانے کی کوشش کی۔

"سینہ ہو تو دل لازمی ہو جاتا ہے۔ پتھر تو بس پہاڑوں میں پائے جاتے ہیں۔ ہاں مگر جو ہر کسی پہ آجائے وہ دل تو نہ ہوا نا۔" وہ بھلا کہاں ہارنے والا تھا۔ اس بار حیات بھی ہنس دیا۔ اور ڈیش بورڈ پہ پڑی سی ڈی اٹھا کر پلیئر میں لگادی۔

"میں خوشبوؤں سی بکھرتی رہی تمہارے لیے۔" متالی سنگھ کی آواز نے سحر سا پھونکنا شروع کیا۔ تمام نفوس خاموشی سے سامنے دیکھنے لگے۔

حیا کا ہلتا وجود مجاہد کو متوجہ کرگیا تھا۔ وہ شاید رو رہی تھی ابھی تک۔ شام ڈھل چکی تھی۔ رات ہونے لگی تھی۔ گھر ابھی دور تھا۔ مگر حیا کی یہ حالت بھی اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے ایک اچٹتی نگاہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے کپل پہ ڈالی تھی۔ حیات سامنے دیکھ رہا تھا۔ جبکہ ثنا مزے سے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے غزل پہ سر دھن رہی تھی۔ اس کے لبوں پہ مسکراہٹ آٹھہری۔ وہ اس کی بیوی تھی۔ اس کی جیون ساتھی۔ اور وہ بنا کسی جھجک اس کو کچھ تو ایسا سونپ سکتا تھا کہ یہ سفر اس کے لیے اس تکلیف کے بجائے خوشی کا باعث بنتا۔ کسی امید اور اطمینان کا۔

اور مجاہد مصطفیٰ نے یہی کیا تھا۔ ایک شوہر نے بیوی کے کان میں ہلکی سی سرگوشی کی تھی۔ بس ایک جملہ کہا تھا۔ حیرت بھری آنکھوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ اور اس کی مسکراہٹ نے اس کی آنکھوں میں کتنے ہی جگنو جگمگا دیئے تھے۔

محبت کسی بندھن کے روپ میں مل جائے تو اسے کون برا کہتا ہے۔ ایسی محبت تو پاکیزہ اور خالص ہوتی ہے۔ محبت نے حیا کے دل پہ دستک دی تھی اور دروازہ وا ہوتے ہی اس محبت کا سحر پوری طرح اثر کرگیا تھا۔ اسے مجاہد مصطفیٰ ہمیشہ کے لیے اپنا بے دام غلام بنا گیا۔

حیا خوش قسمت تھی۔ زندگی کے اہم ترین سفر کے آغاز پہ اس کے ہم سفر نے چند لفظوں اور دھیمے لہجے میں اسے اس سفر کا پہلا وعدہ دان کیا تھا۔

"خوامخواہ ہی شوں شوں کیے جا رہی ہو۔ کچھ دن بعد ہی جب دادی کے پاس چند دن گزارنے آؤ گی تو ان کو بھی اپنے ساتھ لے چلیں گے وعدہ۔" وہ کہہ کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اور حیا اس کے بعد سارے راستے مسکراتی رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"یہ کیا تم نے چینج بھی کرلیا۔" مجاہد مصطفیٰ دوستوں سے فارغ ہو کر دل میں کتنے ہی خواب سجائے کمرے میں آیا۔ تو حیا سادہ سے کاٹن سوٹ میں ملبوس کارپیٹ پہ بیٹھی اپنے زیور اتار رہی تھی۔ اسے شدید شاک لگا۔

"ہاں۔ اب کیا ساری رات وہی بھاری ڈریس پہنے رہتی۔" وہ یوں مخاطب تھی کہ جیسے اس کی اور مجاہد مصطفیٰ کی برسوں کی شناسائی ہو۔ اب کی بار اس کا منہ کھلا رہ گیا۔

"اچھا یہ کیا کر رہی ہو۔" اس نے ایک سیٹ اتار کر دوسرا سیٹ پہنتی حیا کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔

"کل ولیمہ ہے نا۔ اس کے لیے دیکھ رہی ہوں کہ کون سا سیٹ اچھا رہے گا۔" اس نے تیزی سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔ مجاہد نے دیکھا اس بار وہ نظریں نہ اٹھا سکی تھی۔

"چھوڑو یار۔ یہ سب تو بیوٹیشن خود سلیکٹ کرے گی۔" وہ اس کا ہاتھ تھامے اسے زبردستی وہاں سے ہٹالایا۔

"یہاں بیٹھو۔" کندھوں سے تھام کر حیا کو بیڈ پہ بٹھایا تو بیج کی کرسٹل کی لڑیاں جھنجھنا اٹھیں۔

"اتنا پیارا روپ تم نے میرے آنے سے پہلے ہی اس قدر سادگی میں تبدیل کر دیا۔" اس کے قریب بیٹھا بغور اسے دیکھتا وہ مسکرا رہا تھا۔ وہ جھینپ گئی۔

"وہ مجھے عادت نہیں ہے۔ اس قدر بھاری کپڑے پہننے کی ناں۔" وہ نظریں جھکا گئی۔

"خواہش تو تھی نا تمہاری۔" لہجہ شریر ہوا۔ گویا وہ اس کی خواہشوں سے بخوبی واقف تھا۔ اسے حیرت ہوئی۔

"آپ کو کیسے پتا؟" گہری بھوری آنکھوں میں حیرت اتری۔

"مجھے تو بہت کچھ پتا ہے۔ جو آگے آگے، رفتہ رفتہ تمہیں پتا چلے گا۔ تو حیرت سے بت بنی کھڑی جاؤ گی۔" ہاتھ کا سہارا لے کر وہ ذرا سا لیٹتے ہوئے بولا۔ حیا خود میں سمٹ گئی۔

"حیرت ہے۔ مجھے تو کچھ بھی پتا نہیں۔ صرف اتنا کہ آپ کو غصہ بہت آتا ہے۔ اور کھڑوس قسم کے ہیں بس۔" وہ تیزی میں کہہ گئی تھی۔ مگر پھر فوراً" منہ پہ ہاتھ رکھ گئی۔ مجاہد مصطفیٰ کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

"یہ کس نے بتایا تمہیں۔" وہ بہ مشکل ہنسی روک پایا۔

"آپ اسے کچھ کہیں گے تو نہیں۔" وہ کسی سی آئی ڈی آفیسر کی طرح اسے گھورتے ہوئے بولی تھی۔

وہ فوراً" نفی میں سرہلا گیا۔

"ثنا نے۔" مطمئن ہو کر اس نے انکشاف کیا۔

"توبہ ہے۔ ثنا بھابھی بھی تم کیسے کیسے اندازے لگاتی ہیں؟" اس نے کانوں کو چھوا۔

"کیوں آپ ایسے نہیں ہیں؟" وہ جیسے یقین کرنا چاہتی تھی۔ مجاہد مسکرا دیا۔

"یہ تو تم بتاؤ گی کہ میں کیسا ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

"مجھے کیا پتا کہ آپ کیسے ہو۔" وہ ایسے بولی جیسے اس کے سامنے پیپر رکھ دیا گیا ہو۔ اور اسے خبر ہی نہ ہو کہ پرچہ ہے کس چیز کا۔

"ساری زندگی پڑی ہے یار۔ جان جاؤ گی بہت جلد۔" وہ وارڈروب میں سے کچھ نکال رہا تھا۔ حیا کی طرف اس کی پشت تھی۔ وہ خاموشی سے سرہلا گئی۔ ذہن ایک مرتبہ پھر کل کی تیاری کے بارے میں سوچنے لگا۔

"حیا۔" نرم لہجے پر بھی وہ بری طرح چونکی۔

"جی۔"

"کیا یار۔ میں سچ میں اتنا ڈراؤنا ہوں۔" وہ خفا لہجے میں بولا۔

"آئم سوری۔" اسے مجاہد کا خفا ہونا بالکل اچھا نہ لگا تھا۔ تب ہی اپنی فطرت کے برعکس اس نے فوراً" معذرت کرلی تھی۔

"پتا ہے مجھے کتنا شوق تھا تمہیں دلہن کے روپ میں جی بھر کے دیکھنے کا۔ مگر خیر اب صبح شادی والی ویڈیوز دیکھ کر ہی اپنی حسرت پوری کروں گا۔" وہ ایک آنکھ دباتے ہوئے مذاقاً" بولا۔ حیا مسکرا دی۔

"اپنا دایاں ہاتھ ادھر دو۔" مجاہد نے اپنا دایاں ہاتھ آگے کیا۔ حیا ذرا سا جھجکی۔ پھر دھیرے سے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ جو مجاہد مصطفیٰ نے دھیرے سے تھام لیا۔ اور پھر بائیں ہاتھ سے خوب صورت بریسلیٹ جس میں نفیس سی ننھے ننھے ہیروں کی بیل بنی تھی۔ اس کے ہاتھ پر پہنا دی۔

"واؤ۔" حیا خوشی سے چہک اٹھی۔

"تمہاری زندگی کے اس خوب صورت سفر کے آغاز پر میری طرف سے میرے ہم سفر کو ایک ننھا منا سا ویلکم۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ ہاتھ ابھی تک ویسے ہی تھاما ہوا تھا۔

"یہ ننھا منا ہے۔ یہ تو انمول ہے۔" وہ بے اختیار بولی تھی۔

"میری خواہش ہے حیا کہ کاش میں تمہاری ہر

خواہش پوری کر سکوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے حیا کا ہاتھ چھوڑا۔ جو وہ مسلسل کھینچ رہی تھی۔

"میری خواہشیں بہت زیادہ ہیں۔ آپ تھک جاؤ گے۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔

"نہیں تھکوں گا۔" اس نے مضبوطی سے کہا۔ حیا مسکرا دی۔

مجاہد مصطفیٰ نے حیا تندی کے ساتھ مل کر ایک بہت ہی خوب صورت منزل کی طرف قدم بڑھائے تھے۔ ایک دوسرے کو محبتوں کے خواب اور کچھ گلاب دان کرتے ہوئے۔

محبتوں کی ان ساعتوں کو
جذبوں کے در پہ
کچھ دیر روکوں۔ کہ تم ہی پہلی تم ہی آخری داستاں ہو۔

☆ ☆ ☆
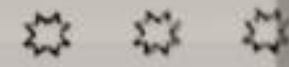
"اللہ دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کے دیتا ہے دادی۔ اور واقعی مجھے چھپر پھاڑ کے ہی دیا ہے۔" اس کی بے تکی بات پہ دادی بس دل ہی دل میں لاحول پڑھ سکیں۔

"منہ دکھائی میں سب گھر والوں نے مجھے ایک سے بڑھ کر ایک گفٹ دیا ہے۔ اور پتا ہے دادی گھر۔ اف گھر کا کیا بتاؤں میں آپ کو میں۔" موبائل کان سے لگائے وہ وسیع ٹیرس پہ جھوم جھوم گئی۔ ہلکے پنک کلر کے کپڑوں میں اس کی ملائی جیسی رنگت میں گلابیاں گھل رہی تھیں۔ باہر آتا مجاہد مصطفیٰ دروازے میں ہی ٹھہر گیا۔

"اور گھر تو بالکل میرے خوابوں جیسا۔ اتنا بڑا ہے کہ میں گھوم گھوم کے تھک جاؤں۔" وہ بے انتہا خوش تھی۔

"اللہ سب تجھے نصیب کرے۔ آمین۔" دادی بھی خوش تھیں۔ کیونکہ ان کی حیا خوش تھی۔

"چلو شکر کہ تمہیں سب پسند آیا۔ میری فکر ختم ہوئی۔" دادی نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا۔

"نہیں دادی۔ سب پسند کہاں؟" اچانک ہی اس نے منہ بنایا تھا۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے کھڑے مسکراتے مجاہد کا منہ اچانک ہی سکڑا تھا۔

"یہاں ویسا سوئمنگ پول نہیں ہے۔ جیسا ثنا کے گھر میں ہے۔ اور دوسرا پودے بھی ویسے اچھے نہیں جیسے وہاں تھے۔" حیا نے ٹیرس کے اوپر سے نیچے جھانکتے ہوئے جیسے ایک بار پھر دیکھ کر تصدیق کی تھی کہ شاید وہ چیزیں وہاں ہوں اور وہ نہ دیکھ پائی ہو۔ مگر تصدیق ہونے پر تاسف سے سرہلاتے ہوئے بتانے لگی دادی کو۔ مجاہد نے ایک لمبی سانس کھینچی تھی۔

"حیا۔ دوسروں کی طرف دیکھنا چھوڑ دو بیٹا۔ یقین کرو لاکھوں ایسے بھی ہوں گے جن کے پاس یہ سب بھی نہ ہوگا جو تمہیں میسر ہے آج۔" حسب معمول دادی نے اسے سمجھایا۔

"پھر بھی دادی اگر ثنا کا ہے تو میرا بھی ہونا چاہیے تھا۔ کتنی حسرت تھی مجھے۔"

"حیا۔ میری نماز کا وقت ہوگیا ہے۔ پھر بات کریں گے۔" دادی کا دل اداس ہونے لگا۔ حیا نے بھی سلام کر کے فون بند کر دیا۔

"حیا" کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے پکارا تھا۔ مجاہد کو اپنے ساتھ دیکھ کر اسے انجانی سی مسرت ہوئی۔

"وہ سامنے والا پلاٹ نظر آرہا ہے تمہیں۔" ایک ہاتھ اس کے کندھے پہ جمائے رکھتے ہوئے اس نے دوسرے ہاتھ سے گھر کے بالکل ساتھ بڑے سرسبز پلاٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں... کیوں؟" وہ ادھر ہی دیکھتے ہوئے بولی۔

"وہاں جو چاہے بنوا لینا۔" اب وہ ٹیرس کی گرل سے ٹیک لگائے سینے پہ ہاتھ باندھے اسے دیکھ رہا تھا۔

"سچ میں۔ مطلب آپ وہاں سوئمنگ پول بنوائیں گے۔" وہ اشتیاق بھرے لہجے میں کہا۔

"ویسے تمہیں کیا تیرنے کا شوق ہے۔" وہ متجسس ہوا۔

"نہیں بس رات میں جب روشنیوں سے پانی کی سطح جھلملاتی ہے۔ اور چاند کا عکس نظر آتا ہے تا تو مجھے

"بہت اچھا لگتا ہے۔" وہ جیسے خوابوں بول رہی تھی۔

"پتا ہے تم بالکل اپنے خوابوں کے جیسی ہو۔" اس نے اچانک ہی اس کے چہرے پر کھیلتی لٹ کو چھوتے ہوئے کہا۔ حیا بلش کرگئی۔ اس کے اس قدر جھینپنے پہ وہ بے ساختہ ہنس دیا۔

"مجھے کام ہے۔" وہ بہانے سے مڑی۔

"اچھا سنو۔ کل ثنا بھابھی کی طرف دعوت ہے۔ اسکائی بلیو والی ساڑھی رکھی ہے وارڈروب میں۔ وہی پہننا۔ میں نے خود لی تھی تمہارے لیے۔" وہ اس کے ہم قدم ہوا۔ حیا رک گئی۔

"مگر.....؟"

"مگر کیا؟" مجاہد مصطفیٰ نے کندھے اچکائے۔

"آپ کو تو یہ لباس بالکل بھی پسند نہیں۔" حیا نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"یہ بات بھی ثنا بھابھی نے بتائی ہوگی۔" اس نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ وہ اثبات میں سرہلا گئی۔

"جو ساڑھی مجھے نہیں پسند وہ میں تمہارے لیے بھی نہیں لایا۔ تم جب پہنوگی۔ تو ثنا بھابھی کو بھی اس بات کا جواب مل جائے گا کہ مجھے ساڑھی کیوں نہیں پسند۔ اور آخری بات....." اس نے دھیرے سے اسے کندھوں سے تھاما اور اس کا رخ اپنی طرف پھیرتے ہوئے بولا۔

"تمہیں مجھ سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جو تمہیں پسند ہو وہی میری پسند اوکے۔" دھیرے سے اس کا گال چھوتا وہ چلا گیا۔ اور حیا کئی لمحوں تک وہیں کھڑی اس کی مہک محسوس کرتی رہی۔

✡ ✡ ✡

دعوت ان دونوں کی امید سے کہیں زیادہ بڑی تھی۔ حیات نے اپنے سب ہی دوستوں کو مدعو کیا تھا۔ وہ بھی بمع فیملی۔ اس طرح مہمانوں کی تعداد خاصی بڑھ گئی تھی۔ لان میں رش دیکھ کر وہ حیا کو سائیڈ کے دروازے سے اندر لے آیا جو کہ کچن میں سے ہو کر جاتا تھا۔ مگر وہاں پہنچ کر ان دونوں کو شدید شاک لگا تھا۔

"کاش وہ وہاں سے نہ آتے۔" دونوں نے ایک ہی بات سوچی۔

"ثنا....." حیا تیزی سے کونے میں سسکتی ثنا کی طرف بڑھی جو ریشمی دوپٹے میں منہ چھپائے روئے جارہی تھی۔ حیا اور مجاہد کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ بھی حیران ہوئی۔ اس نے فوراً اپنا چہرہ صاف کیا مگر حیا اور مجاہد نے اس کے داہنے گال پہ دہکتا نشان واضح دیکھ لیا تھا۔

"یہ حیات نے کیا؟" مجاہد نے آگے بڑھ کر لب کچلتے ہوئے پوچھا۔

"ارے نہیں۔ ایسا کچھ نہیں جیسا تم لوگ سمجھ رہے ہو۔ وہ یہ۔ یہ تو....." وہ نظریں چرا گئی۔

"آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔ میں ابھی بات کرتا ہوں حیات سے۔" غصے سے اس کا چہرہ لال پڑنے لگا تھا۔

"مجاہد بھائی پلیز۔ یہ ہم میاں بیوی کا معاملہ ہے۔ مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگے گا کہ یہ بات ہم دونوں کے علاوہ کسی اور کو معلوم ہو۔ سو پلیز۔" شوہر کی عزت عزیز تھی۔ وہ مٹھیاں بھینچتا باہر نکل گیا۔ ثنا حیا سے لپٹ گئی۔

"تم مجاہد کو بات تو کرنے دیتیں۔" اسے ثنا کی تکلیف بے حد دکھ میں مبتلا کررہی تھی۔ وہ کتنی خوش خوش یہاں آئی تھی۔ مگر اس صورت حال نے اسے اندر تک ہلا کے رکھ دیا تھا۔

"نہیں حیا۔ اس طرح بات پھیل جاتی۔ اور پھر دکھ کس کو ہوتا۔ میرے ہی ماں باپ، بہن بھائیوں کو حیات کے گھر والے تو اس ساری صورت حال پہ خوش ہی ہوں گے۔" اس نے جیسے اک نیا بم پھوڑا تھا۔

"میں نے تو کبھی خواب میں بھی یہ سب نہیں سوچا تھا۔ حیات بھائی نے خود تمہیں پسند کیا تھا۔ پھر اس طرح کیسے۔" وہ بے حد اپ سیٹ تھی۔

"محبت ہونا یا محبت مل جانا اہم نہیں ہوتا حیا' اس محبت کو عزت دینا اور زندہ رکھنا اہم ہوتا ہے۔" وہ

سسکتے ہوئے بولی۔

"لیکن ہوا کیا ہے؟" حیا پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"حیات... حیات۔" وہ دوبارہ سسک پڑی۔

"حیات کو لگتا ہے میں... میں اس میں اس قابل نہیں کہ سوشل گیدرنگ میں ان کے ہم قدم چل سکوں۔ اور وہ بھی صرف اس لیے کہ میں دوسری عورتوں کی طرح ان کے دوستوں سے ویسے کھل کر بات نہیں کرسکتی۔ تم جانتی ہو حیا۔ ہمارے گھر کا ماحول۔ میں تو آج تک بابا' بھائیوں سے کھل کر بات نہیں کرسکتی۔ کہاں یہ نامحرم لوگ۔" اس کی بات بجا تھی۔ مگر حیا خود اس وقت اتنے صدمے میں تھی کہ اسے خود کچھ بھی سمجھ نہیں آرہا تھا۔ کہ کیا کرے۔ کیا کہے۔

"اچھا تم حلیہ درست کرو۔ چلو باہر چلتے ہیں۔ مجاہد ہمارا انتظار کررہے ہوں گے۔" بہت ضبط کے بعد وہ بولی تھی۔ ثنا اس کے ساتھ کمرے کی طرف چل دی۔ اس نے بہت احتیاط سے ثنا کا میک اپ کیا اور اسے ساتھ لیے باہر نکل گئی۔ مجاہد کی نظر دروازے کی طرف ہی تھی۔ وہ واقعی ہی ان کا منتظر تھا۔ فوراً" اس کی طرف بڑھا اور ایک ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اتنے زیادہ لوگوں کو دیکھ کر حیا کا غائب ہوتا اعتماد پل میں بحال ہوا تھا۔

ثنا نے پنک کلر کی شرٹ جس پہ بلیو کلر کا پینٹ کیا ہوا تھا' بلیو جینز پہ پہنی تھی۔ یہ لباس اس کے لیے حیا نے چنا تھا' جالی دار دوپٹا اس نے ایک کندھے پہ ڈال رکھا تھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ حیات نے ایک اچٹتی نظر ثنا پہ ڈالی اور پھر ایک گہری نظر حیا پہ۔ ساڑھی کے بڑے سے پلو کو اپنے گرد لپیٹے ہوئے وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق لگ رہی تھی۔ نور اور کشش کا ہالہ سا تھا اس کے گرد۔

"کمال ہے بھئی۔ جس مجاہد مصطفیٰ کی مردانگی پہ لوگ شک کیا کرتے تھے کہ میلوں دور سے عورتوں کو دیکھ کر دور بھاگتا ہے۔ آج اپنی بیگم کا ہاتھ یوں سرعام تھامے ہوئے ہے۔" احباب اس محفل کے مہمان خصوصی اور اس کی بیگم سے ملنے آگے بڑھے تو حیات نے عجیب سے لہجے میں اس پر طنز کیا۔ مجاہد نے ایک نظر اس پہ ڈالی اور پھر دوسری محبت پاش نظر حیا پہ۔

"کوئی عورت میری بیوی نہیں تھی۔ بیوی کا ہاتھ تھامنے میں کیسی شرم۔" وہ مسکرایا تھا۔

"اور ہاں۔" اب وہ مکمل طور پر حیات کی طرف مڑا تھا۔

"اصل مرد عورتوں کا ہاتھ تھامنے میں نہیں بلکہ عورتوں پہ ہاتھ اٹھانے میں شرم محسوس کرتے ہیں۔" نہ کسی کا ہاتھ اٹھا تھا۔ نہ کسی نے کسی کو چھونے کی کوشش کی تھی مگر پھر بھی حیات کو زور دار طمانچہ لگا تھا۔

"تمہارا مطلب کیا ہے مجاہد؟" وہ سمجھ چکا تھا۔ مگر شاید یہ بات تسلیم کرنے سے عاری تھا کہ اس کی خبر مجاہد کو ہو گئی۔ وہ اتنا تو ثنا کی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھا۔

"کچھ نہیں۔" اسے بحث پسند نہیں تھی۔ تب ہی ہمیشہ کی طرح اس نے بات ختم کردی تھی۔ مگر حیات کا موڈ آف ہو چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"دادی۔ واقعی میں آپ ٹھیک سمجھی تھیں۔ حیات کا رویہ بالکل بھی اچھا نہیں ہے ثنا کے ساتھ۔" وہ دادی سے ملنے آئی تو سب سے پہلے یہ ہی بات بتائی۔

"اللہ اسے صبر دے۔ اور اس کی مشکل آسان کرے۔ آمین۔ مگر تم بھی اس بات سے سبق حاصل کرو حیا مجاہد تمہیں کتنا پیار کرتا ہے۔ کتنی عزت دیتا ہے۔ تمہاری ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تمہارا بھی فرض بنتا ہے اس کا خیال رکھنے کا۔ اور اب تم بڑی ہو گئی۔ اس طرح ہر چیز میں نقص نکالنا چھوڑ دو جیسا تم ہر وقت اپنا فرض سمجھتی ہو۔" دادی نے ایک مرتبہ پھر اسے نصیحت کی۔

"اللہ دادی۔ آپ تو ہر وقت بس میرے پیچھے ہی پڑی رہا کریں۔" حیا چڑ گئی۔

"توبہ ہے دادی۔ اب تو لگتا ہے مجھے اپنا فیصلہ بدلنا پڑے گا۔ ورنہ آپ نے تو وہاں بھی اسی طرح مجھے لیکچر دینے ہیں۔" وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ اس نے آتے ہی دادی کو بتادیا تھا۔ کہ اگلے ہفتے مجاہد کو آفس جوائن کرنا تھا۔ اور چونکہ وہ وہاں اکیلے ہوں گے تو دونوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا تھا کہ، دادی ان کے ساتھ ہی وہاں رہیں گی۔ مگر دادی مان کے نہیں دے رہی تھیں۔ حیا کی بات سن کر وہ کھل کر مسکرائیں۔

"اچھا۔ تو پھر مجھے بھی اپنا فیصلہ بدلنا پڑے گا۔ میں اب ضرور تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ یہ نہ ہو کہ تم وہاں بھی مجاہد سے الٹی سیدھی فرمائشیں کرتی رہو۔" انہوں نے حیا کا وار اسی پر الٹ دیا تھا۔

"خدا کی قسم۔ آپ تو کبھی مجھے جیتنے نہ دینا۔ کتنا تیز ذہن ہے آپ کا۔" اس نے کھلے دل سے دادی کی تعریف کی۔

"مگر چلو اب آپ نے جانے کا وعدہ تو کرلیا۔" وہ ان سے لپٹ گئی۔

☼ ☼ ☼
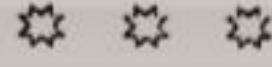
"ہم یہاں رہیں گے؟" فلیٹ میں داخل ہوتے ہی وہ بے یقینی سے بولی تھی۔ اس کے چہرے پہ چھائی ناگواری ان دونوں سے چھپی نہ رہ سکی تھی۔

"صرف چند دنوں کی بات ہے۔ گھر ملتے ہی ہم شفٹ کر جائیں گے۔" تین گھنٹے کی مسلسل ڈرائیو سے وہ تھک چکا تھا۔ تب ہی صوفے پر گر گیا۔

"پھر بھی اتنے تنگ سے فلیٹ میں۔" حیا سب ہی کمرے کھول کر چیک کرتے ہوئے بولی۔

"اتنے کمرے تو ہیں۔ کافی ہیں حیا۔ تم نے کیا سارا محلہ ٹھہرانا ہے بلوا کر۔" اس کی ہمیشہ والی ناشکری باتوں پہ دادی اسے ٹوکے بنا نہ رہ سکیں۔

"محلے ٹھہرانے والی کون سی بات ہے اس میں۔ میں نے تو سوچا تھا اتنا بڑا گھر ہوگا اسلام آباد میں اور یہاں آکر تو دل برا ہونے لگا ہے میرا۔" اس کی خفگی کا اندازہ اس کے چہرے سے لگایا جاسکتا تھا۔

"لیکن۔"

"حیا" دادی نے اسے ٹوک دیا۔

"مجاہد تم منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جاؤ بیٹا۔ میں اتنے تک چائے بنالیتی ہوں۔" انہوں نے حیا کو چپ کروا کر مجاہد سے کہا۔

"نہیں دادی۔ آئم او کے۔ میں خود بنا لیتا ہوں چائے۔ آپ آرام کرلیں ذرا۔" وہ فورا" اٹھ کھڑا ہوا۔

"حیا پھر تم جاؤ۔ جا کر سب کے لیے چائے بنالاؤ۔"

کبھی کبھی مجاہد کی اچھی فطرت دادی کو شرمندہ کردیتی تھی۔ انہوں نے شرمندہ سے لہجے میں حیا کو مخاطب کیا۔ جو بے فکری سے صوفہ سنبھال چکی تھی۔

"نہیں دادی۔ حیا کو بھی آرام کرنے دیں۔ میں نے کہا نا آج چائے میرے ہاتھ کی ہو جائے۔" وہ کہہ کر کچن میں جا چکا تھا۔

"کتنے کیئرنگ ہیں مجاہد۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی تھی۔

"اللہ ہدایت دے تمہیں حیا۔" دادی کلس کے رہ گئیں۔ اس نے جلدی سے سیل فون سے ایئر فون کنیکٹ کیا اور کان میں اڑس لیے۔ دادی اس حرکت پر اسے گھور کر رہ گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

مجاہد مصطفیٰ نے وعدے کے مطابق ہی، بہت جلدی گھر ڈھونڈ لیا تھا۔ گھر کی ایک ایک چیز حیا کی پسند سے لی گئی، مگر بعد میں اس میں بھی کوئی نہ کوئی نقص نکل ہی آتا۔

"تھک جائیں گے۔" حیا نے پہلے دن ہی اسے چیلنج کیا تھا، مگر اسے خود پہ بھروسا تھا، لیکن اب واقعی اسے لگا تھا کہ حیا کی خواہش پورا کرنا مشکل نہ تھا۔ حیا کو راضی کرنا بہت مشکل تھا۔

"میں کچھ بھی کرلوں حیا راضی ہی نہیں ہوتی۔" وہ بے بس ہو کر ماں کے پاس چلا آیا تھا۔

"میں نے تمہیں پہلے ہی سمجھایا تھا مجاہد بیٹا حیا کم عقل ہے اسے شعور دو' اسے احساس دلاؤ کہ جو کچھ

تمہارے بس میں ہے تم صرف وہی اس کے لیے کر سکتے ہو۔ تمہارے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے، جو تمہارا نصیب ہے تمہیں اور حیا کو بس اس قدر ہی ملے گا۔ اس سے زیادہ یہ نہ تمہیں اختیار ہے، اسے تم شکر کرنا سکھا سکتے تھے، مگر تم نے تو اس کی خوابوں کو مزید بے لگام کر دیا بیٹا۔" سکینہ گل کی طبیعت میں خدا نے جھیل سا ٹھہراؤ دیا تھا۔ وہ ہر حال میں صبر شکر کرنے والی عورت تھیں اور حیا اور مجاہد کی شادی کی بعد وہ بہو کی فطرت کو اچھی طرح جان گئی تھیں۔ انہوں نے کئی بار مجاہد مصطفیٰ کو سمجھایا تھا۔

آج اسے پریشان دیکھ کر وہ بھی پریشان ہو گئی تھیں۔ انہیں خوشی تھی کہ مجاہد حیا سے بے حد پیار کرتا تھا اس کا اس کی خواہشات کا احترام کرتا تھا، لیکن وہ جانتی تھیں کہ حد سے زیادہ کوئی چیز اچھی نہیں ہوتی۔ اپنی حد سے آگے چلے جانا خواہ کسی بھی معاملے میں ہو خطرناک ہوتا ہے اور آج یہی صورت حال ان کے عزیز از جان بیٹے کو پیش آ رہی تھی۔

"لیکن امی۔ میں غلط تو نہیں تھا۔ اپنی شریک حیات کے خوابوں کو اپنی آنکھیں سونپنا اور پھر اس کی تعبیر ڈھونڈنا غلط تو نہیں۔ آپ گواہ ہیں حیا سے پہلے میری زندگی میں کسی بھی لڑکی کی کوئی گنجائش نہیں تھی اور اب بھی میں اس کی خواہشات سے تنگ نہیں بلکہ صرف یہ چاہتا ہوں کہ وہ راضی ہو۔ میں جو کچھ بھی اس کے لیے کروں اس پر راضی ہو۔ خوش ہو۔" وہ بھی غلط نہ تھا۔ سکینہ گل کچھ دیر سوچتی رہیں۔

"پھر انتظار کرو مجاہد۔ جس دن اسے ہدایت ملی اور وہ رب کی رضا میں راضی ہوئی تو تمہیں بھی اسے خوش کرنے میں زیادہ مشکل نہیں ہوگی۔" انہوں نے کافی دیر بعد اسے کہا۔ تو وہ حیران ہوا۔ سوالیہ نظروں سے ماں کو دیکھا۔

"حیا کو پتا نہیں کہ اس پر خدا نے کیا کیا مہربانیاں کیں ہیں۔ کس کس نعمت سے اسے نوازا ہے۔ جس دن اسے ہدایت ملی اور وہ رب کی ان نعمتوں کی قدر سیکھ گئی۔ تمہاری ہر چیز خود بخود اس کے لیے اہمیت اختیار کر لے گی۔

اہم یہ نہیں مجاہد بیٹا کہ تم اس کے لیے کیا کیا کرتے ہو۔ اہم بات تو یہ ہے کہ اللہ اسے کس قدر نوازتا ہے، مگر میں نے اسے کبھی خدا کا شکر ادا کرتے نہیں دیکھا ہر وقت اسے اللہ سے گلہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ جو اپنے رب سے شکر ادا نہ کر سکے وہ بندوں کی محبت کو ہرگز نہیں پہچان سکتا نہ ہی ان کی خوشیوں کے لیے کی جانے والی دوسروں کی انتھک کوششوں کو۔" ان کی بات میں وزن تھا۔

"امی۔ تو پلیز آپ چلیں نا میرے ساتھ۔ آپ کسی طرح حیا کو یہ سب سکھا دیں۔ میرا مطلب شکر۔ ضبط کرنا۔" اس نے عقیدت سے ماں کا ہاتھ تھاما۔

"دادی ہیں نا تم لوگوں کے ساتھ۔ میں خود بھی چاہتی تھی کہ دادی تمہارے ساتھ رہیں۔ وہ ضرور ہر بات پر حیا کو ٹوکتی ہوں گی اور یقین جانو۔ مسلسل نصیحت اس مسلسل گرتے پانی کے ایک قطرے کی طرح ہوتی ہے جو مضبوط پتھر میں بھی دراڑ ڈال دیتی ہے۔ نصیحت اثر کرے نہ کرے۔ آدمی کو سوچ ضرور بخش دیتی ہے۔ وہ اپنے اور اپنے ہر عمل پہ سوچنے ضرور لگتا ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن حیا بھی سنبھل جائے گی بس دعا یہ ہے کہ اسے سنبھلنے کے لیے کسی ٹھوکر کی ضرورت نہ پڑے۔" انہوں نے مطمئن انداز میں کہتے ہوئے دعا بھی دی۔

"خواب دیکھنا بری بات نہیں، مگر خوابوں کو ہی زندگی مان لینا غلط ہے کیوں کہ ان کی چمک اس قدر تیز ہوتی ہے کہ پھر ہمیں حقیقت کا سامنا کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور زندگی حقیقت ہے بیٹا ایک اٹل حقیقت۔"

"آپ سچ کہتی ہیں امی۔ خیر میں صبح تک نکلوں گا۔ آپ چلیں گی۔" اس نے عقیدت سے ماں کا ہاتھ تھاما۔

"نہیں بیٹا۔ تمہیں پتا ہے میں زیادہ دیر تک ایک ہی زاویے پہ نہیں بیٹھ سکتی۔ کمر اور ٹانگوں کے جوڑ اس قدر کمزور ہو چکے ہیں تم جانتے ہو، مگر ایک گلہ ہے تم سے۔ آئی رہے تھے تو حیا کو بھی لیتے آتے۔"

انہوں نے محبت سے اس کے چہرے پہ ہاتھ پھیر کر ہلکی سبز مائل روئیں کو ہاتھوں سے محسوس کیا۔

"ثنا آئی ہوئی ہے ورنہ تو ضرور آتی۔ کہاں رہنے والی تھی وہ۔" وہ خود بخود مسکرا دیا تھا۔ حیا کے ذکر پہ اس کی آنکھوں میں کئی جگنو لودینے لگتے تھے۔ سکینہ گل نے دل ہی دل میں ان دونوں کی دائمی خوشیوں کی دعا کی تھی۔

"خوش رہو۔ چلو کوئی بات نہیں، مگر شام میں مجھے فون پر ضرور ملوا دینا۔"

"کیوں۔ فون پر آپ کی بات نہیں ہوتی حیا سے۔" اسے حیرت ہوئی۔

"ارے نہیں ہوتی ہے' وہ کیا ہوتا ہے لائیو سا کچھ۔" وہ ذہن پر زور دیتے ہوئے بولیں۔

"اوہ۔ ویڈیو کالنگ۔۔۔ او کے امی ضرور وعدہ ہے میرا۔" اس نے کسی ننھے سے بچے کی طرح ماں کے گرد بانہیں لپیٹ دیں تھیں۔ سکینہ گل نے مسکراتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

☼ ☼ ☼

"یہ کیا بچپنا ہے حیا؟" کچھ دیر تک تو اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا تھا کہ حیا نے کیا کہا ہے اور جب سمجھ آیا تو پہلی بار شادی کے گیارہ ماہ بعد وہ اس سے نسبتاً اونچے لہجے میں بولا۔ ایک لمحے کو تو وہ بھی لرز گئی، مگر پھر فوراً خود کو سنبھال لیا۔

"اس میں بچپنے کی کیا بات ہے؟ ہماری شادی کو پورے گیارہ ماہ اور دو ہفتے ہو گئے ہیں، لیکن اب تک ہماری اولاد نہیں ہے اس کا مطلب صاف ہے کہ یا تو میں بانجھ ہوں یا پھر۔۔۔؟"

"حیا۔۔۔" وہ چیخ اٹھا تھا۔ اس بار حیا واقعی سہم گئی تھی۔

دادی مجاہد کی چیخ سن کر قریباً" دوڑتی ہوئی وہاں آئی تھیں۔

"کیا ہوا؟ خیریت تو ہے نا۔" ان کو میاں بیوی کے درمیان آنا ذرا بھی اچھا نہ لگ رہا تھا، مگر اس طرح مجاہد کو غصے میں بھی انہوں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ تب ہی پوچھے بنا نہ رہ سکی تھیں۔

"دادی میں ان کو بس اتنا۔۔۔" حیا نے انہیں بتانے کی کوشش کی۔

"حیا۔ بس اب تم ایک لفظ نہیں بولو گی۔" اس کا ضبط جواب دینے لگا تھا۔

"لیکن کیوں؟" وہ بھلا کبھی رکتی تھی۔

"میں نے صرف اتنا تو کہا کہ آپ اور میں ٹیسٹ کرا لیں بس۔" وہ لب کچلنے لگا۔

"مگر کس چیز کا ٹیسٹ؟" دادی اب حیا کی طرف مڑ چکی تھیں۔

"مجھے بچہ چاہیے دادی۔" اس بار جھٹکا دادی کو لگا تھا۔

"یہ کیا بچپنا ہے حیا۔ ابھی تمہاری شادی کو عرصہ ہی کتنا ہوا ہے۔ کہ تم اتنی حد تک سوچنے لگی ہو۔" وہ بھی پریشان ہونے لگی تھیں۔

"سال ہونے والا ہے دادی۔"

"یہ اتنی بڑی مدت نہیں کہ تم اتنی بڑی بات سوچنے لگو۔ اللہ سے اچھے کی امید کرنی چاہیے۔"

"کیوں بڑی مدت نہیں۔ ثنا کی شادی میری شادی سے یہ کوئی دو ماہ قبل ہی ہوئی تھی نا۔ اس کا تو بیٹا ہو گیا پھر میرا کیوں نہیں۔" وہ مایوس لہجے میں بولی۔ دادی تو سر تھام کے رہ گئیں اور مجاہد مصطفیٰ کا دل چاہ سر ہی پیٹ ڈالے۔

"اف از اف۔ بس کہہ دیا نا کہ اس بارے میں آئندہ میں ایک لفظ بھی نہ سنوں۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔" وہ جس قدر لہجہ سخت بنا سکتا تھا اس نے بنایا حالانکہ اس کے لیے خود اسے بھی کتنا دل کڑا کرنا پڑا۔ صرف وہی جانتا تھا، مگر اسے یہی بہتر لگا تھا اب۔ کہنے کے بعد وہ وہاں رکا بھی نہیں تیز تیز قدم اٹھاتا باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

"بی بی جی۔ یہ اماں جی نے دودھ دینے کے لیے کہا

تھا آپ کو۔" رشیدہ اس کی نئی ملازمہ تھی اور حیا کے غصے سے اسے بے حد ڈر لگتا تھا تب ہی کمرے میں آنے پہ تیز نظروں سے خود کو گھورتی حیا کو اس نے جلدی سے صفائی دی۔

"میز پہ رکھ دو۔" حکم آیا۔ اس نے فوراً" تعمیل کردی۔

"سنو۔" وہ مڑ کر جانے لگی کہ حیا کی تیز آواز پہ خود بخود قدم رک گئے۔

"ادھر آؤ۔ بیٹھو یہاں۔" اگلے ہی لمحے وہ حیا کے قدموں میں ہی کارپٹ پہ بیٹھ چکی تھی۔

"کیا تمہارا شوہر بھی تمہیں اس طرح ڈانٹ پلاتا ہے۔" اس کی خوب صورت براؤن آنکھیں جھلملانے لگیں، مگر اگلے ہی لمحے اسے شدید حیرت ہوئی جب رشیدہ زور زور سے رونے لگ گئی۔

"اے۔ چپ کرو۔ دادی آجائیں گی۔ میں نے تمہیں رونے کے لیے نہیں کہا اوکے۔" اگلے ہی پل وہ بری طرح بگڑی تو رشیدہ جلدی جلدی چہرہ صاف کرنے لگی۔

"ہاں بی بی۔ بہت لڑتا ہے میرے سر کا سائیں۔ مارتا بھی ہے۔" وہ نم لہجے میں بولی۔

"تو۔ تو سر کا سائیں کیسے ہوگیا۔ ایسے مردوں کو تو چوک پہ لٹکا کر مٹی کا تیل لگا کر آگ لگا دینی چاہیے جو کھائیں بھی بیوی کا اور پھر ماریں بھی اسے۔" انداز ایسا تھا جیسے ابھی جاکر اس کے شوہر کو پکڑ کر اپنی خواہش پہ عمل بھی کرلے گی۔

"نہ بی بی نہ۔ جیسا بھی ہے مرد ہے میرا۔ شان ہے میری۔ اس کی وجہ سے کوئی بری نظر نہیں ڈال سکتا یہ کیا کم ہے میرے لیے۔" وہ ذرا شرماتے ہوئے بولی۔

حیا کا منہ کھلا رہ گیا۔ یہ بھلا شکر کی کون سی ڈگری تھی جو اس قدر دکھ اٹھانے کے بعد بھی وہ عورت اپنے شوہر کے گن گا رہی تھی۔

"صرف جہالت۔" اس نے اگلے ہی پل دل ہی دل میں خود کو جیسے باور کرایا۔

"اچھا تمہارے بچے ہیں؟" حیا کو اصل سوال یاد آیا۔

"ہاں بی بی جی۔ اللہ رکھے چار بچے ہیں میرے۔ دو بیٹیاں، دو بیٹے۔" وہ خوشی خوشی بتانے لگی۔

"اچھا۔ پہلا بچہ کتنی عمر کا ہے۔ میرا مطلب ہے شادی کے کتنے عرصے بعد پیدا ہوا؟" اس نے سوال کیا پھر فوراً" ہی سوال کی تصحیح بھی کردیں۔

"سال بھی نہیں ہوا تھا کہ میرا شیدا پیدا ہوا تھا۔ تب ہی تو اس کے باپ نے خوش ہو کر اس کا نام رشید رکھا تھا۔" وہ شرمائی اور حیا کا دل غم سے ڈوبنے لگا۔

"اس کا مطلب میرا اندیشہ بالکل ٹھیک ہے۔ میں اب کبھی ماں نہیں بن سکتی۔" وہ آنسو بہانے لگی۔

"اللہ نہ کرے بی بی۔ یہ تو اللہ کے کام ہیں کسی کو جلدی نواز دے کسی کو دیر سے اور کسی کو محروم ہی....."

وہ تیزی میں بولتی منہ پہ ہاتھ رکھ گئی۔

"جاؤ تم۔" اس کی امیدیں دم توڑنے لگیں۔ اندھیرے پھر اسے گھیرنے لگے تھے۔

"ویسے بی بی جی۔ ایک بات بتاؤں۔ اگر آپ کہیں تو میں آپ کو ایک عامل کے پاس لے جاسکتی ہوں۔"

"کیا مطلب؟" حیا نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

"بی بی جی۔ وہ آپ کو ایسا تعویذ یا عمل دے گا کہ آپ منٹوں میں ٹھیک ہوجاؤ گی اور آپ کی ساری مشکل دور....." وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اسے رازداری سے بتانے لگی۔

"سچ میں؟" حیا ساری اداسی بھول کے چہک اٹھی۔

"ہاں بی بی جی۔ بس ذرا ہدیہ زیادہ لیتے ہیں، مگر کام بھی تو بہت مشکل ہے۔" رشیدہ کی بات پہ وہ سر ہلا گئی۔

"ٹھیک ہے۔ پیسے کی کوئی بات نہیں۔ بس تم کل ہی مجھے لے جانا میں مجاہد سے شاپنگ کا بہانہ کرلوں گی۔" اس نے فوراً" سو سو کے دو نوٹ نکال کر رشیدہ کو تھمائے۔ وہ خوشی خوشی گلاس اٹھا کر باہر نکل گئی۔ حیا دیر تک عامل کے بارے میں سوچتی رہی۔

☆ ☆ ☆

ان کے گھٹنے میں کل سے درد تھا۔ ہلدی اور سرسوں کے تیل کی مالش کرنے کے لیے وہ کچن میں ہلدی ہی ڈھونڈ رہی تھیں کہ اوپر کے ایک کیبن سے نکلتے سرخ کپڑے میں لپٹی اس ہڈی نے انہیں دہلا کر رکھ دیا تھا۔ ہڈی کسی جانور کی تھی اور اس پر نہ جانے کیا کچھ لکھا گیا تھا نیل پالش سے۔ زبان بھی انوکھی تھی اور ہڈی کو خاصا تراش خراش کر اس پر لکھا گیا تھا۔

"یا اللہ۔ میرے بچوں پہ یہ کالا جادو کون کر رہا ہے؟ مجھے ابھی مجاہد کو یہ سب بتانا پڑے گا۔ مجھے تو اسی رشیدہ کی کارستانی لگتی ہے۔" ان کا خیال فوراً" کالے جادو کی طرف گیا تھا۔ دل ہول اٹھا تھا۔ وہ تیزی سے حیا کے کمرے میں آئی تھیں۔

"کیا ہوا دادی۔ آپ ٹھیک تو ہیں؟" مجاہد مصطفیٰ جو گود میں رکھے لیپ ٹاپ پہ مصروف تھا۔ ان کی طرف متوجہ ہوا تو ان کا زرد پڑتا چہرہ دیکھ کر فوراً" ان کی طرف لپکا۔

"یہ دیکھو مجاہد بیٹا۔ مجھے کیا ملا کچن سے؟" انہوں نے وہ سرخ کپڑا اور ہڈی اس طرح اسے دکھائی کہ وہ چھو نہ لے۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے حیرت سے کہتے ہوئے ہاتھ بڑھایا۔ دادی نے فوراً" اسے روک دیا۔

"ہاتھ مت لگانا۔ یہ دیکھو۔ یہ کالے جادو کا سامان لگتا ہے بلکہ ہے بیٹا۔" انہوں نے اسے محتاط کرتے ہوئے اپنا اندازہ بھی بتایا۔ مجاہد نے غور سے پہلے اس لال کپڑے کو پھر اس ہڈی کو دیکھا۔ وہ بھی تاسف سے سر ہلانے لگا۔

"واقعی یہ سب ہے تو عجیب۔ پتا نہیں کیا ہے یہ سب؟" وہ شاکڈ تھا۔

"یہ لیں پانی۔ کیا ہوا دادی کو۔" تب ہی حیا اندر آئی اور اگلے ہی پل وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ دادی کے ہاتھ میں وہ سب سامان دیکھ کر اسے شدید شاک لگا تھا۔ اس نے تیزی سے گلاس سائیڈ ٹیبل پہ رکھا اور آگے بڑھ کر وہ سب سامان دادی سے جھپٹ لیا۔ وہ ہائے ہائے کرتی رہ گئیں۔

"یہ کہاں سے ملا آپ کو؟" وہ حیران تھی یا غصے میں۔ وہ دونوں ہی نہیں سمجھ پائے تھے۔

"کچن سے بیٹا۔ وہ میں ہلدی ڈھونڈ رہی۔۔۔"

"کیا مسئلہ ہے آپ کو دادی۔" حیا نے تیز لہجے میں ان کی بات کاٹ دی تھی۔

"ہر جگہ پہنچ جاتی ہیں آپ۔ اب کہاں چھپا کر رکھا تھا میں نے یہ سب کہ کسی کی نظر میں نہ آئے، مگر آپ وہاں تک بھی جا پہنچیں۔ سارے عمل کا بیڑہ غرق کر دیا آپ نے۔" دادی تو کچھ بول ہی نہ سکیں اور مجاہد مصطفیٰ ایک پل میں اصل بات تک پہنچا تھا۔

وہ دادی کی طرف مڑی۔

"آپ نے دادی سارے عمل کا ستیاناس کر دیا۔ میں نے آپ کو اگر اپنے ساتھ رکھا ہے تو صرف آپ کے خیال سے، مگر اس کا مطلب یہ نہیں دادی کہ آپ ہمارے گھر کی ہر بات میں دخل اندازی کریں۔ اتنا بڑا نقصان ہو گیا آپ کی وجہ سے۔" وہ کیا بول رہی تھی۔ دادی کے کان تو بس سائیں سائیں کر رہے تھے۔ انہیں لگا کسی نے انہیں ساتویں آسمان سے پاتال میں پھینک دیا۔

"حیا بس۔" مجاہد کا ہاتھ اٹھ گیا تھا، مگر وہ اعصابی طور پر بے حد مضبوط مرد تھا۔ اسے خود پر قابو پانا آتا تھا۔ تب ہی اس نے اپنا ہاتھ ہوا میں ہی روک لیا تھا، مگر ضبط سے وہ نچلا لب کچلنے لگا تھا۔

"آپ ان کی وجہ سے ماریں گے مجھے۔ جنہوں نے میرا کام بگاڑ دیا۔" وہ رونے لگی تھی۔

"میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔" وہ چلا کر کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکلنے لگی کہ مجاہد نے اس کا ہاتھ پکڑ اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

"تم شاید مجھے معاف کر دو حیا، مگر اس بات کے لیے میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔" تلخی سے کہتے ہوئے اس نے ایک جھٹکے سے حیا کو چھوڑا تھا۔ وہ گرتے گرتے سنبھلی اور روتی ہوئی باہر بھاگ گئی۔

"دادی۔۔۔" وہ بمشکل بول پایا۔

"میں نماز پڑھ لوں مجاہد بیٹا۔" انہوں نے ململ کے

سفید نرم دوپٹے سے اپنا چہرہ صاف کیا۔ "مجھے دعا کرنی ہے" وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ مجاہد بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا دعا کرنی ہے دادی؟"

"اللہ میری حیا کو ہدایت دے۔ آمین۔" مجاہد کے دل کا یقین پختہ ہوا تھا۔ اس نے دھیرے سے دادی کا ہاتھ پکڑا اور ان کو ساتھ لیے ان کے کمرے کی طرف چل دیا۔

☆ ☆ ☆
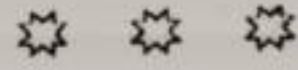
"یہ میرے کمرے کی ٹیرس ہے اور اس سے مجھے وہ دور والی چھوٹی سی سرسبز پہاڑی نظر آتی ہے، جو ہمیشہ ہی مجھے اس طرح سحرزدہ کرتی ہے جیسے واقعی وہ کوئی عام پہاڑی نہ ہو بلکہ کوہ قاف کی سرحدی پہاڑی ہو۔ میرا یہ گھر شہر سے کافی دور نہایت پرسکون جگہ پہ واقع ہے۔ تب ہی یہاں عام شہروں کی طرح صرف صبح سویرے ہی نہیں بلکہ ہر وقت تازہ ہوا میسر ہوتی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ابھی تک یہ علاقہ صنعت کاروں کی نگاہوں سے اوجھل رہا ہے۔"

میں حیا تنزیل، تب ہی گھنٹوں یہاں کھڑے رہ کر صرف اس سحرانگیز منظر کو دیکھ کر ہی کتنی دیر تک مسحور رہتی ہوں۔

یہ میرا اسلام آباد والا گھر ہے جہاں میں نے بارہ ماہ گزارے ہیں۔ میرے کوہاٹ والے گھر میں اور اس گھر میں تھوڑا سا ہی فرق ہے، وہاں گھر کے تین اطراف دوسرے گھروں کی دیواریں آپس میں جڑی ہیں اور یہ سلسلہ کافی دور تک گیا ہے۔ گلی جو گھر تک جاتی ہے وہ اس قدر تنگ ہے کہ وہاں موٹر سائیکل بھی کوئی لے جائے تو خود کو دس بار کوسے اور یہ گھر، تین اطراف سے سرسبز پلاٹس میں گھرا بڑا سا شاندار بنگلہ جہاں سب کچھ ہے اور چوڑی پختہ سڑک کہ تین تین گاڑیاں بھی ایک ساتھ آرام سے گزر جائیں۔

لیکن پھر بھی یہ گھر برا ہے، کیوں کہ یہاں مجاہد مصطفیٰ ہے اور وہ گھر اچھا تھا کہ وہاں مجاہد مصطفیٰ نہیں تھا۔ آئی ہیٹ یو مجاہد۔ پکے والی ہیٹ یو۔

وہ سخت خفا تھی سب سے خفا تھی۔ یہاں تک کہ خود سے بھی۔ کیوں وہ سب کو اپنا سمجھ کر اپنے سارے خواب تھماتی رہی۔ آج تک خوشی کا ہر گزرا لمحہ اسے ایک اذیت ناک یاد کی طرح لگ رہا تھا۔

"دادی میں آپ کو بھی کبھی معاف نہیں کروں گی کبھی بھی نہیں۔" اس نے ہاتھ کی پشت سے سختی سے آنکھیں رگڑیں تھیں۔

دور پہاڑی پہ ایک درخت سے ٹیک لگائے مجاہد مصطفیٰ نے بھی اپنے گھر کو دیکھتے ہوئے ٹھنڈی سانس بھری تھی۔ لمبی سانس کھینچتے ہوئے اس نے سیٹی کے انداز میں لب سکیڑے جیسے خود کو کچھ نارمل کیا اور پتلی سی پگڈنڈی سے اتر کر نیچے گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

☆ ☆ ☆

"سنیں۔ یہاں ایک عامل ہوا کرتے تھے۔ وہ بابا آج کل کہیں اور بیٹھتے ہیں کیا؟" رشیدہ نے بتائے بغیر ہی نوکری چھوڑ دی تھی۔ دو تین دن اس نے رشیدہ کا انتظار کیا پھر مایوس ہو کر خود وہاں چلی آئی تھی، لیکن وہاں اس چھوٹے سے دکان نما کمرے پہ تالا لگا دیکھ کر اسے سخت مایوس ہوئی تھی۔

اس دن کے بعد دادی اپنے کمرے تک محدود ہو کے رہ گئی تھیں اور اچھا ہی تھا کیوں کہ وہ خود بھی ان کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی اور یہ شرمندگی نہیں بلکہ اس کی انا اور ناراضی تھی۔ وہ ابھی تک ان دونوں سے بے حد ناراض تھی۔ اس دن کے بعد سے مجاہد کے ساتھ بھی اس کی بول چال بند تھی۔ مجاہد نے اسے منانا تو دور کی بات معذرت تک کرنا گوارا نہ کیا تھا اور یہ بات اسے مزید مایوس کر رہی تھی۔ ایسے میں اسے صرف وہ بابا ہی یاد رہے۔ "وہ ہی اس کے لیے کچھ کر سکتے ہیں اب۔" سوچتے ہوئے وہ فوراً وہاں چلی آئی تھی، مگر اب اسے لگا اس کا دل بند ہونے لگا تھا۔ تب وہ ہی سامنے والی دکان کے دکاندار سے اس کی بابت پوچھنے لگی۔

"وہ کالے گیٹ والی دکان۔" اس نے ہاتھ سے

اشارہ کیا۔ حیا نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ایک نمبر کے فراڈیے تھے وہ باجی۔ میاں بیوی دونوں ہی ٹھگ تھے۔ بیوی لوگوں کے گھر کام کرنے کے بہانے جاتی اور گھریلو جھگڑوں کا فائدہ اٹھا کر ان کو یہاں اپنے شوہر کے پاس لے آتی۔ دونوں ہاتھوں سے ان بے چاروں کو لوٹتے تھے۔ یہ تو کچھ دن پہلے میڈیا کے لوگوں نے ان کا سارا پردہ فاش کر دیا' دونوں جیل میں ہیں اب۔" اس نے ایک ہی سانس میں ساری بات بتادی اور ایک گاہک کے ساتھ مصروف ہو گیا۔

حیا کا تو سر چکرانے لگا اتنا بڑا دھوکا۔ وہ تو پورے دل سے اس آدمی پہ یقین کرتی تھی۔ اسے اتنے بڑے جھوٹ پہ یقین ہی نہیں آرہا تھا۔

وہ دودھ پیتی بچی نہ تھی کہ اپنا نقصان نہ سمجھ سکتی۔ عقل پر پردے ضرور تھے مگر جب ٹھوکر لگتی ہے نا تو ہر پردہ کھسک جاتا ہے۔ روشنی تو روشنی اندھیرے میں بھی راہیں دکھائی دینے لگتی ہیں۔

وہ مرے مرے قدموں سے سڑک پہ آئی۔ اور فٹ پاتھ پہ ٹھہر گئی۔ ایک ٹیکسی اس کے قریب آکر رکی۔ تو وہ چونکی۔

"کسی عالم کو جانتے ہو۔" اس نے کھڑکی میں سے جھانک کر پوچھا۔ ڈرائیور کو وہ کوئی پاگل عورت لگی۔

"کیا مطلب؟" بغور اس کے حلیے کو دیکھتا وہ حیرانی سے بولا تھا۔

"کہاں جانا ہے آپ..... آپ کی طبیعت ٹھیک ہے۔" ادھیڑ عمر کا وہ شخص چاہ کر بھی اسے نظر انداز کر کے گاڑی آگے نہ بڑھا سکا۔

"مجھے کسی بزرگ کے مزار پہ جانا ہے۔ مجھے سکون تلاش کرنا ہے۔" اور پل بھر میں ساری بات اس آدمی پہ کھل گئی۔

"آئیں بیٹا۔ بیٹھ جائیں میں چھوڑ دیتا ہے۔" انہوں نے پیچھے والا دروازہ کھول دیا تھا۔ حیا کے سیٹ سنبھالتے ہی اس نے گاڑی آگے بڑھادی تھی۔

☼ ☼ ☼
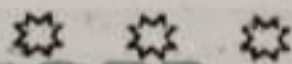
کسی بزرگ کا مزار تھا جہاں اس ڈرائیور نے گاڑی روکی تھی۔ حیا نے اس کے مطلوبہ پیسے دیے اور نیچے اتر آئی۔

"ایک بات سنتی جاؤ بیٹا۔" وہ آگے بڑھنے لگی تھی۔ اس آدمی کی آواز پہ رک کر اسے دیکھنے لگی۔

"تمہاری مدد صرف اللہ کر سکتا ہے۔ یہاں وہاں صرف وقت ضائع کرو گی۔" کہہ کر ہی اس نے گاڑی آگے بڑھادی تھی۔ حیا اس کے لفظوں کو سوچتی رہی۔ جب کچھ سمجھ ہی نہ آیا تو آگے بڑھ گئی۔

بند ہوتے دل کے ساتھ اس نے مزار کے سفید ماربل کے ٹھنڈے فرش پہ قدم دھرے۔ سامنے ہی برگد کے درخت کے نیچے ایک عورت پھٹے پرانے کپڑے پہنے سر دھن رہی تھی۔

"مائی یہ پیسے رکھ لو اور میرے لیے دعا کرنا مائی۔" اس نے پیسے زمین پر ڈال کر کہا۔ وہ عورت ویسی ہی بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ حیا کچھ دیر اس کے جواب کا انتظار کرتی رہی۔ پھر خود ہی بول پڑی۔

"مائی۔ مجھے کوئی تعویذ دے دو۔ کوئی عمل کہ میری ہر مشکل آسان ہو جائے۔" اب کی بار اس کی آواز میں منت تھی کرب تھا' وہ مایوسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ آگے بڑھنے لگی کہ اس عورت نے اچانک ہی اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ گھبرا ہی گئی۔

"بیٹھ جا۔" اس کی آواز کسی مرد کی طرح بھاری تھی۔ وہ حیران تھی۔ پھر بھی اس نے اس عورت کی بات مان لی تھی۔

"پیسے اٹھا لے اپنے۔" ایک اور حکم اور حیا نے اٹھا بھی لیے۔ اتنا تو وہ اسے دیکھتے ہی جان گئی تھی کہ اسے اس مال و دولت کی کوئی چاہ نہ تھی۔

"اب بول کیا چاہیے تجھے۔" سرتاپا اس کا جائزہ لیتے ہوئے وہ بولی تھی۔

"میری کوئی دعا پوری نہیں ہوتی' کوئی خواہش مکمل نہیں ہوتی۔" وہ اداسی سے بولی۔

"کون سی خواہش؟" عورت اس کی طرف متوجہ تھی اس کی بھرپور توجہ کو حیا نے بھی محسوس کیا۔ تب ہی حیا نے اسے سب بتانا ہی بہتر سمجھا۔

اس کی مکمل کتھا سننے پہ اس عورت نے ٹھنڈی سانس بھری۔ حیا کو اس کی نگاہوں میں اپنے لیے رحم محسوس ہوا۔ ترس کھاتی نگاہیں۔ وہ نظریں چرا گئی۔

"تیرے من کو خواہشوں کی دیمک لگ گئی ہے۔"

کافی دیر بعد وہ بولی تھی اور حیا چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"کیا مطلب مائی؟"

"تجھے دنیا کی بھوک لگ گئی۔ پیٹ کی بھوک کا علاج ہے پر روح کی بھوک کا نہیں۔ تب ہی تو کبھی سیر نہیں ہو پاتی۔ اور تجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ تو نے خود اس کو بڑھاوا دیا۔ تو چاہتی تو اس کو روک سکتی تھی اس کا گلا گھونٹ سکتی تھی۔ پر نہ تو نے تو ناشکری سے اس کی بھوک اور بڑھا دی۔

صبر کر۔ شکر کر۔ جا اپنے رب سے مانگ 'اللہ کا ذکر کر۔

اللہ کا ذکر نہ ہو تو روح پہ تالے لگ جاتے ہیں۔ جہاں اللہ کی یاد نہ ہو ایسے دل اندھیروں میں ڈوب جاتے ہیں۔ جا جلدی جا۔" اس نے زمین پر گرا حیا کا بڑا سا دوپٹا اٹھا کر اس کے ہاتھوں میں دیا۔

☼ ☼ ☼

"روح کی بھوک۔" بار بار ذہن میں کہرام مچا رکھا تھا ان لفظوں نے۔

"اس بھوک سے تیری روح مر گئی نا تو یوں ہی بندوں کے در پہ ماتھا رگڑتی مر جائے گی تو بھی۔" اس کے دل میں درد سا اٹھا۔

"ساری عمر دوسروں کی چیزیں دیکھ کر منہ سے پانی گراتی' زبان پھیرتے گزار دے گی۔" گھر پہنچ کر وہ تیزی سے اپنے کمرے میں آئی اور باتھ روم میں خود کو بند کر کے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"تیرے من کو خواہشوں کی دیمک لگ گئی۔"

"جہاں اللہ کی یاد نہ ہو ایسے دل اندھیرے میں ڈوب جاتے ہیں۔"

تو کیا وہ غلط تھی۔ کیا کچھ نہیں تھا اس کے پاس۔

کل بھی جو تھا اچھا تھا اور آج جو بھی تھا بہترین تھا۔
آگہی لاکھ بہتر سہی مگر بے حد دردناک ہوتی ہے۔
حیا بھی جان گئی تھی۔ اپنے نفس کی غلام بن کر اس نے اپنے رب کی عظمتوں سے انکار کیا اور نفس کی اس غلامی نے اسے اس قدر اندھا کر دیا کہ وہ شرک کرنے پہ تل گئی تھی۔
"حیا۔" دادی نے گھبراہٹ بھرے لہجے میں اسے پکارا۔ شرمندگی نے ایک اور روپ دھارا اور اسے سر تاپا فتح کر لیا کہ وہ صرف شرمندہ ہی ہو سکتی تھی۔
"حیا۔ خدا کے لیے بیٹا دروازہ کھولو۔ تم ٹھیک تو ہو۔" وہ پریشان تھیں۔ ہمیشہ کی طرح آج پھر وہ اس کی وجہ سے پریشان ہو رہی تھیں اس سے برداشت نہ ہوا۔ اس نے تیزی سے دروازہ کھولا اور دادی سے لپٹ گئی۔ یوں زاروقطار روتا دیکھ کر ان کا دل بیٹھنے لگا۔
"حیا کیا ہو گیا؟ سب ٹھیک تو ہے نا میرے بچے۔" اسے ساتھ لگائے وہ بیڈ پہ لے آئیں۔ حیا اسی طرح زاروقطار روتی رہی۔
"حیا مجھے بتاؤ۔ کیا ہوا ہے؟" اور اس نے دادی کو مزار والا واقعہ تفصیل سے سنا دیا۔ ہچکیاں لیتی، سسکتی حیا بالکل بچوں کی طرح لگ رہی تھی ان کو۔
"وہ ٹھیک کہہ رہی تھی حیا۔ اللہ تو ہمیں بے حساب نوازتا ہے۔ یہ ہم ہی ہیں جو راضی نہیں ہوتے۔ شکر نہیں کرتے۔ مگر چاہتے ہیں کہ بس جو بھی ہم خواہش کریں۔ ہمیں مل جائے۔
حیا۔ تمہارا قصور پتا ہے کیا ہے۔ خواہش کرنا قصور نہیں۔ خواہشوں کو سب کچھ مان لینا ہی تمہارا اصل قصور ہے۔ خواہش بس زندگی کا ایک چھوٹا سا جزو ہیں، مگر تم نے خواہشوں کو ہی زندگی مان لیا اور خواہشیں انسان کو نفس کا غلام بنا دیتی ہیں بیٹا۔ پھر انسان کو غلط بھی صحیح لگنے لگتا ہے۔"
"مجھے نہ جانے کیوں ہمیشہ سب کم ہی لگتا دادی۔ میرا دل کبھی خوش ہی نہ ہوا۔" بھیگی آنکھوں سے دادی کو دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔
"اللہ کی ذات پہ یقین رکھنے والا اندھیرے میں بھی راستہ تلاش کر ہی لیتا ہے۔ ورنہ پھر اسے مایوسیوں کا اندھیرا گھیر لیتا ہے۔ اگر اس کا یقین خدا سے ہٹ جائے اور وہ اس کی جگہ دوسروں کا در کھٹکھٹانے لگے تب ہی تو مایوسی کو کفر کہا گیا ہے۔" دادی نے محبت سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے سمجھایا۔
"آئم سوری دادی۔ میں نے اپنے غلط عقائد کے لیے آپ کو بھی اتنا ہرٹ کیا۔ ورنہ رئیلی میں تو آپ کو ناراض کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔" اس کی خوب صورت براؤن آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔
"نہ میری جان۔ تم تو میری حیا ہو۔ تم سے بھلا میں کبھی ناراض ہو سکتی ہوں۔ اچھا اب میں ذرا نماز پڑھ لوں۔ تم بھی اللہ سے معافی مانگو اور ہر طرح کے وسوسے سے جان چھڑاؤ۔ ٹھیک ہے۔" وہ سر ہلا گئی۔
اور پھر اپنے رب کے سامنے جھکتے ہوئے اس نے جانا تھا کہ واقعی اس کے ذکر میں سکون اور اطمینان قلب ہے۔

☼ ☼ ☼

اس بار بہار نے عجب ہی رنگ سے آمد دکھائی تھی۔

لیکن اس بار حیا تنہا اداس تھی، بہار کے لیے دروازے اس نے خود بند کیے تھے۔ مجاہد مصطفیٰ جیسے کیئرنگ اور محبت کرنے والے شوہر کو اس نے خود ناراض کیا تھا اور اب منانے میں اسے بے حد مشکل محسوس ہو رہی تھی۔ ہر دفعہ حیا کی طرف سے ہونے والی لڑائی کو بھی خود ختم کرنے والا مجاہد مصطفیٰ اس بار جیسے کوئی رعایت دینے پہ راضی نہ تھا۔
آج وہ گھر پر تھا اور پچھلے کئی دنوں کی طرح آج بھی حیا کو نظر انداز کرنے کے لیے اس نے پائیں باغ میں پناہ لی تھی۔ حیا آج دل سے تیار ہوئی تھی۔ اس نے پنک کلر کے سوٹ کے ساتھ میچنگ دوپٹا اور جیولری پہنی۔ سلیقے سے ہلکا سا میک اپ کیا اور ڈائری اٹھا کر باہر آ گئی۔ اسے جو کچھ بھی بولنا تھا وہ پہلے سے ڈائری میں نوٹ کر چکی تھی۔ مجاہد مصطفیٰ اس کی توقع کے

عین مطابق گلاب کی کیاری کے پاس کھڑا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اس سے کچھ فاصلے پہ لیموں کے ننھے سے پودے کے ساتھ آٹھہری۔

"اتنے پیارے موسم میں تو ڈائری پڑھنے کا مزا ہی کچھ اور ہے؟" حیا کی چہکتی آواز پہ وہ چونکا تھا۔ نگاہ حیا پہ گئی اور تھم گئی۔ حیا نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا' وہ جھٹ سے نظریں بدل گیا اور موبائل نکال لیا۔

"ایک دوسرے کی خواہشات کا احترام کرنا ہر رشتے کی خوب صورتی ہے۔ واہ کیا زبردست قول ہے۔" اونچا لہجہ۔ جتاتا لہجہ۔ مجاہد مصطفیٰ نہ سمجھ نہیں تھا۔

"خواہشات کبھی کبھی تعلقات بگاڑنے کا اہم سبب ہوتی ہیں کیوں کہ یہ توقعات بڑھاتی ہیں اور توقعات پہ پورا اترنا انسان کے اختیار میں نہیں۔" مجاہد مصطفیٰ نے جس خوب صورتی سے جواب دیا تھا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

"انا وہ کیل ہے جو رشتوں کی دیوار میں مکمل دراڑ ڈالنے کی اہلیت رکھتی ہے۔"

"کیا بات ہے لکھنے والی کی۔" اس نے داد دیتے ہوئے کہا۔ نظریں البتہ اب بھی خفا خفا سے مجاہد مصطفیٰ پہ جمی تھیں۔

"رشتوں میں انا کو ختم کرنا چاہیے عزت نفس کو نہیں' کیوں کہ تب انسان خود بھی مکمل نہیں رہتا۔ ادھورا ہو جاتا ہے۔ زبردست پیغام۔" وہ موبائل سے کھیلتے ہوئے بولا۔ حیا کو یہ سب بے کار لگا اس نے آگے بڑھ کر ایک تازہ گلاب توڑا۔

"اسلام آباد کے گلاب مجھے بے حد پسند ہیں۔" وہ اس بار قطعی صرف خود سے بولی تھی۔

"اور مجھے تم۔" مجاہد مصطفیٰ کا شریر لہجہ اسے بری طرح چونکا گیا۔

"آپ۔ ابھی آپ بولے۔" وہ شاکڈ تھی۔

"جی۔ کوئی شک؟" وہ مسکرایا۔

"تو کیا آپ ناراض نہیں؟" وہ ابھی تک غصے میں تھی۔

"کبھی ناراض ہوا ہوں جواب ہوں گا۔" اس نے مسکراتے ہوئے حیا کے ہاتھ تھامے۔

"دیکھو تو بہار کس قدر خوب صورت رنگ لائی ہے اس بار۔" اس نے حیا کا ہاتھ تھام کر اسے ایک کٹے درخت کے چوڑے سے تنے پہ چڑھنے میں مدد کی تھی اور وہاں چڑھ کر چاروں طرف بکھری خوب صورتی کھکھلاتی دلکشی دیکھ کر وہ بھی حیران رہ گئی تھی۔ وہ اس سے ذرا نیچے کھڑا تھا۔

"زندگی کا ہر دن بہار سے عبارت ہے حیا۔ بس یہ ہمارے بس میں ہے کہ انہیں تلاش کریں۔ محسوس کریں۔ خوشیاں بہت ہیں' مگر یا تو ہمیں ان کا شعور نہیں ہوتا یا ہم انہیں مختصر جان کر نظرانداز کر دیتے ہیں۔" مجاہد نے اس ہاتھ پہ گرفت مضبوط کی۔

"واقعی مجاہد۔ آج مجھے بھی یہی محسوس ہو رہا ہے کہ بہار ہمیشہ سے میری دسترس میں رکھی تھی قدرت نے۔ بس مجھے ہی اس کا شعور نہیں اور آج جب اپنے رب کی نعمتوں اور رحمتوں کو پرکھا ہے تو احساس ہوا ہے کہ میں نے خود کو کئی خوشیوں سے محروم رکھا۔" وہ اداسی سے مسکرائی۔

اور واقعی یہ سچ ہے کہ خوشیوں کی گنتی ہماری زندگی میں غموں کے دورانیے سے کہیں زیادہ ہے' مگر پت جھڑ کے گرتے پتوں اور زرد موسم کے بعد نئی زندگی اور بہار کی دستک صرف وہی سن سکتے ہیں جنہیں اللہ پہ یقین ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کو بہاروں کی نوید ملتے دیر نہیں لگتی پھر۔

✡ ✡

طوبیٰ احسن

میرا گھر۔ گھر کا تصور کریں تو کیا خیال دل میں آتا ہے کہ گھر کیسا ہونا چاہیے۔ صاف ستھرا، سجا ہوا، خوب صورت، لیکن گھر کے لوگوں کے دل جڑے ہوئے نہ ہوں تو گھر مکان بن جاتا ہے۔ جس میں افراد ایک دوسرے سے اجنبی ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کی ضروریات اور احساسات سے بے نیاز میرا گھر مکان کب بنا۔ جب میں نے گھر کے باہر کے افراد کو گھر میں دخل اندازی کی اجازت دی۔ میں اپنے ذہن سے سوچنے کے بجائے دوسروں کے ذہن سے سوچنے لگی۔

کل عجیب واقعہ ہوا، کل ہمارے ہاں دو خواتین آئیں، انہوں نے جب امی جان سے یہ سوال کیا "کہ آپ کی بیٹی کی طلاق کیوں ہوئی؟" تو میری تو عجیب حالت ہو گئی۔ ہاتھ لرزنے لگے، ٹانگیں کانپنے لگیں اور دل زور، زور سے دھڑکنے لگا، آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔

میں بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سمیٹ سمیٹ کر باہر لائی، مجھ کو امی جان کی آواز آرہی تھی، پتا نہیں انہوں نے ان خواتین کو کس طرح جواب دیا ہوگا۔ پتا نہیں یہ کون عورتیں ہیں اور ان کو کیا تکلیف ہے جو کہ ایک بند باب کو کھول کر ہمیں تکلیف دے رہی ہیں۔ "میں نے آزردگی سے سوچا۔

اس دن امی جان کے گھر میں اندھیرا چھایا رہا لائٹ بھی چلی گئی اور کھانا بھی نہ بن سکا۔ میں اس گھر کو اب اپنا گھر نہیں کہتی۔ حالانکہ اب تو میں دو سال سے مستقل اس گھر میں قیام پذیر ہوں، لیکن یہ گھر میرا تو نہیں، یہ تو امی جان اور سعدیہ کا گھر ہے، میرا کہاں۔

سب چپ چاپ اپنے بستر پر دراز اپنے اپنے زخم کریدتے رہے۔ خاموشی طاری رہی، سعدیہ بھی اپنی امی کے ہاں گئی ہوئی تھیں۔ لہٰذا اور بھی سناٹا ہو گیا تھا۔

کتنا وقت گزر گیا۔ میں انگلیوں میں حساب لگا رہی ہوں۔ دو سال، تین ماہ اور پندرہ دن ہو گئے ہیں۔ میری اور خالد کی علیحدگی میں غلطی کس کی تھی۔ کون قصوروار تھا۔ یہ مجھ سے زیادہ کون جانے گا، کیوں نا میں آپ کو شروع سے ساری داستان سناؤں۔

مجھے امی جان کی شام کی گفتگو یاد آنے لگی۔ "اس میں کیوں کا کیا سوال" انہوں نے کسی قدر تلخ اور کڑوے لہجے میں کہا۔ "طلاق ہونی تھی، ہو گئی، اس میں کیوں کا کیا سوال۔"

"دراصل۔۔۔" اجنبی خاتون گھبرا سی گئیں۔

"ہماری بیٹی کا رشتہ آیا ہوا ہے خالد سے، ہم تحقیق کر رہے ہیں، بڑی دور سے آئے ہیں، بڑی مشکل سے آپ کا گھر ملا ہے، ہم جاننا چاہ رہے تھے کہ آپ کی بیٹی کے گھر ٹوٹنے کا کیا سبب تھا، ہم اپنی بیٹی کی یہاں شادی کریں یا نہ کریں۔" خاتون بڑی لجاجت سے گفتگو کر رہی تھیں۔

یوں مجھے پتا چلا کہ خالد دوسری شادی کر رہا ہے۔ حالانکہ مجھے خالد سے ذرہ برابر بھی محبت نہیں، لیکن پھر بھی اس کی دوسری شادی کا سن کر دل عجیب سی تکلیف اور اذیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ میں اپنے آپ کو تنبیہ کرتی ہوں۔ مجھے اس سے کیا۔ لیکن۔

✡ ✡ ✡

شادی کو ایک ہفتہ ہی ہوا تھا۔ عالیہ آج اپنی امی کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ ہر ماں کی طرح رخشندہ بیگم بھی "سب اچھا ہے" یہی جملہ سننے کی متمنی تھیں۔ حال

احوال پوچھا ہی تھا کہ عالیہ پھٹ پڑی۔

"نہ جانے کن عجیب و غریب خاندان میں مجھے پھنسا دیا ہے' اس سے تو اچھا تھا کہ میری شادی ہی نہ ہوتی۔" درخشندہ بیگم تو حواس باختہ ہو گئیں شادی کے تمام معاملات تو ٹھیک طرح انجام پائے تھے۔ کوئی بھی مسئلہ یا اختلاف رائے نہیں ہوا تھا پھر اب کیا ہوا؟

مہینے میں ایک بار اور کبھی دوبار عالیہ کی آمد ہوتی اور ہمیشہ ہی وہ اپنے میاں اور سسر سے شاکی دکھائی دیتی۔ ساس تو اس کی کئی سال پہلے انتقال کر چکی تھیں۔ اس کا شوہر خالد اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔

مسئلہ دراصل خالد کی تین پھوپھیاں تھیں' جو کہ خالد اس کی بیوی کے ہر معاملہ میں دخل اندازی کرنا اپنا فرض سمجھتی تھیں۔ ایک پھوپھی تو خالد کے گھر کے برابر میں ہی رہائش پذیر تھیں۔ بقیہ دو 'ایک' دو گلیاں چھوڑ کر رہتی تھیں لیکن روزانہ وہ خالد کے گھر میں شام میں آتی تھیں۔ عالیہ کے سسر اور شوہر شام تک کام سے واپس آجاتے تھے اور چائے کی محفل میں خوب ہلا گلا ہوتا' کبھی چھولے بنائے جاتے اور کبھی پکوڑے' کبھی پھوپھی جان بھی خود سینڈوچ وغیرہ بنا کر آتیں' کبھی بازار سے بیکری کا سامان آجاتا۔

چونکہ ان کے خیال میں عالیہ ابھی ناتجربہ کار اور نو آموز تھی۔ اسی لیے ہر بات سمجھانا اور ہر معاملے میں اپنی رائے دینا ضروری سمجھا جاتا۔ کس وقت کون سا جوڑا پہنا جائے۔ آج کیا پکے اور کس طرح پکایا جائے۔ دسترخوان پر اشیا کو کس طرح پیش کیا جائے۔ گھر کی صفائی ستھرائی' مہمانوں کی خاطر مدارت' محلے والوں کے ساتھ تعلقات غرض ہر معاملے میں ان کی بے جا مداخلت نے عالیہ کو بری طرح چڑا کر رکھ دیا تھا۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آچکی تھی کہ "جس کی ایک ساس نہیں ہوتی اس کی سو ساسیں ہوتی ہیں۔"

سونے پر سہاگا یہ کہ خالد اور ابا (سسر) بھی ان کی ہر بات کو درست سمجھتے اور آنکھ بند کرکے ہر بات پر عمل کرتے اور عالیہ سے بھی یہی توقع رکھی جاتی۔

"ایسا لگتا ہے جیسے ہم کٹھ پتلیاں ہیں۔" عالیہ چڑ کر کہتی۔ "جن کی ڈوریں آپ کی پھوپھو کے ہاتھ میں ہیں' وہ جس طرف اشارہ کرتی ہیں' ہم گھوم جاتے ہیں۔" خالد کو حیرانی ہوتی' وہ سمجھ نہیں پاتا تھا کہ عالیہ کس بات پر اتنی خفا ہو جاتی ہے۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا۔ عالیہ کے لیے دن بدن سمجھوتا کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ مسئلہ تو یہ تھا کہ وہ اب تک خالد کو ہی اپنا ہمنوا ہی نہ بنا پائی تھی۔ دراصل اس کی والدہ کے انتقال کے بعد اس کی پھوپھیوں نے ہر طرح سے خالد اور اس کے ابا کا خیال رکھا۔ اب عالیہ شادی کے بعد ان کو اس طرح سے سارے معاملات میں دخیل دیکھتی تو اس کو کتنا بھی برا لگے گا' لیکن خالد کے لیے یہ معمول کی بات تھی۔

آج تو حد ہی ہو گئی۔ آج عالیہ نے وہی بڑے بنائے اور چھولے ابالے' چھولے تھوڑے سخت رہ گئے۔ پھوپھی جان اس کو سمجھانے لگیں کہ چھولے کس طرح ابالے جاتے ہیں۔ عالیہ کو اچانک ہی اس زور کا غصہ آیا اور اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

"آپ کو اس سے کیا۔" اس نے بدتمیزی سے کہا۔ "کیا یہ آپ کا گھر ہے' آپ اپنے گھر کو کیوں نہیں سنبھالتیں۔ اگر آپ کو ہمارے گھر کی چیزیں پسند نہیں تو براہ مہربانی اپنے گھر تشریف لے جائیں۔" پھوپھی جان اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ان کو عالیہ سے اس بے مروتی کی امید نہ تھی۔ اپنی دانست میں وہ اس کی بھلائی کے لیے کہہ رہی تھیں۔ عالیہ کو اندازہ نہ تھا کہ خالد سب کچھ سن چکا ہے۔ یہ بات چیت باورچی خانے میں ہو رہی تھی اور خالد عالیہ سے کچھ لینے کے لیے آیا تھا۔ اس نے ساری بات سنی اور وہ شعلوں میں گھر گیا۔

پھوپھی جان آنکھوں میں آنسو لیے چپ چاپ گھر سے جانے کے لیے پر تول رہی تھیں کہ اس نے آگ بگولہ ہو کر کہا۔ "ٹھہریے پھوپھی جان۔ آپ نہیں جائیں گی۔ اب عالیہ کو ہی یہاں سے نکلنا ہوگا۔"

"ہاں ضرور۔" عالیہ غصے سے چیخی۔ "مجھے بھی تمہارے اس گھر میں رہنے کا کوئی شوق نہیں' جہاں ہر لمحہ میری توہین کی جاتی ہے اور مجھے ذلیل کیا جاتا ہے۔"

بات بڑھتی گئی۔ چیخ و پکار سن کر ابا بھی چلے آئے۔ وہ حیران ہو رہے تھے کہ نہ جانے پل بھر میں کیا ماجرا ہو گیا۔ باقی دونوں پھوپھیاں جو کہ ابا کے ساتھ اندر بیٹھی تھیں وہ بھی ہکا بکا تھیں۔ بات حد سے بڑھ گئی۔ عالیہ کے ترکی بہ ترکی جواب دینے پر خالد اس حد تک چراغ پا ہو گیا کہ اس نے عالیہ کو ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر نکالا اور دروازہ بند کر دیا۔ پھوپھی جان اور ابا روکتے ہی رہ گئے' لیکن نہ تو عالیہ بات سمجھ رہی تھی اور نہ ہی خالد افہام و تفہیم پر آمادہ تھا۔ پھوپھی جان اپنے آپ کو موردِ الزام ٹھہرا رہی تھیں کہ ان کی وجہ سے خالد اور اس کی بیوی کا جھگڑا ہوا۔

ابا' خالد کو پکڑ کر اندر لے گئے جو کہ غصے سے بالکل باؤلا ہو رہا تھا اور پھوپھی جان جلدی سے دروازہ کھول کر عالیہ کو آمادہ کرنے لگیں کہ وہ اندر آ جائے' لیکن عالیہ ان کا ہاتھ جھٹک کر وہاں سے روانہ ہو گئی اور پھوپھی جان دیکھتی کی دیکھتی رہ گئیں۔

جانے سے پہلے اس نے پھوپھی جان کی طرف رخ کر کے کہا۔ "آپ یہ ہی چاہتی تھیں نا کہ میرا گھر برباد ہو جائے۔ چلیے خوش ہو جائیے' آپ کی یہ خواہش پوری ہو گئی۔" پھوپھی جان دہل کر رہ گئیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ عالیہ ان سے اس حد تک بدگمان اور خفا ہو گی۔

☼ ☼ ☼

وہ رکشا پکڑ کر سیدھی اپنی امی کے ہاں جا پہنچی۔

"بالکل ٹھیک کیا تم نے۔" ساری بات سن کر امی جان نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔ "برداشت کی بھی حد ہوتی ہے۔ وہ سمجھتی کیا ہیں اپنے آپ کو' ہماری بیٹی کوئی لاوارث اور اکیلی ہے۔ میں تو یہ

ہی کہتی ہوں کہ یہ زمانہ صبر کا زمانہ نہیں' بلکہ ہر ایک کو منہ توڑ جواب دینا چاہیے۔ ظلم کو برداشت کرنے والا خود ظالم ہے۔"

"اب دیکھنا' جب تک خالد میاں خود تم سے معافی نہ مانگیں گے میں نہیں بھیجوں گی اور وہ ان کی پھوپھی جان۔" امی جان نے غصے میں دانت پیستے ہوئے کہا۔ "ان کو تو کان پکڑ کے اور ناک رگڑ کے معافی مانگنی ہو گی۔" امی جان کے نخوت سے کہنے پر عالیہ تو کھل ہی اٹھی۔

"شکریہ امی جان۔" وہ امی جان کے گلے لگ گئی۔ امی نے بھی اس کو اپنے سے چمٹا لیا۔ "دیکھو کیا حال بنا رکھا ہے تم نے اپنا' آنکھوں کے گرد حلقے ہو رہے ہیں' چہرے کا رنگ تو بالکل جھلس ہی گیا ہے' تم آرام سے رہو میں اس معاملے کو خود ہی سنبھال لوں گی۔" تین دن ہی گزرے تھے کہ خالد کا فون آیا تو امی جان نے اس کو خوب کھری کھری سنائیں۔

"تم تو جا کر اپنی پھوپھی کی گود میں بیٹھو' تمہیں عالیہ کی کیا ضرورت۔" ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ عالیہ کی طبیعت خراب ہو گئی۔ متلی اور الٹیاں' ڈاکٹر کے ہاں پہنچ کر اندازہ ہوا کہ نئے مہمان کی آمد آمد ہے۔ شادی کے ایک سال بعد خوش خبری سننے کو ملی تھی۔ عالیہ بے حد خوش تھی۔ امی جان نے اس کے سسرال فون کر کے ابا سے بات کی اور یہ خبر سنانے کے ساتھ ساتھ ان کو مزید سنائیں۔ نتیجتاً" ابا پھوپھی جان کے ہمراہ خود عالیہ کو لینے آئے۔ پھوپھی جان نے اس سے معافی مانگی تو امی جان اس کو بھیجنے پر راضی ہو گئیں۔

سسرال پہنچی تو خالد کا موڈ بگڑا ہوا تھا۔ عالیہ کو افسوس ہوا کہ وہ خوامخواہ آگئی۔ "تمہاری امی اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہیں۔" وہ خوب گرجا برسا۔

"خبردار۔" عالیہ چیخی۔ "میری امی جان کو کچھ مت کہنا۔"

"ہاں۔" وہ جاہل عورتوں کی طرح ہاتھ نچا نچا کر بول رہا تھا۔ "تمہاری امی جان میں تو ہیرے جڑے ہوئے ہیں اور ہمارے ہاں کے بزرگ ناکارہ' ہوش و حواس سے عاری اور بے وقوف ہیں۔"

جنگ زور و شور سے جاری تھی۔ عالیہ کا سانس پھول رہا تھا کہ ابا چلے آئے۔

"خالد میں نے تمہیں سمجھایا تھا نا بیٹا۔" وہ بڑی لجاجت سے کہہ رہے تھے۔

"میں برداشت نہیں کر سکتا ابا۔" وہ ابا کو دیکھ کر دھیما ہو گیا۔

"دیکھو ہماری بہو کا خیال رکھو اس کی طبیعت ٹھیک نہیں" عالیہ کی طبیعت مکدر ہو گئی۔ وہ منہ پھیر کر آنے والے بچے کے بارے میں سوچنے لگی۔ اگر اس کو اپنے ہونے والے بچے کا خیال نہ ہوتا تو ان لوگوں سے کوئی تعلق اور واسطہ نہ رکھتی۔ امی جان بھی اسی وجہ سے نرم پڑ گئی تھیں۔

نرم گرم دن گزرنے لگے۔ عالیہ بھی بے خوف ہو گئی تھی۔ ابھی بچہ دنیا میں آیا ہی نہ تھا کہ اس کو لگا کہ اس کے پاؤں مضبوط ہو گئے ہیں۔ پھوپیوں کی آمد بھی کچھ کم ہو گئی تھی۔ ویسے بھی اب وہ عالیہ سے گفتگو کرتے ہوئے احتیاط کرتیں۔ ان کو یہ اندیشہ رہتا کہ اس کو کچھ برا نہ لگ جائے۔ عالیہ کو بڑی خوشی ہوتی۔

"شاباش عالیہ" وہ اپنے آپ کو سراہتی۔ "پہلے ہی ہمت کر لی ہوتی' خیر اب بھی اتنا وقت نہیں گزرا۔"

چھ ماہ ہو چکے تھے عالیہ کی طبیعت گری گری رہتی' ایک دن پھوپھی جان اور ابا باتیں کر رہے تھے۔

"ہمارے ہاں تو ہمیشہ پہلا بیٹا ہی ہوتا ہے۔" ابا خوش دلی سے ہنس کر بولے۔

"ہاں۔" پھوپھی جان نے ہاں میں ہاں ملا کر کہا۔ "ہم سب بہن بھائیوں کا پہلا بیٹا ہی ہوا ہے۔ اب دیکھو خالد کے ہاں کیا ہوتا ہے۔" عالیہ کا موڈ بگڑنے لگا۔

"خیر خالد کے ہاں جو بھی ہو گا جان سے پیارا ہو گا۔" پھوپھی جان جلدی سے بولیں۔

"بالکل بالکل۔" ابا کا موڈ بڑا ہی خوش گوار تھا۔

"بیٹا ہو یا بیٹی" عالیہ خوش ہو گئی۔ اس گفتگو کے دوران خالد چپ چاپ بیٹھا رہا۔ پھر جلدی سے اندر چلا گیا۔

عالیہ کمرے میں آئی تو وہ آفس کا کام کر رہا تھا۔

"آپ کا کیا دل چاہتا ہے۔" عالیہ خالد سے پوچھنے لگی۔ "ہمارے ہاں بیٹی ہو یا بیٹا۔"

"بیٹا۔" خالد نے فائلوں میں سر دیے خلاف توقع جواب دیا۔

"مجھے بیٹی نہیں چاہیے۔" خالد نے سنجیدگی سے کہا۔ "بیٹی ہوگی تو تمہارے ہی جیسی ہوگی۔ ضدی، ہٹ دھرم اور نادان۔" عالیہ تو غم و غصے سے پاگل ہوگئی۔

"آپ سمجھتے کیا ہیں اپنے آپ کو۔" وہ زور سے چلائی۔

"آہستہ بولو تماشا لگانے کی ضرورت نہیں۔" خالد نے سرد مہری سے کہا۔

"اچھا۔ اگر ہمارے ہاں بیٹی ہوگی تو تم کیا کروگے۔" وہ اس کے سامنے تن کر کھڑی ہوگئی۔

"میں اس کو اس کھڑکی سے باہر پھینک دوں گا۔" وہ لفظوں کو چبا چبا کر بولا۔

عالیہ سن ہو کر رہ گئی۔ ایک لمحہ کے لیے کچھ بول ہی نہ سکی۔ اس کے ہاتھ پاؤں بے جان ہونے لگے اور زبان حرکت کرنے سے قاصر، خالد اس کی خاموشی سے بے پروا ہو کر دوبارہ سر جھکائے اپنے کام میں مصروف تھا۔ اس کو اندازہ بھی نہ ہوا اور عالیہ کے اوپر قیامت ہی گزر گئی۔ اس کو خالد سے خوف آنے لگا۔

موقع ملتے ہی امی جان کو فون کرکے ساری بات بتائی۔ انہوں نے اسے جلد از جلد اس گھر سے نکل جانے کا مشورہ دیا۔ ساتھ ساتھ تاکید کردی کہ سارا زیور اور ضروری سامان لے کر آئے۔ عالیہ بے وقوف تھی۔ تین کپڑوں میں وہاں سے نکل جاتی۔ امی جان تجربہ کاری پوری منصوبہ بندی کے ساتھ وہ چپ چاپ خالد کی زندگی سے نکل گئی تھی۔ واپس نہ آنے کے لیے۔

☆ ☆ ☆

عالیہ کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی۔ بچی کو ابتدا ہی سے سانس کا پرابلم تھا۔ ایک ہفتہ ہی میں وہ جہاں سے آئی وہیں چلی گئی۔ خالد اور ابا نے بچی کو دیکھنے کی بہت کوشش کی لیکن امی جان نے ساری کوششیں ناکام بنادیں۔

"ہم آپ لوگوں سے کوئی تعلق رکھنا ہی نہیں چاہتے۔" انہوں نے صاف صاف کہا۔ "آپ کو تو بیٹی چاہیے ہی نہیں تھی۔ اب کیا دلچسپی پیدا ہوگئی۔"

سات دن میں ہی بچی کی سانسیں بند ہوگئیں اور دوسرے دن ہی طلاق نامہ عالیہ کے ہاتھ میں آگیا۔ امی جان نے سکھ کا سانس لیا۔ "تو بھئی سر سے بلا ٹلی۔"

امی جان خوش تھیں، عالیہ نے بھی خوش ہونے کی کوششیں کیں۔ لیکن دل ایک بے نام سے دکھ اور اذیت میں مبتلا تھا۔

آج اس بات کو دو سال، تین مہینے اور پندرہ دن ہوگئے۔ عالیہ نے حساب لگایا۔

"امی جان نے کیا کہا تھا۔" عالیہ ذہن میں وہی گفتگو دہرا رہی تھی جو کہ شام کو ہوئی تھی۔

"اس کی تین پھوپھیاں فساد کی جڑ ہیں۔" امی جان ان کو آگاہ کررہی تھیں، جو کہ خالد کے بارے میں سوال کررہی تھیں۔

"جب تک وہ ہیں خالد کا گھر نہیں بس سکتا۔" امی جان انکشاف کررہی تھیں۔

تین پھوپھیاں خاتون سوچ میں ڈوب کر بولی تھیں۔

"ایک پھوپھی کا تو انتقال ہوگیا اور ایک سعودی عرب چلی گئیں اور ایک لاہور شفٹ ہوگئیں۔"

"اچھا۔" امی جان کے منہ سے حیرت سے نکلا تھا۔ خود عالیہ بھی گم صم ہوگئی تھی۔

دو سال، تین مہینے اور پندرہ دن عالیہ سوچنے لگی۔ کاش وہ صبر سے تھوڑا انتظار کرلیتی، مکان کو گھر بنانے کے لیے صبر اور انتظار کتنا ضروری ہے۔ عالیہ سے زیادہ کون سمجھے گا۔

☆

ناولٹ
عتیقہ ملک
تم گُل میرے دیس میں
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین السلام علیکم!" دونوں اسٹوڈنٹ ڈائس پر آکر رکے تو عرفہ ریاض نے مائیک کا رخ اپنی طرف کرکے بولنا شروع کیا تھا۔

"یوتھ لاء کالج کی اینول ایوارڈ سرمنی (تقریب تقسیم اسناد) میں شرکت کرنے پر آپ سب کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ اور تہہ دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ خاص طور پر اپنے آنریبل چیف گیسٹ بیرسٹر شیر دل ڈھانہ صاحب کا جو ملک کے ممتاز قانون دان ہونے کے ساتھ یوتھ لاء کالج کی ملک بھر میں پھیلی ہوئی شاخوں کے پانیوز میں سے ایک ہیں۔ اپنی گوناں گوں مصروفیات میں وقت نکال کر بیرسٹر صاحب کا اس تقریب میں شرکت کرنا ہمارے لیے بے حد باعث افتخار ہے۔ لیڈیز اینڈ جنٹلمین پلیز گو آ بگ ہینڈ ٹوگیدر ٹو ویلکم فار آور آنرایبل چیف گیسٹ شیر دل ڈھانہ صاحب۔"

بھرپور تالیوں کی گونج سے ہال کے در و دیوار گونج اٹھے تو کمپئیرز نے مسکرا کر چیف گیسٹ کی جانب دیکھا تھا۔ جواباً" ڈھانہ صاحب نے اس تعظیم پر ذرا سا مسکرا کر سر کو خم دیتے ہوئے شکریہ ادا کیا تھا۔ عرفہ نے مائیک اپنے ساتھی کمپئیر معظم وقار کے حوالے کیا تھا۔

"اس شہر میں قانون کی تعلیم دینے والے اداروں میں یوتھ لاء کالج ایک قدیمی ادارہ ہے۔ جہاں انصاف کی بات آتی ہے۔ جہاں مقابلے کی بات ہوتی ہے۔ جہاں ناموری کا نام آتا ہے وہاں یوتھ لاء کالج کے طلباء کا نام آتا ہے۔ اس ادارے کے طلباء نے جہاں ہر شعبے میں خود کو منوایا وہاں یونیورسٹی کی سطح پر مقابلے اور ذہانت کی دوڑ میں صف اول پر پہنچ کر اپنے کالج اور اساتذہ کا نام روشن کیا۔ جیسے ہماری ساتھی طلب علم سیکنڈ ایئر کے وقاص شہیدی۔۔۔ جنہوں نے 2013ء کے اینول ایگزامز میں یونیورسٹی کی سطح پر دوسری پوزیشن حاصل کی۔ آج کی شام۔۔۔ ان کے نام۔۔۔ آج کا فنکشن اس ذہین طالب علم کی ذہانت کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے۔۔۔

لیڈیز اینڈ جنٹلمین پلیز گو آ بگ ہینڈ ٹوگیدر فار آور برلینٹ اسٹوڈنٹ وقاص شہیدی۔"

تالیوں کی گونج میں معظم غفار کی گمبھیر آواز دب کر رہ گئی تھی۔ اسٹیج کے ایک طرف بیٹھے اسٹوڈنٹ میں سے وقاص شہیدی نے کھڑے ہو کر حاضرین کا شکریہ ادا کیا تھا۔

"اللہ تعالیٰ کے بابرکت نام سے اپنے پروگرام کا آغاز کرتے ہیں۔ قرآن مجید فرقان حمید کی مقدس اور بابرکت آیات کی تلاوت کے لیے تشریف لاتے ہیں قاری مجاہد حسین۔۔۔"

عرفہ ریاض نے اپنی خوب صورت آواز میں اناؤنس کیا اور دونوں اسٹوڈنٹ کمپئیرز ڈائس سے ہٹ کر اسٹیج پر ایوارڈ کے حق دار قرار پانے والے طلباء کے ساتھ آن بیٹھے تھے۔

مگر چند ہی لمحوں میں ان دونوں کے چہروں سے اضطراب جھلکنے لگا تھا کیونکہ قاری مجاہد حسین کو بیک اسٹیج سے آنے میں دیر ہو گئی تھی۔

"کیا ہوا قاری صاحب کیوں نہیں آرہے؟"

"میرا خیال ہے ان کے آنے تک میں کچھ اشعار پڑھ دیتا ہوں۔" معظم غفار اس سے مشورہ کرکے اٹھا تھا۔

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔ تلاوت کلام پاک سے قبل چند حمدیہ اشعار آپ کی نذر کرتا ہوں۔" معظم ایک دفعہ پھر مائیک سنبھال چکا تھا۔

"وقاص! بیک اسٹیج جاکر دیکھو قاری صاحب کیوں نہیں آرہے؟" عرفہ نے دھیمی آواز میں وقاص کو بیک اسٹیج جانے کی ہدایت کی تھی۔

"قاری صاحب میرا نکاح پڑھانے گئے ہیں۔ دیر سے واپس آئیں گے۔" یہ تمسخرانہ آواز پہلی رو میں بیٹھے ہوئے ایڈووکیٹ زین العابدین کی تھی۔ وہاں موجود اسٹاف کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"تو پھر تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" جواباً" کسی نے پوچھا تھا۔۔۔ مگر جس کسی کو سنانے کے لیے یہ بات کہی گئی تھی۔ اس کی سماعتوں میں یہ الفاظ تیر بن کر اترے

تھے زہر بن کر رگ جاں میں اترے تھے۔

یہ کوئی نہیں جانتا تھا کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ ان الفاظ نے کسی ذی نفس کے اردگرد وحشتیں بکھیر دی تھیں۔ اس نے اپنی سماعتوں کو حاضر رکھنے کی کوشش کی تھی۔

تیری نوازشوں سے ترے کرم سے مولا
رحمت کی سبز چادر ہر ایک پر تنی ہے
کچھ اس ادا سے ہم نے اب کے تجھے پکارا
ہے پُریقین لہجہ اور آنکھ میں نمی ہے

معظم غفار کے خوب صورت روح میں اترنے والے آواز اس کو ڈھارس دے رہے تھے اور تب ہی بیک اسٹیج سے قاری مجاہد حسین نمودار ہوئے تھے۔

☆ ☆ ☆

وہ گاڑی سے ذرا فاصلے پر کھڑا بے زاری سے پلازہ سے باہر نکلتے لوگوں پر نظریں جمائے عاصم کا انتظار کررہا تھا۔ اسے اندر گئے نہ جانے کتنی دیر ہوگئی تھی۔ عاصم جو اسے دو منٹ انتظار کرنے کا کہہ کر اندر گیا تھا۔ اتنی دیر کے بعد بھی باہر نہ نکلا تو زین شاہ کی بے زاری کوفت میں بدلنے لگی تھی۔ اردگرد ٹھیلے اور ریڑھیوں والے اپنی اپنی آوازیں لگا رہے تھے۔ یہ شہر کے صنعتی ایریے سے ملحق بازار اور گرد و نواح کا خاصا رش والا علاقہ تھا۔

"سنیں بھائی!" ابھی وہ عاصم کو کال کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ قریب سے ایک نسوانی آواز پر نظریں اٹھا کر دیکھا تھا۔

گرین کلر کے کاٹن کے سوٹ میں ملبوس سر پر دوپٹا اور چہرے پر ڈھیروں تھکن اور گرمی کا شدید احساس لیے وہ اس سے مخاطب تھی۔

"جی!" وہ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"ایک برگر تو بنا دیں۔" وہ اطمینان سے شولڈر بیگ اتار کر اب پیسے ڈھونڈ رہی تھی۔

"جی۔" دوسری طرف زین شاہ کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔ مانا کہ اس وقت وہ برگر ٹھیلے کے قریب کھڑا تھا اور خاصے رف حلیے میں تھا مگر اب اتنا بھی گیا گزرا نہیں تھا کہ کوئی یوں اس سے برگر بنانے کی فرمائش کر ڈالے سو اس حساب سے اس کا "جی" خاصا لمبا اور قابل توجہ تھا۔

"جلدی کریں ناں۔" بیگ سے پیسے نکال کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی تو اسے اپنی طرف تکتے پا کر پھر سے پیاس اور تھکن زدہ لہجے میں گویا ہوئی تھی۔ زین نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں نہ جانے برگر والا کہاں چلا گیا تھا۔

"شکر ہے یار... تم ابھی تک ادھر ہی کھڑے ہو ورنہ اس ٹوانے کے بچے نے میرا اتنا وقت ضائع کیا۔ میں تو سوچ رہا تھا۔ کہیں تنگ آکر تم نکل ہی نہ گئے ہو۔" ـــــ تبھی عاصم تیزی سے بولتا ہوا اس کے پاس آیا تو زین شاہ نے گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے ڈیش بورڈ سے سن گلاسز اٹھا کر چڑھائے اور گاڑی ریورس کرنے لگا تھا۔ گاڑی سڑک پر ڈالتے ہوئے اس نے ایک نظر ان محترمہ کو دیکھا محترمہ کی نظریں خاصی شرمندگی سے اس کے تعاقب میں تھیں۔ البتہ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ دل ہی دل میں خود کو کوس بھی رہی تھی۔

"جی باجی... کیا لینا ہے کیا چاہیے؟" تب ہی برگر والا بھاگم بھاگ اپنے ٹھیلے پر آن کھڑا ہوا اور اسی افتاد سے دریافت بھی کررہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"عرفہ... مجھے یاد نہیں رہا ذرا سویٹ ڈش کا ڈونگا فریج میں رکھ دینا۔"

بھیا کے آواز لگانے پر شازمہ بھابھی کچن سے نکلیں اور پھر پلٹ کر اسے ہدایت کرتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ گئیں اور بریانی کا مسالا بھونتے ہوئے اس نے تیز تیز ہاتھ چلاتے ہوئے آنچ دھیمی کی اور ڈونگا اٹھا کر فریج میں رکھا تھا۔ مسالا تقریباً تیار ہوچکا تھا اس نے پانی ڈال کر ابلنے کا انتظار کیا اور چاول ڈال کر ڈھکن لگاتے ہوئے تیزی سے کچن سمیٹنا شروع کیا تھا

جو کہ لنچ کی تیاری کے دوران خاصا بکھر چکا تھا۔
وہ صرف دو دن کے لیے گھر آئی تھی پہلا دن تو آرام کرتے ہوئے گزرا تھا مگر آج لنچ پر۔ بھابھی کو خصوصی اہتمام کرتے ہوئے دیکھ کر خود کو ان کا ہاتھ بٹانے سے نہ روک سکی تھی۔ اگرچہ صفائی اور اوپر کے کاموں کے لیے ملازمہ موجود تھی۔ مگر دو چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ بھابھی گویا گھن چکر بنی رہتیں۔ ایسے میں عرفہ گھر پر ہوتی تو حتی الامکان ان کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتی۔
"عرفہ کتنی دیر لگے گی۔ تمہارے بھیا کھانے کا پوچھ رہے ہیں۔" بھابھی کے کچن میں جھانکنے پر وہ اپنے دھیان سے چونکی تھی۔
"بس بھابھی! بریانی دم پر ہے۔۔۔ میں برتن لگاتی ہوں۔"
لنچ کے لیے تیار کی گئی ڈشز ٹیبل تک لاتے ہوئے اسے بھول گیا کہ اس نے اپنا موبائل استری اسٹینڈ پر چارجنگ پر لگایا تھا اور بھیا گھر پر ہی تھے۔ جب سے پچھلے چند ماہ سے اس کے موبائل پر نامعلوم نمبر سے میسجز اور کالز کا سلسلہ شروع ہوا تھا وہ ایسی غلطی کبھی نہیں کرتی تھی۔

تپش سے بچ کے گھٹاؤں میں بیٹھ جاتے ہیں
گئے ہوؤں کی صداؤں میں بیٹھ جاتے ہیں
ہم اردگرد کے موسم سے جب بھی گھبرا جائیں
تیرے خیال کی چھاؤں میں بیٹھ جاتے ہیں

موبائل پر میسج کی بپ بجی تو آخری سیڑھی سے نیچے آتے ابوذر ریاض نے موبائل اٹھالیا تھا اور کچن سے باہر آتی عرفہ کے ہاتھ سے پلیٹ چھوٹتے چھوٹتے بچی تھی۔ ابوذر ریاض لب بھینچ کر موبائل اسکرین پر نظر دوڑا رہے تھے، تبھی موبائل اسکرین پر ایک اور میسج نمودار ہوا تھا۔

وقت گزرا تو یہ ملال ہوا
ختم زندگی کا ایک سال ہوا
کتنی شدت سے کوئی یاد آیا
آج جینا بڑا محال ہوا

"آئی مس یو جاناں۔۔۔ کب واپس آرہی ہو؟" علی وقاص۔
"آپ تو کچھ لے ہی نہیں رہے کہاں بھوک بھوک کا شور مچار کھا تھا اور اب۔۔۔" شازمہ بھابھی نے انہیں دو تین بار ٹوکا اور پھر ان کی پلیٹ میں چاول ڈالے تھے مگر ان کی بھوک کیوں اڑ گئی تھی یہ عرفہ ریاض اچھی طرح جانتی تھی۔ خود اس کے اپنے حلق میں نوالے اٹک گئے تھے۔ وہ منتظر رہی کہ بھیا اس سے کچھ پوچھیں گے مگر وہ زہر مار کر کے اٹھ گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

"میں جب بھی بھیا سے ملنے جاتی ہوں وہ یہی کہتے ہیں کہ میں ان کی فکر چھوڑ کر اپنے کیریئر پر توجہ دوں اپنی ایجوکیشن کمپلیٹ کروں۔" وہ اپنی دوست نصرت سے بے حد الجھے انداز میں ڈسکس کرنے چلی آئی تھی۔
"وہ بالکل ٹھیک کہتے ہیں تمہارے خاندان کے ساتھ پیش آنے والے حادثے نے تمہاری زندگی کے بہت سے قیمتی سال نگل لیے ہیں۔ اور خدانخواستہ کل کلاں کو تمہیں ہی اپنی فیملی کی کفالت۔۔۔"
"ایسے مت کہو نصرت خدا کے لیے ایسے مت کہو میں کبھی ایسا سوچ بھی نہیں سکتی میں ان کے بغیر اپنی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی وہ بھائی سے بڑھ کر میرے لیے باپ کی طرح ہیں اور میری وجہ سے۔۔۔"
"تمہاری وجہ سے نہیں وہ سب قسمت میں اسی طرح ہونا تھا تمہارے بھیا کا ارادہ تھا نہ تمہارا اس میں کوئی قصور۔ اب اس گلٹ سے نکل کر مثبت انداز میں زندگی کے موجودہ رخ کو دیکھو اور تم یہ بھی تو سوچو کہ جب تم ایجوکیشن کمپلیٹ کر کے اپنا کیریئر بنالو گی تو تمہارے بھائی کو کتنا اطمینان ہوگا یہ کیس تو کتنا عرصہ لٹکتا رہے گا اور تم اس طرح ان کی فیملی کو سنبھال سکو گی۔" "اب یونیورسٹی رول کے مطابق اتنے سالوں بعد میں ڈراپ کیا ہوا فائنل سمسٹر Continue اسٹارٹ نہیں کر سکتی یوں بھی ایم اے ایجوکیشن سے ہوگا کیا؟ زیادہ سے زیادہ میں ٹیچر لگ جاؤں گی نا۔ چوہدری انکل

ہیں نا بھائی کے لائز۔ انہوں نے مجھے اس فیلڈ میں آنے کا مشورہ دیا ہے۔ مگر میں سوچتی ہوں اس میں تو بہت سے سال لگ جائیں گے۔"

"سال گزر جاتے ہیں عرفہ سال گزرنے میں کون سی دیر لگتی ہے۔ بس تم حوصلہ پکڑو اور زندگی کو وہیں سے جینا شروع کرو جہاں سے تم نے اسے چھوڑا تھا۔ ان شاء اللہ ساری مصیبتوں کا حل نکلتا چلا جائے گا۔"

✪ ✪ ✪
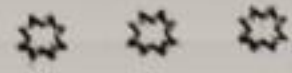
"اس گھٹیا علی وقاص سے تو بات کرنا ہی پڑے گی۔ یہ بھلا چاہتا کیا ہے۔ اپنی بہن کے نمبر رومانٹک میسج بھیج بھیج کر دل پشوری کرلے۔" دانت پیستے ہوئے وہ سوچ رہی تھی اور بالآخر فیصلہ کیا تھا۔

پچھلے کئی ماہ سے یہ سلسلہ چل رہا تھا مختلف قسم کے میسجز جن میں اسے بڑے رومانٹک القابات سے مخاطب کیا جاتا۔ ہر ہفتے دو ہفتے بعد کال آجاتی مگر اس نے کال اٹینڈ نہ کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ حقیقی معنوں میں پہلی بار آج اسے اس صورت حال پر شدید کوفت اور حد درجہ پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد اس نے سفیر سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

پتا نہیں اس کے نمبر پر کال ملے گی یا نہیں۔۔۔ نمبر ڈائل کرتے ہوئے وہ وسوسے کا شکار تھی۔ سفیر آرمی میں کیپٹن تھا اور آج کل کسی ہل ایریا میں پوسٹڈ تھا۔ اس کی باضابطہ طور پر سفیر سے بات طے تھی۔ دوسرے کزن ہونے کے ناطے بھی وہ بے تکلف ہو کر اس سے مشورہ اور مدد لے سکتی تھی۔

"زہے نصیب۔ آج دشمنوں نے کیسے یاد کرلیا؟" دوسری طرف اس کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی تھی۔

"مذاق مت کرو سفیر' میں اس وقت بہت پریشان ہوں۔" اس کا لہجہ حد درجہ مضمحل تھا۔

"تب ہی تو۔۔۔ تب ہی تو۔۔۔ میں کہوں دشمنوں نے دشمنی چھوڑ کر دوستی کا ہاتھ بڑھانے میں پہل کی ہے ضرور کوئی بات ہے۔"

"سفیر! اب میں رو دوں گی اب اگر تم نے بک بک بند نہ کی۔" وہ حد درجہ سنجیدہ ہوئی۔

"او کے۔۔۔ او کے بتاؤ کیا پریشانی ہے؟" اس کے روہانسے انداز پر وہ سنجیدہ ہو چلا تھا تب اس نے بغیر سانس لیے ساری صورت حال کہہ سنائی تھی۔

"پچھلے کئی مہینے سے یہ سلسلہ چل رہا ہے اور تم مجھے اب بتا رہی ہو۔"

"سفیر ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ میں تمہیں بتاتی۔۔۔ میسجز آتے رہتے تھے میں ڈیلیٹ کرتی رہتی تھی۔ اور کال تو میں نے کبھی اٹینڈ ہی نہیں کی میرا خیال تھا جو بھی ہے تنگ آکر خود ہی چھوڑ دے گا۔"

"اب میں کیا کروں؟" وہ گہرا سانس لے کر پوچھ رہا تھا۔ "تم ایسا کرو وہ نمبر مجھے سینڈ کرو۔"

"نمبر کا تم کیا کرو گے۔۔۔ میں بھیا کی وجہ سے سخت پریشان ہوں۔ پتا نہیں انہوں نے کیا سوچا ہو گا۔"

"ان کی تم فکر مت کرو۔ میں ان سے بات کر لیتا ہوں۔"

"بہر حال مجھے تم نمبر سینڈ کرو میں دیکھوں تو یہ الو کا۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے رکا۔ "ہے کون یہ؟"

✪ ✪ ✪

بھیا کے مسلسل اصرار اور دوستوں کے تائیدی مشوروں کے نتیجے میں وہ تعلیم مکمل کرنے کا ارادہ باندھ کر یوتھ لاء کالج پہنچی تھی۔ زندگی کی غلام گردشوں سے گزرنے کے بعد ذہن اور حالات دونوں ہی اس قدر تبدیل ہو چکے تھے کہ اس نے اب کی بار قسمت آزمانے کے لیے قانون کے شعبے کو اپنے لیے مناسب چنا تھا۔ پتا نہیں کب تک اس شعبے میں قسمت کی گردشوں سے نبرد آزما رہنا پڑے لہٰذا وہ یوتھ لاء کالج کے چوکیدار سے معلوم کر رہی تھی کہ ایڈمیشن کے لیے اسے کہاں سے رہنمائی مل سکتی ہے۔ جو اسے چھوڑ کر اندر گیا اور پھر چند ثانیوں کے بعد باہر آگیا تھا۔

"آئیں بی بی۔۔۔ آپ کو جو کچھ پوچھنا ہے اسامہ صاحب سے پوچھ لیں۔" چوکیدار اسے آفس کے اندر

چھوڑ کر باہر چلا گیا تھا۔

"پلیز بیٹھیں..." صوفے پر بیٹھے شخص نے خیر مقدمی انداز میں اسے بیٹھنے کی دعوت دی تھی۔

"مجھے معلوم تو ہے کہ اب کسی بھی کالج میں ایڈمیشن وغیرہ نہیں ہو رہے لیکن مجھے پتا کرنا تھا کہ اس سال ایگزام دینے کے لیے میرا ایل ایل بی میں ایڈمیشن ہو سکتا ہے۔"

"آئی تھنک ہو سکتا ہے ہمارے کالج کی چند سیٹس باقی ہیں۔" اسامہ صاحب نے سوچتے ہوئے کہا تھا۔

"میرا خیال ہے آپ پراسپکٹس وغیرہ چیک کر لیں بغیس پیک اطمینان سے دیکھ لیں۔ ابھی ہمارے ایڈمن ہیڈ آنے والے ہیں وہ آپ کو باقی انفارمیشن دے دیں گے۔"

"میرا آپ سے معلوم کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جو آپ لوگ یونیورسٹی وغیرہ میں رجسٹریشن کرواتے ہیں۔ وہ کیا اب...؟"

"کسی بھی اسٹوڈنٹ کی رجسٹریشن لیٹ فیس کے ساتھ ایگزامنیشن فارم بھیجنے سے پہلے تک کروا دیتے ہیں۔ وہ کوئی پرابلم نہیں ہے۔"

"لیجیے ہمارے ایڈمن ہیڈ بھی آ گئے۔" کلرک نے کھڑکی کے شیشوں سے گیٹ کے اندر داخل ہوتی گاڑی کو دیکھ کر کہا تھا۔

"ایڈووکیٹ زین صاحب سے آپ باقی تفصیلات پتا کر سکتی ہیں۔" ایڈمن آفس میں داخل ہونے والے بندے پر نظر پڑتے ہی عرفہ پر گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔ وہ جو اس روز بے تکے انداز میں برگر بنانے کا آرڈر دے کر کچھ دیر شرمندہ رہی تھی۔ مگر پھر زیادہ دیر تک اس بات کے اثر نہ رہ سکی کہ زندگی کے بکھیڑے اور الجھنیں ہی اس قدر تھیں کہ ذرا دیر کو کی جانے والی احمقانہ حرکت اس کے ذہن سے نکل گئی تھی۔

مگر اپنی اس غلطی پر شرمندگی کسی ان دیکھی بلا کی مانند آج پھر اس پر وارد ہو گئی تھی۔ ایک مشہور و معروف کالج کے ایڈمن ہیڈ کی حیثیت سے اس شخص کا سامنا کرتے ہوئے جسے محض تین دن پہلے وہ برگر بنانے کا کہہ چکی تھی۔

☆ ☆ ☆
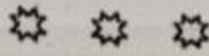
پہلی پہلی بار محبت کی ہے
پہلی پہلی بار محبت کی ہے
کچھ نہ سمجھ میں آئے میں کیا کروں...

بار بار موبائل کی بجتی ٹون بھی اس کی گہری نیند میں خلل ڈالنے میں ناکام رہی تھی اور ٹون بجتی رہی بجتی رہی۔ حتیٰ کہ اس کی روم میٹ فائزہ کی آنکھ کھل گئی تھی۔

"عرفہ عرفہ پلیز... اس موبائل کو یا تو آف کر دو یا کال اٹینڈ کرو..." وہ بے حد جھنجلا کر کہہ رہی تھی۔

"ہیلو۔" اس نے نیند بھری آواز میں اس کی کال ریسیو کی تھی۔

"جانم اس پہاڑوں کے جانشین کو زحمت دینے کی کیا ضرورت تھی ہمارا آپس کا معاملہ تھا ہم خود ہی طے کر لیتے۔"

دوسری طرف بغیر کسی تعارف کے شروع ہونے والی گفتگو اس کی نیند بھک سے اڑا گئی... ابھی انہیں سوئے ہوئے محض ایک گھنٹہ ہی ہوا تھا بارہ بجے آنے والی یہ کال... اور یہ بھی اتفاق تھا کہ اس شخص کی آواز وہ پہلی بار سن رہی تھی۔

"کیا بکواس ہے... کون بات کر رہے ہو۔" اس کا لہجہ خود بخود سخت ہو چلا تھا۔

"تم نے پہچانا نہیں... علی وقاص بات کر رہا ہوں۔" بے تکلفانہ انداز میں یوں کہا گیا گویا وہ کتنا اچھا ریلیشن شپ رکھتے ہوں اور محض اتفاق سے عرفہ کو اسے پہچاننے میں غلطی ہو گئی ہو۔

"کون ہو تم علی وقاص اور تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟"

"میں ایک ٹیلی کام انجینئر ہوں اور مسئلہ... میرے ساتھ تو کوئی مسئلہ نہیں... سوائے آپ کی جدائی کے... اس مسئلے کو حل کرنے میں لگا ہوں... عنقریب

حل ہو جائے گا۔ مگر ہائے یہ فراق یار۔۔۔ فی الوقت تو اس سے بڑا مسئلہ کوئی نہیں۔" دوسری طرف ٹھنڈی سانس بھر کر کہا گیا تھا اور عرفہ کو سمجھ نہ آیا کہ وہ اس بکواس کا کیا جواب دے۔

"کیپٹن سفیر کا فون آیا تھا بڑی بڑھکیں مار رہا تھا۔ میں نے بھی کہا تم کون ہوتے ہو ہمارے آپس کے معاملے میں بولنے والے۔۔۔ ہم خود ہی اس معاملے کو نبٹا لیں گے۔" عرفہ نے جل کر کال کاٹ دی اور فون بھی آف کر دیا تھا مگر اس کی نیند اڑ چکی تھی۔

"سو جاؤ رانگ کالز پر پریشان نہیں ہوتے۔" اسے نیم دراز دیکھ کر فائزہ نے مشورہ دیا اور کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں مگر عرفہ ریاض سو نہ سکی وہ ایسی رانگ کالز افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا تعلق جس خاندان سے تھا وہاں پر کا کوا بہت آسانی سے بنایا جاتا تھا اور اگر ایک دن کی بات ہوتی تو وہ اگنور کر دیتی مگر یہ سلسلہ تو پچھلے چھ ماہ پر محیط تھا۔

☼ ☼ ☼
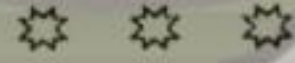
"سر جس طرح آپ بتا رہے ہیں کہ پیپرز میں محض چند ماہ باقی ہیں تو میں کورس کور کر لوں گی؟" اس نے کچھ پریشانی سے دریافت کیا تھا۔

"وائے ناٹ؟ آپ کا اکیڈمک ریکارڈ شو کر رہا ہے کہ آپ کافی بریلنٹ اسٹوڈنٹ ہیں اور ہم آپ کو سبجیکٹو اور اوبجیکٹو کے نوٹس دیں گے پیپرز کے دوران۔۔۔ اس کے علاوہ پیپرز کے دوران سلیکٹو اسٹڈی کے لیے ہر پیپر کا ایک گیس ملے گا۔"

"سر مجھے لیٹ فیس کتنی جمع کرانی ہو گی؟"

"لیٹ فیس۔۔۔" اس نے چند ثانیے کو سوچا تھا "آپ یوں کریں رولز کے مطابق جو ہماری فیس ہے وہ جمع کرا دیں ہم آپ سے لیٹ فیس چارج نہیں کریں گے؟" اس نے شائستگی کے ساتھ دی جانے والی رعایت سے آگاہ کیا تو عرفہ خاصی مطمئن ہو گئی تھی۔

"اور سر ہاسٹل۔۔۔؟"

"یہ بات تو آپ کو سب سے پہلے پوچھنی چاہیے تھی بلڈنگ کے سیکنڈ فلور پر ہمارا گرلز ہاسٹل ہے اور کالج کی بیک پر الگ بلڈنگ میں بوائز کے لیے اکوموڈیشن ہے۔"

"تھینک یو ویری مچ سر؟ میں ڈاکومنٹس اور فیس کس کو کب جمع کراؤں؟" عرفہ نے مزید اس کا ٹائم لینا مناسب نہ سمجھا تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلے ڈیڑھ ماہ میں علی وقاص نے ہر وقت کالز کر کے اور میسجز بھیج بھیج کر اس کا حقیقی معنوں میں جینا حرام کر ڈالا تھا۔ اس نے نمبر تبدیل کیا مگر محض ایک ہفتے کے بعد وہ نمبر بھی علی وقاص معلوم کر چکا تھا۔ اس نے کس رنگ کی چپل پہنی ہے، کس رنگ کے کپڑے پہنے ہیں حتیٰ کہ اس کے بالوں پر کس رنگ کی پن لگی ہے۔ وہ کون سی بات تھی جو علی وقاص کو معلوم نہیں تھی۔ اس نے فائزہ سے مشورہ کیا یقیناً "یہ کوئی یونیورسٹی کا اسٹوڈنٹ تھا جو اس کے بارے میں ایسی انفارمیشن بھی رکھتا تھا اور تب اس نے سفیر سے بات کی کہ وہ اسے اس نمبر کا ڈیٹا معلوم کر کے دے اور یہ کام سفیر کے لیے کچھ مشکل نہ تھا۔

"عمر مبارک۔۔۔"

"وہ لمبی زلفوں والا لڑکا۔۔۔ ایجوکیشن کا ہی اسٹوڈنٹ ہے۔۔۔ جس نے داڑھی رکھی ہوئی ہے شاید کسی جماعت سے بی لانگ کرتا ہے۔" فائزہ نے اس کا بائیو ڈیٹا معلوم ہونے پر کچھ حیران ہو کر کہا تھا۔

"میرے ذہن میں نہیں آ رہا۔۔۔" عرفہ خاصی الجھی ہوئی تھی۔ اب ایم اے ایجوکیشن کے ڈیڑھ سو اسٹوڈنٹس میں سے ہر ایک کی پہچان تو اسے نہ تھی۔

"بہر حال کل تم میرے ساتھ چلنا ذرا اس کی خبر لیں گے۔" اس نے فائزہ سے کہا تھا "ہاں ہاں کیوں نہیں یار۔۔۔ مجھے تو خود اس پر اتنا غصہ آ رہا ہے کیا چھپا رستم نکلا۔" فائزہ نے دانت پیس کر تائید کی تھی۔۔۔ "دیکھنے میں تو اتنا شریف لگتا ہے کبھی کسی کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا اور حرکتیں تو دیکھو۔۔۔"

"اب جب اسے پتا چلے گا کہ ہم نے اس کے نمبر کا بائیو ڈیٹا معلوم کر لیا ہے تو یقیناً" کچھ تو اثر ہو گا۔ اپنی حرکتوں سے باز آہی جائے گا۔" عرفہ نے امید بھرے انداز میں لب چلائے تھے۔

"باز کیسے نہیں آئے گا؟ باز نہیں آئے گا تو ہم ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ کو کمپلین کر دیں گے۔"

☆ ☆ ☆

"سر ہم منگلا ڈیم چلیں گے۔" فضا کی رائے تھی۔

"نہیں سر کلر کہار جائیں گے۔" نمرہ نے فرمان جاری کیا تھا۔

"سر میں نے کٹاس نہیں دیکھا ہوا....." عظمیٰ نے نکتہ اٹھایا تھا۔

"چلیں ایک دن منگلا دوسرے دن کلر کہار اگلے دن کٹاس بھی ہو آئیں گے۔" زین العابدین نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا تھا۔

"آپ کیوں خاموش ہیں عرفہ آپ بھی بتائیں نا آپ کہاں جانا چاہیں گی۔"

"سر میرے لیے جانا مشکل ہے۔" اس نے معذرت کی۔

"کیوں بھئی سارے اسٹوڈنٹس کو جانا ہو گا کوئی ایکسکیوز نہیں چلے گا۔ بوائز نے تو نادرن ایریاز کی فرمائش کی ہے۔ لیکن آپ لوگوں کی وجہ سے ہم کسی نزدیکی پکنک سے ہو کر آنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا کوئی ایک پوائنٹ ڈیسائڈ کر کے بتا دیں۔"

"عرفہ آپ کی اسٹڈیز کیسی جا رہی ہیں کوئی پرابلم تو نہیں ہے۔" اس نے آفس کی جانب مڑتے ہوئے یاد آنے پر پوچھا تھا۔

"سر کرمنالوجی کا سبجیکٹ بہت مشکل اس کے چند ٹاپکس مجھے بالکل سمجھ نہیں آرہے۔"

"اچھا۔ ایسا کریں اپنی قوم کے ایک دو اور لوگوں کو بھی لے کر میرے آفس آجائیں میں آپ کو سمجھا دیتا ہوں۔" سر کے آفر کرنے پر وہ نمرہ اور عظمیٰ کے ساتھ آفس آگئی تھی۔

"اور اینڈ میں اس ٹاپک کے حوالے سے آپ کو ایک ٹپ دے دوں کہ آپ کائنڈز آف قتل کو نیت کو مدنظر رکھتے ہوئے پڑھیں تو یہ آپ کو بہتر طور پر سمجھ آئیں گی..... جیسے قتل عمد میں نیت بھی قتل کی ہوتی ہے اور سزا بھی نیت کے حساب سے دی جاتی ہے..... یعنی ارادتاً" کیے جانے والے قتل پر قصاص کے طور پر سزائے موت دی جاتی ہے اور قتل خطا میں جو نیت سے نہیں ہوتا عام طور پر دیت....."

"ایکسکیوزمی سر؟" عرفہ نے اچانک کہا تو زین العابدین نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"سر کورٹ کی طرف سے پھانسی کی سزا سنا بھی دی جائے تو عمل تو نہیں ہوتا؟" اس نے موہوم سی امید کے تحت پوچھا تھا۔ وہ چند ثانیے خاموش رہا۔

"آج کل تو پھانسی کی سزا پر عمل درآمد نہیں ہو رہا ..... لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا..... گورنمنٹ کی پالیسیاں تبدیل ہوتی رہتی ہیں تو عمل درآمد شروع ہو جاتا ہے اور اس سزا پر عمل درآمد ہونا بھی چاہیے کیونکہ ایک شخص جو کسی فرد کو بے رحمی سے قتل کر دے اسے اس انجام تک ضرور پہنچنا چاہیے۔"

"سر کچھ لوگ مجبوری میں یا انتہائی حالت میں ایسے قدم اٹھا لیتے ہیں تو....."

"مجبوری میں کوئی بھی ایسا قدم اٹھانا سیلف ڈیفنس کہلاتا ہے یہ تو آپ پڑھ ہی رہی ہیں۔"

"سر قانون بہت اوقات سیلف ڈیفنس کو تسلیم ہی نہیں....."

عظمیٰ نے اسے کہنی ماری تو عرفہ کو اس کا ایسا کرنا بہت کھلا وہ گھور کر اس کی طرف دیکھنے لگی تھی اور سر زین اپنی کسی سوچ میں گم تھے کہ ان کی طرف توجہ ہی نہیں دی تھی۔

"تم مجھے کیوں کہنیاں مار رہی تھیں۔" آفس سے نکل کر کلاس کی طرف جاتے ہوئے اس نے عظمیٰ کی کلاس لینا شروع کی تھی۔

"یار تم دیکھ نہیں رہی تھیں سر کتنے پریشان سے ہو گئے تھے۔"

"کیوں؟ سر کیوں پریشان ہو گئے تھے؟" وہ حیران ہو کر سوال کر بیٹھی تھی۔

"تمہیں نہیں پتا سر کے چھوٹے بھائی..."

"سنو تو عظمیٰ آج کلاس میں کیا ہوا..." تبھی ان کی دوسری کلاس فیلوز ہنستی ہوئی باہر نکلیں اور عظمیٰ کی بات ادھوری رہ گئی۔

وہ تھرڈ پراف کا عبداللہ ہے نا ہر وقت ناخن چباتا رہتا ہے۔

"ہاں ہاں کیا ہوا اسے؟" ان تینوں نے مشترکہ سوال کیا تھا۔

"اسے کچھ نہیں ہوا یہ اپنی وردہ ہے نا تین دن اسے اس حرکت پر ٹوک چکی تھی آج اس نے عبداللہ کو ناخن کترتے ہوئے دیکھا تو شوز میں سے پاؤں نکال کر اس کے سامنے چیئر پر رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"عبداللہ بھائی یہ میرے پاؤں کے ناخن تھوڑے بڑھ گئے ہیں۔ میرا نیل کٹر ہاسٹل میں گم ہو گیا ہے۔ آپ ذرا میرے ناخن بھی کتر دیں آپ کی عادت بھی پوری ہو جائے گی اور میرے ناخن بھی کٹ جائیں گے۔"

ساری کلاس ہنس ہنس کر دوہری ہو گئی اور عبداللہ بے چارا حق دق... ہماری وردہ کے کیا کہنے..."

☆☆☆
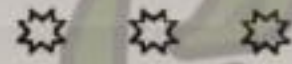
اور پندرہ دن کے لیے عمر مبارک کی طرف سے خاموشی چھا گئی۔ شاید اس پر عمر خان کے سمجھانے کا اثر ہوا تھا۔ فائزہ اور عرفہ نے آپس میں ڈسکس کیا تھا۔ بہر حال جو بھی تھا عرفہ نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ مگر عمر مبارک ان لوگوں میں سے تھا جو سکھ کا سانس لیتے ہیں نا لینے دیتے ہیں۔

محض پندرہ دن کے وقفے سے اس نے پھر وہی سلسلہ شروع کر دیا تھا اور پہلے سے زور و شور کے ساتھ بلکہ وہ تو اس کی حرکتوں کا جتنا نوٹس لے رہی تھی اتنا ہی وہ سر چڑھ رہا تھا۔

لائبریری میں کتابوں کی ورق گردانی اور ٹریننگ کے لیے ماڈل لیسن کا انتخاب کرتے وہ ایک دوسرے کو رائے سے بھی نواز رہی تھیں اور یوں تھوڑی بہت گپ شپ بھی جاری تھی۔

"مختلف مواقع کے لیے لباس کا انتخاب۔" میں نے ٹاپک سلیکٹ کر لیا ہے۔" عرفہ نے فائزہ کو آگاہ کرتے ہوئے بتایا تھا۔

"ارے واہ یہ تو بڑا زبردست ٹاپک تم نے سلیکٹ کیا ہے۔ ویسے بھی یہ چند دنوں میں تمہارے بہت کام آنے والا ہے۔" فائزہ نے عرفہ کو داد دی تھی۔

"کیوں؟ بھلا یہ ٹاپک اس کے کیوں کام آنے والا ہے؟" ان کے ساتھ بیٹھی ہوئی رانیہ پوچھنے لگی تھی۔

"اسی سمسٹر کے اینڈ پر پیا دیس سدھار رہی ہیں۔"

"واؤ کون ہیں موصوف؟ جو ہماری بنو کو لینے آرہے ہیں؟"

"کیپٹن سفیر... میرے کزن ہیں۔" عرفہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

"اوہ ماشاء اللہ اپنے ہی شہر رخصت ہو کر جاؤ گی نا..."

"ایکچوئلی ان کی فیملی تو پھالیہ میں ہی سیٹل ہے مگر مجھے تو ان کے ساتھ لور لور پھرنا ہو گا جاب جو آرمی کی ہے۔" اور ریک کے دوسری طرف کتاب کے ورق الٹتا عمر مبارک ٹھٹک کر ان کی گفتگو سن رہا تھا۔

اور اس روز اس نے عرفہ کا نمبر وقفے وقفے سے ڈائل کیا تھا۔

"مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے... میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔" عرفہ نے اس کا نمبر پڑھ کر ڈیلیٹ کیا تھا وہ کیوں ملنا چاہتا تھا اور اسے کیا بات کرنی تھی عرفہ کو اس سے کوئی مطلب تھا نہ دلچسپی۔

کالج کے گیٹ پر پہنچ کر اس نے ہارن دیا تو چوکیدار نے گیٹ وا کر دیا اور اس سے قبل کہ وہ گاڑی آگے بڑھتی تب ہی ایک اور گاڑی گیٹ سے قدرے فاصلے پر رکی تو زین العابدین کی آنکھوں میں حیرت اور الجھن تیر گئی۔ کیونکہ گاڑی کی فرنٹ سیٹ سے عرفہ اتر رہی تھی۔ کندھے پر شولڈر بیگ اور ہاتھوں میں بڑا سا شاپر تھامے یقیناً وہ ویک اینڈ گزار کر ہاسٹل واپس آئی تھی

اور فواد ہمدانی کی گاڑی سے اسے اترتے دیکھ کر زین العابدین ایک لمحے کے لیے گاڑی آگے بڑھانا بھول گیا تھا۔ اس وقت گیٹ پر خاصا رش تھا للذا فواد کی نظر اس پر نہیں پڑی تھی اور وہ گاڑی ٹرن کرتے ہوئے وہاں سے جا چکا تھا' تبھی پیچھے سے ہارن کی آواز پر وہ چونکا اور تیزی سے گاڑی کھلے گیٹ کے اندر لے آیا تھا۔

"عرفہ کون تھی؟ فواد ہمدانی سے اس کا کیا رشتہ تھا۔ کیا وہ ابوذر ریاض کے خاندان سے بی لانگ کرتی ہے۔" اس کا ذہن مسلسل ایک سوچ میں الجھا ہوا تھا۔ اور اس سوچ کے تحت چند آفیشل میٹرز نمٹانے کے بعد اس نے عرفہ کا بایو ڈیٹا نکلوایا تھا۔

"اومائی گاڈ۔" اس نے سر تھام کر خود سے کہا تھا۔ یہ لڑکی ابوذر ریاض کی بہن ہے اس کا فادر نیم ایڈریس اور ڈاکومنٹس اس کے سامنے کھلے پڑے تھے۔

☼ ☼ ☼
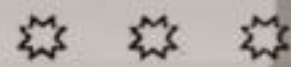
"جو کچھ میں نے بتایا ہے اچھی طرح سمجھ لیا ہے نا اور اب مکمل اعتماد سے جانا زیادہ کنفیوژ ہونے کی ضرورت نہیں' یہ کوئی روٹین سے ہٹ کر بات تو ہے نہیں۔" ٹریننگ ورکشاپ کی بریک میں کوئی چپس کتر رہا تھا کوئی سموسے اڑا رہا تھا تو کہیں کہیں گروپنگ کی شکل میں ایک دوسرے سے لیسن چینج کر کے ڈسکس کر رہے تھے۔ کیونکہ روزانہ نیا ماڈل بنانا اسٹوڈنٹس کے لیے ممکن نہیں ہوتا للذا ورکشاپ آرگنائزر کی طرف سے ماڈل چینج کرنے کی اجازت تھی۔

"ایکسکیوزمی۔" کچھ گھبرایا ہوا جمی چور کی داڑھی میں تنکا لیے عرفہ کے پاس کھڑا تھا۔

"جی۔۔۔" رانیہ سے لیسن ڈسکس کرتی عرفہ نے سر اٹھایا تھا۔

"وہ مجھے آپ کا ماڈل مل سکتا ہے۔"

"وائے ناٹ۔۔۔ لیکن میرا ماڈل تو' دن کے مختلف اوقات میں کھانے کا انتخاب ہے یہ تو ہوم اکنامکس کا ٹاپک ہے اور بوائز کی تو ہوم اکنامکس ہوتی ہی نہیں ہے۔ آرگنائزر اوبجیکشن کریں گے۔"

"خیر ہے جی دے دیں۔ اوبجیکشن کی دیکھی جائے گی۔" عرفہ نے ماڈل اور چارٹ اس کے حوالے کیا تھا۔ تو جمی نے نکھیوں سے دور کھڑے عمر مبارک کی طرف دیکھا تھا۔ جس نے وِیل ڈن کا اشارہ دیا تھا۔

"آپ مجھے پریزنٹیشن سمجھادیں گی۔"

"ہاں سمپل سی ہے۔ بس یوں کہہ دیں کہ غذا انسانی جسم کی اہم ضرورت ہے اور انسان اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے دن کے مختلف اوقات میں کھانے کا انتخاب کرتا ہے۔ کھانے کا انتخاب کن چیزوں کو مد نظر رکھ کر کرنا ہے یہ آج کے سبق میں۔۔۔" جمی ذرا سا جھک کر سیدھا ہوا اور یہ منظر عمر مبارک کے موبائل میں سیو ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

"سر طلحہ کی انگیجمنٹ ہوئی ہے۔" وہ سب گول دائرہ بنائے فضا اور رشنا کے مشترکہ بیڈ پر بیٹھی تھیں۔

"اچھا تمہیں کیسے پتا چلا؟" نمرہ کے انکشاف پر فضا نے دلچسپی سے پوچھا تھا۔ "ہمارے ان کے ساتھ فیملی ٹرمز ہیں۔"

"چپ ہو جاؤ۔۔۔ چپ ہو جاؤ آپ سب لوگ' پرسوں پیپر ہے اور گپیں یوں لگا رہے ہو۔ جیسے چھانگا مانگا میں پکنک منانے آئے ہو۔" عرفہ نے چیخ کر ان سب کو خاموش کروایا تھا۔

"تو کیا پیپر کو سر پر بٹھالیں' نوٹ لکھ کر ہونٹوں پر چپکالیں کہ پرسوں پیپر ہے۔" فضا نے منہ بنا کر ٹوکا تھا۔

"آپ لوگوں کو ذرا بھی کوئی ٹینشن نہیں اور میری جان نکلی جا رہی ہے یہ ٹارٹ Tort تو میری جان کا وبال بن گیا ہے۔"

"یہ کونسیپٹ کا کنسیپٹ کلیئر کرو۔ کنسیپٹ کلیئر ہو تو کچھ مشکل نہیں لگے گا۔" عظمیٰ نے مشورہ دیا تھا۔

"میرا خیال ہے تم صرف سلیبس کے کونسیپٹ

ریوائز کرو پیپر تو نکل ہی جائے گا۔" اسے نمرہ کا مشورہ قابل عمل لگا تھا۔

"تمہارے پاس سلیبس کے کونسچن ہیں؟"

"نہیں۔"

سرزین کو کال کرو وہ مسیج کردیں گے۔"

"ہوں" اس نے پرسوچ انداز میں موبائل اٹھایا تھا۔ پیپرز کے دنوں میں نوٹس کی ضرورت ہو یا اسٹوڈنٹ کو کوئی پرابلم' ایک ٹیچر کی ڈیوٹی ہوتی اور آج کل سارے اسٹوڈنٹس کو سرزین سے رجوع کرنے کی ہدایت تھی جو خود بھی بوائز ہاسٹل میں مقیم تھے جہاں آج کل طلباء کی زوروشور سے کلاسز بھی ہوتیں۔

دوسری طرف بیل جاتی رہی مگر کسی نے کال ریسیو نہ کی۔

"آئی ایم عرفہ... سر آئی نیڈ یو ہیلپ پلیز اٹینڈ مائی کال۔" مسیج ٹائپ کرتے ہوئے اسے یقین تھا کہ سر اسے خود ہی کال کرلیں گے۔

کافی دیر تک جب سر کی جانب سے کوئی ریپلائی نہ ہوا تو اس نے دوبارہ کال کی تھی۔

"ہیلو..." دوسری تیسری بار بیل جانے پر انہوں نے کال ریسیو کی تھی۔

"سر میں عرفہ بات کر رہی ہوں۔"

"جی!" دوسری طرف خاصے روکھے انداز پر وہ ٹھٹکی تھی۔

"سر یہ ٹارٹ کا پیپر ہے مجھے تو بہت مشکل لگ رہا ہے اور میری تیاری بھی اچھی نہیں ہے۔" اس نے اپنی مشکل بیان کی۔

"اب میں آپ کو تسلی تو دینے سے رہا کہ میں یونیورسٹی کا V.C لگا ہوں آپ کا پیپر کلیئر کروا دوں گا۔" سر کے درشت انداز پر وہ یک دم خاموش ہو کر رہ گئی۔

"اب آپ بولیں گی یا میں فون بند کردوں؟"

"نہیں سر وہ مجھے سلیبس کے کونسچن چاہئیں تاکہ میں تھوڑی سلیکٹو اسٹڈی کرسکوں۔" اس نے کہا تو جلدی سے تھا مگر اس سے زیادہ جلدی سے کال کاٹ دی گئی تھی۔

اور وہ حیرت سے موبائل ہاتھ میں لیے سوچ رہی تھی کہ سرزین کو کیا ہوا بھلا میرے ساتھ اس انداز میں کیوں بات کر رہے تھے۔

اور اس کی حیرت بجا تھی لیٹ ایڈمیشن لینے پے اگر وہ ایگزام دے رہی تھی تو سب سے زیادہ حوصلہ افزائی کرنے والے سرزین ہی تھے اور سب سے زیادہ کورس کو سمجھنے میں ہیلپ بھی انہوں نے کی تھی۔ کافی دیر تک کتاب کی ورق گردانی کرنے کے بعد کوئی سلیبس کونسچن کا مسیج نہ آیا تھا۔ حالانکہ سلیبس کے کونسچن ہر ٹیچر کے موبائل میں موجود ہوتے جو کسی بھی اسٹوڈنٹ کے ڈیمانڈ کرنے پر فوراً" سینڈ کردیے جاتے۔

✡ ✡ ✡

"صرف ایک بار وہ مجھ سے باہر ملنے آئے میں وعدہ کرتا ہوں اس کا نمبر اپنی فون بک سے ڈیلیٹ کردوں گا اگر وہ مجھے کبھی نظر بھی آئی تو راستہ بدل لوں گا۔"

"آخر تم کون سی زبان سمجھتے ہو عمروہ تمہاری کال سننے کی روادار نہیں ہے اور تم باہر ملنے کی بات کر رہے ہو۔" فائزہ نے کوفت سے کہا تھا۔

"تم اس کی دوست ہو تم اسے سمجھاؤ گی تو وہ سمجھ جائے گی۔"

"کیا سمجھ جائے گی اور ایسی گھٹیا اور بے تکی بات کیوں سمجھاؤں گی۔ البتہ اب تمہارے سمجھنے کی باری ہے۔ تم اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو وہ ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ کو کمپلین کردے گی۔"

"ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ کی ایسی کی تیسی۔ زیادہ سے زیادہ ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ مجھے ایکسپل کردے گی اور مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ میرا کسی اور سبجیکٹ میں ایڈمیشن نہیں ہوا لہٰذا یونیورسٹی میں وقت گزارنے کے لیے میں نے اس میں ایڈمیشن لے لیا۔ ورنہ کسی ڈگری کی ضرورت نہیں ہے۔"

"تمہاری انسلٹ تو ہو گی کہ..."

"میری کیا انسلٹ ہو گی۔۔۔ انسلٹ تو اس کی ایسی کروں گا کہ وہ یاد رکھے گی اور۔۔۔"

"ایک منٹ مجھے دینا۔" اسپیکر آن ہونے کے باعث یہ ساری گفتگو سنتی عرفہ نے طیش سے موبائل اس سے چھینا تھا۔

"تم جیسے کتنے کتے ہوں گے جو لڑکیوں کے پیچھے بھوں بھوں کرتے لگ جاتے ہیں اور مجھ جیسی ہزاروں لڑکیاں ایسی بھونک پر توجہ دیے بغیر یونیورسٹی سے ڈگریاں لے کر گھر لوٹ جاتی ہیں۔ جبکہ ایسے کتے ان کا کچھ نہیں بگاڑ پاتے۔"

"میں کتا ہوں یا انسان' اس بات کا فرق تو تمہیں تب پتا چلے گا۔ جب میں تمہارا نمبر اور پکس فیس بک پر لگاؤں گا اور تمہیں مجھ جیسے ہزاروں کتوں کی کالز موصول ہوں گی۔" وہ انتہائی واہیات انداز میں قہقہہ لگا کر ہنس رہا تھا۔

"پکس تم اپنی بہن کی لگا دینا۔" اس نے دانت پیس کر کہا تھا۔

"بہن تو میری کوئی ہے نہیں۔ البتہ تمہاری جو پکس میں نیٹ پر لگاؤں گا وہ تم خود بھی دیکھ کر حیران رہ جاؤ گی اور تمہارا ایکٹیشن بھی۔۔۔"

☼ ☼ ☼

"کیا بات ہے عرفہ؟" اس کا چہرہ صدمے سے یا پھر طیش سے زرد ہو رہا تھا سب سے پہلے سامنے والے روم کی نمرہ نوٹس لینے آئی تو اسے تکیہ گود میں رکھے گم سم بیٹھے دیکھ کر نوٹس کیا تھا۔

"تم کچھ پریشان لگ رہی ہو؟" جواباً" وہ خاموش رہی۔

"فضا' شبنم اس کی طرف دیکھو اسے کیا ہوا ہے؟"

"ہیں۔۔۔ واقعی۔۔۔ تمہارا چہرہ کوئی کہانی سنا رہا ہے۔"

"کوئی کہانی نہیں؟" اس نے سپاٹ سے انداز میں جواب دیا تھا۔

"پیپر کی ٹینشن ہے۔۔۔"

"نو ٹینشن ریلیکس ہو کر تیاری کرو' ان شاء اللہ پیپر اچھا ہو جائے گا۔" نمرہ اسے پرسکون رہنے کا مشورہ دیتی باہر چلی گئی۔

نمرہ کے جانے کے بعد اس نے سر کا نمبر ڈائل کیا۔

"سر میں نے آپ سے گیس کوئسچن کی ڈیمانڈ کی تھی۔"

"اب آپ کو رول نمبر سلپ ایشو ہو چکی ہے اور ہماری کوئی ایسی ریسپانسبلٹی نہیں ہے۔"

"تو کس کی ریسپانسبلٹی ہے؟" وہ ازحد درجہ طیش دبا کر پوچھ رہی تھی۔

"آئی ڈونٹ نو اینڈ پلیز ڈونٹ کال می اگین۔۔۔"

"میں لعنت بھیجتی ہوں آپ کو کال کرنے پر۔ آپ کے گیس کوئسچن پر اور آپ کے کالج پر۔"

"عرفہ ذرا میرے ساتھ کچن میں آؤ چائے بنانی ہے۔" وہ واپس کمرے میں آئی تو شبنم اس کے سر پر سوار تھی۔

"نہیں میرا دل نہیں چاہ رہا۔" اس نے قطعیت سے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"چلو میرے ساتھ نہیں آنا نہ سہی یہ بتاؤ تمہیں ہوا کیا ہے؟"

"ذرا اپنا موبائل تو دو شبنم۔۔۔ مجھے سر سے بات کرنی ہے۔" سر اس کے نمبر سے کال اٹینڈ نہ کرتے سو اس نے شبنم سے موبائل مانگا تھا۔

"سر زین سے؟" شبنم نے موبائل اٹھاتے ہوئے سوالیہ انداز میں پوچھا تھا۔

"ہوں۔" اور اس نے موبائل عرفہ کو دینے کے بجائے خود ہی سر کا نمبر ملا ڈالا تھا۔ مگر نمبر بزی جا رہا تھا۔ سو اس نے عرفہ کو بتا کر موبائل رکھ دیا تھا۔

"عرفہ اسمگلنگ کا کوئسچن تمہاری بک میں ہے۔ میری بک میں تو پرنٹنگ کی غلطی کی وجہ سے میلٹیشن پر ایکیوشن دوبار آگیا ہے مگر سمگلنگ کا کوئسچن ہے نہیں۔"

"ہم سا ہو تو سامنے آئے۔" موبائل گنگنایا تو شبنم نے یس کا بٹن پش کر کے کان سے لگایا تھا۔

"السلام علیکم سر میں پارٹ ون کی اسٹوڈنٹ شبنم بات کر رہی ہوں یہ عرفہ نے آپ سے بات کرنی ہے لو عرفہ بات کرو۔" شبنم نے جلدی جلدی بات کرتے ہوئے موبائل عرفہ کی طرف بڑھایا تھا۔

"ایکسکیوزمی شبنم۔۔۔ بات سنیں میری۔ مجھے عرفہ سے کوئی بات نہیں کرنی۔" عرفہ نے موبائل کان سے لگایا تو دوسری طرف سے آواز سنائی دی اور فوراً لائن کٹ گئی تھی اور ہاسٹل کے گراؤنڈ میں ڈیڑھ گھنٹہ چکر لگانے کے بعد عرفہ نے کالج پرنسپل کا نمبر ڈائل کیا تھا۔

"سر مجھے آپ کے کالج سے پیپرز نہیں دینے۔ پلیز آپ لوگ میری فیس ری ٹرن کر دیں۔"

☆ ☆ ☆
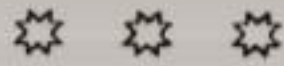
"عرفہ تمہارے ذہن میں کبھی خیال نہیں آیا کہ تم ایک بار اس سے مل لو۔" فائزہ نے کچھ جھجکتے ہوئے سوال کیا تھا۔

"کبھی نہیں، کبھی بھی نہیں، میرا اس سے ایسا کونسا رشتہ ہے کہ یہ مجھے پریشرائز کرے اور میں اس سے ملنے چل دوں۔" اس نے سختی سے نفی کی تھی۔

"رائٹ۔" فائزہ نے تائید میں سرہلایا تھا۔

"مجھے لگتا ہے اس نے کسی سے شرط لگا رکھی ہے۔" فائزہ نے خیال ظاہر کیا تھا۔

"جو بھی ہو۔" عرفہ نے استہزائیہ انداز میں ناک سے مکھی اڑائی تھی۔ "یہ تو کبھی ممکن نہیں چاہے وہ کچھ بھی کرے، یہ بھی کوئی طریقہ ہے کہ کسی لڑکی کو فون کر کے دھمکیاں دینا شروع کر دو۔"

اگرچہ عرفہ اس کی بکواس کو سنجیدگی سے لے رہی تھی اور اب تک وہ صرف سنجیدگی سے ہی لیتی آئی تھی۔ مگر تب اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں جب عمر مبارک نے اسے اس کی ایک تصویر سینڈ کی۔۔۔ اس کی پریشانی کا عالم ہی اور تھا اور ازحد درجہ پریشانی کے باوجود اس نے اگلے کئی روز تک عمر کی کالز کو اٹینڈ نہ کر کے اسے مسلسل اگنور کرنے کی پالیسی روا رکھی تو اس کے دھمکی آمیز میسجز میں شدت آنا شروع ہو گئی تھی۔

"آئی تھنگ مجھے گھر والوں کو اس صورت حال سے آگاہ کر دینا چاہیے بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتیں بہت سنجیدہ صورت حال اختیار کر لیتی ہیں اور گھر والوں کو تب پتا چلتا ہے جب پانی سر سے اونچا ہو جاتا ہے۔"

"بالکل صحیح، میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔" فائزہ نے تائید کی تھی۔ سو عرفہ نے نہ صرف سفیر بلکہ بھیا کو بھی صورت حال سے باخبر کرنے میں دیر نہیں کی تھی۔

"بچے آپ نے گھر والوں کو کیوں زحمت دی۔ اگر ایسا کوئی ایشو تھا تو آپ خود ہی مجھے بتا دیتیں اگر ہم اسٹوڈنٹس کے پرابلمز سولو نہ کریں تو ہمارا یہاں بیٹھنا تو بے کار ہوا نا۔" ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ میڈم صغریٰ نے نہایت توجہ سے بات سن کر عرفہ اور عمر مبارک کو بھی بلوا بھیجا تھا۔

اور عمر مبارک پہلے تو عرفہ کو ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ آفس میں دو مردوں کے ساتھ بیٹھا دیکھ کر حیران ہوا اور پھر خود کو انتہائی لاپروا ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی۔

"زیرو زیرو نائن ایٹ فائیو۔۔۔ آپ کا نمبر ہے عمر مبارک۔"

"یس میم" اس نے ان سے آنکھیں ملائے بغیر جواب دیا تھا۔

"اور اس نمبر سے اپنی کلاس فیلو عرفہ ریاض کو بہت سارے میسجز بھی آپ نے کیے ہیں، کلاس فیلوز بہنوں کی طرح ہوتی ہیں۔" میڈم صغریٰ نے عرفہ کا موبائل اٹھا کر ان باکس کھولتے ہوئے پتا نہیں نصیحت کی تھی یا سوال۔

"میں تمہیں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑوں گا۔" انہوں نے خود کلامی کے انداز میں میسج پڑھا تھا۔

"میں تمہیں رسوا کر دوں گا۔"

"ویری گڈ۔" استہزائیہ انداز میں انہوں نے تبصرہ

کیا تھا۔

"میں تم پر تیزاب پھینکوا دوں گا۔"

"آپ اپنی کوئی صفائی دینا چاہیں گے عمر مبارک۔"
میڈم صغریٰ نے موبائل ٹیبل پر واپس رکھتے ہوئے اپنی چیئر کا رخ اس کی طرف کیا تھا۔

"نو میم۔" اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا تھا۔

"او کے...."

Umar you are expel from this department

اور اگر آئندہ آپ نے اس اسٹوڈنٹس سے کنٹیکٹ کرنے کی کوشش کی یا آپ اس ڈیپارٹمنٹ کے اردگرد بھی نظر آئے تو میں پولیس کال کرنے میں دیر نہیں کروں گی۔" عمر مبارک سرخ چہرے کے ساتھ آفس سے نکلا تھا۔

☆ ☆ ☆

"عرفہ ہمارا پرائیویٹ کالج ہے' ہم اسٹوڈنٹس کو ایکسٹرا آرڈنری فیور دیتے ہیں مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسٹوڈنٹس ہمارے سر پر چڑھ کر ناچیں۔"

"سر آپ لوگوں نے اچھا کاروبار کھولا ہے پہلے لوگوں کو قائل کرتے ہیں اور جب فیس بٹور لیتے ہیں تو اس کے بعد آپ کے اسٹاف کے مس بی ہیویئر کی کوئی لمٹ ہی نہیں ہوتی۔"

"اور تو کسی اسٹوڈنٹ کی کمپلین نہیں آئی...."

"مجھے اس سے مطلب نہیں ہے کہ کسی اور کی کمپلین ہے یا نہیں۔" زین العابدین آفس میں داخل ہوا تو پرنسپل عاصم رضا کو فون پر محو گفتگو پایا تھا۔

"او کے آپ آفس آجائیں میں تفصیل سے میں آپ سے بات کرتا ہوں۔"

"بیٹھو زین.... یہ لیٹ کمر اسٹوڈنٹ عرفہ کا کیا جھگڑا ہوا ہے تمہارے ساتھ' مجھے اس کی بات پر یقین تو نہیں آرہا مگر...."

"کر لو اس کی بات پر یقین...." وہ یک دم بھڑک کر اٹھ کھڑا ہوا تھا" اس نے جو کہا وہ سب سچ ہے۔" وہ دانت پیس کر کہہ رہا تھا۔

"کیا مطلب ہے زین؟ تم نے اس کے ساتھ ایسا مس بی ہیو کیوں کیا ہے؟" عاصم اٹھ کر اس کے پاس آن کھڑا ہوا تھا۔

"یہ تو کچھ بھی نہیں ہے میرا دل چاہتا ہے میں اس خاندان کے ایک ایک فرد کو زندہ زمین میں گاڑ دوں اور...."

"کس خاندان کی بات کر رہے ہو زین؟ عرفہ کا تعلق کس خاندان سے ہے؟" عاصم نے اس کی بات کاٹ کر الجھن زدہ انداز میں پوچھا تھا۔

"یہ لڑکی.... یو نو عاصم یہ لڑکی ابوذر ریاض کی بہن ہے۔ اسے میں نے فواد صدیقی کی گاڑی سے اترتے دیکھا تھا اور اس کے ڈاکومنٹس چیک کیے تو مجھے سمجھ آئی کہ یہ...."

"واٹ....؟" عاصم کو جیسے جھٹکا لگا تھا۔

"کیا عرفہ کو پتا ہے کہ تم....؟"

"پتا نہیں...."

"اگر یہ لڑکی ابوذر ریاض کی بہن ہے تب بھی وہ یہ بی ہیویئر ڈیزرو نہیں کرتی...." شاک سے نکل کر چیئر سنبھالتے ہوئے عاصم نے کہا تھا۔

"کیوں ڈیزرو نہیں کرتی۔ میرا خون کھول اٹھتا ہے اسے دیکھ کر...."

"زین.... یہ لڑکی مجرم نہیں ہے مگر اس کے باوجود اس کے ساتھ جو کچھ ہوا اور جو ہو رہا ہے وہ کم نہیں ہے تم اس پوائنٹ پر بھی سوچو۔"

"مے آئی کم ان سر...." تبھی عرفہ نے دروازے سے اندر داخل ہونے کی اجازت طلب کی تھی۔

"آئیں عرفہ بیٹھیں پلیز.... زین آؤ تم بھی بیٹھو۔" عرفہ بیٹھ چکی تھی مگر زین العابدین اپنی جگہ پر رخ موڑے کھڑا رہا۔

"یہ آپ دونوں کا فیملی ایشو ہے اور اسے آپ دونوں ہی سلجھا لیں تو اچھا ہوگا۔"

"کیا فیملی ایشو سر!" عرفہ نے الجھ کر پوچھا تھا۔

"عرفہ کیا آپ نہیں جانتیں کہ یہ زین العابدین ہیں

عمر مبارک کے بڑے بھائی۔" عاصم نے بغور اسے دیکھتے ہوئے انکشاف کیا تو عرفہ کی آنکھیں حیرت کی شدت سے پھیل گئیں اسے لگا کالج کی عمارت دھڑام سے اس کے اوپر آن گری ہے۔

زین العابدین اس کی طرف دیکھے بغیر تیزی سے آفس سے نکلتا چلا گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"آج لاسٹ پیپر تھا۔ بھیا ان شاء اللہ کل میں گھر آؤں گی۔" فائزہ کو اس نے کینٹین بھیجا تھا کہ کچھ کھانے کو لے آئے تبھی بھیا کی کال آنے پر وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ کر بات کرنے لگی تھی۔

"جی 'فاطمہ آنٹی کا ڈرائیور اڈے تک چھوڑ آئے گا۔" وہ ایم اے ایجوکیشن کے تینوں سمسٹرز فاطمہ آنٹی کے گھر آتی جاتی رہی تھیں۔ اس شہر میں قیام پذیر ہونے کے باعث اس کی خبر گیری کی ذمہ داری بھی انہوں نے ہی نبھائی تھی۔

"میں آٹھ بجے تک نکلوں گی ساڑھے دس بجے تک پہنچ جاؤں گی۔"

"جی جی میں نکلتے ہی آپ کو کال کردوں گی۔ اوکے اللہ حافظ۔" وہ جونہی فون بند کرکے پیچھے مڑی جی تیزی سے ستون کی آڑ میں ہوا اور پھر کاریڈور کے آخری سرے پر جاکر نمبر ڈائل کرنے لگا تھا۔ وہ بہت دنوں سے عمر کے کہنے پر عرفہ کا تعاقب کر رہا تھا۔

"ہاں جی بولو۔" دوسری طرف عمر نے بے زاری سے کہا تھا۔

"زبردست نیوز وہ کل گھر جا رہی ہے۔" جی نے پرجوش انداز میں اطلاع دی تھی۔

"کب... کس کے ساتھ۔" دوسری طرف عمر بھی الرٹ ہوا تھا۔ یہ بھی دونوں فریقین کی بدقسمتی تھی کہ یہی عمر مبارک کے والد کی کوچ کمپنی تھی اور صبح عرفہ کو ان کی کوچ میں سفر کرنا تھا۔ ایک بڑی کوچ کمپنی کے مالک کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے زیادہ تر ڈرائیور اور کنڈیکٹر اسے جانتے تھے اور ایسے میں اپنی پلاننگ پر عمل درآمد کرنا عمر کے لیے کوئی مشکل نہ تھا۔ کوچ شہر میں داخل ہوئی تو اس کی رفتار قدرے کم ہوگئی تھی اور خاص طور پر اسٹینڈ کی طرف بڑھتے ہوئے رینگ رہی تھی۔

"اگر کسی نے اترنا ہے تو یہیں اتر جائیں۔" ڈرائیور نے ایک منٹ کے لیے بریک لگا کر پیچھے مڑ کر کہا تھا۔

"اف اوہ بھیا تو یقیناً" اسٹینڈ پر ہی ویٹ کر رہے ہوں گے۔" عرفہ کوفت سے سوچتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"آپ ایک منٹ بیٹھیں باجی... آپ کا بیگ اوپر ہے اسٹینڈ پر پہنچ کر میں اتار دیتا ہوں۔" کنڈیکٹر نے اسے اٹھتے دیکھ کر کہا تو وہ دوبارہ سے سیٹ پر بیٹھ گئی اور کھڑکی سے باہر شہر کی بے ہنگم ٹریفک کو دیکھنے لگی تھی۔ یہ ابوذر ریاض کی عادت تھی کہ جب بھی عرفہ گھر آنے کے لیے کسی کوچ پر بیٹھتی وہ ڈرائیور سے اس کا نمبر ضرور معلوم کرتے اور آج انہیں آنے میں کچھ دیر ہوگئی تھی۔ تبھی انہوں نے کوچ کو اسٹینڈ کی طرف جاتے دیکھا تو دھیمی رفتار سے اپنی گاڑی بھی اس کے پیچھے لگادی 'نمبر دیکھ کر انہیں اندازہ ہو چلا تھا کہ عرفہ اسی کوچ سے اترنے والی ہے۔

عرفہ چونکہ ڈرائیور کے پیچھے والی سیٹ پر ہی تھی لہٰذا اس نے مڑ کر نہ دیکھا کہ پوری کوچ خالی ہو چکی ہے اور تبھی ایک ہاتھ اس کے کندھے پر آن ٹھہرا تھا۔ اس کے لبوں سے ایک چیخ نکلی تھی۔

"تم کیا سمجھ رہی تھیں یونیورسٹی سے مجھے نکلوا کر تمہاری جان چھوٹ جائے گی میں تو دنیا کے آخری سرے تک تمہارا پیچھا کر سکتا ہوں۔" اس نے دوسرے ہاتھ میں پکڑا رومال اس کے منہ پر رکھنا چاہا تھا۔

ڈرائیور اور کنڈیکٹر جنہیں عمر نے یہ کہا تھا کہ وہ باقی لوگوں کے نیچے اترنے کے بعد اس لڑکی سے کوئی بات کرنا چاہتا ہے۔ عرفہ کے تیزی سے چیخ کر اٹھنے اور عمر کے اس کا بازو کھینچنے پر چونکے تھے۔

"کیا کرتے ہیں صاحب یہ بس ہے کوئی بند کمرہ تو نہیں... کتنے لوگ متوجہ ہو جائیں گے۔" ڈرائیور

نے بریک لگا کر اسے کہا اور کنڈیکٹر بھی قریب آ کر سمجھانے لگا تو عرفہ کو موقع ملا وہ تیزی سے بھاگ کر کوچ کے دروازے پر پہنچی اور عمر کنڈیکٹر کو دھکا دے کر ہٹاتے ہوئے اس کے پیچھے آیا اور اسے روکنے کی کوشش میں عرفہ کی چادر کا پلو اس کے ہاتھ میں آ گیا تھا عرفہ دروازے سے اترتے جھٹکا کھا کر نیچے گری تھی اس کا سر ننگا ہو چلا تھا یہ منظر گاڑی میں پیچھے آتے ابوذر ریاض نے دیکھا تھا اور عرفہ کے پیچھے اس کی چادر کھینچنے والے عمر مبارک کو بھی۔۔۔

☼ ☼ ☼
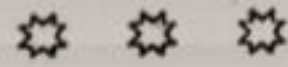
"تمام حالات و واقعات "گواہوں کے بیانات، پوسٹ مارٹم رپورٹ اور پولیس انکوائری کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ عدالت اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ملزم ابوذر ریاض نے بوجہ ذاتی عناد مقتول عمر مبارک کو بے رحمی سے قتل کیا ہے۔ لہٰذا انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے یہ عدالت سابقہ عدالت کے فیصلے کو بحال رکھتے ہوئے ملزم ابوذر ریاض کو سزائے موت کا حکم دیتی ہے۔" کمرہ عدالت کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور عمر مبارک قتل کیس کے فیصلے کی ہائی کورٹ نے چھ دن پہلے تاریخ دی تھی اور بالآخر اس تاریخ پر ایک خاندان کی امیدوں کا چراغ لرز کر رہ گیا تھا وہ شعلہ امید بھی بجھ چکا تھا جس کے تحت ان کے دل کو آسرا ملتا تھا کہ شاید یہ عدالت پھانسی کے حکم کو عمر قید میں تبدیل کر دے جہاں بار کے وکلا کی بڑی تعداد موجود تھی وہیں دونوں پارٹیوں کی طرف سے بہت سے لوگ احاطہ عدالت میں موجود تھے اور عرفہ ریاض بھی جس کی قسمت میں تقدیر نے یہ دن بھی لکھ ڈالے تھے کہ 'زندگی گویا بدل کر رہ گئی تھی۔

کیپٹن سفیر کی شادی ہو چکی تھی پھوپھو نے اس قصے کو وجہ بنا کر رشتہ ہی توڑ ڈالا تھا۔ اگر بھابھی کے میکے کا سہارا نہ ہوتا تو۔۔۔ ان کے بھائی فواد صدیقی نے ہی زیادہ تر کیس کی پیروی میں دن رات ایک کیے تھے مگر کیس اتنا مضبوط تھا کہ امید کی کوئی صورت نظر نہ آتی۔

"یس فواد صاحب۔۔۔" لائر نے ٹرے میں سے کولڈ ڈرنک اٹھا کر ان کی طرف بڑھائی تھی۔

"لو بیٹا آپ بھی۔۔۔" اس نے عرفہ کو لینے کا اشارہ کیا مگر وہ یونہی سر جھکائے بیٹھی رہی حقیقتاً "اس کا دل چاہ رہا تھا دھاڑیں مار مار کر رو دے۔

"فواد صاحب۔۔۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن یقین کریں آپ کسی بھی وکیل کے پاس جائیں وہ آپ کو یہ ہی کہے گا کہ اس کیس میں امید کی کوئی صورت نہیں ہے سوائے اس کے کہ مقتول کے ورثا صلح پر آمادہ ہو جائیں۔"

"وکیل صاحب ہم اس سلسلے میں ہر ممکن کوشش کر چکے ہیں۔ پھر بھی وہ کسی صورت صلح پر تیار نہیں ہوتے۔ پھر عمر مبارک کے باپ کے پاس پیسے کی کمی نہیں ہے وہ کیوں صلح کرے گا۔"

"آپ لوگ انہیں اس وقت کی سچویشن سے آگاہ کریں ہو سکتا تھا کہ ان کے دل میں انسانیت آ جائے۔۔۔"

"وہ لوگ بات سننے پر آمادہ ہوں تب نا۔۔۔" فواد صدیقی نے مایوسی سے کہا تھا۔

"کوئی اپروچ استعمال کرو۔۔۔ کوئی پنچائت کا راستہ ڈھونڈو۔"

☼ ☼ ☼
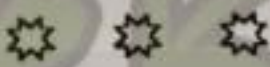
بھابھی کی والدہ عصمت آنٹی اور فواد بھائی کو سلام کر کے وہ چائے بنانے کے لیے کچن میں چلی آئی تھی۔ اور جب چائے کی ٹرے لا کر اس نے ٹیبل پر رکھی تو تینوں نفوس بالکل خاموش تھے یا عرفہ کو یوں لگا جیسے وہ اسے دیکھ کر خاموش ہوئے تھے لہٰذا وہ واپس کچن میں چلی آئی اور بے دلی سے بچی ہوئی چائے کپ میں ڈال کر پینے لگی تھوڑی دیر میں ان دونوں کی واپسی ہوئی تو بھابھی کچن میں آ کر برتن دھونے لگی تھیں۔ "بھابھی فواد بھائی نے بتایا نہیں ثالثی صاحب نے کیا بات کی ہے۔ وکیل صاحب کے ایک جاننے والے کرنل ثالثی کے ذریعے فواد بھائی نے پنچایت کا سہارا لے کر ورثا

سے ایک بار پھر بات کرنے کی کوشش کی تھی۔

"نہیں۔" بھابھی مختصر جواب دے کر اپنے کام میں لگی رہیں۔

"اچھا میں سمجھی فواد بھائی کوئی ضروری بات کرنے آئے تھے۔" جواباً" پھر خاموشی چھائی رہی۔

"نہیں بھابھی؟" اس نے پھر دوہرایا تھا۔

"عرفہ..." بھابھی نے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ سنک میں رکھ کر اس کے چہرے پر اداس نظر ڈالی تھی۔

"وہ لوگ بہت مشکل سے خون بہا پر راضی ہوئے ہیں۔"

"کیا... واقعی؟" اس نے خوشی سے پوچھا تھا۔

"کتنی رقم کا مطالبہ کیا ہے؟"

"رقم نہیں..." یک دم اپنی بات ادھوری چھوڑ کر وہ رو پڑی تھیں اور عرفہ پھٹی پھٹی نظروں سے انہیں روتے ہوئے دیکھتی چلی گئی اس کے پاس کوئی حرف تسلی نہ تھا۔ نہ اپنے لیے نہ ان کے لیے۔

☼ ☼ ☼
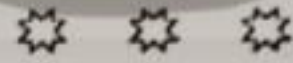
وہی کالج تھا اور وہی در و دیوار اور گیلریاں تھیں۔ لمبے لمبے کاریڈور میں گھومتے بوائز کے بلند بانگ قہقہوں سے دیواریں جھنجنا جاتیں... اور لڑکیوں کے شوخ چنچل قہقہے کمروں میں کھنکھارتے پھرتے... اگر کوئی تبدیلی آئی تھی تو وہ دو افراد کے لیے تھی۔ عرفہ حتی الامکان اس کا سامنا کرنے سے کتراتی... اگر کوئی ایسا اتفاق ہو بھی جاتا تو راستہ بدل لیتی اسے زین العابدین کی شعلہ بار نظروں سے خوف آتا تھا۔

"عرفہ ریاض کون سی بچی ہے بھا... ئی۔" کاریڈور میں بخشو بابا آوازیں لگاتے پوچھ رہے تھے۔

"جی بابا میں ہوں۔" وہ لائبریری کے دروازے پر آن کھڑی ہوئی۔

"آپ کو پرنسپل صاحب نے بلایا ہے۔"

"اچھا..." اس نے پرسوچ انداز میں کہا اور اس کے ساتھ ہی آفس کی جانب چل دی۔

"مس نویدہ کے کچھ پرابلمز چل رہے تھے تو انہوں نے آف لیا ہے ان شاءاللہ ہمیں دوبارہ جائن کریں گی۔" آفس کے دوسری طرف بیٹھے بندے سے بات کرتے ہوئے انہوں نے سر کے اشارے سے عرفہ کو اندر آنے کو کہا تھا۔

"پلیز بیٹھیں عرفہ۔"

"اچھا سر پھر مجھے اجازت..." وہ شخص اجازت لے کر چلا گیا تو وہ عرفہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ "عرفہ میری زین سے اسٹوڈنٹ لائف سے جان پہچان ہے۔ آئی تھنک ہی از ویری نائس مین بٹ... آپ کے بھائی کے کیس میں اس نے اور اس کی فیملی نے جس ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا ہے اس کی توقع میں خود بھی نہیں کر سکتا تھا بہرحال آپ مایوس نہ ہوں ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن اس معاملے میں ہم واقعی بہت مایوس ہیں پچھلے تین سال سے۔ جس خواری کا سامنا ہمیں ہے اس کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔"

"مجھے اچھی طرح سے آپ کی پرابلمز کا اندازہ ہے میں چاہتا ہوں کہ آپ زین سے اس سارے ایشو پر خود بات کریں جب اسے اندازہ ہوگا کہ عمر کی اس سارے معاملے میں کس قدر غلطی تھی تو یقیناً" آپ کی فیملی کے لیے اس کے دل میں سوفٹ کارنر پیدا ہوگا۔"

☼ ☼ ☼
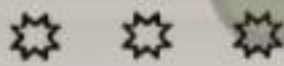
"بابا جان یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ ایک طرف ہمارے بھائی کے قاتل کو معاف کر رہے ہیں اور دوسری طرف ایک ان دیکھی لڑکی میرے سر منڈھ رہے ہیں؟"

زین العابدین نے انتہائی غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا تھا۔ اس کے بڑے بھائی علی حسن کے بھی کم و بیش یہی تاثرات تھے۔

"دیکھو زین حاجی رب نواز اور دوسرے لوگوں کے اصرار نے مجھے ایسا سوچنے پر مجبور کر دیا ہے میں نہ تو تمہارے بھائی کے قاتل کو معاف کر رہا ہوں اور نہ ہی

کوئی ان دیکھی لڑکی تمہارے سر منڈھ رہا ہوں۔ مجھے تو ابوذر ریاض اور اس کے خاندان کو ذلیل کرنے کا ایک اور طریقہ ہاتھ لگا ہے۔"

"کیا مطلب ہے بابا جان؟ ہم لڑکی خون بہا میں اسی لیے لے رہے ہیں تاکہ عدالت میں صلح کا بیان دیں۔"

"فیصلہ تو یہی ہوا ہے لیکن ایک دفعہ زین اس لڑکی سے نکاح کرلے پھر دیکھو میں کیا کرتا ہوں۔"

"ہوں!" علی حسن نے پرسوچ انداز میں کہا تھا "بابا جان کیا آپ بھی میری طرح یہ سوچ رہے ہیں کہ اس لڑکی کو گھر لانے کے بعد زین دوسری شادی کرے اس طرح....."

"شادی تو زین کی صرف ایک ہی ہوگی اور وہ ہم بہت دھوم دھام سے کریں گے۔" ان دونوں بھائیوں کے چہروں پر الجھن کے تاثرات تھے۔

طاہر قیوم کا بزنس کافی پھیلا ہوا تھا ان کی زوجہ سردار بانو کافی سادہ خاتون تھیں اور طاہر قیوم معروف اداروں کے پڑھے اعلا سوسائٹی کے پروردہ تھے تین بچوں کی موجودگی میں زندگی بالکل آسان تھیں اور ایک فضائی سفر کے دوران ملنے والی فضائی میزبان سوزین طاہر قیوم کی زندگی میں آگئی اور سردار بانو کی کوئی جگہ نہ رہی۔

علی حسن اور زین العابدین کانونٹ میں زیر تعلیم تھے۔ البتہ عمر مبارک کافی چھوٹا تھا۔ طاہر قیوم نے بچے اپنے پاس ہی رکھے تھے عمر مبارک پر ابتدا میں کوئی توجہ دینے والا نہ تھا طاہر قیوم نے اسے لاڈ پیار تو دیا مگر ماں کی تربیت نہ دے سکے۔ ان کے لاڈ پیار کے نتیجے میں وہ ہاسٹل کی ڈسپلنڈ لائف سے گھبرا کر روتا، نتیجے میں طاہر قیوم اسے گھر لے آئے۔

محض تین سال بعد ہی سوزین انہیں چھوڑ کر وطن واپس لوٹ گئی مگر سردار بانو کو ان کی زندگی میں واپس لوٹنے میں گیارہ سال لگے تھے۔ جو کمی ابتدائی عمر میں ماں کی عدم موجودگی کے باعث اس کی تربیت اور شخصیت میں آئی وہ ساری زندگی نمایاں رہی۔ مگر طاہر قیوم قطعاً" ماننے کو تیار نہ تھے کہ ابوذر ریاض کے ہاتھوں اس کے حادثاتی قتل میں اس کا کوئی قصور تھا۔

اب جب فواد صدیقی نے جوڑ توڑ کے بعد انہیں صلح پر آمادہ کرنے کی کوشش کی تو وہ بمشکل خون بہا پر رضامند ہوئے تھے مگر یہ بھی ان کی ایک چال تھی۔

صلح کے فیصلے کی رو سے عرفہ ریاض کا زین العابدین سے نکاح ہوگیا اور رخصتی کورٹ میں صلح کے بیانات کے بعد ہونا طے پائی تھی۔

"میرا خیال ہے حاجی صاحب آپ فون کرکے پتا کریں وہ لوگ ابھی تک پہنچے کیوں نہیں ہیں۔" فواد صدیقی نے تیسری بار حاجی رب نواز کے پاس آکر کہا تھا۔ وہ سب احاطہ عدالت میں کھڑے دوسری پارٹی کے افراد کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے اور انتظار کی گھڑیاں طویل ہونے لگیں تو ان کی بے چینی بھی سوا ہونے لگی کیونکہ' دوسرے فریق کی آمد کا نام و نشان تک نہ تھا۔ وہ پنچایتی افراد کے سرپنچ کے ساتھ عرفہ کو عدالت لے کر آئے تھے جہاں صلح کے بیانات کے بعد عرفہ کو طاہر قیوم کے خاندان کے ساتھ چلے جانا تھا۔

"میں دو تین دفعہ کوشش کرچکا ہوں طاہر صاحب کا نمبر بند ہی جارہا ہے۔" اس نے موبائل نکال کر نمبر دوبارہ ڈائل کیے تھے۔

اور جب عدالت کا وقت ختم ہوا تو سب کے چہرے فق تھے طاہر قیوم کی طرف سے یہ چال تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی' نہ ہی اس علاقے میں قبائلی جرگے کی طرح پنچایت اتنی موثر تھی کہ زبردستی کسی سے فیصلے کو منوایا جاسکتا تھا۔

"میرا خیال ہے ہمیں گھر واپس جانے کے بجائے طاہر قیوم کے گھر جانا چاہیے یہ کئی زندگیوں کا ہی نہیں ہماری عزتوں کا بھی سوال ہے۔" واپسی کی بات کرنے پر حاجی رب نواز کے ساتھ ساتھ ایک اور سرپنچ نے بھی رائے دی تو سبھی نے اتفاق کیا تھا۔

اگر طاہر قیوم نے ابوذر ریاض کے خاندان کو ذلیل کرنے کا نیا طریقہ سوچا تھا تو یہ طریقہ یقیناً" کارگر ٹھہرا تھا۔ اگرچہ عرفہ نے یہ قربانی بھائی کی بریت کے لیے دی تھی مگر دل کے نہاں خانوں میں یہ سوال بھی اس کی قسمت پر آنسو بہا رہا تھا۔ کیا ایسی رخصتی بھی کسی کی

ہوئی ہوگی؟ یا خدا اس ذلت کے ساتھ رخصت ہونا کسی کا نصیب نہ بناتا۔ اس کے دل سے آہ نکل رہی تھی۔

دل میں اندیشے سر اٹھا رہے تھے۔

"کیا یہ قربانی اس کے بھائی کی بریت کا سبب بن سکے گی؟" اور اس سوال کا جواب اسے قیوم ہاؤس کے گیٹ پر ملا تھا جہاں یہ قافلہ تین گھنٹے رکا رہا تھا۔ مگر باوجود سب کے اصرار کے گھر کا کوئی فرد ان سے بات کرنے نہ آیا تھا صرف ملازمین تھے جو بار بار آکر بتاتے۔

"صاحب لوگ گھر پر نہیں ہیں مری گئے ہیں۔"

کیوں گئے ہیں اور کب واپس آئیں گے؟ یہ انہیں معلوم نہیں تھا۔

ابوذر ریاض کی سزا کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کردی گئی تھی اور گزرتے ماہ و سال نے ایک اتفاق کی صورت عرفہ کو زین العابدین کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ وہی زین العابدین جس سے اس کا کوئی رشتہ نہ تھا یا پھر سارے رشتے اسی کی ذات سے جڑے تھے بس یہ تھا کہ وہ کسی رشتے کو ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔ یہ کیا کم تھا کہ اس کا سارا خاندان اپنے انتقام پر پورا اتر رہا تھا۔

مگر عاصم رضا کے مشورے نے عرفہ کو سوچنے پر مجبور کردیا کیا پتا اس کی بات سن کر وہ کم از کم اپنے رویے کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جائے۔ وہ ایڈمن آفس کے باہر باغیچے میں کھڑی پودوں کے پتے نوچ نوچ کر پھینک رہی تھی اس کے اضطراب کا یہ عالم تھا کہ اسے خود بھی اپنی اس حالت کا احساس تک نہ تھا کافی دیر سے وہ انتظار میں کھڑی تھی کہ آفس خالی ہو تو وہ اندر جا کر بات کرے۔

"بیٹا آپ یہاں کیوں کھڑی ہیں؟" چوکیدار کافی دیر سے اسے یہاں کھڑا دیکھ رہا تھا سو اس کے پاس آکر پوچھ رہا تھا۔

"کچھ نہیں بابا جی۔۔۔ مجھے سر سے بات کرنی ہے۔"

"تو آپ اندر چلی جائیں نا۔" چوکیدار کے کہنے پر وہ ناچار آفس کی طرف بڑھی مگر اندر بیٹھے دو تین اسٹوڈنٹس کو دیکھ کر اندر جانے کی بجائے آفس کے سامنے سے گزر کر آگے چلی گئی تو چوکیدار نے اسے حیرت سے دیکھا تھا۔ اور کندھے اچکا کر واپس بینچ پر جا بیٹھا تھا تھوڑی دیر بعد واپس پلٹی تو اسٹوڈنٹس آفس سے نکل رہے تھے۔ کافی حوصلے کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے آفس کے اندر قدم رکھا تھا۔

"سر میں اندر آسکتی ہوں؟"

"No" اس نے فارمیلٹی کے طور پر کہا تھا مگر زین العابدین کا ایک لفظی انکار سن کر وہ جہاں کی تہاں رہ گئی۔

"سر مجھے آپ سے بات کرنی ہے؟" اس نے وہیں کھڑے کھڑے وضاحتی انداز میں کہا۔

"اور مجھے آپ کی کوئی بات نہیں سننی۔" سابقہ لہجے میں کہتے ہوئے اس نے ٹیبل پر رکھے فون سیٹ کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنا شروع کیے تو عرفہ واپسی کے لیے مڑ گئی۔

"اس کی زندگی میں امید کا پنچھی نہ پہلے تھا نہ اب۔۔۔ لہٰذا اس کے اڑنے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ زندگی بس ویسی ہی تھی جیسے پچھلے تین سال سے۔ اذیت کی بھٹی میں سلگتی، ناامیدی کے دامن میں پناہ لیتی ہوئی، آنے والے وقت کے خوف میں جکڑی ہوئی، قسمت کے اندھیروں سے الجھتی ہوئی اور ان اندھیروں میں امید کا چراغ روشن کرنے والا کوئی نہ تھا۔

☆ ☆ ☆
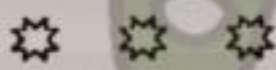
ایوارڈ سرمنی فنکشن کی ڈیٹ فکس ہوتے ہی میڈم ماہرہ نے ان سب کو طلب کیا تھا۔

"بچو آپ لوگوں کو پتا ہے نا کالج کا اینول فنکشن سر پر ہے۔"

"یس میم۔۔۔ ہم نے ڈریسز سلوانا شروع کردیے ہیں۔" نمو نے بعجلت کہا تھا۔

"ورائٹی شو کی کمپیئرنگ کے لیے ایک تو آپ کے بھائیوں میں سے ہوگا ایک آپ لوگوں میں سے ہو جائے۔"

"میرا تو کوئی بھائی ہی نہیں ہے۔" فضا نے پریشانی سے آنکھیں پھیلا کر سرگوشی نما انداز میں کہا تھا۔
"بدتمیز کلاس فیلوز کو بھائی کہہ رہی ہیں۔" عرفہ نے ڈپٹا تھا۔
"کوایجوکیشن میں ہم بھلا بھائیوں کے ساتھ پڑھنے آئے ہیں۔۔۔"
"کمال ہے آپ سب لوگ لوئرز بننے جارہے ہیں اتنی خاموشی کیوں ہے؟" میڈم نے حیرت کا اظہار کیا تھا۔
"یہ فضا بہت بولتی ہے میم۔۔۔"
"نو نو میں بالکل نہیں بولتی۔۔۔ اور آئندہ تو بالکل نہیں بولوں گی آئی پرامس مجھے یہ سزا نہ دی جائے بولنے کی۔۔۔" فضا نے فوراً" ڈرنے کی ایکٹنگ کی تو میڈم نے گھورا تھا۔
"شبنم ٹھیک رہے گی میم اس میں بہت کانفیڈنس ہے اور۔۔۔"
"میم پلیز مجھے گھر سے الاوڈ ہی نہیں ہے۔" اس نے فوراً" ٹوکا تھا۔
"عرفہ نہ صرف اچھا بولتی ہے بلکہ ریجنل لیول پر ڈی بیٹر بھی رہ چکی ہے۔" فضا نے اظہار خیال کیا تھا۔
"م۔۔۔ میرا تو فنکشن میں آنے کا ارادہ ہی نہیں ہے۔"
"میرا خیال ہے میں کمپیئرنگ کرلوں گی اگر کوئی کمی بیشی ہوئی تو ساتھ پرنسپل صاحب کو لے لوں گی آپ لوگ آرام سے تشریف رکھیے گا مہمان خصوصی کے ساتھ۔" میڈم ماہرہ کو حقیقتاً" غصہ آگیا تھا۔
"پلیز ڈونٹ مائنڈ میم ہم ابھی آپ کو ڈیسائڈ کرکے بتا دیتے ہیں۔" سب سے پہلے عرفہ نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا تھا۔
"اوکے آپ لوگ جاسکتے ہیں۔" میڈم نے ہنوز پھولے منہ کے ساتھ کہا تو وہ ایک دوسرے کو گھورتی باہر چلی آئی۔
اور سب کے پاس ایک سے بڑھ کر ایک بہانے تھے سب کا اصرار تھا کہ عرفہ ڈی بیٹر رہ چکی ہے لہٰذا یہ کام صرف اس کے بس کا تھا۔
"اور جہاں تک میٹر لکھ کر دینے کی بات ہے تو وہ ہم مل کر لکھ دیں گے تمہیں صرف اسٹیج پر بولنا ہوگا کیونکہ یہ ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔"
اور عرفہ جس نے بہت کانفیڈنس کے ساتھ پروگرام کی ابتدا میں مائیک سنبھالا تھا جیسے اپنی ساری چوکڑیاں بھول بیٹھی تھی۔ قاری مجاہد کے ذرا سے دیر سے آنے پر یا پھر زین العابدین کے ایک فقرے نے۔۔۔ وہ جو اپنی نفرت کے اظہار کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا۔ چاہے اس کی تنفر بھری نگاہیں ہوں۔۔۔ یا پھر کوئی طنزیہ استہزائیہ فقرہ۔۔۔ "مولوی صاحب میرا نکاح پڑھانے گئے ہیں دیر سے آئیں گے۔" کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ فقرہ کس کے لیے تھا اور جس کے لیے تھا اس کے ارد گرد گونج رہا تھا۔
ورائٹی شو کے اختتام پر ڈنر تھا اور وہ الگ تھلگ کونے میں ایک ٹیبل پر آکر بیٹھ گئی تھی۔ جبکہ باقی سب خوش گپیوں میں مگن پلیٹیں لیے ادھر ادھر پھر رہی تھیں ویٹر نے ایک دوبار اس کے پاس آکر پوچھا مگر اس نے نفی میں سرہلا دیا تھا۔ مہمانوں کے درمیان پھرتے زین العابدین کی نظر اس ٹیبل پر پڑی جہاں وہ ارد گرد سے بے نیاز بیٹھی تھی اور ایک استہزائیہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ تبھی اس نے عرفہ کو خاموشی سے باہر کی طرف کھسکتے دیکھا تو اس کی فخریہ مسکراہٹ اچنبھے میں بدل گئی۔ وہ جانتا تھا کہ تمام فی میل اسٹوڈنٹس ہاسٹل کی گاڑی میں آئی تھی۔ اب یوں اکیلے رات کے وقت۔ بحفاظت ہاسٹل پہنچ جائے گی؟ یہ بات اس کے سوچنے کی نہیں تھی مگر وہ سوچ رہا تھا۔
اور پھر بلا سوچے سمجھے فنکشن کو ادھورا چھوڑ کر پارکنگ سے عجلت میں گاڑی نکال کر روڈ پر ڈال دی تھی اور جب وہ اسے روڈ کنارے جاتی دکھائی دی تو بے اختیار ہی اس کے پاس بریک لگائے تھے۔ وہ گاڑی کے یوں اچانک پاس رکنے پر تیزی سے دور ہوئی پھر حیرت سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

"گاڑی میں بیٹھو۔" وہ فرنٹ ڈور کھول کر درشتی سے کہہ رہا تھا اور گاڑی میں بیٹھتے ہی عرفہ کے دماغ نے فوراً" کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہوٹل سے ہاسٹل کا فاصلہ محض آدھے گھنٹے کا تھا اور پندرہ منٹ گزر چکے تھے۔

"آئی تھنک آپ کا ہاسٹل آچکا ہے۔" وہ پندرہ منٹ بھی گزر گئے بلکہ عرفہ نے سوچنے میں ضائع کر ڈالے تھے اور اگر کوئی لمحہ بچا بھی تھا تو وہ اسے ضائع ہرگز نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"سر آپ میری بات سنیں۔"

"پلیز آپ اتریں گاڑی سے مجھے واپس جانا ہے۔" اس نے انتہائی بدتمیزی سے کہا تھا۔

"نہیں اتروں گی جب تک آپ میری بات نہیں سنیں گے۔" اس نے ہٹ دھرمی سے کہا تو وہ بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔

"اوکے آپ نے جو بکواس کرنا ہے کریں میں سن رہا ہوں۔"

"میرے بھائی کی غلطی نہیں تھی وہ عمر کو جانتے بھی نہیں تھے۔ اس نے ایک سال سے مسلسل میرا جینا دوبھر کر رکھا تھا اس روز اس نے ....." وہ انتہائی تیز رفتاری سے اسے بتاتی چلی گئی۔ "سر اگر آپ کو یقین نہیں آرہا تو اس کوچ کے ڈرائیور اور کنڈیکٹر سے مل کر پوچھ لیں انہوں نے بھی بار بار عمر کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اس کا رویہ انتہائی غیر مناسب ہے۔" پتا نہیں زین العابدین نے اس کی بات کو سنا تھا یا نہیں مگر وہ سب کچھ کہنے کے بعد ہی گاڑی سے اتری تھی۔

اور زین اگلے کئی دنوں تک اپنے ہی رویے پر الجھن کا شکار رہا بھلا اسے کیا ضرورت پڑی تھی کہ عرفہ دن کو اکیلی نکلے یا رات میں اس کے پیچھے جانے کی کوئی تک بنتی تھی۔

✡ ✡ ✡
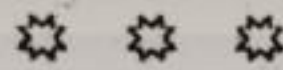
ایڈمن آفس میں ہلکے پھلکے ماحول میں فارم فل ہو رہے تھے کلیریکل اسٹاف کی موجودگی میں لڑکیوں کا ایک گروپ اپنے اپنے ایگزامز فارم فل کر رہا تھا۔

"لیجئے جی آپ کا فارم ہوا مکمل' اب یہاں سگنیچر بھی کر دیں۔" ایڈووکیٹ زین نے ایک نظر تمام ڈاکومینٹس پر ڈال کر نادیہ سے سائن کرنے کو کہا تھا اور جب اس نے سائن کر کے پیپرز اس کی طرف واپس بڑھائے تو وہ ایک بار پھر دیکھنے لگا تھا کہ شاید کوئی کمی رہ گئی ہو۔

"ویسے نادیہ آپ کا آئی ڈی کارڈ شو کرتا ہے کہ آپ کچھ زیادہ ہی پرانی ہیں۔" اس نے شگفتہ لہجے میں نادیہ کو مخاطب کیا تھا۔ نادیہ ایل ایل بی کی اسٹوڈنٹس میں سب سے میچور تھی اور وجہ بھی یہ تھی کہ وہ اردو میں ایم فل کرنے کے بعد اسے لاء کرنے کا شوق چڑھا تھا۔

تمام لڑکیوں کے چہروں پر دبی دبی مسکان آگئی۔

"سر اب اتنی بھی پرانی نہیں ہوں آپ سے تو تھوڑی کم پرانی ہوں۔" نادیہ نے بظاہر برامان کر کہا تھا۔

"اف نادیہ میں مانتا ہوں کہ میں نے بہت غلط بات کہی ہے مگر آپ نے تو حد ہی کر دی۔"

"سر میں نے حد کر دی ہے تو نکالیں ذرا اپنا آئی ڈی کارڈ....؟" اس نے تنک کر کہا تھا۔

"آئی ڈی کارڈ تو میرا گھر رہ گیا ہے۔" اس نے انتہائی ہوشیاری کا مظاہرہ کیا تھا۔

"سر آپ اتنے پرانے ہیں کہ آپ کا آئی ڈی کارڈ گھر رہ گیا ہے۔" اسماء نے انتہائی معصومیت سے سوال کیا تو کلیریکل اسٹاف سمیت تمام لڑکیاں کھلکھلا اٹھی تھی۔

"ویسے آپ کے بچے بھی ہماری طرح بہت اچھا اچھا پڑھ رہے ہوں گے نا سر؟" زونیرا کے گلوڈی پن سے اتنے نایاب سوال کی توقع کی جاسکتی تھی بھلا؟

"یا اللہ میں ان لڑکیوں کو کیوں چھیڑ بیٹھا؟" ایڈووکیٹ زین العابدین نے مصنوعی بے چارگی کے ساتھ خود کو کوسا تھا۔

"زونیرا بی بی ابھی تو مجھے یہ بھی نہیں پتا کہ عالم بالا میں میرے کتنے بچے دنیا میں آنے کو تیار پھر رہے ہیں اور آپ نے ان کے اسٹڈیز کا بھی سیاپا ڈال دیا۔" اس نے انتہائی سنجیدگی سے شکوہ کناں نظر زونیرا پر ڈالی تھی۔

"یہ تو ڈاکٹر صاحبہ آکر ڈیسائڈ کریں گی کہ کتنے بچے عالم بالا میں یہاں آنے کے لیے تیار ہیں۔" ایڈووکیٹ شیرازی نے اندر داخل ہوتے ہوئے اس کی بات سنی تھی۔ لہٰذا خود کو کہنے سے باز نہ رہ سکا تھا۔ اس کا شمار ان کے فیملی فرینڈز میں ہوتا تھا۔

"کون؟ ڈاکٹر صاحبہ کون سر؟" تمام اسٹوڈنٹس اس کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔

"اسٹوڈنٹس عنقریب آپ لوگوں کو ڈاکٹر شیریں صاحبہ اور ایڈووکیٹ زین العابدین کی شادی خانہ آبادی میں شرکت کا کارڈ ملے گا۔"

"ارے واقعی سر؟"

"جی آپ کو پہلے سے بتا رہا ہوں پھر یہ نہ ہو کہ عین وقت پر کہیں... ہائے اللہ جی دوپٹا تو ٹھیک سے ڈائی نہیں ہوا..." انہوں نے اپنی اسٹوڈنٹس کی نقل اتاری تھی۔

"سنو تمہارے پاس اس کلر کا دوپٹا ہو گا؟" تمام لڑکیاں بے ساختہ ہنسی تھیں جبکہ عرفہ ریاض نے پہلے توقف چہرے کے ساتھ ایڈووکیٹ شیرازی کو دیکھا اور پھر زین العابدین کو... اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیا تھا کہ زین العابدین نے جلدی سے نگاہیں چرائیں مگر اگلے کئی روز تک وہ سوچتا ہی رہا۔ اس پل عرفہ کی آنکھوں میں کیسا تاثر ابھرا تھا؟ دکھ کا، خوف کا، تعجب کا یا پھر سب کچھ لٹ جانے کا، کسی ایسے صدمے کا جس کے بعد زندگی بے معنی لگنے لگتی ہے۔ اور یہ بات اس نے اتنی بار سوچی تھی کہ اسے شمار کرنا ناممکن ہو جاتا۔ مگر یہ قطعاً نہیں سوچا تھا کہ وہ یہ سب کیوں سوچ رہا تھا اگر سوچ لیتا تو شاید جان لیتا کہ جو رشتہ ان دونوں کے درمیان تھا ایک بے نام احساس کے ساتھ اپنی جگہ بنا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے دوست شیر بخت کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ شیر بخت کا تعلق کوئٹہ کے ایک نواحی گاؤں سے تھا۔ شیر بخت کے گاؤں کا ٹور بہت تھکا دینے والا مگر جہاں اس شادی میں شرکت کے طفیل اسے بلوچی ثقافت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا وہیں شیر بخت اور اس کے کزنز کے ساتھ اس نے شکار اور سیر و تفریح کا بھرپور لطف اٹھایا تھا مگر اب مزید ایک دن کا آف لے کر اس بھرپور تھکن کو بے فکری سے اتار رہا تھا اس کی گہری نیند موبائل کی بپ سے ٹوٹی تھی۔ اس نے مندی مندی آنکھوں سے نمبر دیکھتے ہوئے یس کا بٹن دبایا تھا۔ دوسری طرف عقیلہ بھابھی تھیں۔

"ہاں زین کیسے ہو کیسی رہی شیر بخت کی شادی؟" حال احوال کے بعد وہ شادی کی رپورٹ لے رہی تھیں۔

"بہت زبردست... بھابھی آپ سنائیں گھر میں خیریت ہے۔"

"سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ اور میں نے تمہیں یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ ڈاکٹر شیریں بھی دبئی کانفرنس سے آگئی ہے اور اس کے دادا جان بھی عمرہ کر کے واپس آچکے ہیں۔ تو بابا جان کہہ رہے تھے کہ اسی ہفتے کا کوئی ٹائم لے لیتا ہوں۔"

"ہوں!"

"کیا ہوں؟ بھئی کوئی دن بتاؤ جب تم مکمل طور پر فری ہو گے۔ بابا جان دو دن پہلے اس معاملے میں مجھ پر سخت ناراض ہو چکے ہیں کہ اتنے مہینوں سے معاملہ چل رہا ہے اور ابھی تک کچھ فائنل نہیں ہو سکا۔ وہ تو اسے تمہاری اور میری نالائقی قرار دے رہے تھے بہرحال اب مزید دیر نہیں ہونی چاہیے تم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ لیتا اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ بزرگوں کے درمیان ہو گا۔"

"دیکھتا ہوں بھابھی... پھر آپ کو انفارم کر دوں گا"

بابا جان کہاں ہیں؟" اس نے بے دلی سے کہا تھا۔
"بابا جان تو زمینوں پر گئے ہیں لو ماں جی سے بات کرو۔" انہوں نے ماں جی کو موبائل دیا تو وہ قدرے غائب دماغی سے ان کے سوالوں کا جواب دینے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼
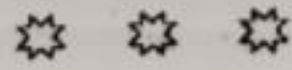
دما دم مست قلندر کی دھن پر ناچتے گاتے بدمست درویش شام کے اس شور شرابے میں گردوپیش سے بے نیاز جھوم رہے تھے زائرین کی ٹولیاں آتی جاتی سلام کر کے پلٹ رہی تھیں نذرانے کے صندوقچے کھلنے کا ٹائم ہو رہا تھا۔ "پنج اکھیوں والی سرکار کے مزار پر" کے مزار پر ڈوبتے سورج کے ساتھ دیا جلا کر وہ تیزی سے پلٹی تھی۔ اس نے رکشے والے کو رکنے کے لیے کہا تھا اور شام کے دھندلکے میں عصر کی اذانوں کے ساتھ پھٹ پھٹ کرتے رکشے میں واپسی کا سفر طے کر رہی تھی۔ سیاہ سوک اکارڈ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے زین العابدین کی نگاہ بے دھیانی میں اس پر پڑی اور پھر اسے گردوپیش کا دھیان کم ہی رہا تھا۔ وہ بھلا اس وقت کہاں سے لوٹ رہی تھی۔ یہ سوچنے کی ضرورت اسے قطعاً" نہ تھی مگر اس نے سوچا تھا اور اس قدر شدومد سے سوچا تھا کہ اس کا دھیان کچھ اور سوچنے کے مقابل ہی نہ رہا تھا۔ اس نے مناسب فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب شروع کیا تھا اور رکشا ہاسٹل کی سڑک پر مڑا تو وہ تیزی سے کراس کر کے ہاسٹل کے گیٹ پر آرکا تھا۔ عرفہ ریاض گیٹ پر آکر اتری تو وہ گاڑی سے اتر کر اس کے پاس چلا آیا تھا۔
"یہ آپ اس وقت اکیلی کہاں گئی تھیں؟" بلا سوچے سمجھے وہ اس کا راستہ روک کر ترش لہجے میں پوچھ رہا تھا۔
"میں تو ہمیشہ اکیلی جاتی ہوں آپ آج کا کیوں پوچھ رہے ہیں؟" بڑے تحمل اور سکون سے اس نے جواباً" سوال کر ڈالا تھا۔
"میں نے پوچھا ہے آپ اس وقت گئی کہاں تھیں؟" اس نے لفظ اکیلی ہٹا دیا تھا۔

"سر مجھے کسی نے بتایا تھا کہ سات جمعرات ڈوبتے سورج کے ساتھ "پنج اکھیوں والی سرکار کے مزار پر دیا جلانے سے بندھے ہاتھوں کی ہتھکڑیاں کھل جاتی ہیں میں نے سوچا جہاں میں نے زندگی کو گروی رکھ دیا وہاں یہ تو کوئی بڑی بات ہی نہیں۔" زین العابدین لاجواب ہو کر کھڑا رہا اور وہ اندر جا چکی تھی۔
مگر واپس پلٹنا اس کے لیے اتنا آسان نہیں تھا۔ اور واپس پلٹنے کے بعد بھی وہ بہت دیر تک حساب کتاب کرتا رہا۔ اس نے واپسی کے سفر میں عرفہ کو موسیٰ خیل کے قریب دیکھا تھا۔ اور "پنج اکھیوں والی سرکار" کا مزار تو بہت آگے تھا شاید پندرہ بیس کلومیٹر" اس کا یوں تنہا رکشے پر جانا اور۔۔۔ زین العابدین کی آنکھ جیسے کھلتے کھلتے کھل جاتی اور اگلی جمعرات وہ ہاسٹل سے خاصا دور گیٹ پر نظر جمائے محو انتظار تھا وہ باہر نکل کر رکشے پر بیٹھی تو اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے آگے بڑھا دی۔
اگر طاہر قیوم دیکھ لیتے جو قدم انہوں نے ابوذر ریاض کے خاندان کو خوار کرنے کے لیے اٹھایا تھا۔ ان کا وہی قدم اب ان کے لاڈلے زین العابدین کو کس طرح خاک چھاننے پر مجبور کر رہا تھا۔ مگر وہ نہیں دیکھ سکتے تھے۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم بھابھی" سائلنٹ موبائل نے بار بار وائبریٹ ہو کر اسے پچھلے دروازے سے کلاس روم سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔
"وعلیکم السلام۔"
"عرفہ کیسی ہو؟"
"میں ٹھیک ہوں آپ سنائیں خیریت ہے۔" بات کرتے کرتے وہ ساتھ میں خالی کلاس روم میں داخل ہو گئی تھی۔
"ہاں خیریت ہی ہے میں نے یہ پوچھنے کے لیے فون کیا تھا کہ اس سنڈے کو تمہارا گھر آنے کا ارادہ ہے یا نہیں۔"
"آپ بتائیں خیریت تو ہے قبل از وقت کیوں پوچھ

رہی ہیں؟"

"عیسیٰ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ تو رات کو بھی بھائی جان کو بلوانا پڑا میں سوچ رہی ہوں چند دنوں کے لیے امی کی طرف چلی جاؤں کوئی ایمرجنسی......"

"کیوں بھابھی عیسیٰ کی طبیعت زیادہ خراب ہے؟"

وہ ازحد پریشان ہو گئی۔

"ڈائریا ہو گیا ہے تو بھر۔ ابھی تو میڈیسن دے رہی ہوں دعا کرو بہتر ہو جائے۔" انہوں نے ہچکچاہٹ کے ساتھ بتایا تھا۔

"بھابھی میرا اس ہفتے آنے کا قطعا" کوئی ارادہ نہیں ہے آپ ضرور آنٹی کی طرف چلی جائیں وقت بے وقت عیسیٰ کو ہاسپٹل لے جانا پڑا تو آپ کو سہولت رہے گی۔" اپنا پروگرام دل ہی دل میں کینسل کرتے ہوئے اس نے یقین دہانی کرائی تھی۔ فون بند کر کے وہ کچھ دیر تک یوں بیٹھی رہی پھر یک دم ہی ٹیبل پر سر رکھ کر رو دی۔ بھابھی کی پریشانی کا خیال تھا پیارے ننھے بھتیجے کی تکلیف کا احساس یا پھر یہ احساس کہ اس پر یہ وقت بھی آنا تھا جب وہ ویک اینڈ پر اپنے گھر نہیں جا سکے گی اس کے تصور میں گھر پر پڑا تالا آرہا تھا۔

گھڑی پر ٹائم دیکھتے ہوئے وہ اپنے آفس سے نکل کر کلاس روم کی طرف آیا تھا مگر کلاس روم سے ایڈووکیٹ ذوالفقار صاحب کے بولنے کی آواز سن کر اندازہ ہوا کہ ان کا لیکچر ابھی جاری تھا۔ آفس کی جانب واپس جانے کے بجائے وہ انتظار کرنے کا ارادہ باندھ کر سامنے کلاس روم میں داخل ہوا مگر یک دم ٹھٹک گیا تھا۔ ٹیبل پر سر رکھ کر ہچکیوں اور سسکیوں کے ساتھ روتی عرفہ ریاض کو دیکھ کر اس کے قدم وہیں ٹھہر گئے تھے۔ ایک نامانوس سے احساس کے تحت عرفہ نے سر اٹھایا تھا۔

"کیا ہوا ہے آپ کو...... کیا مسئلہ ہے؟" بے ساختہ ہی وہ پوچھ بیٹھا تھا۔ حالانکہ اس کے مسئلوں سے وہ بے خبر کب تھا۔

"کچھ نہیں!" اس نے آنسو صاف کرتے ہوئے نفی میں سر ہلایا اور تیزی سے اٹھ کر کلاس روم سے

نکلتی چلی گئی۔ وہ کتنی ہی دیر تک وہاں کھڑا تھا۔

بہت دن پہلے اس کے دل میں کوئی دراڑ پڑی تھی کب؟ یہ زین العابدین نہیں جانتا تھا۔ وہ تو بس یہ جانتا تھا کہ آج اس دراڑ کی جگہ اس نے ایک شگاف نمودار ہوتے دیکھا تھا۔ اور یہ شگاف اتنا بڑا تھا کہ عرفہ ریاض با آسانی اس میں سے گزر کر قابض ہو گئی تھی۔ کوئی جگہ عمر مبارک کی تھی اور کہیں وہ قابض تھی۔

"کیا ہر رشتے کی اپنی اپنی جگہ ہوتی ہے؟" اس نے خود سے بار بار سوال کیا تھا اگلے کئی دنوں تک..... کئی ہفتوں اور مہینوں تک وہ بھابھی کو ٹال ٹال کر تھک گیا تو سب کچھ کہہ ڈالا تھا۔

"بھابھی ہمارے خاندان کی عورتیں پردوں والی گاڑیوں میں' سیاہ شیشوں والی گاڑیوں میں سفر کرتی ہیں۔ اور وہ ہر جگہ..... میں برداشت نہیں کر پاتا یہ نہیں کہ میں عمر کو بھول جاتا ہوں..... مگر میرا دل چاہتا ہے میں اس لڑکی کو بند کر دوں میں اسے پابند کر دوں قید کر دوں وہ یوں کہیں بھی نہ جا سکے اس کے چھوٹے چھوٹے بھتیجے ہیں۔ اس کے ساتھ آنے والا کوئی نہیں سوائے فواد صدیقی اور اس سے بھلا اس کا رشتہ ہی کیا ہے۔" سب جاننے کے بعد عقیلہ بھابھی نے صرف ایک بات کہی تھی۔

"وہ لڑکی تمہیں کہاں ملی زین؟" تم جانتے ہو تمہاری اس بات کی بھنک بھی بابا جان کو پڑ گئی تو وہ طوفان کھڑا کر دیں گے وہ بھلا گوارہ کر سکتے ہیں کہ......"

اور طوفان آیا پھر قیوم ہاؤس کے در و دیوار لرزا کر چھٹ بھی گیا کہ ہر طوفان کو چھٹ جانا ہوتا ہے اگر معاملہ اولاد کا ہو تو......

✲ ✲ ✲

اے شان کریمی مجھے مایوس نہ کرنا
تقدیر بدل جاتی ہے دعاؤں کے اثر سے

"ماشاء اللہ کتنا خوب صورت شعر ہے۔" حقیقتاً" شبنم کے پڑھے گئے اس شعر نے عرفہ کے دل کو چھو لیا تھا۔

"عرفہ اب تمہاری باری ہے۔"

بڑی بے اماں ہے زندگی ' اسے بن کے کوئی پناہ ملے
کوئی چاند رکھ میری شام پر میری شب کو مہکا گلاب کر
کوئی بدگماں سا وقت ہے کوئی بدگماں سی دھوپ ہے
کسی سایہ دار سے لفظ کو ' میرے جلتے دل کا حجاب کر

"واؤ... زبردست۔" سب نے دل کھول کر داد دی تھی۔

"ویسے اس زمین پر لکھا گیا ایک اور شعر بھی مجھ پر وارد ہو چکا ہے اگر...."

"عرفہ ریاض سے کوئی ملنے آیا ہے۔" دروازہ ناک کر کے پیون نے اطلاع دی تھی۔

"بیٹا میں آپ کو لینے آیا ہوں گھنٹے تک تیار ہو جاؤ میں ایک دو ضروری کام نبٹا کر آپ کو پک کرتا چلوں گا۔" نواد صدیقی نے مختصربات چیت کر کے بتایا تھا۔

"ٹھیک ہے بھائی جان۔"

"آپ اپنا سارا سامان پک کرلیں شاید آپ کا واپس آنا نہ ہو سکے۔"

"جی!" حیرت اور استعجاب سے وہ یہی کہہ سکی۔

"اصل میں عمر مبارک کے والد صلح کا بیان دینے پر راضی ہو گئے ہیں۔" عرفہ کو پہلے تو اپنے کانوں پر یقین ہی نہ آیا اور پھر خوف اور خوشی کے ملے جلے احساسات نے گھیر لیا تھا۔

☆ ☆ ☆
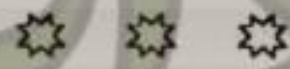
جو لوگ آتے ہوئے اس کے ساتھ آئے تھے وہ مہربان چہرے کورٹ کے احاطے میں ہی رہ گئے تھے وہ واپسی کا سفر یکسر اجنبی لوگوں کے ساتھ طے کر رہی تھی۔

بے تحاشا اندیشوں کے ساتھ دل میں ایک ہوک سی اٹھ رہی تھی۔ کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ بھیا کو آزاد دیکھ لیتی۔ وہ گھر لوٹ کر آتے تو تب اس اجنبی دیس کی مسافت اختیار کرتی۔ بیانات کے بعد رہائی کے عمل میں تین چار دن لگنے تھے۔

علی حسن ڈرائیو کر رہے تھے جبکہ ان کے ساتھ سنگلاخ چہرہ لیے طاہر قیوم بیٹھے تھے اور اپنی گفتگو میں جیسے اس کے وجود کو یکسر فراموش کر چکے تھے ڈھائی گھنٹے کی مسافت کے بعد گاڑی ایک چار دیواری کے اندر رکی تو وہ دونوں اتر کر اندر کی طرف بڑھ گئے تھوڑی دیر میں ایک ملازمہ نے اسے اترنے کو کہا اور اسے لیے طاہر قیوم کے کمرے میں چلی آئی جہاں گھر کے سارے افراد موجود تھے سمیت زین العابدین کے۔ جو ٹانگ پر ٹانگ رکھے طاہر قیوم کے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس نے محض ایک نگاہ اس پر ڈالی اور دوبارہ سے باپ کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

"بہو.... اس لڑکی کے سامان کو دیکھ لو۔ کوئی فالتو چیز اس کے پاس نہیں ہونی چاہیے کوئی موبائل وغیرہ۔" انہوں نے کڑے لہجے میں کہا تو عرفہ نے پرس میں سے موبائل نکال کر خود ہی علی حسن کی بیوی عقیلہ کی طرف بڑھایا تھا۔

"بہو اس لڑکی سے موبائل لے لو اور لڑکی یاد رکھو تمہارا اپنے پیچھے کسی سے رابطہ نہیں ہونا چاہیے یوں سمجھو وہ سب تمہارے لیے مر گئے۔" انتہائی سفاکانہ الفاظ پر یک دم اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں تو اس نے سر نیچے جھکا لیا تھا۔

"ہم نے تمہارے بھائی سے بدلہ لینے کے لیے یہ قدم اٹھایا ہے۔ ورنہ بہت جلد ہم زین العابدین کی پسند اور مرضی سے شادی کروا رہے ہیں۔" سچ یہی تھا کہ وہ اسی شرط پر راضی ہوئے تھے اگر زین العابدین ان کی خواہش پر دوسری شادی کرلے اور اس لڑکی کو صرف انتقاماً" اس گھر میں سسکتی زندگی گزارنے کے لیے لائے تو وہ صلح کے بیانات دے سکتے ہیں۔

"لے جاؤ اسے...." بالآخر اس کی پیشی اختتام پذیر ہوئی۔

"بھابھی کھانا لگوائیں مجھے تھوڑی دیر میں واپس جانا ہے۔" زین العابدین کے کہنے پر وہ کچن میں آئیں تو زین بھی عقیلہ کے پیچھے چلا آیا تھا۔

"بھابھی میں آج واپس جا رہا ہوں۔"

"ہاں تو جاؤ نا میں نے کب منع کیا ہے۔" انہوں

نے بے مروتی سے کہا تھا۔
"مجھے اکیلے ڈر لگتا ہے۔" اس نے معصومیت سے بتایا تھا۔
"اچھا کچھ کرتی ہوں۔۔۔ کہیں میری ہی بابا جان سے بے عزتی نہ کروا دینا۔"
"اماں جان۔۔۔ اس کو زین کے ساتھ بھیج دیں یہ اکیلا رہتا ہے تو کوئی ملازمہ بھی نہیں آتی۔۔۔ کام کی سہولت ہو جائے گی۔" عقیلہ نے اماں جان سے پوچھنے کے در پردہ طاہر قیوم سے اجازت لینا چاہی۔
"بیٹی جس کی چیز ہے وہی سنبھالے۔۔۔ اچھا برا جو سلوک ہے وہی جانے اس کو کھانا دو اور ساتھ کرو اس کے۔۔۔" سردار بانو کے کہنے پر طارق قیوم نے ہنکارا بھرا مگر خاموش رہے تھے۔
"کھانا نہیں کھایا تم نے؟" عقیلہ نے ٹرے میں رکھے جوں کے توں کھانے کو دیکھا تھا۔
"یہ کچھ کپڑے ہیں پتا نہیں تمہارے ناپ کے ہیں یا نہیں میں نے زین سے پوچھ کر اندازا" سلوائے تھے۔"
"چارلی۔ اس کو زین کی گاڑی میں بٹھا آؤ۔" عقیلہ کا دیا شاپر پکڑ کر وہ حیران تھی۔ جب گاڑی گاؤں کی حدود سے نکل کر نسبتاً" صاف شفاف روڈ پر پہنچی تو یکسوم رک گئی۔
"آگے آکر بیٹھو۔" اپنے دھیان سے چونک کر اس نے سنا تھا۔ وہ نارمل سے انداز میں فرنٹ ڈور کھول کر اس سے مخاطب تھا وہ کچھ کہے بغیر آگے آکر بیٹھی تو گاڑی دوبارہ سے اسٹارٹ ہو گئی۔
"یہ لو۔" وہ اس کا موبائل پاکٹ سے نکال کر اس کی طرف بڑھا رہا تھا عرفہ نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔
"میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ میرے دل میں تمہارے بھائی کی بہت گنجائش ہے۔ اور مجھے نہیں لگتا کہ جب تک مجھے عمر یاد رہے گا تب تک کوئی گنجائش نکلے گی۔ مگر میں تمہیں اپنے رشتوں سے ملنے اور رابطہ رکھنے سے نہیں روکوں گا۔ البتہ اتنا محتاط رہنا کہ بابا جان کو پتا نہ چلے۔۔۔ فی الحال فون پر ہی بات چیت کر لینا۔"
اور عرفہ کچھ بول نہ سکی بس اس کے زردی کھنڈے چہرے پر زندگی دوڑنے لگی تھی۔
"اور بابا جان نے تم سے جو کہا اس کے لیے بہت بہت معذرت۔۔۔ آئندہ کسی دوسرے کی باتوں پر مت رونا تمہارے آنسو مجھے ہارنے پے مجبور کر دیتے ہیں اور جو چیز ہمیں ہارنے پر مجبور کر دے وہ بالکل اچھی نہیں لگتی۔" عرفہ کو لگا اس کی زندگی میں اتنا حیرت بھرا دن کبھی نہیں آئے گا۔
"تمہارے لیے میرے دل میں ابھرنے والا پہلا احساس عزت کا تھا اور یہ احساس کب محبت میں بدل کر مجھے بے بس کر گیا مجھے پتا نہیں چلا۔" وہ اس کا گود میں دھرا ہاتھ پکڑ کر اسٹیئرنگ میں رکھ کر کہہ رہا تھا۔
"تم میری عزت محبت اور خواہش تو ہو مگر انتقام ہر گز نہیں تم کچھ کہو گی نہیں؟" وہ پوچھ رہا تھا اور عرفہ کا دل چاہا وہ کہے۔

ملنا تمہارا مجھ سے کوئی حادثہ نہ تھا
یہ کارنامہ دل کا کرشمہ دعا کا تھا

وہ گنگ سی خاموش تھی مگر اسے یقین تھا یہ سفر زندگی بھر کا تھا اور کبھی نہ کبھی وہ دل کو چھو لینے والے ان الفاظ کے سہارے اپنے جذبات کا اظہار کر سکے گی۔
ڈھلتی دوپہر کے سائے لمبے ہو کر ماحول کو ٹھنڈک بخش رہے تھے گاڑی کے باہر کا موسم جتنا سہانا تھا اندر کا اس سے زیادہ خوشگوار اور ان دونوں کے دل اس سہانے موسم کی لے پر یکساں تال سے دھڑک رہے تھے۔

☆ ☆
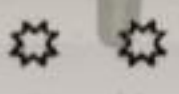
کچھ موتی چنے ہیں

ادارہ

مطالعہ کرتے ہوئے ہم مختلف احساسات سے دوچار ہوتے ہیں۔ کچھ جملے ہمارے فکرو احساس کے دریچوں پر دستک دیتے ہیں۔ کچھ تحریروں میں الفاظ کی خوب صورتی، تشبیہ اور استعارے سحر طاری کردیتے ہیں اور کچھ تحریریں پڑھتے ہوئے مسکراہٹ لبوں سے جدا نہیں ہوتی۔

کچھ موتی چنے ہیں۔ یہ سلسلہ ایسی ہی تحریروں کے لیے شروع کیا جارہا ہے۔ ہم اپنی قارئین سے درخواست کریں گے کہ وہ اس سلسلے میں حصہ لیں اور اپنی پسندیدہ تحریروں سے اقتباس ہمیں ارسال کریں۔

کامیاب عاشق

کامیاب عاشق وہ ہوتا ہے، جو عشق میں ناکام ہو، کیونکہ جو کامیاب ہوجائے وہ عاشق نہیں خاوند کہلاتا ہے، عاشق، شاعر اور پاگل ان تینوں پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ خود کسی پر اعتبار نہیں کرتے۔ اس دنیا میں جس شخص کی بدولت عاشق کی تھوڑی بہت عزت ہے وہ رقیب ہے، جب رقیب نہیں رہتا تو اچھے خاصے عاشق اور محبوب میاں بیوی بن جاتے ہیں۔ (ڈاکٹر یونس بٹ۔ شیطانیاں)

(طاہرہ ملک، رضوانہ ملک، جلال پور پیروالا)

محبت

محبت تاریک جنگل کی طرح ہوتی ہے ایک بار اس کے اندر چلے جاؤ پھر یہ باہر آنے نہیں دیتی، باہر آبھی جاؤ تو آنکھیں جنگل کی تاریکی کی اتنی عادی ہوجاتی ہیں کہ روشنی میں کچھ بھی نہیں دیکھ سکتیں وہ بھی نہیں جو بالکل صاف اور واضح ہوتی ہے۔ (عمیرہ احمد۔ ایمان، امید اور محبت)

(فلک قراۃ العین عینی۔ منڈی بہاؤالدین)

گدھا

مغرب کو گدھے میں قطعی کوئی مضحکہ خیز بات نظر نہیں آتی۔ فرانسیسی مفکر اور انشائیہ نگار مونیشن تو اس جانور کے اوصاف حمیدہ کا اس قدر معترف اور معرف تھا کہ ایک جگہ لکھتا ہے کہ۔

"روئے زمین پر گدھے سے زیادہ پر اعتماد، مستقل مزاج، گمبھیر، دنیا کو حقارت سے دیکھنے والا اور اپنی دھن میں مگن رہنے والا اور کوئی ذی روح نہیں ملے گا۔"

ہم ایشائی دراصل اس لیے گدھے کو ذلیل سمجھتے ہیں کہ اس میں کچھ انسانی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ مثلاً" یہ کہ اپنی سہار اور بساط سے زیادہ بوجھ اٹھاتا ہے اور جتنا زیادہ پٹتا ہے اور بھوکوں مرتا ہے اتنا ہی آقا کا مطیع، فرماں بردار اور شکر گزار ہوتا ہے۔ (مشتاق احمد یوسفی۔ آب گم)

(شبانہ عبدالستار۔ بہلول پور)

دکھ

اللہ تعالیٰ جس کو اپنا آپ یاد دلانا چاہتا ہے اسے دکھ کا الیکٹرک شاک دے کر اپنی جانب متوجہ کرلیتا ہے۔ دکھ کی بھٹی سے نکل کر انسان دوسروں کے لیے نرم پڑ

جاتا ہے پھر اس سے نیک اعمال خود بخود اور بہ خوشی سرزد ہونے لگتے ہیں۔ دکھ تو روحانیت کی سیڑھی ہے۔ اس پر صابر و شاکر ہی چڑھ سکتے ہیں۔ (بانو قدسیہ۔ دست بستہ)

(شازیہ اعجاز۔ فیصل آباد)

تخلیق کا فیصلہ

زندگی میں جو جذبہ آپ کو برباد کرنے لگے اس جذبے سے دور ہو جائیں کیونکہ انسان کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اس کی تخلیق کا فیصلہ خدا نے کیا ہے وہ خود خدا نہیں بن سکتا۔۔۔ وہ خود کو برباد نہیں کر سکتا۔ (سمیرا حمید۔ یارم)

(حمدا واجد۔ کراچی)

انسان اور شیطان

ایک عالی شان پلازہ کے سامنے شیطان کھڑا زار و قطار رو رہا تھا کہ انسان بہت احسان فراموش مخلوق ہے۔ ایک راہ گیر نے شیطان کو آہ و زاری کرتے اور انسان کو برا بھلا کہتے دیکھا تو وہ رک گیا اور اس نے شیطان سے اس کی وجہ پوچھی شیطان نے کہا۔

"کروڑوں روپے مالیت کا یہ پلازہ دیکھ رہے ہو؟ حاجی خدا بخش نے یہ پلازا میرے مشوروں پر عمل کے نتیجے میں حاصل شدہ سرمائے سے تعمیر کیا مگر جب یہ پلازا مکمل ہو گیا تو میرا شکر ادا کرنے کے بجائے اس کی پیشانی پر موٹے لفظوں میں۔

"ھذا من فضل ربی" لکھوایا۔ (عطاء الحق قاسمی۔ ہنسنا منع ہے)

(نسرین زمان۔ مری اسلام آباد)

وقت

آرنلڈ، مولانا شبلی اور علامہ اقبال کے استاد تھے موصوف علی گڑھ میں فلسفے کے پروفیسر تھے۔ ان کے وطن تشریف لے جانے کے موقع پر شبلی نعمانی کے ساتھ گئے۔ وہ بمبئی سے جہاز میں سوار ہوئے۔ جب جہاز عدن پہنچ کر آگے بڑھا تو اچانک اس کا انجن خراب ہو گیا۔ جہاز کے ملازمین اور کپتان گھبرائے گھبرائے تدبیریں کرتے تھے لیکن انجن بالکل بے کار ہو گیا۔ جہاز کے چلنے کی رفتار سست ہو گئی۔ شبلی فرماتے ہیں کہ وہ بصد اضطراب دوڑتے ہوئے موصوف کے پاس پہنچے تو دیکھا۔ وہ نہایت اطمینان سے کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ انہوں نے ان سے کہا۔

"آپ کو کچھ خبر بھی ہے؟"

وہ بولے "ہاں! انجن خراب ہو گیا ہے۔"

مولانا شبلی نے کہا "ایسی حالت میں یہ کتاب دیکھنے کا کون سا موقع ہے۔"

آرنلڈ صاحب نے فرمایا "جہاز کو اگر تباہ ہونا ہی ہے تو یہ تھوڑا سا وقت اور بھی قدر کے قابل ہے۔"

(فردوس بانو۔ نارووال)

جیل کے دانش ور

ہمارے ہاں چونکہ، جیل میں چھوٹے لوگوں کو صعوبتیں اور بڑے لوگوں کو "سہولتیں" حاصل ہوتی ہیں۔ لہٰذا اکثر بڑے لوگوں کے لیے جیل "جسٹ فار اے چینج" اور چھوٹے لوگوں کے لیے "جسٹ فار اے چینج" کے مترادف ہوتی ہے۔ بڑے لوگ جب جیل میں ہوتے ہیں تو باقاعدہ سے وہ کام شروع کر دیتے ہیں، جنہیں کرنے کی انہیں باہر فرصت نہیں ملتی، مثلاً "ڈاڑھی رکھ لینا" پانچ وقت نماز پڑھنا" تین وقت مطالعہ اور ہمہ وقت کتاب لکھنا وغیرہ وغیرہ بقول انکل سرگم! "جیل ایک ایسی بے ادب جگہ ہے، جہاں بڑا بڑا ادب تخلیق ہوتا ہے۔ (فاروق قیصر۔ تیلی تماشہ)

(اریشہ محمود۔ وزیر آباد)

☼ ☼

شعاع عبیر
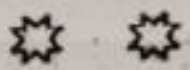
قرآن پڑھو

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ۔۔۔ "قرآن پڑھو' وہ قیامت کے دن اپنے پڑھنے والوں کے لیے شفاعت کرنے والا ہوگا' چمکتی ہوئی دو سورتیں پڑھو' سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران۔ یہ دونوں قیامت کے دن بادل ہوں گی یا دونوں سایہ کرنے والی چیزیں ہیں یا پرندوں کی صف باندھی ہوئی دو ٹکڑیاں ہیں (جو) اپنے پڑھنے والے کی طرف سے جھگڑا کریں گی۔ سورہ بقرہ پڑھو' اس پر عمل کرنا برکت ہے اور اس کو چھوڑنا حسرت ہے اور باطل لوگ اس پر عمل کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔"

2018

(مشکوۃ شریف' کتاب فضائل القرآن)

دنیا میں غموں کی وجہ

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ "جس وقت کسی بندے کے گناہ زیادہ ہوجاتے ہیں اور اس کے اعمال اس قدر نہیں ہوتے جس سے ان کے گناہ جھاڑ دے تو اللہ تعالیٰ اس کو غم میں مبتلا کردیتا ہے' تاکہ اس کے گناہ جھاڑ دے۔"

1494

(مشکوۃ شریف' باب عیادت المریض وثواب المرض)

رشیدہ فیض۔۔۔ جام پور

روزی دینے والا

حضرت حاتم ایک مرتبہ سفر پر جانے لگے تو اپنی بیوی سے فرمایا۔ "میں چار مہینے تک باہر رہوں گا' تمہارے واسطے کس قدر خرچ مہیا کرجاؤں۔"

انہوں نے جواب دیا۔ "جس قدر آپ کو میری زندگی منظور ہے۔"

حضرت نے فرمایا۔ "تمہاری زندگی میرے ہاتھ میں نہیں۔"

بیوی نے جواب دیا۔ "تو میری روزی بھی آپ کے ہاتھ میں نہیں۔"

حضرت چلے گئے تو ایک بڑھیا نے حضرت کی بیوی سے پوچھا۔ "حضرت آپ کے واسطے کتنی روزی چھوڑ گئے ہیں؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "حضرت خود ہی تو روزی کھانے والے تھے۔ جو کھانے والا تھا' وہ چلا گیا' جو دینے والا ہے وہ یہیں ہے۔"

ثمینہ کوثر عطاری' علیزے۔۔۔ ڈوگہ گجرات

مہکتی کلیاں

☆ کارخانہ قدرت میں فکر کرنا بھی عبادت ہے۔

(حضرت علیؓ)

☆ اللہ کی اطاعت قلب سے ہوتی ہے' قالب سے نہیں۔

(غوث الاعظمؒ)

☆ اگر کوئی تیرے حق میں بدی کرے اور تو کسی کے حق میں نیکی کرے دونوں کو فراموش کر۔

(امام جعفر صادقؒ)

☆ اگر چڑیاں متحد ہوجائیں تو شیر کی کھال کھینچ سکتی ہیں۔

(شیخ سعدیؒ)

☆ جب رشوت دروازے سے داخل ہوتی ہے تو امانت کھڑکی کی راہ سے نکل جاتی ہے۔

(رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم)

☆ جو لوگ زندگی کو ایک مقدس فریضہ سمجھ کر بسر کرتے ہیں' وہ کبھی ناکام نہیں ہوتے۔

(حضرت داؤد علیہ السلام)

☆ عورت سب سے اچھا اور سب سے آخری آسمانی تحفہ ہے۔

(رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم)

☆ تکلف کی زیادتی محبت کی کمی کا باعث بن جاتی ہے۔

(حضرت عیسیٰ علیہ السلام)

☆ گناہ ناسور ہے' اگر ترک نہ کرو تو برابر بڑھتا رہے گا۔

(امام جعفرؒ)

حسینہ ریاض "ظریف شہید" تحصیل شجاع آباد

گرجنے کے بعد

حکیم سقراط اپنے زمانے کا بہترین فلاسفر اور عظیم انسان تھا۔ اس نے جان بوجھ کر ایک جھگڑالو اور تند مزاج عورت سے شادی کی تھی' تاکہ حکیم کی ذات میں غصہ اور کینہ نہ رہے۔ ایک مرتبہ حسب عادت اس کی بیوی نے لڑائی جھگڑا کیا اور سقراط کو سخت برا کہا' پھر پانی سے بھری بالٹی ان کے سر پر انڈیل دی۔ اس ساری کارروائی کے بعد سقراط نے کمال تحمل سے صرف اتنا جواب دیا۔ "کیا گرجنے کے بعد برسنا بھی ضروری تھا۔"

فوزیہ ثمرین' ام ہانیہ عمران۔۔۔ گجرات

تین چیزیں

تین چیزیں ایک جگہ پرورش پاتی ہیں۔ (1) پھول' (2) کانٹے' (3) خوشبو۔

تین چیزیں ہر ایک کو ملتی ہیں۔ (1) موت' (2) خوشی' (3) غم۔

تین چیزیں ہر ایک کی الگ الگ ہوتی ہیں۔ (1) صورت' (2) سیرت' (3) قسمت۔

تین چیزوں کو کبھی چھوٹا نہ سمجھو۔ (1) قرض' (2) فرض' (3) مرض۔

مدیحہ نورین مہک۔۔۔ برنالی

یقین

غم اور مشکلات صرف اللہ کو بتایا کرو' اس یقین پر کہ وہ تمہاری آواز بھی سنے گا' مشکلات بھی دور کرے گا۔

حوصلہ

حالات کیسے بھی ہوں' کبھی بھی اپنے حوصلے کی دیوار کو گرنے مت دینا' کیونکہ لوگ اکثر ہی گری ہوئی دیوار کی اینٹیں اٹھا کر لے جاتے ہیں۔

مدیحہ۔۔۔ برنالی

سنہرے موتی

☆ رنگین خواب دیکھنے سے بہتر ہے کہ انسان ڈٹ کر زندگی کی بلیک اینڈ وائٹ حقیقتوں کا سامنا کرے۔

☆ اضطراب بے سبب نہیں ہوتا' بلکہ یہ بھولا ہوا سبق' چھوڑی ہوئی منزل اور نظر انداز کیے ہوئے فرائض یاد دلاتا ہے۔

☆ لوگوں کے آگے جھکنے سے بہتر ان سے مایوس ہونا زیادہ اچھا ہے۔

☆ دکھ صرف بچھڑنے کا نہیں ہوتا' بلکہ کبھی کسی سے ملنے کا بھی ہوتا ہے' جب کوئی بہت پرانا ہم دم دوست برسوں برسوں بعد لبوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں سرد مہری سجا کر ملے تو یہ ضرور سوچتا کہ اس وقت سے بچھڑنے کا دکھ زیادہ تھا یا ملنے کا۔

☆ ہم پرانے لوگوں کو یاد کرتے ہیں اور نئے لوگوں میں زندگی بسر کرتے ہیں' ہم ماضی کو معیار بنا لیتے ہیں اور حال کی زندگی کو اس معیار پر لانے کی کوشش کرتے ہیں' ہمیں سکون کیسے مل سکتا ہے' وہ لوگ چلے گئے' وہ

زمانہ بیت گیا اس کی یاد حال کو بدحال کر دے گی۔

☆ سچ ایک ایسی عمارت ہے، جو جھوٹ کی تیز و تند آندھیوں میں بھی شان سے کھڑی رہتی ہے۔

ثریا شاہ۔ کھوڑ پکا

ہم پوچھیے

☆ کہتے ہیں کہ جوڑے آسمان پر بنتے ہیں کیا واقعی؟
مگر ٹوٹتے زمین پر ہیں۔

☆ شوہر کو تفریح کا موقع کب ملتا ہے؟
بیوی کے میکے جاتے ہی۔

☆ ساس، سسر، سسرال، سالا، سالی ان تمام رشتوں کا آغاز "س" سے کیوں ہوتا ہے؟
دولہا کے خلاف سب کے سیریس ری ایکشن کے لیے۔

☆ عقل گھاس چرنے کب جاتی ہے؟
کسی خوب صورت مریضہ کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہی۔

☆ بیوی کی مار پیٹ سے بچنے کا آسان طریقہ کیا ہے؟
دوسری بیوی کو ڈھال بنالیں۔

☆ محبتوں کا قحط کیوں پڑ گیا ہے؟
گرلز کالجز میں تعطیلات کی وجہ سے۔

☆ محبوبہ کو منانے کا آسان نسخہ؟
رقیب سے دوستی کرلیں فوراً "مان جائے گی۔"

فوزیہ ثمرث، ام ہانیہ عمران۔۔۔ گجرات

تقدیر

زندگی کے دوراہے پر چلتے چلتے کبھی کبھی ایسے لمحات بھی آتے ہیں، جب اپنے جذبات کو کچل کر دوسروں کے جذبات کا احترام کرنا پڑتا ہے، یہ ہی وہ مقام ہے جہاں انسانیت تکمیل پاتی ہے اور بلندی سے ہمکنار ہوتی ہے، زندگی کے حوادث کا مقابلہ اس خوبی سے کرو کہ تدبیر کی ٹکر سے تقدیر مسکرا اٹھے۔

طاہرہ ملک، رضوانہ ملک۔۔۔ جلال پور پیروالا

لاجواب

زندگی میں کچھ کھونا پڑے تو یہ دو لائنیں ہمیشہ یاد رکھنا۔

جو کھویا اس کا غم نہیں۔ لیکن جو پایا ہے وہ کسی سے کم نہیں۔

جو نہیں ہے وہ ایک خواب ہے اور جو ہے وہ لاجواب ہے۔

اعتماد

شاخ پر بیٹھا پرندہ شاخ کی کمزوری یا اس کے جھولنے سے نہیں ڈرتا، کیونکہ اس کو شاخ پر نہیں اپنے پروں پر اعتماد ہوتا ہے۔

رشتے

جب ناخن بڑے ہو جاتے ہیں تو ناخن ہی کاٹے جاتے ہیں، انگلیاں نہیں، بالکل اسی طرح جب آپس میں رشتے داروں میں غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں تو غلط فہمیاں ختم کرنی چاہئیں نہ کہ رشتے۔

نازیہ جہانگیر۔ کراچی

زخم

ہم نے ایک پتنگ باز سے پوچھا۔ "آپ کے ماتھے پر یہ زخم کیسا ہے؟"

انہوں نے کہا۔ "ساتھ والی چھت پر خاتون نظر آتی تھیں نا جس کا خاوند دبئی میں رہتا تھا۔"

ہم نے کہا۔ "ہاں پھر۔"

"کل شام وہ اچانک دبئی سے واپس آگیا۔" پتنگ باز نے منہ بسورتے ہوئے جواب دیا۔

فوزیہ ثمرث۔ گجرات

موتی مالا

☆ انسان جب اچھا سوچتا ہے تو اللہ خود ہی راستے بنا دیتا ہے اور مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔

بشریٰ محمود

حنا ممتاز صدیقی، کی ڈائری میں تحریر

اعتبار ساجد کی غزل

کبھی جب زندگی میں ہو تمہیں احساس تنہائی
تو کچھ اچھی کتابوں، اچھے لوگوں کی
رفاقت میں
کسی جلوت کی خلوت میں
بس اپنے دل کو بہلانا
اور اس کو اتنا سمجھانا
کہ اب ان فاصلوں کو پاٹنا مشکل ہے جاناں
اگر یہ فاصلے مٹ بھی گئے تو
اجنبی بن کر کہیں ملنے سے کیا حاصل
تمہیں شام جدائی اس لیے سمجھا رہا ہوں میں
کہ جان من
دکھی ہو کر کبھی فریاد مت کرنا
مجھے تم یاد مت کرنا

رضوانہ ملک، کی ڈائری میں تحریر

محسن نقوی کی غزل

میں نے اس طور سے چاہا تجھے
میں نے اس طور سے چاہا تجھے اکثر جاناں
جیسے مہتاب کو بے انت سمندر چاہے
جیسے سورج کی کرن سیپ کے دل میں اترے
جیسے خوشبو کو ہوا رنگ سے ہٹ کر چاہے
جیسے خوابوں میں خیالوں کی کماں ٹوٹتی ہے
جیسے بارش کی دعا آبلہ پا مانگتے ہیں
میرا ہر خواب مرے سچ کی گواہی دے گا
وسعت دید نے تجھ سے تیری خواہش کی ہے
میری سوچوں میں کبھی دیکھ سراپا اپنا
میں نے دنیا سے الگ تیری پرستش کی ہے
خواہش دید کا موسم کبھی دھندلا جو ہوا
نوچ ڈالی ہیں زمانے کی نقابیں میں نے
میں نے چاہا کہ تیرے حسن کی گلنار فضا
میری غزلوں کی قطاروں سے دہکتا جائے

فوزیہ ثمر بٹ، کی ڈائری میں تحریر

ارشد ملک کی نظم

تمہیں ہم یاد رکھتے ہیں
تمہیں ہم یاد رکھتے ہیں
تمہاری یاد سے دل کا نگر آباد رکھتے ہیں
تیرا مہتاب چہرہ، گہری جھیل سی آنکھیں
تیری زلفیں، حسین پلکیں، تیرا لہجہ
تیرا وہ کھلکھلانا
اور کسی بھی بات پر ہنسنا
وہ پھر کچھ سوچنا، اور سوچ کر گم سا ہو جانا
خیالوں اور خوابوں میں ہمارے ساتھ رہتا ہے
تمہیں ہم ساتھ رکھتے ہیں
تمہیں ہم یاد رکھتے ہیں
تمہاری یاد سے دل کا نگر آباد رکھتے ہیں
کسی کے ساتھ چلنا ہو
کسی سے بات کرنی ہو
کسی کا پیار سے تکنا
کسی بھی پھول کا کھلنا
کوئی بھی گیت گاتے ہوں
کوئی بھی شعر پڑھتے ہوں
تمہیں ہم ساتھ رکھتے ہیں
تمہیں ہم یاد رکھتے ہیں
تمہاری یاد سے دل کا نگر آباد رکھتے ہیں

مگر جب رات ہوتی ہے
تیری ہی بات ہوتی ہے
وہاں اک چاند ہوتا ہے
تیرا یہ پھول سا چہرہ
مجھے چندا میں دکھتا ہے
فضاؤں میں، ہواؤں میں
تیری خوشبو بکھرتی ہے
تمہیں، ہم ساتھ رکھتے ہیں
تمہیں ہم ساتھ رکھتے ہیں
تمہاری یاد سے دل کا نگر آباد رکھتے ہیں

حرا قریشی، کی ڈائری میں تحریر
محسن نقوی کی غزل

میں چاہنے والوں کو مخاطب نہیں کرتا
اور ترک تعلق کی میں وضاحت نہیں کرتا

میں اپنی جفاؤں پہ نادم نہیں ہوتا
میں اپنی وفاؤں کی تجارت نہیں کرتا

خوشبو کسی تشہیر کی محتاج نہیں ہوتی
سچا ہوں مگر اپنی وکالت نہیں کرتا

احساس کی سولی پہ لٹک جاتا ہوں اکثر
میں جبر مسلسل کی شکایت نہیں کرتا

میں عظمت انسان کا قائل تو ہوں محسن
لیکن کبھی بندوں کی عبادت نہیں کرتا

نادرہ سلطانہ، کی ڈائری میں تحریر
ناہید عزمی کی نظم

عزت دو
ہاتھ کے چھالے
رہنے دو...
پاؤں میں کانٹے
چبھنے دو...
آنکھ کا کاجل
بہنے دو...
زخمی دل ہے
رِسنے دو
جسم کا ایندھن جلتا ہے
اس کو جل کر بجھنے دو
تم سے اک فریاد ہے بس...!
عزت مجھ کو عزت دو...!

عابدہ حبیب، کی ڈائری میں تحریر
اسلم ہمدم کی غزل

کسی بھی آنکھ میں چبھنا مجھے اچھا نہیں لگتا
کسی کے ہونٹ پہ سجنا مجھے اچھا نہیں لگتا

پتا جب سے لگا مجھ کو خدا کی بارگاہ ہی کا
بتوں کے سامنے جھکنا مجھے اچھا نہیں لگتا

سبھی خوشیاں ادھوری اور محبت کی بھی باتیں
کسی کے پیار کا سپنا مجھے اچھا نہیں لگتا

دھڑکنے دو دل بے تاب کو یونہی دھڑکتا ہے
اب اس پہ ہاتھ کا رکھنا مجھے اچھا نہیں لگتا

یہاں دنیا کے میلے میں سبھی انسان فانی ہیں
کسی انسان پہ ہنسنا مجھے اچھا نہیں لگتا

نہ گھبراؤ مرے یارو ابھی کچھ دور ہے منزل
بڑھو آگے ذرا رکنا مجھے اچھا نہیں لگتا

مرے حصے کی سب نفرت مرے ہمدم مجھے دے دو
محبت کا مزا چکھنا مجھے اچھا نہیں لگتا

شگفتہ سلیمان

نمرہ، اقرا ــــــــــ کراچی

یہ شہرِ صداقت بھی عجیب شہر ہے شبنم
میں سچ ہے یہاں اک شخص بھی سچا نہیں دیکھا

اقصیٰ ناصر ــــــــــ کراچی

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

جاسمہ مریم نوید ــــــــــ کورنگی

میں شہرِ گل میں زخم کا چہرہ کیسے دکھاؤں
شبنم بدست لوگ تو کانٹے چبھو گئے

لائبہ، ایمن ــــــــــ مظفر آباد

باغِ عالم میں رہے شادی و ماتم کی طرح
پھول کی طرح ہنسے رو دیے شبنم کی طرح
شکوہ کرتے ہو خوشی تم سے منائی نہ گئی
ہم سے غم بھی تو منایا نہ گیا غم کی طرح

فوزیہ ثمر بٹ ــــــــــ گجرات

یوں تو اس شہر میں ہر اک محبت سے ہیں
جانے تنہائی میں کس کس کا بُرا مانگتے ہو
اس کو سب علم ہے شہزاد وہ سب جانتا ہے
کس لیے ہاتھ اٹھاتے ہو دُعا مانگتے ہو

صائمہ سندھو ــــــــــ اسلام آباد

کاش وہ صبح نیند سے جاگے تو مجھ سے لڑنے آئے
کہ تم کون ہوتے ہو میرے خوابوں میں آنے والے

مدیحہ نورین مہک ــــــــــ برنالی

چراغِ دل کو ذرا سنبھال کے رکھنا
آج پھر چل رہی ہے ہوا اُداسی کی بہت

صائمہ جیجی ــــــــــ کراچی

اک تمہارے سوا کون ہے میرا
پھر تنہا کس کے سہارے چھوڑ دیتے ہو

عائشہ، تحریم ــــــــــ گوجرہ

ہم یہ نہیں چاہتے کہ لوگ تیرے لیے دُعا نہ کریں
ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ لوگ تجھے دُعا میں نہ مانگیں

اقصیٰ ناصر ــــــــــ کراچی

کاش دل کی آواز میں اتنا اثر ہو جائے
ہم جنہیں یاد کریں انہیں خبر ہو جائے

سیدہ نسبت زہرا ــــــــــ کھروڑ پکا

عمر اس وسوسے میں بیت گئی
یوں نہ ہوتا عدم تو یوں ہوتا

گڑیا شاہ ــــــــــ کھروڑ پکا

اُداسی روح کے اندر!!
کہیں یہ تمہارا نام لکھ کے رکھ گئی ہے

ملا، فضہ ــــــــــ فیصل آباد

لگ جائیں دل سے نکلنے والی دُعائیں تمہیں
آنے والے لمحے آج سے بہتر پائیں تمہیں.

سدرہ وزیر ــــــــــ خوشاب (چیل)

جانے کیا اس کو لوگوں سے تھیں شکایتیں
تنہائیوں کے دیس میں خود کو بسا دیا
خود بھی وہ ہم سے بچھڑ کے ادھورا سا ہو گیا
مجھ کو بھی اتنے لوگوں میں تنہا بنا دیا

گیلانی سسٹرز ــــــــــ کھروڑ پکا

ساتھ دل کے چلے، دل کو نہ روکا ہم نے
جو نہ اپنا تھا اسے ٹوٹ کے چاہا ہم نے
اک دھوکے میں کٹی ہے یہ عمر ساری
کیا بتائیں کیسے پایا کیسے کھویا ہم نے

عذرا ناصر ــــــــــ کورنگی

بزدل ہیں وہ لوگ جو محبت نہیں کرتے
بہت حوصلہ چاہیے برباد ہونے کے لیے

نمل، ثمینہ تاج ——— کراچی

مت پوچھ تجھ سے بچھڑ کر محسن
آج تک کتنے اندھیروں میں کھویا ہوں
تو مجھ سے بچھڑ کر بھی خوش ہو گا
میں تجھے یاد کر کے رو رہا ہوں

آسیہ جاوید ——— علی پور چٹھہ

چلو اب مان بھی جاؤ کہ
میرے بن ادھورے ہو

مریم ——— لاہور

جہانِ نو کا تصور، حیاتِ نو کا خیال
بڑے فریب دیے تم نے بندگی کے لیے

ایمہا ——— سیالکوٹ

وہ صرف اپنے حدود و قیود کا نکلا
اس ایک شخص کو کیا کیا سمجھ کے چاہا تھا

سمیرا علی ——— لاہور

زہے نصیب اُسے بھی میرا خیال آیا
مگر یہ بات حقیقت نہیں، تمنا ہے
کہاں وہ بام، کہاں میں اور آج کا موسم
کہ جاؤں بھی تو وہ سمجھے، ہوا کا جھونکا ہے

امبرین اسلم ——— کراچی

آدمی کو خاک نے پیدا کیا
خاک کے ساتھ آدمی نے کیا کیا
ایک دُنیا مجھ سے تھی روٹھی ہوئی
تو نے بھی ٹھکرا دیا، اچھا کیا

امبر آصف ——— کراچی

یہ غلط ہے اور وہ ٹھیک ہے یہ روا ہے اور وہ ناروا
ابھی کوئی بات اٹل نہیں ابھی آدمی تگ و دو میں ہے

نمرہ، اقراء ——— کراچی

تو میرا حوصلہ تو دیکھ، داد تو دے کہ اب مجھے
شوقِ کمال بھی نہیں، خوفِ زوال بھی نہیں

نائمہ طارق ——— ضلع لیہ

یہ اور بات ہے کہ وہ عدو ہوا ہے آج مگر
کل تک وہ میرا دوست تھا اُسے بُرا نہ کہو
نہ جانے کون سی مجبوریوں کا قیدی ہو
وہ ساتھ چھوڑ گیا ہے تو بے وفا نہ کہو

صائمہ جیمی ——— کراچی

وہ بھی خدا تھا اُس کی عبادت نہ کر سکے
ہم ٹوٹ کر کسی سے محبت نہ کر سکے
وہ گفتگو میں کرنے لگا تھا ملاوٹیں
لیکن یہ کیا کہ اُس سے شکایت نہ کر سکے

فوزیہ کاشف ——— فیصل آباد

سادہ کاغذ رکھ کے آیا ہوں نمائش گاہ میں
دیکھ کر ہوتی تھی ہر تصویر کو اُلجھن مجھے

فوزیہ غزل ——— شیخوپورہ

جس کی جھنکار میں دل کا آرام تھا وہ تیرا نام تھا
میرے ہونٹوں پہ رقصاں جو نام تھا وہ تیرا نام تھا
مجھ پہ قدرت ہمیشہ رہی مہرباں دے دیا سارا جہاں
جو سب سے بڑا انعام تھا وہ تیرا نام تھا

علیزہ آفریدی ——— عمر کوٹ

دیارِ غیر میں کیسے تجھے صدا دیتے
تو مل بھی جاتا تو آخر تجھے گنوا دیتے
تمہی نے ہم کو سنایا نہ اپنا دُکھ ورنہ
دُعا وہ کرتے کہ آسماں ہلا دیتے

سائرہ احسان ——— لاہور

یہ کس مقام پہ سوجھی تجھے بچھڑنے کی
اب تو جا کے کہیں دن سنورنے والے تھے

کرن ——— کراچی

کبھی ہم بھیگتے ہیں چاہتوں کی تیز بارشوں میں
کبھی برسوں نہیں ملتے ہلکی سی رنجش میں
بہت سے زخم ہیں دل پر مگر ایک زخم ایسا ہے
جو جل اُٹھتا ہے راتوں میں جو جلتا ہے بارشوں میں

صدف عمران ——— کراچی

اک شخص کی ضد ہے مجھے کردار بنا کر
افسانہ لکھو اور میرا نام نہ آئے

ایم۔آر۔کے ——— مظفر گڑھ

اچھا تمہارے شہر کا دستور ہو گیا
جس کو گلے لگا لیا وہ دُور ہو گیا
دادی سے کہنا اُس کی کہانی سنائیے
جو بادشاہ عشق میں مزدور ہو گیا

مریم یوسف ——— کراچی

دُشمنوں کی تو بات ہی کیا ہے
دوستوں نے بھی گل کھلائے بہت

روبینہ شریف

ہائی وے

ایک پاکستانی فرانس میں ایک ہائی وے پر گاڑی چلا رہا ہوتا ہے۔ گاڑی چلاتے ہوئے جس موڑ سے اسے مڑنا ہوتا۔ وہ اس سے چھوٹ جاتا ہے۔ اگلا موڑ بیس میل بعد آنا ہوتا ہے۔ تو وہ پاکستانی اسٹائل میں گاڑی روک کر' تیز رفتار ہائی وے پر ریورس گیئر میں چلانا شروع کردیتا ہے۔ پیچھے سے آنے والا ٹرک زور سے ٹکرا جاتا ہے۔

ایک پولیس والا آتا ہے پہلے فرنچ ٹرک ڈرائیور سے بات کرتا ہے اور پھر پاکستانی کے پاس آکر کہتا ہے۔

"آپ سے معذرت خواہ ہیں ٹرک ڈرائیور نے اتنی شراب پی ہوئی ہے کہ مستی میں کہہ رہا ہے آپ ہائی وے پر ریورس گیئر میں چلا رہے تھے۔ ہم اس کو ابھی جیل بھجواتے ہیں۔ شکریہ۔"

انیلا افضال... قصور

زخمی حالت

ایک شخص رات کو زخمی حالت میں سڑک پر پڑا تھا۔ پولیس نے ابتدائی رپورٹ تیار کی اور ہوش آنے پر اس شخص سے پوچھا۔

"کیا تم شادی شدہ ہو؟"

"جی میں بیوی کی ٹکر سے نہیں بلکہ گاڑی کی ٹکر سے زخمی ہوا ہوں۔" اس شخص نے جواب دیا۔

حنا کرن... پتوکی

ہوشیاری

ایک بہت ہی عیار اور مکار مجرم کو گرفتار کرنے پر انسپکٹر شہباز کو انعام دیتے ہوئے آئی جی صاحب نے پوچھا۔

"انسپکٹر تمہیں کیسے پتا چلا کہ عورت کے بھیس میں وہ مجرم مرد ہے؟"

انسپکٹر نے سادگی سے جواب دیا۔

"سر! مجرم وغیرہ تو مجھے پتا نہیں تھا... مجھے تو وہ عورت ہی لگی تھی' لیکن ذرا مشکوک دکھائی دے رہی تھی' میں نے اس کا پیچھا شروع کردیا وہ ایک مال میں گھس کر چیزیں دیکھنے لگی۔ وہاں بہت سے آئینے لگے ہوئے تھے جب وہ کسی آئینے کے سامنے نہیں رکی تب میں سمجھ گیا کہ وہ عورت نہیں ہے۔"

افشاں سمیع... گھوٹکی

انسان اور گدھا

ایک بار کلاس میں محمد بلال احمد عرف پڑھاکو بچہ گدھا لے آیا۔

استانی نیلم غصے سے بولی۔

"اس کو ادھر کیوں لائے ہو؟"

پڑھاکو بچہ معصوم سی صورت بنا کر بولا۔

"مس جی آپ ہی تو کہتی ہیں کہ آپ اب تک کتنے ہی گدھوں کو انسان بنا چکی ہیں۔ تو میں یہ سوچ کر اس کو ادھر لے آیا کہ آپ اس کو بھی انسان بنادیں۔"

اریبہ خان۔ خان پور

لاٹری

کنجوس بنیا (ہندو) روزانہ مندر جا کر کئی کئی گھنٹے پرارتھنا کرتا تھا۔

"اے بھگوان! میری لاٹری لگادے۔ اے بھگوان میری لاٹری لگادے۔"

10 سال کی پرارتھنا کے بعد ایک دن بھگوان اس کے خواب میں آیا اور اسے تھپڑ رسید کرتے ہوئے بولا۔

"تیری لاٹری کیسے لگواؤں۔ پہلے لاٹری ٹکٹ تو لے لو"

ثمرہ، اقراء۔ کراچی

فیلنگز

ایک کنجوس اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ بیٹھا چپس کھا رہا تھا گرل فرینڈ نے پوچھا کہ۔

"کیا محسوس کر رہے ہو؟"

کنجوس: "تم مجھ سے تیز چپس کھا رہی ہو۔"

کنجوس

بس میں سوار ایک کنجوس آدمی کرایہ کم ادا کرنے پر مصر تھا اور برابر جھگڑا کیے جا رہا تھا۔ کنڈیکٹر کو جو غصہ آیا تو وہ کنجوس کا ٹرنک اٹھا کر بس سے باہر پھینکنے لگا۔ کنجوس نے چلا کر کہا۔

"حد ہو گئی ہے ایک تو مجھ سے کرایہ زیادہ مانگ رہے ہو اور دوسرے میرے بیٹے کو بھی زخمی کرنا چاہتے ہو۔"

نشا فاطمہ۔ ایبٹ آباد

کریڈٹ

مزاحیہ ادب کے دو حضرات آپس میں محو گفتگو تھے۔

پہلا: "میں نے کار خریدنے کے لیے بینک سے کریڈٹ لیا۔ قسطیں بروقت ادا نہ کر پایا چنانچہ بینک نے میری کار واپس ضبط کر لی۔"

دوسرا: "کاش میں نے شادی کے لیے بھی بینک سے کریڈٹ لیا ہوتا۔"

سیدہ نسبت زہرا۔ کہروڑ پکا

رپورٹ

ایک شخص عرصہ سے ایک ڈاکٹر کے پاس زیر علاج تھا۔ مرض پیچیدہ تھا اس نے دوسرے ڈاکٹر سے رجوع کیا اور پھر پہلے ڈاکٹر کے پاس جا کر کہا۔

"میں نے دوسرے ڈاکٹر کو دکھایا ہے وہ کہتا ہے کہ آپ کی تشخیص غلط ہے۔"

پہلا ڈاکٹر جل کر بولا: "ٹھیک ہے۔ تم اس کا علاج کراؤ، پوسٹ مارٹم رپورٹ خود بتا دے گی کہ کس کی تشخیص غلط ہے۔"

سدرہ وزیر۔۔۔ خوشاب

اچھی نظر

ایک خاتون نے آئینہ میں اپنا عکس دیکھ کر میرے سے کہا۔

"میں سچ مچ بدصورت ہوں، مجھ میں کون سی چیز ایسی ہے۔ جس کی میرے شوہر تعریف کر سکتے ہیں؟"

اتفاق سے شوہر اسی وقت کمرے میں داخل ہوا اور بیوی کی بات سن لی۔

اس نے کہا۔ "بیگم تمہاری نظر بہت اچھی ہے۔"

وثیقہ زہرہ۔۔۔ سمندری

سوچ کا فرق

امریکن کی سوچ "ہم چاند پر پہنچ گئے۔ اب آگے کیا کرنا ہے۔"

چائینز کی سوچ "ہم 95% دنیا کی مارکیٹ پر راج کر رہے ہیں۔ اب باقی کیسے کریں۔"

انڈین کی سوچ "ہم نے پاکستان کو فارن پالیسی سے شکست دی۔ اب اگلا قدم کیا ہونا چاہیے۔"

پاکستانی کی سوچ "10 بجے بجلی گئی تھی تو 12 بجے آئی۔ اب 3 بجے جائے گی تو 5 بجے آئے گی، پھر 8 بجے جائے گی۔۔۔ اور جلدی سے موٹر چلا کر پانی بھر لو۔ ٹنکی خالی ہے۔"

طاہرہ ملک، رضوانہ ملک۔۔۔ جلالپور پیر والا

کلاسیکل بے عزتی

ایک لڑکا سائیکل پر جا رہا تھا، سائیکل کا ٹائر بھینس کے گوبر کے بیچ سے گزر گیا، قریب کچھ لڑکیاں کھڑی تھیں انہوں نے تالیاں بجا کے کہا۔

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔"

لڑکا رکا اور بولا۔

"وش کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ کیک تو کھانا ہی پڑے گا۔"

گڑیا شاہ۔ کہروڑ پکا

حسن و صحت

ادارہ

کمپلیکشن اور جلدی ساخت خراب ہوجانے کے اسباب

عمر کے اضافہ اور بعض دوسری وجوہات کے باعث کمپلیکشن کا بہت عام سا مسئلہ جلدی رنگت کو سانولا بناتا ہے۔ جلدی رنگت کے سانولا پڑجانے کی سب سے زیادہ عام وجہ یہ ہے کہ ہماری جلد کی سب سے اوپری سطح 'رنگ کی سیاہ کرنے والے قدرتی مادہ "میلانین" کو ضرورت سے زیادہ اپنے اندر جذب کرنے لگتی ہے۔ میلانین بھاری اور اوپری جلد کی سطح کے زیریں حصہ میں پیدا ہوتا ہے اور ہماری جلد کے مردہ خلیے اسے اپنے اندر جذب کرنا شروع کردیتے ہیں۔

کمپلیکشن پر اثر انداز ہونے والے دوسرے عناصر میں عمر گزرنے کے ساتھ جلد کو پرشباب بنانے والے اجزا کی پیداوار میں کمی اور مردہ جلدی خلیوں کو رگڑ کر جسم سے علیحدہ نہ کرنا بھی شامل ہے۔ عمر گزرنے کے ساتھ جلد میں پیدا ہونے والی خرابیاں' بہت زیادہ نمایاں ہونے لگتی ہیں۔ دوران خون میں کمی' چکنائی اور پسینہ پیدا کرنے والے غدودوں کی کارکردگی میں سست رفتاری ہماری جلد کو خشک بنادیتے ہیں اور ان پر جھریاں نمودار ہونے لگتی ہیں۔

جلد کی کمپلیکشن اور اس کی ساخت کی حفاظت

جلد کی کمپلیکشن اور اس کی ساخت کے جو پہلو ہماری سب سے زیادہ توجہ کے مستحق ہیں ان میں یہ باتیں شامل ہیں۔ جلد کا رنگ' اس کا شفاف پن' بہت زیادہ خشکی' کھردراپن اور چکناہٹ۔ گھر کی بنی ہوئی ایسی بے شمار مصنوعات ہیں جن سے ہمارا کمپلیکشن بہت بہتر ہوسکتا ہے۔ اور جلد کی ساخت کو زیادہ نکھارا جاسکتا ہے۔

جلد کی کمپلیکشن کو بہتر بنانے والی گھریلو مصنوعات

کلینزنگ بنانے کا نسخہ:

صابن کی جگہ چہرہ صاف کرنے کے لیے بیسن کا استعمال کریں۔ سبز چنے اور کابلی چنے کی برابر مقدار لے کر پیس لیں اور اسے دودھ یا پانی میں حل کرلیں۔

اس پیسٹ سے بدن رگڑیں اور پھر صاف پانی سے دھو ڈالیں۔ جلد کے شفاف پن کو بحال کرنے کے لیے یہ بہترین نسخہ ہے۔ اس ترکیب پر ہفتہ میں ایک سے دو مرتبہ عمل کریں۔

کمپلکشن ماسک:۔

1۔ ہلدی پاؤڈر کی ایک چٹکی کھانے کا ایک چمچہ پاؤڈر کا دودھ کھانے کے دو چمچے شہد اور آدھے لیموں کا عرق لے کر آپس میں ملالیں اور ان کا پیسٹ بنالیں۔ چہرہ پر مل کر اسے چھوڑ دیں یہاں تک کہ وہ خشک ہو جائے۔ پھر صاف پانی سے دھو ڈالیں۔ فرق خود ہی محسوس کریں گی۔

2۔ سفید اور سیاہ زیرے کی برابر مقدار لے کر پیس لیں اور دودھ یا کریم میں اس کا پیسٹ بنالیں۔ اسے پورے چہرہ پر مل لیں اور پھر بیس منٹ بعد دھو ڈالیں۔ بہترین نتائج کے حصول کے لیے یہ ماسک ہفتہ میں کم سے کم دو مرتبہ ضرور لگائیں۔

رنگ گورا کرنے کا آسان نسخہ:۔

لیموں لے کر اسے دو حصوں میں کاٹ لیں۔ ایک حصہ چہرہ پر آہستگی سے ملیں۔ دوسرے نصف حصہ کا عرق ایک پیالی میں نچوڑ لیں اور تھوڑا سا پہاڑی نمک ملا کر پی لیں یہ عمل روزانہ چھ سے آٹھ ہفتوں تک برابر کرتی رہیں۔ اس کے فوائد آپ خود ہی محسوس کریں گی۔

بلیک ہیڈز اور کیل مہاسوں کے داغ مٹانا:۔

ہلدی' ہائی زوم اور رائی کے بیج لے کر ان کا پیسٹ بنالیں۔ اور روزانہ رات کو سوتے وقت دھبوں پر لگالیا کریں۔ صبح سویرے پانی سے دھو ڈالیں۔ یہ داغ رفتہ رفتہ ہلکے پڑتے چلے جائیں گے۔

جلد کی ساخت بہتر بنانے کے لیے گھریلو کاسمیٹکس

چکنی جلد کی موئسچرائزنگ:۔

چائے کا ایک چمچہ مکئی کا آٹا اور چوتھائی چمچہ صندل کی لکڑی کا برادہ لے کر آپس میں ملالیں اور اسے جلد کی کلینزنگ کے لیے استعمال کریں۔ اس کے بعد چائے کا ایک چمچہ سرکہ ایک گلاس پانی میں حل کر کے اس سے ٹوننگ کریں کچے آلو کے چند ٹکڑے کاٹ کر چہرہ پر چپکائیں اور پندرہ منٹ تک لگے رہنے دیں۔ ہموار اور نم جلد کے حصول کے لیے اس نسخہ کو برابر استعمال کریں۔

خشک جلد کی موئسچرائزنگ:۔

ہلکے صابن سے جلد کی صفائی کے بعد عرق گلاب سے اسے ٹون کریں۔ ایک چمچہ گلیسرین لے کر اس میں چند قطرے وٹامن آئل یا آملہ آئل ملالیں اور اسے چہرہ پر مل لیں۔ پھر 20 منٹ کے بعد اسے دھو ڈالیں۔ جلد کی ساخت کو ہموار اور ملائم بنانے کے لیے یہ نسخہ مستقل استعمال کریں۔

جلد کو ہموار اور روشن بنانے کے لیے فیشل

ایک لیموں کے عرق میں انڈہ ملا کر پھینٹ لیں اور یہ ماسک چہرہ اور گردن پر مل لیں۔ 30 منٹ بعد صاف پانی سے دھو ڈالیں۔ ہفتہ میں کم سے کم ایک مرتبہ یہ ماسک ضرور لگائیں۔

پھٹی ہوئی جلد کے لیے ماسک

چار اونس السی کا خالص تیل' 8 اونس عرق گلاب' چوتھائی اونس ٹنکچر بنزائین لے کر انہیں آپس میں حل کر لیں روزانہ صبح اور رات کو لگایا کریں۔

دوسرے مفید مشورے

☆ جلد پر مساج کرنے کے لیے وہی بہترین شے ہے۔ یہ خشک اور چکنی دونوں جلدوں کو ٹون اپ کرتا ہے۔

☆ جلد کی رنگت کو بہتر بنانے کے لیے روزانہ ایک گلاس لیموں کا عرق پیا کریں۔ اس کے اندر موجود وٹامن "سی" جلد کے لیے فائدہ مند ہے۔

☆ جلد چکنی اور ہموار ساخت کے لیے وٹامن "اے" کی ضرورت ہے۔ جو آپ کو مولی گاجر کے جوس سے کافی مقدار میں مل سکتا ہے۔

کرن کا دستر خوان

خالدہ جیلانی

مونگچھیاں

اشیاء :

مونگ کی دال	آدھا پاؤ
پیاز	ایک بڑی سی گڈی
پسی ہوئی مرچیں	ایک بڑا چمچہ
ہلدی	چائے کا آدھا چمچہ
لہسن	دس جوے
گھی	دو بڑے چمچے
ہرا دھنیا	تھوڑا سا

ترکیب :

پکانے سے چار پانچ گھنٹے قبل دال بھگو دیں۔ جب خوب گل جائے تو سل پر باریک پیس لیں۔ پسی ہوئی دال میں نمک، زیرہ اور مرچیں حسب مرضی شامل کر لیں۔ ایک ٹرے یا سینی میں اس مرکب کی چھوٹی چھوٹی گولیاں سی بنا کر رکھ لیں اور انہیں دھوپ میں سکھا لیں جب سوکھ جائیں تو انہیں ایک ڈبے میں رکھ دیں۔ ایک پتیلی میں پیاز کے لچھے سرخ کر کے ایک پلیٹ میں رکھ لیں، اب بقیہ مرچیں ہلدی، دھنیا، لہسن اور پیاز پیس لیں گھی میں تھوڑی پیاز ڈال کر یہ مسالا خوب بھونیں۔ مونگچھیاں اس میں شامل کر لیں گلنے کے موافق پانی ڈال کر مونگچھیوں کو گلا لیں۔ ہلکا ہلکا شوربہ بھی رکھ لیں۔ ہرا دھنیا کتر کر ڈال دیں۔ کھانے کے وقت ڈونگوں میں پیش کریں۔

چکن پیاز فرائیڈ

اشیاء :

چکن بریسٹ	دو عدد
پیاز	دو عدد
ہرا دھنیا کٹا ہوا	دو کھانے کے چمچے
پودینہ کٹا ہوا	دو کھانے کے چمچے
ہری مرچ کٹی ہوئی	تین عدد
زیرہ	ایک کھانے کا چمچہ
بیسن	آدھا پاؤ
کھانے کا سوڈا	آدھا چائے کا چمچہ
چاولوں کا آٹا	دو کھانے کے چمچے
لال مرچ پسی ہوئی	ایک چائے کا چمچہ
لال مرچ کٹی ہوئی	ایک چائے کا چمچہ
اجوائن	آدھا چائے کا چمچہ
گرم مسالا پسا ہوا	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
پانی	حسب ضرورت
تیل	تین کھانے کے چمچے
تیل	تلنے کے لیے
چاٹ مسالا	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب :

پہلے چکن بریسٹ کو بہت باریک کاٹ لیں۔ اب پیاز کو بھی باریک کاٹ لیں۔ ہری مرچ کو باریک کاٹ لیں۔ ایک پیالے میں چکن، پیاز، ہرا دھنیا، پودینہ اور ہری مرچ کو اچھی طرح سے مکس کر لیں۔ اس کے بعد

اس میں کٹا دھنیا، زیرہ، بیسن، سوڈا اور چاول کا آٹا ڈال کر مکس کرلیں۔ اب اس میں پسی لال مرچ، کٹی لال مرچ، اجوائن، گرم مسالا، نمک اور پانی شامل کرکے گوندھ لیں اور آخر میں تیل بھی شامل کرلیں۔ اب تیل گرم کرکے چکن مکسچر کی تھوڑی تھوڑی مقدار شامل کرکے ڈیپ فرائی کرلیں اور گولڈن ہونے پر نکال لیں۔ جب سب فرائی ہوجائیں تو اوپر سے چاٹ مسالا چھڑک کر سرو کریں۔

چکن چنا

اشیاء:

مرغی	بغیر ہڈی کا گوشت آدھا کلو
چنے	ایک کپ (ابال لیں)
پیاز	تین عدد (براؤن کرلیں)
ٹماٹر	دو کھانے کے چمچے (پسے ہوئے)
تازہ بالائی یا کریم	دو کھانے کے چمچے
مکھن	آدھا کپ
تیل	حسب ضرورت
دھنیا پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	ایک چائے کا چمچہ
سرخ مرچ	ایک چائے کا چمچہ
کٹی ہوئی ہری مرچ	ایک چائے کا چمچہ
لہسن ادرک	ایک چائے کا چمچہ
دہی	1/4 کپ
گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچہ

ترکیب:

تیل گرم کریں لہسن ادرک اور مرغی ڈال کر تل لیں۔ پھر باقی مسالا ملا کر پکالیں۔ اب اس میں ٹماٹر اور ابلے ہوئے چنے ملا کر بھون لیں۔ مرغی گل جائے اور رنگت سرخی مائل ہوجائے تو اس بھنے ہوئے آمیزے کو چولہے سے اتار کر تھوڑی دیر کے لیے دم پر رکھ دیں۔ تیل اوپر آجائے تو ہرا دھنیا ڈال دیں اور نان کے ساتھ پیش کریں حسب پسند شوربہ رکھ سکتی ہیں۔

اناناس کی پڈنگ

اشیاء:

اناناس	آدھا کلو
میدہ	دو اونس
مکھن	دو اونس
دودھ	ایک سیر
انڈے	چار عدد
چینی	حسب پسند

ترکیب:

اناناس کو چھیل کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرلیں اور پاؤ بھر پانی میں ایک بڑا چمچہ چینی ڈال کر اس میں کٹا ہوا اناناس ڈال دیں اور پندرہ منٹ تک پکالیں پھر اتار کر ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیں اب میدہ میں مکھن کو خوب ملائیں پھر انڈے توڑ کر اس میں ڈال دیں اور خوب پھینٹ لیں جب بالکل ایک جان ہوجائے تو اس میں دودھ ملائیں اور چینی بھی ملا دیں۔ جب سب کچھ مل کر ایک ہوجائے تو اس کو ایک کھلے منہ کے برتن میں ڈال دیں اور اناناس کے ٹھنڈے ٹکڑے بھی ڈال دیں اب اس کو ایک دیگچے میں پانی ڈال کر اس میں برتن رکھ دیں اور اوپر سے منہ بند کردیں اور پکنے کے لیے رکھ دیں۔ بیس پچیس منٹ کے بعد دیکھیں اگر جم گیا ہو تو اتار لیں اور خوب ٹھنڈا ہونے پر کھانے کے لیے پیش کردیں۔

اس ماہ کا خط

طاہرہ ملک۔ جلال پور پیروالا

جو نہی کرن ہاتھوں میں آیا تو سب سے پہلے "تنا ے میرے نام" میں پہنچے جہاں ہمارے لیے دو دو سرپرائز تھے ایک تو میرے خط کا شامل ہونا اور دوسرا سوئیٹ مدیرہ جی آپ کا 'خاموشی کو توڑنا' آپ نے خوب صورت انداز میں جواب دے کر دل خوش کردیا میں کرن کے ذریعے اپنے پیارے بھائی محمد جنید ملک کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جو آپ کے اور ہمارے ملاپ کا سبب بنتا ہے۔ وہ ملتان میں پڑھ رہا ہے لیکن وہ جب آتا ہے تو 'ہماری خاطر گھر سے بہت دور پوسٹ آفس جانا پڑتا ہے۔

اب آتے ہیں کرن کی تحریروں کی طرف ٹائٹل گرل ہمیشہ کی طرح خوب صورت لگ رہی تھی۔ حمد و نعت سے مستفید ہوتے ہوئے یاد محمود ریاض اور "دور تمہارا ہے دیس مجھ سے" میں محمود ریاض صاحب کے بارے میں جانا 'اتنے اچھے اور نیک انسان کی کمی تو کوئی بھی پوری نہیں کرسکتا بس اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ 'انہیں اور ان کے بیٹوں کو جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائے۔ (آمین) "ماں ناراض ہوجائے تو" مشہور شخصیات کی رائے جان کر اچھا لگا۔ سوبری عاصمہ جہانگیر اور بیوٹی فل ماورا ہمیشہ کی طرح بہت اچھی لگیں۔ "ستارہ امین کومل" آپ کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔

"اک ساگر ہے زندگی" یہ جان کر حیرت ہوئی کہ شاہ زین سالار کا بیٹا ہے۔ زینب کے ساتھ کیا بیتی بے چینی سے انتظار کررہے ہیں۔

"بد مزاج" میں راشدہ رفعت بہت خوب 'مردوں کی اس قسم پر افسانہ لکھنے کی 'بھئی یہ کیا بات ہوئی آپ کے نرم لب و لہجے کے حقدار آپ کے گھر والے ہوتے ہیں اور آپ ان بے چاریوں کو دبا کے رکھتے ہیں۔ صدف آصف "میں اور تم" نوید جیسی اچھی سوچ رکھنے والے باہمت لوگ کم ہوتے ہیں مشکلات میں ہر کوئی صبر کا دامن چھوڑ بیٹھتا ہے "وے ڈھول سانول" نازیہ جمال آپ نے شہری لڑکی کو بڑے اچھے طریقے سے گاؤں میں ایڈجسٹ کرادیا ہے۔ لڑکی محبت کے لیے۔ اپنے شوہر کے لیے سب کچھ برداشت کرلیتی ہے۔ فیروز کی ماں پہ غصہ آیا جس نے نوری بے چاری کی قدر نہ کی۔ "ردائے وفا" مائی فیورٹ ناول غموں کا شکار ہوتا جارہا ہے ایک سوہا کے دکھ ہی کم نہ تھے رہی سہی کسر حسیب نے پوری کردی 'حسیب تو چلو ویسے بھی ماہا سے محبت کرتا ہے اور اس کے ساتھ ٹھیک ہے ماہا کا جب دل صاف ہوگا تو اس کی بات بھی سن لے گی' اصل خطرہ تو بے چاری سوہا کا ہے وہ اپنی گرہستی بچانے کے چکر میں تھی اور یہاں نائلہ بی بی اس کی جان لینے کے درپے ہے۔ فرحین اظفر جی نائلہ کو تو سبق سکھائیں گناہ گار ہونے کے باوجود عفت 'حدید' سوہا 'انس جیسے معصوم لوگوں کی خوشیوں کے درپے ہے۔

"میں گمان نہیں یقین ہوں۔" زیان جی نے تو اپنی فرینڈز کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی حیران کردیا زرینہ بیگم پتا نہیں کب سدھریں گی۔ یہ سوتیلی مائیں نہ جانے کیوں معصوم سی بچیوں پہ ظلم و ستم کے پہاڑ توڑتی ہیں ہم تو انتظار کررہے ہیں کب زیان کو اس کا اصل حقدار (ایک) ملے گا۔) (رنم جی) جو شہریار سے انسپائر ہورہی ہے فراز ہی ملے گا اسے 'شہریار کی طرح خوددار اور عنیزہ کی بیٹی میرے خیال میں زیان ہی ہے۔

"سحر نو" کسی نے صحیح کہا ہے کہ ایک عورت ہی دوسری عورت کا گھر تباہ کرتی ہے اور اس کی خوشیاں اجاڑتی ہے اس کی جیتی جاگتی مثال قرۃ العین فیصل نے ہمیں دکھائی' آسیہ بانو کو ایک چھوٹی سی غلطی کی اتنی بڑی سزا ایک طرف اس کا سہاگ اجڑا اور دوسری طرف گود اجاڑی گئی 'بہت افسوس ہوا عفرا اور آسیہ بانو کے غم پر 'یہ جان کر اینڈ میں خوشی ہوئی بھلے تئیس سال بعد لیکن بیٹا ملا تو سہی 'وہ بھی اتنا اچھا نیک اور سلجھا ہوا 'اگر آذر نہ ملتا تو آسیہ بانو کی زندگی مزید خراب ہوجاتی۔

"مسافت" میں تو حیرانی ہی حیرانی تھی 'یہ کیا بیرسٹر صاحب ایک مضمون پر ہی مر مٹے 'بن دیکھے محبت کا شکار ہوگئے 'بڑے

دل کے مالک لوگ تھے۔ اس کہانی میں ایک محبت کی قربانی دے رہی ہے تو دوسری اپنے شوہر کی ویسے اتنے اعلا وارفع لوگ دیکھنے میں بہت کم ملتے ہیں۔

"کرن کرن خوشبو" میں کنول شاہین 'امینہ ملک' آمنہ ولید کا انتخاب پسند آیا "کچھ موتی چنے ہیں" واؤ زبردست ہمارے لیے ایک اور زبردست سا سلسلہ 'ایسے اقتباسات جو ہمارے دل میں گھر کر جاتے ہیں جنہیں بے ساختہ ڈائری میں لکھنے کو دل کرتا ہے' وہی ہم اپنے پیارے کرن سے بھی شیئر کر سکتے ہیں۔

"یادوں کے دریچے" سے سب کے انتخاب اچھے لگے 'اس حوالے سے ایک ریکوسٹ ہے کہ ہمیں کب اس سلسلے میں جگہ دیں گے۔ ویسے ہر سلسلے میں اپنا نام دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔" "مجھے یہ شعر پسند ہے" نمرہ اقراء' عائشہ' رضیہ طاہر' سدرہ وزیر' کرن' بینش اور ندا کی پسند پسند آئی "کرن کا دستر خوان" خالدہ جیلانی جی اتنی مزیدار چیزوں کی ترکیب بتا کر آپ تو ہمارے مزے کر دیتی ہیں ہر چیز ایک سے بڑھ کر ایک' تھی کسی ایک ڈش کی تعریف کرنا باقیوں کے ساتھ زیادتی ہو گی۔

"مسکراتی کرنیں" میں حماواجد' نسرین ناز' مومل آفتاب اور ہیا اسامہ کا انتخاب لاجواب تھا۔ حسن و صحت "ناریل" کے اتنے فائدے جان کر بہت خوشی ہوئی اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز بے مصرف پیدا نہیں کی ہر چیز کے اتنے فائدے ہوتے ہیں کہ انسانی عقل جان کے دنگ رہ جاتی ہے "تا ہے میرے نام" افشاں سمیع' ثناء شہزاد' امبر گل' فوزیہ ثمریٹ' ام ہانیہ' عمران کے تبصرے ہمیشہ کی طرح لاجواب تھے امبر گل جی آپ تو مستقل تبصرہ نگار ہیں آپ کی کمی کیسے کوئی Feel نہیں کر سکتا آپ کی کمی ہم نے بھی Feel کی تھی۔

تو جناب ہم اینڈ میں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پورا کرن ہر طرح سے لاجواب تھا اور ہاں جی کرن کتاب کی تعریف نہ کریں یہ تو زیادتی ہو گی بہت بہت شکریہ کہ آپ ہمارے لیے علیحدہ سے خوب صورت سی کتاب پیش کرتے ہیں جو کہ ہر لحاظ سے مکمل ہے۔

ج ۔ پیاری طاہرہ آپ نے کرن کی ہر کہانی پر تفصیل سے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے بہت شکریہ "یادوں کے دریچے" میں ان شاء اللہ آپ کو بھی ضرور جگہ ملے گی آپ اچھی سے نظم یا غزل شاعر کے حوالے کے ساتھ بھیج دیں۔

وثیقہ زہرہ ۔ سمندری

خوب صورت ٹائٹل سے سجا کرن 14 تاریخ کو ملا سرسری سا سارا ڈائجسٹ پڑھ ڈالا۔ فہرست میں فائزہ افتخار کا ناولٹ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کافی عرصے بعد ان کی کہانی پڑھ سکیں گے۔ "کچھ موتی چنے ہیں" "نیا سلسلہ شروع کر کے آپ نے بہت اچھا کیا ہمیں تو بہت پسند آیا ہے مریم عزیز کا "شام مسکرانے لگی" "ناولٹ" ڈھول سانول "پسند آئے۔ باقی تبصرہ اگلے ماہ کیوں کہ بہنوں سے ملنے شہر آئی ہوں جاتے ہوئے خط پوسٹ کرنا ہے ورنہ گاؤں جا کر دوبارہ خط لکھنا مشکل ہو جائے گا۔

ج ۔ وثیقہ آپ نے اپنی مصروفیت کے باوجود ہمیں خط لکھا آپ لوگوں کی یہ محبت دیکھ کر ہمیں بہت خوشی ہوتی ہے۔

رضوانہ ملک ۔ جلال پور پیر والا

سب سے پہلے تو آپ سب کو ماہ رمضان بہت بہت مبارک ہو اللہ سے دعا ہے کہ "اللہ تعالیٰ ہر کسی کو اس ماہ مقدس میں نیک کام کرنے کی توفیق دے۔

معصوم سی ٹائٹل گرل کافی پیاری لگی' عاصمہ جہانگیر سے ملاقات اچھی رہی "ماں ناراض ہو جائے تو" میں سب ماؤں کی نصیحتیں بہت زبردست تھیں جنہیں میں نے فوراً ہی اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا۔ "میری بھی سنیے" میں ماورا کو دیکھ کر اچھا لگا' عروہ اور ماورا یہ دونوں میری فیورٹ ہیں۔ سب سے پہلے اپنا فیورٹ ناول "اک ساگر ہے زندگی" پڑھا' یہ جان کر کافی حیرت ہوئی کہ شاہ زین سالار کا بیٹا ہے اور ایشال اس کا کزن ہے۔ فرحین اظفر کے ناول "ردائے وفا" میں نائلہ پر اتنا غصہ آتا ہے کہ حد نہیں اس نے سب کی زندگی عذاب بنائی ہوئی ہے حدید بے چارے پر ترس آتا ہے حدید جیسے سوفٹ نیچر کا کپل نائلہ کے ساتھ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اب پتا نہیں سوہا کے ساتھ کیا ہوتا ہے آگے سوہا کو نائلہ سے بچ کے رہنا چاہیے۔ سوہا کو ساری باتیں انس سے کہہ دینی چاہیے تھیں۔ مریم عزیز کا ناول "شام مسکرانے لگی" بہت اچھا تھا اس میں ناز اور صہیب بہت اچھے لگے دونوں سلجھے

ہوئے تھے۔ ضمیر میں ضمیر نام کی کوئی چیز ہی نہ تھی کہ اس نے اپنے کزن دوست کو دھوکا دیا اور اس کی منگیتر علینہ کو اس سے بدظن کیا۔ سہیل ناز سے پیار کرتا تھا لیکن اعتماد نہیں' یہ کیسا پیار تھا اس کا' ویسے ناز جیسی یونیک لڑکی کو سہیل ڈیزرو بھی نہیں کرتا تھا۔ فائزہ افتخار کا ناول "شاید" بھی بہت اچھا ہے اس میں سعد' ام ہانی سے سچا پیار کرتا ہے۔ "وے ڈھول سانول" نازیہ جمال کا پیارا ناولٹ تھا اس میں فیروز کافی نائس تھا' نوری کی ساس کو اس پہ الزام نہیں لگانا چاہیے تھا' لیکن پھر بھی نوری نے سمجھداری سے کام لیا اس نے اپنی ساس کو معاف کردیا اور اپنے گھر چلی گئی۔ صدف آصف کا افسانہ "میں اور تم" بہت اچھا تھا۔ سمیرا غزل' راشدہ رفعت اور آسناتھ کنول سب کے افسانے بیسٹ تھے قرۃ العین فیصل چنا کا ناولٹ "سحر نو" بھی بہت اچھا تھا۔ "کرن کا دسترخوان" میں ساری ڈشز اچھی تھیں اور تبصرے سب کے اچھے تھے اور آپ کا خطوں کا جواب دینا کافی اچھا لگا اور بہت ہی خوشی ہوئی۔

ج۔ بہت شکریہ رضوانہ۔

ملک قرۃ العین عینی۔۔۔۔ منڈی بہاؤالدین

کرن اپنے نام ہی کی طرح منفرد ہے۔ ویسے تو میں کرن کی خاموش قاری ہوں اور میرا اور ڈائجسٹ کا ساتھ 5 برس سے بھی زیادہ کا ہے۔ لیکن اس دفعہ میں نے خط لکھ ہی لیا۔ کرن کا ہر سلسلہ بہترین ہے۔ کرن بہت مشکلات کے بعد 14 مئی کو سخت گرمی میں ٹھنڈک کا ایک نرم جھونکا بن کر ہاتھوں میں آیا۔ ٹائٹل کی ماڈل بالکل پسند نہیں آئی سوری لیکن جس چیز نے اٹریکٹ کیا وہ تھا ماڈل کا ڈریس۔

حمد و نعت بہترین تھیں۔ "بات سے بات" محمود ریاض صاحب کے بارے میں پڑھ کر اچھا لگا۔ عاصمہ' جہانگیر اور ماں کے بارے میں سروے اچھا لگا۔ پلیز مادرا اور عروہ کی جان چھوڑ دیجیے۔ فائق خان اور عاطف اسلم بمع فیملی انٹرویو شامل کریں' بہت مہربانی ہوگی۔ "مقابل ہے آئینہ" میں ستارہ آمین کومل کا ساتھ اچھا لگا۔ "اک ساگر ہے زندگی" اور "ردائے وفا" کی ابھی اقساط جمع کررہی ہوں تبصرہ بعد میں کریں گے اگر آپ نے ہم ناقدروں کو جگہ دی تو' اصل میں' میں ایک استانی ہوں اس لیے وقت کی قلت ہے۔ "میں گمان نہیں یقین ہوں۔" نبیلہ ابر راجہ کی کاوش بہترین ہے۔ ویلڈن نبیلہ جی "شام مسکرانے لگی" پڑھ کر مزا آیا۔ گڈ مریم جی عرصہ بعد ایسی کہانی پڑھ رہے ہیں "شاید" فائزہ افتخار کی تحریر دیکھ کر لطف آگیا۔ واہ فائزہ جی ویلکم ٹو کرن "وے ڈھول سانول" نازیہ جمال کا ناولٹ پڑھا بس ٹھیک ہی تھا فیروز کی ماں کی منافقت پر دل کھول اٹھا' چلتے چلتے ہم پہنچے "ردائے وفا" پہ" نہیں کیا وجہ ہے کہ جب بھی یہ تحریر پڑھتی ہوں تو فرحانہ ناز ملک کی یاد بہت شدت سے آتی ہے۔ یہ جگہ ان کی تھی خدا ان کی مغفرت کرے اور ان کے گھر والوں کو صبر وجمیل عطا فرمائے۔

بہرحال فرحین اظفر کی بلاشبہ بہترین تحریر ہے۔ نائلہ کا کردار بہت برا لگتا ہے۔ نائلہ کی چالاکیاں دیکھتے ہیں کہ' یہ کہاں تک سوہا کی زندگی میں کیا تبدیلیاں لاتی ہے' انس کا سوہا کے ساتھ رویہ سمجھ میں نہیں آتا۔ حدید کی خاموشی سمجھ سے باہر ہے قرۃ العین چنا کی تحریر اچھی تھی لیکن تحریر کے اینڈ میں ان کا قلم کمزور ہوگیا۔ ایک تو آذر کو اچانک علم ہوگیا کہ وہ عشرت جہاں اور اسرار علی کا بیٹا نہیں ہے۔ دوسرا اس نے کوئی اس طرح کا ری ایکٹ نہیں کیا جو کہ میرے خیال میں اسے کرنا چاہیے تھا۔ بلاشبہ آسیہ بیگم کا صبر رنگ لے ہی آیا اور ان کا بیٹا ان کو مل ہی گیا۔ افشاں سمیع نے بہت بہترین خط لکھا' پلیز عمیرہ احمد اور نمرہ احمد کی کاوش کو پرچہ کی زینت بنائے کرن بہترین ڈائجسٹ ہے۔

ج۔ پیاری عینی! ہمیں بہت اچھا لگا کہ آپ نے کرن میں خط لکھا یہ سلسلہ آپ لوگوں کے لیے ہی شروع کیا گیا ہے تاکہ آپ کی رائے کی روشنی میں ہم کرن کو بہتر سے بہتر کرسکیں آپ آئندہ بھی اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیں۔ آپ کی فرمائش نوٹ کرلی گئی ہے۔

نشا نورین۔۔۔۔ بوتالہ جھنڈا سنگھ

تیز بارش میں کرن کا ملنا جہاں کرن کو دیکھ کر خوشی ہوئی وہاں اپنا نام کہیں بھی نہ دیکھ کر مایوسی بھی ہوئی پھر سوچا میرا لیٹر ہی نہیں ملا ہوگا ورنہ ایسے کیسے ہوسکتا تھا نشا لکھے اور شائع نہ ہو۔

سویٹ سی ماڈل سادے لباس میں ہلکا سا مسکراتی پیاری لگ رہی تھی۔

سب سے پہلے "اگ ساگر ہے زندگی" میں نفیسہ سے ملاقات کی۔ سب کردار آہستہ آہستہ اوپن ہوتے جارہے ہیں۔

ہیں۔

واہ مریم عزیز کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہی مگر یہ مریم آپ کو ہماری یاد تو آئی' بے شک سالوں بعد آئی۔

ہیں۔۔۔ ہیں۔۔۔ ہیں۔۔۔ یہ کیا فائزہ افتخار ویلڈن بہت خوشی ہوئی آپ کا ناولٹ دیکھ کر بس جلدی سے ایک مکمل ناول لکھیں وہ بھی قہقہوں سے بھرپور۔ افسانے ابھی پڑھ نہیں پائے اور انٹرویو وہی پرانے "مسکراتی کرنیں" بھی اپنی جگہ اچھی تھیں اور سب سے اچھا سلسلہ ہے "تمہارے میرے نام" جس میں ہم کم از کم اپنی رائے دے سکتے ہیں اور سب سے بڑا سرپرائز جو آپ نے جواب دیے یقین مانیے آپ کے ایک لفظ لکھنے سے سیروں خون بڑھ جاتا ہے پلیز یہ سلسلہ اب جاری رکھیں اور تھینکس فوزیہ تمر میرا تبصرہ پسند کرنے کا۔

ج۔ پیاری بہن آپ نے صحیح اندازہ لگایا آپ کا خط ہمیں نہیں ملا تھا جب ہی شائع نہ ہوسکا اب کی دفعہ ملا تو شائع کردیا گیا۔ اور آپ کی فرمائش نوٹ کرلی گئی ہے۔

ثناء شہزاد۔۔۔ کراچی

اپریل کا شمارہ تو 9 تاریخ کو ہی مل گیا تھا جبکہ مئی کے شمارے نے 12 تاریخ کو اپنے درشن کروائے۔ ماڈل بہت پیاری اور معصوم لگ رہی تھی۔ سب سے پہلے اداریہ اور حمد و نعت پڑھے' اس کے بعد سوچا اس بار انٹرویوز بھی پڑھ ہی لیے جائیں ماورا کے جوابات بہت اچھے لگے کیونکہ یہ بذات خود مجھے پسند ہیں "مقابل ہے آئینہ" میں ستارہ آمین کومل نے اپنے جوابات میں شعر لکھے وہ زیادہ اچھے لگے۔ محمود ریاض صاحب کی برسی کے موقع پر ان کے لیے سچے دل سے دعا کی اللہ پاک ان کے درجات کو بلند فرمائے اور اپنی رحمتوں کے سائے میں رکھے۔ (آمین) محمود ریاض صاحب کی وجہ سے آج ہم گھر بیٹھے اتنا زبردست رسالہ پڑھ رہے ہیں اور اس کے ذریعے اپنی زندگی کو سنوار رہے ہیں۔ مدرز ڈے کے حوالے سے جو آپ نے سروے کیا۔ اس میں سب کے جواب اچھے تھے اور سب کی ماؤں کی نصیحتوں کو میں نے بھی اپنے پلو سے باندھ لیا کیونکہ' اچھی بات ہر ایک کو سیکھنی چاہیے۔ افسانے چاروں اچھے تھے "مسافت" میں ایک بیوی نے اپنے شوہر کی دوسری شادی کروائی بہت خوب "کاش حقیقت میں بھی ایسا ہو۔ صدف آصف نے "میں اور تم" میں بہت اچھی بات سمجھائی کہ آپ دو سہیلیوں کی خوشیوں سے خوش ہوں گے تو اللہ پاک آپ کو خوشیاں دے گا' اگر دو سہیلیوں کی خوشیوں سے حسد رکھیں گے تو خوشیاں آپ کے در پر کبھی نہیں آئیں گی۔ "بد مزاج اور کانچ" بھی اچھے تھے۔ ناولٹ تین تھے جس میں سے صرف دو پڑھے فائزہ افتخار کا "شاید" اگلے ماہ پڑھ کر پھر تبصرہ کروں گی۔ "سحر نو" میں اماں بی نے آسیہ بانو سے ان کا نومولود بچہ چھین کر بہت زیادہ حاکمیت اور فرعونیت دکھائی مگر آخر میں ماں بیٹے کو در مصطفیٰ کے سائے میں ملا کر دل خوش کردیا۔ نازیہ جمال صاحبہ نے بھی اچھا لکھا۔ فیروز کی محبت میں نورینہ نے ایک الگ ماحول میں خود کو ایڈجسٹ کیا وہ اچھا لگا ایک لڑکی کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ تائی نے اس بے چاری کا زیور چوری کرکے اس پر الزام لگایا جبکہ بعد میں ان کا بھائی زیور لے کر فرار ہوگیا اور بھانڈا پھوٹ گیا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ برائی کبھی چھپ نہیں سکتی۔ "شام مسکرانے لگی" "مریم عزیز" نے بھی اچھا لکھا مگر میرے ایک بات سمجھ نہیں آئی کہ ہر کہانی میں تائی ہی کیوں بری ہوتی ہے (میری تائی تو بہت اچھی ہیں) خیر کہانی اچھی تھی۔ علینہ نے پہلے تو بے وقوفی دکھائی مگر بعد میں ضمیر کو کرارا جواب دے دیا' وہ صہیب کے ساتھ مجھے بھی اچھا لگا۔ "ایک ساگر ہے زندگی" نفیسہ سعید کا ناول اب کھل کر سامنے آیا۔ اب دیکھتے ہیں آخری قسط میں کیا کیا پردے اٹھائے جائیں گے "ردائے وفا" میں نائلہ پر حد سے زیادہ غصہ آتا ہے کیا کوئی اس طرح بھی کرسکتا ہے اب پتا نہیں کیا ہوگا سوہا کے ساتھ' وہ دونوں بہنیں تو پہلے ہی اتنی دکھی ہیں حدید کی شادی عفت سے ہونی چاہیے تھی۔ نائلہ کو سزا ملنی تھی اور یہ ماہا کو کیا ہوگیا اسے عقل سے کام لے کر حسیب کو معاف کردینا چاہیے۔ غلطی تو ہر انسان سے ہوتی ہے جبکہ حسیب اس سے اتنی محبت کررہا ہے۔ جب اللہ بڑی سے بڑی غلطی معاف کردیتا ہے تو ہم کون ہوتے ہیں معاف نہ کرنے والے پلیز سوہا کے ساتھ انس کا رویہ پہلے کی طرح ہوجائے وہ محبت لوٹ آئے جو پتا نہیں کہاں چلی گئی ہے۔ "کرن کرن خوشبو" میں سب کا انتخاب لاجواب تھا۔ "یادوں کے دریچے" میں بھی سب کی غزلیں بہت پسند آئیں۔ "کچھ موتی چنے ہیں" نیا سلسلہ شروع کیا ہے اچھا جائے گا یہ بھی باقی سلسلوں کی طرح۔ "تمہارے میرے نام" میں سب کے تبصرے شاندار تھے۔ امبر جی آپ یقین کریں میں دو مہینے سے سوچ رہی

تھی کہ پوچھوں گی امبر گل اور انیقہ انا کہاں غائب ہیں' لیکن خط اتنی جلدی جلدی میں لکھتی تھی کہ موقع نہیں مل سکا خیر آپ واپس آگئیں موسٹ ویلکم اور ہم کسی کو بھی نہیں بھولتے" آپ سب قاری بہنوں سے تو دل رشتہ جڑا ہوا ہے۔ ارے سب سے اہم بات تو کہنا بھول ہی گئی بہت بہت شکریہ کہ "تارے میرے نام" میں آپ نے جوابات دینے شروع کردیے یہ بندمت کیجیے گا۔

ج وشتا ناول' ناولٹ اور افسانے پسند کرنے کا شکریہ۔ آپ کا خط شائع کردیا گیا ہے' یقیناً" انیقہ جی اور امبر گل آپ کے دلی جذبات سے واقف ہوجائیں گی اب۔

روبینہ لیاقت۔۔۔ ملتان

سب سے پہلے تو میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کہ آپ نے "مقابل ہے آئینہ" میں جگہ دی۔

دس تاریخ سے ہی شاپ کے چکر لگوانے شروع کردیے تھے بھائی پتا کرکے آؤ کہ "کرن" آگیا' آگے سے جواب ملتا "کل آئے گا" لو کر لو گل اور وہ کل چودہ تاریخ کو آئی اور تپتی دوپہر میں "کرن" کی ٹھنڈی روشنی موڈ کو خوش گوار کرگئی۔

ماڈل تو پیاری تھی پر اس کا ڈریس کچھ خاص نہ تھا (سوری) تو جناب سب سے پہلے ہم "تارے میرے نام" میں غوطہ زن ہوئے بھئی اپنی قارئین بہنوں سے بھی تو ملنا تھا نا۔ سب کی شکوے شکایتیں سنیں اچھا لگا ویسے امبر جی آپ کا شکوہ سر آنکھوں پر آپ بھی تھی کہاں اتنے عرصے سے؟ وہ (آئینہ) بھی صاف گو ہے لگی لپٹی رکھنے کا قائل نہیں۔ فوزیہ جی بہت شکریہ پسند کرنے کا۔ باقی سب بہنوں کا بھی پسند کرنے کا شکریہ۔ کچھ کمی سی تھی وہ پوری ہوئی آپ کے جوابات کی بدولت "تارے میرے نام" کو چار چاند لگ گئے۔ "میری بھی سنیے" میں ماورا کو سنا' اچھا لگا سن کر اور عاصمہ جہانگیر سے بھی ملاقات کی۔ "ماں ناراض ہوجائے تو" سروے بھی اچھا تھا۔ فائزہ افتخار کا "شاید" پڑھا اچھا لگا دیکھتے ہیں آگے آگے ہوتا ہے کیا؟ اب آتے ہیں قرۃ العین چنا کے "سحر نو" کی طرف ویلڈن قرۃ العین جی۔ اماں بی نے اچھا نہیں کیا تھا پھر وہ خود بھی تو خوش نہیں رہیں ساری زندگی' آسیہ بانو کا صبر رائیگاں نہیں گیا ان کو صبر کا کتنا خوب صورت انعام ملا۔ شکر ہے اماں بی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ "ڈھول سانول" ٹھیک تھا (سوری نازیہ جی)۔

افسانے سارے ہی لاجواب تھے۔

"بدمزاج" راشدہ رفعت جی کیا کہنے آپ کے' آخر میں تو ہم فریحہ کی چالاکی پر دم بخود رہ گئے' اچھا تھا۔ "مسافت" بھی اچھا تھا" آمنا تھ کنول "نئی رائٹر ہیں کیا؟ یونیک نیم ہے آپ کا۔ "شام مسکرانے لگی" مریم جی اچھا کیا تائی جی اور ان کی فیملی کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ ناز سمجھ دار تھی پر کبھی علینہ کی بے وقوفیوں پر غصہ آتا اور کبھی صہیب کی بدگمانی پر' صہیب کو پتا تھا علینہ بے وقوف ہے اسے علینہ سے بدگمان ہی نہیں ہونا چاہیے تھا۔ چلو خیر شکر ہے صہیب کی بدگمانی دور ہوئی اور ہاں وہ کیا کہتے ہیں "جان بچی سو لاکھوں پائے" قسط وار ناول ابھی کوئی بھی نہیں پڑھا اس لیے تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں۔

ج ۔ روبینہ اب تو کسی کو شکایت نہیں ہوگی کہ ہم اپنے جاننے والوں کو "مقابل ہے آئینہ" میں شامل کرتے ہیں۔ آپ نے کچھ کہانیاں پسند کیں اور کچھ نہیں پسند کیں' ہمیں اپنی رائے سے آگاہ کیا بہت شکریہ۔ قسط وار ناول پڑھ کر بھی اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔

پرواکرن صدیقی۔۔۔ کوٹ چھٹہ

"کرن" ہمیشہ کی طرح لیٹ ملا۔ سلسلے وار ناولز کے کیا کہنے۔ دونوں بہت لاجواب ہیں۔ حبیبہ' زینب کی بیٹی ہے' یہ پڑھ کر ہم شاکڈ رہ گئے۔ فرہاد جیسے ہی مرد ہوتے ہیں جن کی بیویاں بھٹکتی ہیں۔

"ردائے وفا" میں کہانی نے اچانک ہی پلٹا کھایا ہے جو ہمیں بالکل اچھا نہیں لگا۔ نبیلہ ابرار راجہ "میں گمان نہیں یقین ہوں" مجھے ابھی تک تو متاثر نہیں کرپائیں۔

"کرن" کے ساتھ میرا تعلق دس سال پہلے جیسا مضبوط ہے جیسے بھی حالات ہوئے میں نے "کرن" پڑھنا نہیں چھوڑا۔

اب میں اپنی تین کہانیاں ارسال کررہی ہوں۔ مجھے تو اتنی سی بھی امید نہیں ہے کہ میرا یہ خط بھی کرن کی زینت بنے گا کیوں کہ تعریف تو میں نے کوئی کی نہیں ہے اگر برا لگا تو معذرت۔

ج ۔ پرواکرن آپ نے خط لکھا شکریہ۔ آپ کی کہانیاں ہمیں موصول ہوگئیں ہیں' اگر قابل اشاعت ہوئیں تو ضرور شائع کریں گے اچھی کہانیوں کا تو ہمیں انتظار رہتا ہے۔

☼ ☼